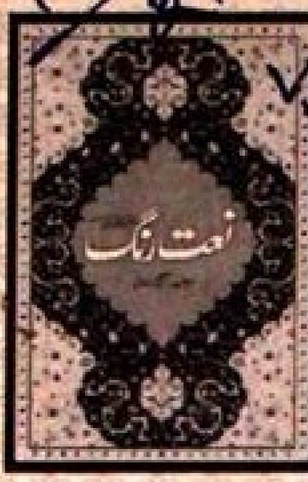
نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ

نعت رنگ

مرتب: صبیح رحمانی



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نعتیہ ادب کا علمی تحقیقی و تنقیدی کتابی سلسلہ

نعت رنگ

شمارہ ۲۸
نومبر ۲۰۱۸ء

مرتب
سید صبیح الدین رحمانی

نعت رنگ
میں شامل تمام مقالات متعلقہ
ماہرین کی رائے اور منظوری کے
بعد شامل کیے گئے ہیں
مقالہ نگاروں کی آراء سے مجلسِ
ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں

B-306 Block 14
Gulistan-e-Johar
Karachi, Pakistan
0333-5567941
0332-2668266
Email: sabeehrehmani@gmail.com
www.naatresearchcenter.com

پاکستان میں قیمت: 500 روپے

وہ دل جو عشقِ محمد ﷺ سے روشناس نہیں
کتاب جہل ہے جس کی کوئی اساس نہیں

(سلیم گیلانی)

ہندوستان میں ''نعتیہ صحافت'' کے فروغ کے لیے

جذبہ، اخلاص اور محنت سے مصروفِ عمل

فیروز احمد سیفی

کے نام

دھنک

فکر و فن

انٹرویو

ایوانِ مدحت

مطالعاتِ نعت

ابتدائیہ

مطالعاتِ نعت کے حالیہ منظرنامے پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ پہلو قدرے اطمینان کا باعث بنتا ہے کہ اب اس کام پر ادب کی مین اسٹریم کے لوگ بھی توجہ کر رہے ہیں۔ ان میں ایسے نام شامل ہیں کہ جو عصری ادبی تناظر میں اپنی ایک مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ نقد و نظر کے شعبے میں ان کی کارگزاری اور پیش رفت کو نہ صرف اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، بلکہ ان کے افکار و خیالات اور تنقیدی منہاج و مباحث دوسروں کے لیے بھی تحریک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے خوشی کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ ان سینئر لوگوں کے ساتھ ہی ساتھ نئی نسل کے نقاد بھی اس کام کی طرف اپنے انداز سے مائل ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ساختیات، پس ساختیات، لسانی مباحث اور مابعد جدید تصورات کی روشنی میں بھی نعت کے جائزے اور مطالعات سامنے آنے لگے ہیں۔ اس طرح موجودہ عہد میں مجموعی طور پر نقدِ نعت کی جو فضا بنی ہے، وہ بلاشبہ بہت حوصلہ افزا ہے، اور اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اب تنقیدِ نعت خود اپنی جگہ ایک فکر افروز اور توجہ طلب شعبے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یقیناً یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی بخشی ہوئی توفیقات کا معاملہ ہے — اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ جب اس نے خود اپنے محبوب سے فرمایا ہے:

ورفعنا لك ذكرك

(اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔)

نقدِ نعت کا یہ منظر جو آج افکار و تصورات کی روشنی کا سامان لیے ہوئے ذہنوں کو جلا بخش رہا ہے اور دلوں کو منور کر رہا ہے، یہ آپ کے ذکر بلندی کا مظہر ہی تو ہے۔

نعت اور نقدِ نعت کے ایک پُرشوق قاری اور نعت رنگ کے مرتب کی حیثیت سے اس باب میں ہونے والی پیش رفت پر مسلسل میری نگاہ رہتی ہے اور میں اس میں ہونے والے ہر نئے کام اور نئے اضافے کے بارے میں باخبر رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہوں۔ خدا کے فضل و کرم سے اس شعبے کی اکثر و بیشتر چیزیں میری نظر سے گزرتی بھی رہتی ہیں اور میرا ذہن ان کے حوالے سے اور عصری ادب و نقد کے تناظر میں سامنے آنے والے سوالات و مباحث اور افکار و تصورات کے بارے میں غور و فکر بھی کرتا

رہتا ہے۔ گزشتہ دنوں جو چندنئی تنقیدی تحریریں سامنے آئیں، ان کے مطالعے کے دوران میں دو ایک باتوں کا احساس ہوا۔ ''نعت رنگ'' کے قارئین اور اس دور کے اہلِ نقد ونظر کو میں ان کے بارے میں آگاہ کرنا یا آپ کہہ لیجیے کہ اُن کو بھی اپنے احساس کی اس رَو میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کام اس خیال سے بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی بڑی علمی وفکری سرگرمی اس وقت تک نہ تو اپنے نئے رجحانات کے تعین میں کوئی مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے اور نہ ہی عہد در عہد آگے سفر کرسکتی ہے، جب تک کہ وہ اپنی تہذیب و روایت کے مرکزی نکتے کو ہمہ وقت ملحوظِ خاطر نہ رکھے۔ یہ مرکزی نکتہ اسی صورت میں ہمہ وقت ملحوظِ خاطر رہ سکتا ہے کہ جب اسے نئے افکار و مباحث کے بدلتے ہوئے تناظر میں مسلسل تازہ کیا جاتا رہے، اور بار بار اس کی طرف توجہ دلائی جاتی رہے۔

رواداری اور وسعتِ قلبی کو ہماری تہذیب وروایت کے بنیادی اور مرکزی نکتے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں سب سے بڑھ کر خود نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے روزمرہ امور میں نظر آتا ہے، اور جلوت وخلوت دونوں میں۔ چناں چہ ہماری علمی، فکری اور ادبی روایت بھی اس سے آراستہ نظر آتی ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ادب وتنقید میں اختلافِ رائے کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ اہلِ علم و دانش تو اس ضمن میں اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ اختلاف تو ادب کے لیے ایک بابرکت چیز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ نئے پہلو سامنے لاتا اور نئے افکار کو اجاگر کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ تاہم اختلاف کو ہمیشہ اپنے حدود کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اختلاف پھر اختلاف نہیں رہتا، بلکہ مخالفت بن جاتا ہے، جو کہ ظاہر ہے، مثبت نہیں، ایک منفی رویہ ہے۔ ادب وتنقید میں اور خصوصاً مطالعاتِ نعت میں تو ہر صورت میں اس سے مکمل طور پر گریز کیا جانا چاہیے۔

اس عرصے میں بعض ایسے مضامین و مقالات اور تجزیات سامنے آئے جن کے مطالعے میں یہ احساس شدت سے ہوا کہ اختلافِ رائے کے حدود کا قطعاً خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں جن معاصرین یا متقدمین کی آرا سے اختلاف کیا گیا ہے، ان کے لیے نامناسب رویے کا اظہار اختلاف کا نہیں، مخالفت کا واضح تأثر دیتا ہے۔ اختلاف کسی بھی رائے، خیال، فکر یا تصور سے کیا جاسکتا ہے، اور اس کے تقابل میں اپنی رائے یا خیال کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام دلائل کے ساتھ ہونا چاہیے۔ محض کسی کو رد کردینا یا پھر اس طرح کے کسی موقعے پر عمومی انداز کا مسترد کرنے والا لہجہ اختیار کرنا کافی نہیں ہوتا۔ بات میں وزن پیدا ہوتا ہے دلیل سے اور اس کو مستحکم کرتا ہے متبادل زاویہ، نیا خیال اور نیا بیانیہ۔ ایسا نہ ہو تو محض رد و مخالفت کا منفی احساس ہی سامنے آتا ہے جو نعت، ادب اور تنقید کسی کے لیے کارآمد نہیں ہوتا۔

اختلافِ رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ کوئی بھی رائے، خیال یا فکر ادب وتنقید میں حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ اس میں ردوبدل اور اضافے کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے۔ بعض افکار ومباحث کی معنویت اور بعض تخلیقی اظہار کے قرینے کسی خاص عہد کے رجحانات اور رویوں کے زیرِ اثر بھی ہوتے ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے اور خصوصاً ان کا تجزیہ اور محاکمہ کرتے ہوئے، اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ اظہار کا پیرایہ تخلیقی ہو یا تنقیدی اس میں شخصی اسلوب، مزاج اور رجحان کا بھی ایک خاص دخل ہوتا ہے۔ اس لیے عمومی انداز سے چیزوں کو مسترد کرنا ادب ونقد کے لیے کبھی مفید اور قابلِ قدر عمل نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیے کہ ادب ونقد میں رنگا رنگی اور تنوع کی اپنی ایک جاذبیت اور اہمیت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے، اس تنوع کا انحصار افراد کی اپنی اپنی تخلیقی اپج اور فکری بصیرت پر ہوتا ہے۔ اگر تنوع نہ ہو تو ادب کا کام بھی ایک مشینی یکسانیت کا شکار ہو کر ساری جاذبیت کھو سکتا ہے۔

ادبی تنقید اور خصوصاً نقدِ نعت میں یہ بات بھی لازماً یاد رکھنی چاہیے کہ یہ فکر ونظر کو روشن کرتی ہے اور ذہنوں کو کھولتی ہے۔ اس لیے اس میں لہجے اور اندازِ بیاں کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ چوں کہ فکر وفہم کے راستے وا کرتی ہے، اس لیے ہمیشہ دلیل کے ساتھ آتی ہے۔ تنقید کو فتوے کا انداز ہرگز اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ فتووں کا طریقہ اور زبان دونوں الگ ہوتے ہیں اور ادبی تنقید کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ تنقید کا مقصد بہتر تفہیم اور نئے زاویے کی تلاش ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ علمی انداز اور تہذیبی رویہ اختیار کرے۔ اس میں سنجیدگی، ذمہ داری اور متانت سے اظہارِ خیال کیا گیا ہو۔ مہذب انداز میں، دوستانہ طریقے سے اور ہمدردانہ مزاج سے اپنی رائے اور خیال کو اجاگر کیا گیا ہو۔ تنقیدِ نعت کے لیے تو یہ سب لازمے تقاضے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص صرف استرداد کا رویہ اختیار کرتا ہے اور شدت پسندی کے ساتھ رائے دیتا ہے اور عمومی انداز میں بیانات جاری کرتا ہے تو چاہے وہ کتنا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو، ادب ونقد میں اس کی بات کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے۔ اس لیے کہ اگر ادبی تقاضے پورے نہ ہوں تو کوئی خیال، کوئی رائے، کوئی نظریہ، کوئی تصور اور کوئی فکر ادب ونقد میں جگہ ہی نہیں پا سکتی۔

اس وقت جب کہ نعتیہ تنقید اور مطالعات کا کام ادب کے مرکزی دھارے کا قابلِ قدر حصہ بن چکا ہے، نعت کے ناقدین کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ادب میں ہر مکتبِ فکر کی اپنی ایک جگہ اور اپنی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ کسی کو یکسر مسترد کر کے کوئی نیا خیال، کوئی نئی فکر یا کوئی نیا نقاد ادب وتنقید میں قطعاً اپنی جگہ نہیں بنا سکتا۔ جگہ صرف اس صورت میں بن سکتی ہے کہ بے شک اختلافِ رائے کا اظہار کیا جائے، مگر تمام تر اختلاف کے باوجود دوسروں کی آرا، تصورات اور افکار کا احترام بھی کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ

آزادیِ اظہار کا بنیادی تقاضا ہے۔ ہاں، اختلاف رائے کو سامنے لاتے ہوئے ضروری ہے کہ اپنے فکر و نظر پر توجہ مرکوز کی جائے اور اُن کی معنویت کو دلیل و برہان کے ساتھ شائستگی اور سلیقے سے پیش کیا جائے۔ نعتیہ تنقید کا فروغ صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جب ان معاملات اور حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کام کیا جائے۔

''نعت رنگ'' بنیادی طور پر ایک نعتیہ ادب و تنقید کا فورم ہے۔ یہاں ہر فکر و خیال کے لوگوں کو جو نعت اور آدابِ نعت اور تنقیدِ نعت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوں، خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ کسی مسلک، کسی مکتب، کسی نظریے، کسی فلسفے اور کسی اسلوب کے تخلیق کاروں اور ناقدین کے لیے ہمارے ہاں نہ تو کوئی خاص رعایت اور نہ ہی کوئی پابندیاں۔ ہمارے ہاں اختلافِ رائے کو اہمیت دی جاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ ادب شائستگی کو ملحوظ خاطر رکھ کر کیا گیا ہو۔ نعت کی تخلیق اور تنقید آپ کا، میرا، ہم سب کا کام ہے۔ اس کے لیے ہم سب کو اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے انداز سے، لیکن پوری ذمہ داری، سنجیدگی اور متانت سے کام کرنا چاہیے تاکہ ہم اس نعتیہ تنقید کو سلیقے اور کامیابی سے آگے بڑھا سکیں۔

وفیات

نعت رنگ کے ہر تازہ شمارے کی اشاعت پر اپنے مرحوم نعت نگاروں اور نعت کاروں کی یادوں کو تازہ کرنا ہمارا معمول رہا ہے۔ یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جو تاعمر ذکر نبی کریم ﷺ کے چراغ روشن کرتی رہی ہیں۔ ان سے جڑی یادوں کا ہجوم ان سطور کو لکھتے ہوئے مجھے ہمیشہ اپنے اطراف محسوس ہوتا ہے۔ کتنے لہجے، فقرے، اشعار اور واقعات یوں تازہ ہوتے چلے جاتے ہیں گویا ملاقات ہو رہی ہو۔ ان عظیم خدمت گزارانِ نعت کی زندگی اور احوال و آثار کا تذکرہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم ان اچھی مثالوں اور خلوص و محبت کے حوالوں کو اپنی آنے والی نسلوں کے لیے اپنے عہد کی تاریخ کے طور پر محفوظ کر جائیں۔ یہ مثالیں اور یہ حوالے ان نئے رہ روانِ نعت کے لیے عزم و حوصلے کا باعث ہوں گے اور وہ ان سے ایک مقصدی زندگی کا ڈھنگ سیکھ سکیں گے، ان بزرگوں کی راہ پر چلتے ہوئے وہ خود اپنی زندگی کے اختتام کو اپنے بعد والوں کے لیے موت کا نوحہ نہیں، بلکہ ایک بامعنی اور دائمی زندگی کا نغمہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق (۱۴ر جنوری ۱۹۱۸ء، امراوتی - ۲۷ر نومبر ۲۰۱۷ء، ناگپور)

ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق اُردو نعت کے پہلے محقق تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی خواہش اور تحریک پر ۱۹۴۵ء میں اپنے تحقیقی مقالے ''اُردو میں نعتیہ شاعری'' کی رجسٹریشن کرائی اور

۱۹۵۵ء میں ناگپور یونیورسٹی نے اس مقالے پر ڈاکٹر صاحب کو پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں یہ مقالہ اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے شائع ہوا۔ اس طرح ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق کے اس وقیع مقالے کے اشاعت سے اُردو میں نعت فہمی کی نہ صرف ضرورت واضح ہوئی، بلکہ اس کے فکری و فنی لوازم کا شعور بھی اجاگر ہوا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح نعتیہ شاعری کو ادب کی ایک الگ صنف کی حیثیت سے دیکھنے میں بھی اس مقالے نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

۱۴؍ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر صاحب پہلی اور آخری بار پاکستان نعت اکیڈمی کی سلور جوبلی کی تقریبات میں ادیب رائے پوری کی دعوت پر کراچی تشریف لائے تو پاکستان کے اہم نعت شناسوں کو ان سے ملاقات اور نشستوں کا موقع ملا۔ وہ تہذیب و شائستگی کا مرقع تھے۔ لباس سے طور اطوار تک، صورت سے سیرت تک، ظاہر سے باطن تک محبت اور مروّت میں ڈھلی ہوئی ایک دل نواز شخصیت۔ گفتار میں حد درجہ ملائمیت، انکسار اور لہجے میں نرمی و لطافت۔ خود کم بولیں اور دوسروں کو زیادہ سنیں۔ گفتگو میں اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کے عادی۔ چہرے پہ کوئی منفی کیفیت نہ بیزاری، بلکہ آہستہ آہستہ اپنے دلائل سے مخاطب کو فتح کرنے کی صلاحیت کے حامل۔ ان سے چند روزہ ملاقات میں ادب، زندگی اور تہذیب کے جانے کتنے ہی پہلوؤں پر بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ اسی موقع پر حضرت حسان حمد و نعت بُک بینک کے سالانہ مجلّے ''حضرت حسان نعت ایوارڈ'' مطبوعہ ۱۹۹۲ء کے لیے کراچی میں ڈاکٹر صاحب کا ایک انٹرویو کرنے کی سعادت بھی مجھے اور غوث میاں کو ملی۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان آکر یہاں کی دینی سرگرمیوں اور بالخصوص نعت کی ترقی دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور تقریباً ہر محفل میں اس حوالے سے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے مقالے کی تکمیل کے مراحل میں مطلوبہ مواد اور حوالہ جاتی کتب کی کمی کا احوال بیان کرتے تھے۔ اس ضمن میں مزید کچھ جاننے کے خواہش مند افراد مجلّہ اوج 'نعت نمبر' مطبوعہ (۹۳-۱۹۹۲ء) میں شائع ہونے والا پروفیسر حفیظ تائب کا مضمون ''اُردو نعت کے اوّلین محقق'' کا مطالعہ بھی کرسکتے ہیں۔

اُردو دنیا کو نعتیہ ادب کی طرف متوجہ کرنے والی یہ عظیم شخصیت امراوتی ضلع کے ایک قصبے تلے گاؤں وساسر میں پیدا ہوئی۔ ان کے والد کا نام سیّد عنایت محی الدین تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۴۱ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا (بعدازاں ایم اے فارسی اور اُردو بھی کیا) پھر حیدرآباد دکن ورنگل اور گلبرگہ میں عارضی طور پر مختلف مدارس میں شعبہ تدریس سے وابستہ رہے۔ ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو گورنمنٹ ماس کالج ناگپور میں عربی کے لیکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اس وقت اس کالج میں منظور حسین شور اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں جیسی شخصیات بھی پروفیسر کی حیثیت سے موجود تھیں۔ یہیں ڈاکٹر غلام

مصطفیٰ خاں نے انھیں نعت پر پی ایچ ڈی کرنے کے لیے تیار کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو ڈراما نگاری سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ان کا ایک طویل ڈراما ''کشمکش'' کے عنوان سے سامنے آیا جو ۲۲۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ ڈراما برسوں ناگپور یونیورسٹی کے ایم اے اُردو کے نصاب میں شامل رہا بعدازاں ایک اور ڈراما ''زہر و تریاق'' بھی ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔

عربی فارسی اور اُردو کے گہرے مطالعے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مقالے اور دیگر مضامین میں مطالعے کا وسیع تناظر سامنے آتا ہے۔ مقالے میں مختلف شعرا کے فکری اور ادبی تجزیے میں خود ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی آرا بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

میرا جی چاہتا ہے کہ آج ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی اس خوشی سے بھی اپنے نئے نعت شناسوں کو روشناس کراؤں جو ڈاکٹر صاحب کو پاکستان میں نعت کے فروغ کے مجموعی ماحول کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ اس خوشی میں نعت کے فروغ کے اسباب و وجوہ جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کیں وہ نہایت قابلِ توجہ ہیں:

> ''مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ پاکستان میں نعتیہ ادب کے ہر پہلو پر اس کے فروغ اور اس کی تشہیر کے سلسلے میں جو کام ہو رہا ہے، وہ نہایت حوصلہ افزا ہے۔ میں جب موجودہ دور کو دیکھتا ہوں اور ۱۹۴۶ء کو یاد کرتا ہوں جب میں اس موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے کام شروع کر رہا تھا تو محسوس کرتا ہوں کہ دنیا بدل گئی ہے۔ پاکستان میں نعت کی ایک نئی دنیا آباد ہوگئی ہے۔ اس تبدیلی کے اسباب پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے جو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا خواب دیکھا تھا وہ تو خواب و خیال ہی رہا، مگر یہ وہی جذبہ ہے جو سیاسی دنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنی تسخیر کے لیے علم و ادب کی دنیا میں آ گیا ہے اور نعت نبی کریم ﷺ کو نظامِ مصطفوی کا بدل بنا لیا۔''

(مضمون سے اقتباس مشمولہ 'بہر زماں بہر زباں'، از نور احمد میرٹھی، مطبوعہ ۲۰۰۶ء، ادارہ فکر و فن کراچی، ص ۹۱)

ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق کی شخصیت اُردو نعت ہی نہیں، بلکہ اُردو شعر و ادب میں بھی ایک محسن کی حیثیت رکھتی ہے کہ ان کی وجہ سے اُردو کی ایک عظیم صنفِ سخن جو اُردو کے اربابِ بست و کشاد کی توجہ سے محروم رہی، اس کا رفیع الشان تعارف ہوا اور سچ پوچھیے تو آئندہ آنے والے ہر زمانے میں اب صنفِ نعت کی تنقید و تحقیق کے ضمن میں جو بھی کام ہوگا تو اس میں ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق کا علمی و روحانی تصرف شامل رہے گا اور ادب کے ایوانوں میں نبی کریم ﷺ کے ذکر کے پھلنے پھولنے سے ڈاکٹر صاحب کے درجات بھی بلند ہوتے رہیں گے۔ انشاء اللہ۔

پروفیسر عارف رضا (۱۳؍ستمبر ۱۹۳۵ء - ۱۵؍اگست ۲۰۱۸ء)

پروفیسر عارف رضا سے اپنے تعارف اور تعلق کو میں کیسے بھول سکتا ہوں کہ ان سے میرا پہلا تعارف فیصل آباد میں ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی صاحب کے گھر میرے ہی اعزاز میں منعقدہ ایک محفل میں ہوا تھا۔ اس محفل کا انعقاد ڈاکٹر ریاض مجید نے کیا تھا اور اس کی صدارت حافظ لدھیانوی مرحوم نے کی تھی۔ یہ کسی بھی شہر میں بطور شاعر میرے لیے رکھی گئی پہلی تقریب تھی۔ کسی سے کوئی خاص تعارف نہ تھا۔ بس محفل ہوٹل میں ڈاکٹر ریاض مجید صاحب سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے فیصل آباد کے حلقۂ نعت کو ایک جگہ مدعو کرلیا سو ایک ساتھ اپنے عہد کے عظیم نعت نگاروں کی رفاقت میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔ اسی مجلس میں پروفیسر عارف رضا سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ ان کی شعر گوئی اور گفتگو دونوں نے مجھے متاثر کیا۔ بعدازاں پھر محفل ہوٹل فیصل آباد میں مجلسِ اقبال کی کسی تقریب میں ایک نعتیہ مشاعرے میں دوبارہ ملاقات ہوئی۔ اس زمانے تک ان کا مجموعہ ''عطا کی خوشبو'' بھی آچکا تھا جو انھوں نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔ یوں ان کی شخصیت اور شاعری کے بعض روشن پہلو میری یادداشت کا حصہ بن گئے۔ وہ تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ جی سی کالج میں نفسیات کے شعبے کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائضِ منصبی سے سبکدوش ہوئے۔ مجلسِ اقبال فیصل آباد اور پاکستان پروفیسرز ایسوسی ایشن فیصل آباد کے صدر رہے۔ حافظ لدھیانوی اور ریاض مجید کی ہمہ وقتی رفاقت نے عارف رضا کو صراطِ نعت کا مسافر بنایا اور یوں وہ ۱۹۸۳ء میں نعت گوئی کی طرف باضابطہ طور پر متوجہ ہوئے۔

جب سے متاعِ زیست ہے وہ جانِ زندگی — پیدا ہوئے ہیں آپ ہی سامانِ زندگی
تیری عنایتوں کے سبب اے بہارِ دیں — ناواقفِ خزاں ہے گلستانِ زندگی
فیضِ نبی سے ربط ہے یومِ الست سے — حاصل ازل سے ہے ہمیں عرفانِ زندگی
یارب ثنائے خواجہ مقدر رضا کا ہو — مہکے نبی کی نعت سے دیوانِ زندگی

☆

نعتِ نبی اثاثۂ عمرِ رواں ہوا — اب اُسوۂ حضور ہی منزل نشاں ہوا
دیدِ رُخِ جمال کی کس کو مجال ہے — خوش ہوں کہ حُسنِ شہرِ نبی عکسِ جاں ہوا
پہنچی درِ نبی پہ رضا کی نوائے شوق — پیدا ہنر میں نور کا طرفہ سماں ہوا

عارف رضا کی شعری ریاضت، شاعرانہ صنعتوں کا شعور، زبان کے لہجوں پہ عبور اور مذہبیت اور اخلاقیات کو شعری گداز میں ڈھالنے کا ہنر انھیں معاصر نعت گو شعرا میں ایک ممتاز حیثیت عطا کرتا ہے۔ ابھی نعت کے ناقدین پر عارف رضا جیسے کتنے ہی صاحبِ فنِ نعت نگاروں کے کلام کا بالاستیعاب ادبی مطالعہ قرض ہے۔

۱۵؍اگست ۲۰۱۸ءکو اپنے دامن میں اپنے دو نعتیہ مجموعے ’عطا کی خوشبو‘ (۱۹۹۱ء) اور ’ثنا کی خوشبو‘ (۲۰۰۰ء) لیے ہوئے۔ یہ خوش کلام نعت گو اس یقین کے ساتھ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا:

اُٹھیں گے حشر میں قبروں سے سب درود سرشت
نبی کی ذات پہ پڑھتے ہوئے درود و سلام

ابوالامتیاز ع س مسلم (۸؍اپریل ۱۹۲۲ء، ضلع جالندھر- ۵؍جون ۲۰۱۷ء، دُبئی)

ع س مسلم کا پورا نام عبدالستار مسلم تھا اور کنیت ابوالامتیاز تھی اسی لیے انھوں نے اپنا قلمی نام ابوالامتیاز ع س مسلم رکھا۔ وہ ایک کامیاب تاجر تھے۔ بعض اہم رفائی اداروں کے قیام و انتظام میں ان کا اہم کردار رہا۔ شعر و ادب سے انھیں خصوصی شغف تھا۔ بالخصوص حمد و نعت ان کے محبوب موضوعات رہے۔ ان کی متعدد تخلیقات حمد و نعت کے حوالے سے شائع ہوئیں، مثلاً حمد و نعت (۱۹۸۴ء)، کاروانِ حرم (۱۹۸۸ء)، اللہ و رسول (۱۹۹۳ء)، کعبہ و طیبہ (۱۹۹۳ء)، زمزمۂ سلام (۱۹۹۳ء)، زمزمۂ درود (۱۹۹۳ء)، حمدِ باری تعالیٰ (۲۰۰۸ء)، زبورِ نعت (۲۰۰۰)، واگاں میں ول موڑ (پنجابی کلام نعتیہ کلام، ۲۰۰۸ء) اسماء النبی پیراہنِ شعر میں (۲۰۱۰ء)، اسماء النبی صدف ضمائر میں (۲۰۱۰ء) جبکہ نثری کتب میں سرودِ نعت (مجموعہ مضامین، ۲۰۰۰ء) وغیرہ معروف ہیں۔ مسلم صاحب کی حمد و نعت گوئی کے حوالے سے ایک کتاب ’’ع س مسلم کی حمدیہ و نعتیہ شاعری‘‘ مرتبہ پروفیسر حسین سحر (۲۰۱۰ء) بھی شائع ہو چکی ہے۔ ان کے فکر و فن پر عرب دنیا سمیت ہندو پاک کی متعدد جامعات میں تحقیقی و تنقیدی مقالات لکھے گئے ہیں جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

مسلم صاحب معاصر نعتیہ منظرنامے میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے کلام میں حضور اکرم ﷺ کی سیرت بیان کرتے ہوئے اور ان سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے حقیقت پسندی اور آداب و احترام کے ان تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے تھے جو علمی اندازِ نعت کے لیے ضروری ہیں۔ قرآن و حدیث اور تاریخ کے جو اشارے ان کے کلام میں ظاہر ہوتے ہیں وہ ان کے تبحرِ علمی، عمیق مطالعے اور تحقیق و تجسس کی گواہی دیتے ہیں۔ ان کی نعت کا اساسی موضوع دربارِ رسالت میں حاضری و حضوری ہے کہ سفرِ حضوری ہی سے ان کی نعت گوئی کا آغاز ہوا تھا۔

خوش بخت و خوش مآل ہوں شہرِ نبی میں ہوں — اک کیفِ لازوال ہوں شہرِ نبی میں ہوں
وہ سر بہ سر کرم کا ہیں دریائے بے کنار — سر تا قدم سوال ہوں شہرِ نبی میں ہوں
مجھ کو نبی کے باغ کی مسلم لگی ہوا — شاداب ہوں، نہال ہوں، شہرِ نبی میں ہوں

۵؍جون ۲۰۱۷ء کو دبئی میں اس اہم نعت گو نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔

محمود احمد مفتی (۱۵ رمئی ۱۹۶۵ء-۲۷ راگست ۲۰۱۸ء)

محمود احمد مفتی فیصل آباد کے نعتیہ منظرنامے پر بحیثیت نعت گو شاعر ایک الگ شناخت رکھتے تھے۔ ایک خوش اسلوب نعت گو اور خوش آواز نعت خواں کی حیثیت سے ان کی مقبولیت نمایاں رہی۔ اوائل عمری ہی سے نعت کے خدمت گزاروں میں رہے۔ نعت کانفرنس کا انعقاد کیا اور فیصل آباد کو شہرِ نعت کے نام سے پکارنے کی فضا بنانے میں سرگرم رہے۔ ان کا تعلق ایک دینی گھرانے سے تھا۔ والد علامہ غلام رسول سمندری والے ایک عالم اور خطیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ بھائیوں میں مولانا محمد مقبول احمد سرور کی شہرت بھی ایک عالم اور خطیب ہی کی ہے جبکہ دیگر بھائیوں میں پروفیسر محمد مسعود اختر بطور شاعر و ادیب اور محمد وجاہت رسول ایک دینی مزاج رکھنے والے نوجوان ہیں۔ محمود احمد مفتی کی قلمی سرگرمیوں کا آغاز اسپورٹس جرنلزم سے ہوا۔ روزنامہ عوام فیصل آباد کے اسپورٹس ایڈیشن کے انچارج رہے۔ علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی رہی۔ نسیمِ ادب فیصل آباد کے بھی صدر رہے۔ شعر گوئی کا شوق نوعمری سے رہا خصوصاً نعت ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا سرنامہ رہی۔ ان کا ابتدائی نعتیہ کلام رسالہ 'صاحب خلقِ عظیم' میں شائع ہوا۔ ۲۰۰۵ء میں ان کا نعتیہ مجموعہ ''نعت میرا بھرم'' زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اس مجموعے میں ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر ریاض مجید اور ڈاکٹر شبیر احمد قادری جیسے ممتاز نعت شناسوں کی تقاریظ موجود ہیں جنھوں نے ان کی نعت گوئی کو سراہا ہے۔

میں سرنگوں تھا بوجہِ ندامتِ عصیاں
کہی تھی نعت مگر منہ چھپا کے ہاتھوں میں

☆

نوعِ انسان اگر ساری بھی ہو نعت سرا
غیر ممکن ہے ادا حقِ ثنا ہو جائے

۲۷ راگست ۲۰۱۸ء کو فیصل آباد سے تعلق رکھنے والا یہ پُرعزم ثنا گو، ثنا خواں حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا مگر اس روشن آرزو کے ساتھ:

زندگی نعت کے ماحول میں گزرے مفتی
بعد مرنے کے بھی بس یہ ہی ہنر ساتھ رہے

پروفیسر منیر قصوری (۲ رجون ۱۹۴۷ء، امرتسر-۲ رجون ۲۰۱۸ء، لاہور)

منیر قصوری کا نام تاریخِ خدامِ نعت میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ ان کی سرپرستی میں کتابی

سلسلہ ''ایوانِ نعت'' کا پہلا شمارہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا گو کہ ''ایوانِ نعت'' اپنا اشاعتی سفر صرف چھ شماروں تک جاری رکھ سکا مگر ان چھ شماروں کو دیکھ کر نعت کے فروغ کے لیے ان کے عزم اور خواہشات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ مختصر مگر معیاری مضامین کے ساتھ نعتیہ شاعری کا عمدہ انتخاب اس کے ہر شمارے میں نظر آتا ہے۔ اس کتابی سلسلے کی مجلسِ ادارت میں منیر قصوری کا نام کہیں نظر نہیں آیا مگر حقیقت یہ ہے کہ روزِ اوّل سے نام و نمود کی خواہش سے دُور اس شخص نے پورے اخلاص سے اس کتابی سلسلے کے ذریعے فروغِ نعت کی کوشش و کاوش کی۔ ان شماروں میں دیگر اہلِ علم کے ساتھ ساتھ منیر قصوری کے مضامین بھی شامل ہوتے رہے۔ وہ عربی زبان و ادب کے اُستاد تھے۔ اس لیے ان کا عربی ادبیات کا مطالعہ بھی گہرا اور وسیع تھا۔ ان کے جو مضامین میری نظر سے گزرے ہیں وہ بیشتر عربی زبان کے نعت گو شعرا ہی کے تعارف اور تذکرے پر مشتمل ہیں۔ منیر قصوری کی شخصیت کا ایک توانا اور روشن حوالہ ان کی شعر گوئی بھی رہا، بالخصوص ان کی نعت گوئی۔ ان کے تین نعتیہ مجموعے میری نظر سے گزرے ہیں جن میں ''جادۂ رحمت'' (۱۹۸۳ء)، ''سوئے مصطفیٰ'' (۲۰۰۰ء) اور ''شہرِ کرم'' (۲۰۰۷ء) شامل ہیں۔ ان کے کلام کا اپنا ایک جداگانہ رنگ ہے جس کے نمایاں عناصر جذب و مستی اور والہانہ پن ہیں، زورِ بیاں، قادرالکلامی اور رموزِ فن سے بخوبی آشنائی نے ان کے کلام میں مزید حسن اور تخلیقی جمال پیدا کیا۔ انھی اوصاف کی بنا پر ان کی نعت گوئی میں تاثیر اور دل آویزی کی کیفیت شدید ہوئی ہے۔

شہرِ کرم فزا سے ارادت کسے نہیں ان کے قریب رہنے کی حسرت کسے نہیں
کس کو نہیں درِ کرم آثار کی لگن اس در سے آرزوے شفاعت کسے نہیں
پھر ٹوٹنے لگا ہے دلوں پر عذابِ غم پھر احتیاجِ دامنِ رحمت کسے نہیں
کیوں ذاتِ مصطفیٰ کا سہارا نہ لے منیر تائیدِ مصطفیٰ کی ضرورت کسے نہیں

خود کو ساری عمر ''درویشِ مصطفیٰ مست'' لکھنے اور سمجھنے والا منیر قصوری اپنے گھر کو ''بوصیری منزل'' لکھ کر نسبتوں کا فیضان حاصل کرنے والا منیر قصوری ۲ر جون ۲۰۱۸ء کو اپنے فنِ نعت گوئی کا چراغ لیے ہوئے قبر کی تاریکیوں میں اُتر گیا۔

نوٹ: محمد سلیم چودھری نے ''شعراے امرتسر کی نعتیہ شاعری'' میں منیر قصوری کی تاریخِ پیدائش ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۷ء لکھی ہے جب کہ ان کے بچوں نے مجھے ۲ر جون ۱۹۴۷ء بتائی ہے۔)

قدیرؔ القادری (۵ر مارچ ۱۹۶۳ء، حیدر آباد - ۱۵ر جولائی ۲۰۱۸ء، حیدر آباد)

مرزا قدیر احمد بیگ کا قلمی نام قدیر القادری تھا۔ ایک صاحب علم صوفی، ایک حاذق طبیب اور ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے آپ کا تعارف علمی حلقوں میں ہوا۔ طبیعت میں اوائل عمری ہی سے دینی رنگ غالب

تھا جسے حضرت حاجی سعید احمد شاہ قادری سے شرفِ بیعت وخلافت نے مزید گہرا کیا اور یوں آپ کی زندگی کے روز وشب مخلوقِ خدا کی خدمت اور تربیت میں صرف ہوئے۔ شعروادب سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کی مطبوعہ کتب میں ان کے دو نعتیہ مجموعے ''خم خانہ مدینہ'' (۱۹۸۵ء) اور ''عارض چہ عارض'' (۲۰۱۵ء) بھی شامل ہیں۔ جنھیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ موصوف کے کلام میں عشقِ نبویﷺ، مدینہ طیبہ میں قیام کی آرزو اور سیرت سرورِ دوعالم سے اکتسابِ فیض کی تمنا کے رنگ کتنے گہرے ہیں۔

ظلمت سے نکالا ہمیں کس ماہ لقا نے
محبوب خدا، صاحب لولاک لما نے
قانون وہ بخشا ہمیں محبوبِ خدا نے
رد ہو گئے قانون زمانے کے پرانے

☆

مشعل راہِ ہدایت ڈھونڈو
یعنی سرکار سے نسبت ڈھونڈو
خواہش خلد بریں ہے تو سنو
قدؔر، طیبہ میں سکونت ڈھونڈو

☆

عشقِ محبوبِ ربّ ضروری ہے
ورنہ یہ زندگی ادھوری ہے

☆

گنجائش خیالِ زمانہ نہیں کوئی
دل میں مرے خیالِ محمد مقیم ہے

قدرالقادری صاحب نے اپنی ایک خانقاہ، مسجد جو مدینہ مسجد کے نام سے معروف ہے، مدینہ ٹاؤن، ہالا ناکہ میں تعمیر کی تھی، ان کے انتقال کے بعد انھیں اسی مسجد کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

صبیح رحمانی

نامِ رسول ہے کہ نمودِ کمالِ فن
اس نقش نے نکھار دیا ہے جمالِ فن

(حفیظ تائب)

بابِ تمجید

گوہرِ وصفِ نبی کی ہو سمائی جس میں
بحر تو بحر ہے دل میں بھی وہ گہرائی نہیں

(احمد جاوید)

دل کی بنیاد رکھنے والا کون؟ مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ
اور پھر اس میں رہنے والا کون؟ مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ

کون اقرا کی خاص نسبت سے آگہی کو عروج دیتا ہے؟
لفظِ اظہار دینے والا کون؟ مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ

کون اوّل ہے کون آخر ہے کون ظاہر ہے کون باطن ہے؟
عبدہٗ سے جھلکنے والا کون؟ مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ

کون تطہیر روح کرتا ہے، کون انفاس میں دھڑکتا ہے؟
دُور و نزدیک سننے والا کون؟ مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ

کون اہل نظر قبیلے کو عشق و مستی کا سوز دیتا ہے؟
سرِ صورت میں بسنے والا کون؟ مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ

کس کے عفو و عطا کے چرچے ہیں کس کے لطف و کرم کے غوغے ہیں؟
ساری خلقت کو دینے والا کون؟ مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ

کون ہے زینت سراء پردہ، کون ہے نورِ شہرِ کُن فیکون؟
ملک آباد کرنے والا کون؟ مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ

کون مٹی میں رُوح پھونکتا ہے کون اُسے نور سے اُجالتا ہے؟
رنگ میں رنگ بھرنے والا کون؟ مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ

کس نے تخلیق کو نمو بخشی کس نے ہستی کو خدوخال دیئے؟
حرمت ہُو پہ کھلنے والا کون، مَالِكُ الْمُلك لَا شَرِيكَ لَهٗ

ریاض مجید، فیصل آباد

ہمسفر ہوگا نبیؐ کا کرم، اِن شاءاللہ
سُرخرو جائیں گے دنیا سے ہم، اِن شاءاللہ

اللہ اللہ جو دمِ نزع لبوں پہ ہو گا
سہل ہو جائے گی راہِ عدم، اِن شاءاللہ

حشر میں پائیں گے ناعت، نبویؐ القابات
احمدؐ اسلوب، محمدؐ رقم، اِن شاءاللہ

زندگانی کا سفر ہو گا سکینت انجام
راہِ حق سے نہ ہٹیں گے قدم، اِن شاءاللہ

حمدِ رب، نعتِ نبیؐ، مدحِ صحابہ کے طفیل
بخشوائے گا ہمارا قلم، اِن شاءاللہ

جھانکنا نزع میں اِن قبلہ طلب آنکھوں میں
آنکھ کی پتلی پہ ہو گا حرم، اِن شاءاللہ

جاگتے سوتے رہے یاد اگر موت، تو پھر
دل سے مٹ جائے گا دنیا کا غم، اِن شاءاللہ

ظلمت آثار، اِس اک راہ سے ہٹ کر ہر راہ
راہِ طیبہ پہ رہیں گے قدم، اِن شاءاللہ

حمد اور نعت کی نسبت سے قیامت میں ریاضؔ
رہ ہی جائے گا ہمارا بھرم، اِن شاءاللہ

ریاض مجید، فیصل آباد

کیا مولا نے پھر لطف و کرم، الحمدللہ
نگاہوں میں ہے پھر بابِ حرم، الحمدللہ
سدا کی خشک آنکھوں میں ہے نم، الحمدللہ
مرے اللہ نے رکھا بھرم، الحمدللہ
ہے کیسی شہ حقیقت، آنکھ مل مل دیکھتا ہُوں
ہوئے تعبیر و خواب ایسے بہم، الحمدللہ
خدائے پاک کی کس کس عطا کا شکر کیجے؟
ہے تا حدِ نظر خوانِ نعم، الحمدللہ
حطیمِ کعبہ میں میزابِ رحمت کے ہیں نیچے
ہوئے اپنی نظر میں محترم، الحمدللہ
ازل کے خواب کا تعبیر نامہ سامنے ہے
نہیں اب نارسائی کا اَلم، الحمدللہ
سدا کے بے وطن سجدوٗ وطن آنا مبارک!
جبیں محرابِ کعبہ میں ہے خم، الحمدللہ
سلیقہ شکر کا دَر آئے تہذیبِ انا ہو
ہر آن الحمدللہ، دمبدم، الحمدللہ
قرینہ حمد کا معمولِ روز و شب ہُوا ہے
خوشا قسمت کہ ہے نوکِ قلم، الحمدللہ
ہماری وصف آرائی جہاں سے مختلف ہے
خوشا! اللہ کے واصف ہیں ہم، الحمدللہ
ریاضؔ عاصی و خاطی پہ رحمت ہے خُدا کی
شفیعِ حشر ہیں شاہِ اُمم، الحمدللہ

ریاض مجید، فیصل آباد

حمد کس طور سرافراز ہے، ماشاء اللہ
لفظ ہر شعر حُبّ انداز ہے، ماشاء اللہ

وِرد کس اسمِ معظّم کا ہے انفاس اندر
لبِ جبریل ہم آواز ہے، ماشاء اللہ

ذکر و تسبیح سے ہے بندگی، معراج مقام
روح کی عرش پہ پرواز ہے، ماشاء اللہ

حرمِ حمد میں دن رات مراقب ہیں خیال
روح سدرہ کی ہم اعزاز ہے، ماشاء اللہ

لفظ آئینہ ہوئے چہرۂ تنہائی کے
قلم احساس کا غمّاز ہے، ماشاء اللہ

لفظِ سبحان کی گردان ہے دھڑکن دھڑکن
دلِ ہر ذرّہ ہم آواز ہے، ماشاء اللہ

کلک و قرطاس ہمہ نُور ہوئے جاتے ہیں
کس حسیں حمد کا آغاز ہے، ماشاء اللہ

آخرِ شب کا ہے ماحول سکینت آثار
ذکر اذکار کا دَر باز ہے، ماشاء اللہ

حمد کی سمت ریاضؔ غزل آرا کا رجوع
ہنرِ نعت کا اعجاز ہے، ماشاء اللہ

ریاض مجید، فیصل آباد

وہ مرے پاس ہے ، سبحان اللہ
جزوِ احساس ہے ، سبحان اللہ

شاہد اس نور کی زر کاری کا
دلِ عکّاس ہے ، سبحان اللہ

کرب کی رات میں فجرِ تسکیں
عفو کی آس ہے، سبحان اللہ

اُس کرم پاش کے ہونے کا خیال
روح کی پیاس ہے، سبحان اللہ

رحمتِ رب سے ہیں آسودہ نصیب
زندگی راس ہے، سبحان اللہ

اُس نگاہوں میں نہ آتے کی مہک
جزوِ انفاس ہے ، سبحان اللہ

لبِ ہر ذرہ ، دلِ ہر شے کو
ذکرِ حق راس ہے ، سبحان اللہ

ہر گُل آیتِ قرآنی میں
اُس کی بُو باس ہے، سبحان اللہ

نام اس ذاتِ گرامی کا ریاضؔ
زیبِ قرطاس ہے ، سبحان اللہ

ہو دن کہ ہو شب، سبحان اللہ
ہو زینتِ لب ،سبحان اللہ

سو لاکھ دعاؤں کا حاصل
راضی رہے رب، سبحان اللہ

ماحولِ خیر کی خواہش میں
کہتے رہیں سب ،سبحان اللہ

دَرِ بہجت کے وا ہوتے ہیں
کہتے ہیں جب ،سبحان اللہ

ہے وِرد وظیفہ جینے کا
ہستی کا سب،سبحان اللہ

ہو یہ ہی ریاضؔ دمِ آخر
سانسوں کی طلب ،سبحان اللہ

ریاض مجید،فیصل آباد

دم آخر رہے وردِ زباں، الحمدللہ
جدا ہو جسم سے اس طرح جاں، الحمدللہ

جو کوئی چیز ہے مصروف ہے تسبیح رب میں
زمیں الحمدللہ، آسماں، الحمدللہ

ہے کیا سرشاریِ بہجت تشکّر زادگاں کی
زباں الحمدللہ اور بیاں الحمدللہ

خوشا! تسبیح کا حاصل مہکتا ہے لہو میں
ہے نزدِ جاں بہشتِ جاوداں، الحمدللہ

ترستی ہے بہت زمزم کو جاں کی شور وادی
ہو سنگِ قلب پر پیہم رواں، الحمدللہ

رہے تسبیح خواں یوں ہی رگوں میں خوں مسلسل
ہو سانسوں کا وظیفہ جاوداں، الحمدللہ

نظر میں ہے مطافِ کعبہ اور میزابِ رحمت
ہے وادی روح کی جنت نشاں، الحمدللہ

ریاضؔ آسودہ دِل ہے حمدِ رب کی سرخوشی میں
ہنر ہے سوئے مکہ پَر فشاں، الحمدللہ

ریاض مجید، فیصل آباد

تحقیق و تنقید

اُردو زبان کو کبھی ہندی اور کبھی ریختہ کہا گیا۔ ہر علاقے نے اسے اپنی زبان کہا اور ہر علاقے میں اس کی مخالفت بھی کی گئی۔ مگر یہ زبان نت نئے علاقے تسخیر کرتی رہی اور آج ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، عرب امارات، سعودی عرب، ماریشس کے علاوہ امریکا، برطانیہ اور جنوبی افریقا وغیرہ میں اس کے بولنے والوں کے علاقے ہیں۔ اسے دیارِ غرب اور امریکا میں بھی برعظیم جنوبی ایشیا سے نقل مکانی کرنے والوں کے رابطے اور اظہار کے ذریعے کا درجہ حاصل ہے۔

اس صورتِ حال کے کئی اسباب ہیں۔ اُردو کی لسانی لچک اور امکانات کو ایک بڑا اور بنیادی سبب سمجھا جاتا ہے مگر راقم الحروف کے نزدیک اُردو کو یہ حیثیت اسلام کے حقائق کے بیان اور ثنائے محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عطا کی ہے۔ ویسے تو زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر اس سے کون انکار کرے گا کہ عربی، فارسی اور اُردو اسلام کی زبانیں ہیں۔ آج تو یہ بات بڑے اعتماد اور یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اُردو کے دامن میں دین کا جو علمی سرمایہ اور خزینہ ہے، اس کی بنا پر وہ عربی کے بعد سب سے زیادہ سرمایہ دار اور مالا مال ہے اور جہاں تک شعر وسخن کا سوال ہے اُردو اپنے امتیازات پر فخر کرسکتی ہے۔ اُردو کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی میں حمد ونعت کا جیسا سرمایہ اُردو میں سامنے آیا ہے اس میں کوئی دوسری مثال اس کے مدِمقابل نہیں۔ ہمارا یہ عہد تو نعت کا عہدِ زرّیں ہے۔ نعت کی کہکشاں اُردو شاعری کے آسماں پر جگمگا رہی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی مدح کی جوئے نور ہماری زبان کی وادیوں سے مستانہ وار گزر رہی ہے۔

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی

ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری، بھارت

اُردو کی سب سے پہلی نعت اور اس کا تخلیق کار

ABSTRACT: The text, presented below, relates to research work that involved researchers in debate, from decades. Three different opinions have so far been emerged through scholars, to highlight the first written Naat in Urdu. According to Baba-e-Urdu, Maulvi Abdul Haq, Professor Yunus Shah, Raja Rasheed Mahmood and Dr.Ifzal Ahmad Anwar, the first Naatia poetry was done by the great saint Hazrar Khawaja Gesu Draz Banda Nawaz. Dr. Jamil Jalibi says that Mathnavi Kadam Rao Padam Rao, written by Fakhr Deen Nizami, was the first creative poem in Urdu containing couplets of Naat as well. Contrary to all, author of this article opines, on the basis of internal witness of Mathnavi Chandain, that Mullah Dawood created the first Mathnavi in Urdu carrying first ever written couplets of Naat. As revealed from the record, he completed the Mathnavi in the year 781 Hijrah, while Khawaja Gesu Draz completed his literary works during the period 815 and 825 Hijrah and Mathnavi Kadam Rao Padam Rao was written during 825 to 839 Hijrah. The periods mentioned herein elucidate that the first written Naat , was appeared in Mathnavi Chandaain of Mullah Dawood, and not in any other creative work in Urdu. The article also contains glimpses of contemporary literary period and life sketch of Mullah Dawood.

اُردو کی اولین نعت کے بارے میں اب تک کے تین نظریات راقم کے پیش نظر ہیں۔ پہلا نظریہ بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر سید یونس شاہ اور راجا رشید محمود کا ہے، جن کے اقوال کے بموجب حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو سب سے پہلی اُردو لغت لکھنے کا شرف حاصل ہے۔ بابائے اُردو نے اپنی کتاب ''اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کے کام'' میں خواجہ بندہ نواز کا وہ نعتیہ کلام رقم کیا ہے، جو انہیں ان کے بقول آغاز حیدر حسن کی مملوکہ بیاض میں مندرج ملا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد انور نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی جانب سے منتسب نعتیہ اشعار اپنے مضمون میں معنون بہ ''اُردو کا

اولین نعت گو"، مشمولہ "نعت رنگ" شمارہ ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء کے صفحات ۲۴، ۲۵، ۲۶ میں نقل کیے ہیں۔

اس نظریہ کے بطلان اور نادرستی کو سمجھنے سے پیشتر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی بابت درج ذیل باتیں سمجھنی ضروری ہیں۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سیّد یوسف راجو قتال کے صاحبزادے ہیں، جو ۷۲۰ھ میں دلّی میں متولد ہوئے تھے۔ آپ پانچ سالوں تک دلّی میں سکونت پذیر رہ کر اپنے والد کے ساتھ دیوگری (دولت آباد) تشریف لائے اور ۷۳۶ھ میں دلّی واپس آگئے اور یہاں تخمیناً ۸۰ سالوں تک مقیم رہے۔ آپ ۸۱۵ھ میں گلبرگہ تشریف لائے جہاں آپ دس سالوں تک اقامت گزیں رہ کر ۸۲۵ھ میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ اس طرح آپ نے تخمیناً ۸۵ سال دلّی میں اور تقریباً بیس سال دکن میں گزارے۔ ان بیس سالوں میں ان کی حیات کے وہ دس سال بھی شامل ہیں، جو انہوں نے اپنے والد کے ساتھ دکن جا کر گلبرگہ میں گزارے تھے۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی بابت نصیر الدین ہاشمی اپنی تخلیق "دکن میں اُردو مع اضافہ آندھرا میں اردو" چھٹی اشاعت ۱۹۶۳ء کے ۲۸، ۲۹ صفحات میں بحوالہ "تذکرہ اولیائے دکن" رقم طراز ہیں کہ "حضرت سیّد محمد حسینی، جو عام طور پر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نام سے مشہور ہیں، ۸۱۵ھ میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں گلبرگہ آئے اور ۸۲۵ھ میں یہاں انتقال فرمایا۔" موصوف مزید رقم طراز ہیں کہ "آپ کی چند تصانیف کا پتہ چلتا ہے یعنی معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود اور شکار نامہ اور رسالہ سہ بارہ وغیرہ۔ یہ رسالے علم تصوف میں لکھے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان رسائل کے زمانہ تصنیف کا صحیح علم حاصل نہیں ہوا، مگر انہوں نے اپنی تصانیف کا سلسلہ گلبرگہ تشریف لانے کے بعد آغاز کیا، کیونکہ شمالی ہند کے قطع نظر دکن میں دکنی زبان کا رواج تھا، عام و خاص اس زبان کا استعمال کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ۸۱۵ھ و ۸۲۵ھ کے درمیانی زمانہ کی تصانیف قرار دی جا سکتی ہیں۔" موصوف اپنی اسی کتاب میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ "مولانا عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے اپنی تالیف "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں بعض نامکمل نظمیں شائع فرمائی ہیں جن کو حضرت گیسو دراز سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آغا حسن صاحب پروفیسر اُردو نظام کالج حیدر آباد کی مملوکہ بیاض میں خواجہ صاحب کے نام سے حسب ذیل کلام درج ہے۔" (اس کے آگے کلام درج کیا گیا ہے!) نصیر الدین ہاشمی نے اسی صفحہ ۳۲ کے حاشیہ نمبر ۲ کے تحت رقم کیا ہے کہ یہ بیاض ۱۱۱۴ھ کی مرتبہ ہے۔ ان کے بقول یہ بیاض عالم گیر کے عہد کے کسی بزرگ ابوالقاسم نصیر الدین کی ہے، جو عالم گیر کے ساتھ ان کی فوج میں شامل تھے اور جہاں جہاں سے ان کو تصوف کا کلام ملا اس کو جمع کر لیا۔"

واضح ہو کہ اورنگ زیب کا عہد سلطنت ۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۸ھ اور بیاض میں ضوابط روایت ودرایت کی ناپسی اور سلسلہ رُوات کا فقدان ہے۔ نصیر الدین ہاشمی خود ہی رقم طراز ہیں کہ ''یہ بیاض...... کسی بزرگ ابوالقاسم نصیر الدین کی ہے۔'' اور یہ کہ جہاں جہاں سے ان کو تصوف کا کلام ملا، اس کو جمع کرلیا'' علاوہ ازیں یہ بیاض عالم گیر کی وفات سے ۴ سال قبل اور خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی وفات سے ۲۸۹ سال بعد کی مرتبہ ہے۔ اس طرح یہ بیاض غیر مستند اور ساقط المعیار ہے۔

نصیر الدین ہاشمی کے ان جملوں کے بعد کہ ''افسوس ہے کہ ان رسائل کے زمانہ تصنیف کا صحیح علم حاصل نہیں ہوا۔'' اور یہ کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب........ نے اپنی تالیف ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں بعض نامکمن نظمیں شائع فرمائی ہیں، جن کو حضرت گیسودراز سے منسوب کیا گیا ہے اور یہ کہ انھوں (خواجہ بندہ نواز) نے اپنی تصانیف کا سلسلہ گلبرگہ تشریف لانے کے بعد آغاز کیا ہے اور یہ کہ ''یہ (خواجہ بندہ بندہ نواز گیسودراز کی تصانیف) ۸۱۵ھ و ۸۲۵ھ کے درمیانی زمانہ کی تصانیف قرار دی جاسکتی ہیں۔'' اُردو کے اولین نعت گو ہونے کا سہرا ان (خواجہ بندہ نواز گیسودراز) کے سر نہیں باندھ جاسکتا، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ مُلّا داؤد فی الواقع ۷۸۱ھ میں اپنی مثنوی ''چندائن'' تخلیق کرچکے تھے، جس کا چھٹا بند نعت کا ہے اور جس کے پانچ افتتاحی بند حمد باری تعالیٰ سے متعلق ہیں۔

حامد حسن قادری اپنی تخلیق ''داستانِ تاریخ اُردو ۱۹۳۸ء کے دوسرے اڈیشن ۱۹۵۷ء کے صفحہ ۳۱ پر خواجہ بندہ نواز گیسودراز اور ان کی تصانیف کے عہد تخلیق کی بابت فرماتے ہیں کہ ''خواجہ گیسودراز ۱۳۲۰ء/ ۷۲۰ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی سے فیض باطن اور اجازت و خلافت پائی، فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت (۱۴۱۲ء مطابق ۸۱۵ھ) کے دہلی سے حسن آباد (گلبرگہ) آئے۔ احمد شاہ اوّل بہمنی کے زمانے میں ۱۴۲۲ء/ ۸۲۵ھ میں وصال فرمایا۔ عربی وفارسی کے بڑے اعلیٰ پایہ کے مصنف تھے۔ اپنے مریدوں اور عام طلبۂ علم کو درس بھی دیا کرتے تھے اور عوام کی آسانی کے لیے کبھی کبھی دکنی اُردو میں بھی سمجھاتے تھے۔ آپ کے چند مقولے اور اشعار کتابوں اور بیاضوں میں پائے گئے ہیں۔''

عبارت مرقومہ بالا سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ موصوف ۸۱۵ھ میں بعہد فیروز شاہ بہمنی گلبرگہ آئے اور یہیں ۸۲۵ھ میں احمد شاہ اوّل بہمنی کے زمانے میں انتقال فرمایا اور یہ کہ آپ عوام کی آسانی کے لیے کبھی کبھی دکنی اردو بھی استعمال کرتے تھے۔

اُردو نعت کے اوّلین محقق ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق المتولد ۱۹۱۵ء والمتوفی ۲۸ نومبر ۲۰۱۷ء اپنی معرکہ الآرا تصنیف ''اُردو میں نعتیہ شاعری'' مطبوعہ ۱۹۷۶ء میں جس پر مرحوم ومغفور کو ناگپور

یونیورسٹی نے ۱۹۵۵ء میں اُردو نعت پر پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی اور جس کی طباعت اُردو اکادمی سندھ کراچی سے ہوئی ہے، رقم طراز ہیں:

حضرت سیّد محمد حسینی............ آپ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے نام سے مشہور ہیں۔ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ تھے۔ ۸۱۵ھ میں گلبرگہ آئے اور ۸۲۵ھ میں انتقال کیا۔ آپ کا مزار زیارت گاہ خلائق ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کا سلسلہ رُشد و ہدایت عربی، فارسی اور دکھنی تینوں زبانوں کے ذریعہ جاری رہا۔ تین رسالے معراج العاشقین، ہدایت نامہ اور سہ بارہ تصوف میں لکھے۔ ان رسالوں کا سن تصنیف معلوم نہ ہو سکا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ سنہ ۸۱۵ھ و سنہ ۸۲۵ھ کے درمیان لکھے گئے ہوں گے۔ خواجہ صاحب سے منسوب بعض اشعار بھی دستیاب ہوئے ہیں۔'' ۲

سطور مرقومہ بالا سے تین باتیں واضح ہوئیں۔ (۱) یہ رسالے (خواجہ بندہ نواز سے منسوب رسالے) ۸۱۵ھ و ۸۲۵ھ کے درمیان لکھے گئے ہوں گے۔ (۲) ان کا سن تصنیف معلوم نہ ہو سکا اور یہ کہ (۳) خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے دستیاب اشعار کا ان کی جانب سے انتساب متیقن نہیں ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے مقدمہ کدم راؤ پدم راؤ میں صفحہ ۲۴ پر خواجہ صاحب کی ۳۶ کتابوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان میں ''ایک بھی کتاب دکنی اُردو میں نہیں ہے۔............ خواجہ بندہ نواز کی یہ تصانیف سب کی سب فارسی، عربی میں ہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ قول بھی قابل توجہ ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے ''کسی رسالے'' پر نہ سال تصنیف درج ہے اور نہ سال کتابت۔'' ۳ جبکہ مُلّا داؤد نے اپنی تخلیق چندائن میں اس کا سن تخلیق خود ہی درج کر دیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد انور اپنے وقیع مضمون ''اُردو کا اوّلین نعت گو'' مشمولہ نعت رنگ، شمارہ ۲۷ کے صفحہ ۲۴ میں فرماتے ہیں کہ ''ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق نے اُردو نعت کے موضوع پر پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، انھوں نے قدیم دور کے اُردو نعت گو شعرا اور نعتیہ مخطوطات، کے باب میں سب سے پہلے حضرت سیّد محمد حسینی گیسودراز کا ذکر کیا ہے۔ ۴ اس سلسلے میں فاضل محقق نے ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق کا یہ قول نقل نہیں کیا کہ ''حضرت خواجہ بندہ نواز کا سلسلہ رُشد و ہدایت عربی، فارسی اور دکنی تینوں زبانوں کے ذریعہ جاری رہا۔ تین رسالے معراج العاشقین، ہدایت نامہ اور بارہ تصوف میں لکھے۔ ان رسالوں کا سن تصنیف معلوم نہ ہو سکا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ سن ۸۱۵ھ و سنہ ۸۲۵ھ کے درمیان لکھے گئے ہوں گے۔ ۵ خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کے عرصہ تخلیق کی بابت مرحوم ڈاکٹر سیّد رفیع الدین کا قول یہ ہے کہ ''یہ سنہ ۸۱۵ھ و سنہ ۸۲۵ھ کے درمیان لکھے گئے ہوں گے۔'' اور قاعدہ کلیہ یہ ہے اور تخلیق

کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کسی کے قول وعمل میں تضاد کی صورت میں اس کو اس کے عمل پر ترجیح وسبقت دی جاتی ہے۔ اس مسلّمہ کے تحت حضرت ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق کے اس قول کو کہ ''یہ (خواجہ بندہ نواز کے رسائل) ۸۱۵ھ وسنہ ۸۲۵ء کے درمیان لکھے گئے ہوں گے'' ان کے اس عمل پر ترجیح دی جائے گی کہ انھوں نے اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں قدیم دور کے اُردو نعت گو شعرا اور نعتیہ مخطوطات کے باب میں سب سے پہلے حضرت سیّد محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز کا ذکر کیا ہے۔ بالخصوص ان احوال وکوائف میں جبکہ دیگر محققین ادب مثلاً نصیر الدین ہاشمی رقم طراز ہیں کہ ''انھوں نے اپنی تصانیف کا سلسلہ گلبرگہ تشریف لانے کے بعد آغاز کیا۔'' نیز ان کے اس قول کی بنیاد پر کہ ''اس لحاظ سے یہ تصنیف ۸۱۵ھ وسنہ ۸۲۵ھ کے درمیانی زمانہ کی تصانیف قرار دی جاسکتی ہے۔'' یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کی کل مدت ۱۰ سال یعنی ۸۱۵ھ وسنہ ۸۲۵ھ تک ہے، اس طرح ان کی ادبی زندگی کا عرصہ ۷۸۱ھ کے کم از کم ۳۴ سال بعد کا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد انور نے اپنے محولہ بالا مقالہ میں سیّد محمد حسینی (خواجہ بندہ نواز گیسودراز) کو نویں صدی ہجری کا بزرگ مانا ہے جبکہ مُلّا داؤد بالیقین اور بلاریب آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں۔ پروفیسر موصوف اپنے مقالہ مشمولہ نعت رنگ، شمارہ ۲۷ پر رقم طراز ہیں ''دو بزرگ ہیں: ایک کا نام سیّد محمد حسینی ہے، دوسرے کا شاہ حسینی۔ پہلے کا تعلق نویں صدی ہجری سے ہے، دوسرے کا بارہویں صدی ہجری سے۔'' اس طرح پروفیسر موصوف نے خود ہی سیّد محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو نویں صدی ہجری کا بزرگ مانا ہے جبکہ ملا داؤد کی چندائن کا سن تخلیق ۷۸۱ھ ہے اس طرح آپ آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ ہوئے۔ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ادبی زندگی ۸۱۵ھ وسنہ ۸۲۵ھ کے درمیان دس سالوں میں محصور ہے جبکہ آپ کی جسمانی زندگی ۱۰۵ سالوں کے عرصہ کو محیط ہے۔ جن میں سے ۸۵ سال آپ نے دلّی میں گزارے۔ اس طرح آپ کی جسمانی زندگی کا عرصہ ہجری سنہ کی آٹھویں اور نویں دونوں صدیوں سے منسلک ہے جبکہ آپ کی ادبی زندگی کی مدت نویں صدی ہجری کے دوسرے عشرے کے نصف ثانی اور تیسرے عشرے کے نصف اوّل سے متعلق ہے۔ مرحوم ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق کے اپنے تحقیقی مقالہ ''اردو میں نعتیہ شاعری'' میں قدیم دور کے نعت گو شعرا اور نعتیہ مخطوطات'' کے ضمن میں حضرت سیّد محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو شرف اوّلیت بخشنے کی اصل اور اہم وجہ یہ ہے کہ مقالہ ''اردو میں نعتیہ شاعری'' کی ترتیب ۱۹۵۵ء میں اس وقت عمل میں آئی تھی، جب فخر الدین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور ملا داؤد کی مثنوی چندائن دریافت نہ ہوئی تھیں، واضح ہو کہ اول الذکر کی دریافت ۱۹۷۳ء میں اور آخر الذکر کی دریافت ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ اس طرح مقالہ ''اردو میں نعتیہ شاعری'' کی ترتیب کے

وقت تک دستیاب معلومات کی روشنی میں اُردو نظم و نثر میں اوّلیت کا شرف خواجہ بندہ نواز گیسودراز ہی کو حاصل تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق نے ''قدیم دور کے نعت گو شعرا اور نعتیہ مخطوطات'' کے ضمن میں پہلا نام خواجہ بندہ نواز گیسودراز کا درج کردیا، جو اس وقت تک کی دستیاب معلومات کی روشنی میں بالکل درست تھا۔ بعد میں جب ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۷ء میں مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور مثنوی چندائن منصہء شہود پر جلوہ گر ہوگئیں تو یہ نظریہ نادرست اور غلط ثابت ہوگیا اور اوّلیت کا شرف ملا داؤد کو حاصل ہوگیا۔

اس طرح سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو اُردو کا پہلا نعت گو بتلانے کے جتنے بھی دعوے کیے گئے ہیں اور اس سلسلے میں جتنے بھی شواہد و براہین پیش کیے گئے ہیں، وہ سب کے سب قیاس وظن اور استقراء و گمان کے نتائج ہیں اور ان کی بنیاد ٹھوس، مضبوط اور استوار نہیں ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد انور کا اسی قبیل کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اس طویل اقتباس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس پس منظر کا حامل انسان، جو سنسکرت سیکھ چکا ہو، فارسی موسیقی کے بجائے ہندی موسیقی کو ترجیح دیتا ہو، سماع کو اسلام پھیلانے کا وسیلہ بنائے ہوئے ہو، جس کا کلام مخصوص مزاج کے لوگ بند حجرے میں سنتے ہوں، موسیقی کے قدر دان اور آشنا جس کی خدمات کی تحسین کرتے ہوں، جس نے چکی نامہ، رباعی، مثلث، مسدس جیسی شعری ہیئتوں میں دادِ سخن دی ہو، جسے سیّد سلمان ندوی جیسے نابغہ انسان نے صوفیا کے چشتیہ سلسلے کا سلطان القلم قرار دیا ہو، بعض شعرا اپنی مثنویوں میں حمد و نعت کے بعد، جس کی منقبت لکھتے رہے ہوں، اس نے ساٹھ برس تک خود کوئی شعر نہ کہا ہوگا؟''[۶]

یہ ساری کی ساری باتیں عقیدت مندانہ جوش میں کہی گئی باتیں ہیں۔ کسی کے سنسکرت سیکھ چکنے، فارسی کے بجائے ہندی موسیقی کو ترجیح دینے، سماع کو اسلام پھیلانے کا وسیلہ بنانے، مخصوص مزاج کے لوگوں کے بند حجروں میں کسی کا کلام سننے، موسیقی کے قدر دان اور آشنا کے تحسین خدمات کرنے، کسی نابغہ انسان کے کسی کو صوفیا کے چشتیہ سلسلے کا سلطان القلم قرار دینے، چکی نامہ، رباعی، مثلث، مسدس جیسی شعری ہیئتوں میں دادِ سخن دینے، شعرا کے حمد و نعت کے بعد کسی کی منقبت لکھتے رہنے سے، کسی شخصیت یا کسی ولی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کوئی شعر کہے، مزید برآں یہاں بات ''ہوگا'' کے سہارے کہی گئی ہے۔ واضح ہو کہ تحقیق میں ''ہوگا'' کے سہارے کوئی بات نہیں کہی جاتی۔

پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد انور کے یہ سبھی نظریات خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو اوّلین نعت گو ثابت کرنے سے قاصر ہیں۔ خواجہ بندہ نواز گیسودراز کو اُردو کا اوّلین نعت گو ثابت کرنے والوں اور انھیں اُردو کا اوّلین نعت گو ماننے والوں اور کہنے والوں پر یہ لازم تھا اور لازم ہے کہ وہ خواجہ بندہ نواز کا کوئی ایسا

نعتیہ شعر یا کوئی ایسی نعت پیش کریں، جو چندائن کے سن تخلیق ۷۸۱ھ سے پیشتر کی ہو، جو وہ نہیں کر پائے۔ اس سلسلہ کے سبھی حضرات نے قیاس و استقراء اور ظن و گمان کا سہارا لیا ہے۔ تحقیق و تنقید کی دنیا میں یہ سبھی ذرائع بے سود وغیرہ ملتفی ہیں اور لہٰذا ناقص ہیں، جبکہ راقم نے حتمی طور پر چندائن کے متعین و متقین سن تخلیق کی نشان دہی کی ہے۔

واضح ہو کہ راقم نے ۱۹۷۷ء میں اپنے تحقیقی مقالہ ''اردو شاعری میں نعت'' کے مفصل خاکے میں ملا داؤد کو اُردو کا پہلا شاعر، اُردو کا پہلا مصنف، اُردو کا پہلا مثنوی نگار اور اُردو کا اوّلین نعت گو قرار دیا تھا۔ اس نے اپنے مقالہ میں فخر دین نظامی کو اُردو نعت میں دوسرے مقام پر رکھا تھا اور یہی ترتیب اس کی مطبوعہ کتاب میں بھی برقرار ہے۔ راقم نے اپنے تحقیقی مقالہ میں عربی اور فارسی اوّلین نعت گوئی کی بھی نشاندہی کردی تھی اور ان تحقیقات کو یو جی سی کے جے آر ایف وظیفہ کے قاعدہ قانون کے منشا کے مطابق محصلات کے زیر عنوان یو جی سی آفس کو ششماہی وظیفہ رپورٹ کے ضمن میں ارسال کردیا تھا۔

تحقیق و تنقید میں فیصلے مثبت دلائل پر کیے جاتے ہیں نہ کہ ظن اور تخمینے کے سہارے۔

راقم السطور ملا داؤد کی ۷۸۱ھ کی تخلیق کردہ نعت کو اس بنیاد پر اوّلین نعت مانتا ہے کیونکہ اس کو ۷۸۱ھ سے ماقبل کا اُردو نعت کا کوئی نمونہ ہنوز دستیاب نہیں ہوا۔ پروفیسر افضال احمد کی یہ بات مبنی بر حقیقت ہے کہ راقم نے ملا داؤد کی تاریخ پیدائش و وفات درج نہیں کی اس لیے کہ ادب کا تعلق تخلیق کار کی ادبی زندگی سے ہے، نہ کہ اس کی جسمانی زندگی سے۔ ملا داؤد کی ۷۸۱ھ میں چندائن کی تخلیق اس حقیقت کی تصدیق و توثیق کرتی ہے کہ وہ ۷۸۱ھ تک ایک پختہ کار تخلیق کار بن چکے تھے۔ تخلیق و تخلیق کار اور اس کے زمانِ تخلیق کے علاوہ اغراض کے لیے تخلیق کار کے سنین ولادت و وفات کی ضرورت پڑ سکتی ہے، چنانچہ راقم السطور ملا داؤد کے سن پیدائش و وفات اور ان کے متعلقات و منسلکات اور نتائج و عواقب سے مفصل بحث اپنی زیر ترتیب کتاب مثنوی چندائن مصنفہ ملا داؤد میں کرے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

اکثر محققین ادب نے خواجہ صاحب سے منتسب اشعار کی ان کی جانب نسبت یقینی نہیں مانی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید رفیع الدین کا درج ذیل قول ملاحظہ ہو:

''خواجہ صاحب سے منسوب بعض اشعار بھی دستیاب ہوئے ہیں۔''[۸]

نصیر الدین ہاشمی فرماتے ہیں کہ ''افسوس ہے کہ ان رسائل کے زمانہ تصنیف کا صحیح علم نہیں ہوا۔''[۹]

ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنے تحقیقی مقالہ ''اردو میں نعت گوئی'' مطبوعہ حمایت اسلام پریس لاہور ۱۹۹۱ء کے صفحات ۱۶۸، ۱۶۹ اور ۱۷۰ میں متعدد جگہوں پر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی جانب منتسب کلام

کی ان کی جانب نسبت مشکوک قرار دی ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ ''اگرچہ بعد کی تحقیق نے ان رسائل سے خواجہ گیسو دراز کی نسبت کو مشکوک قرار دیا ہے۔ ۱۰

۲۔ ''تاہم ان سے منسوب اشعار میں نعت کا ایک نمونہ ملتا ہے۔'' ۱۱

۳۔ ''خواجہ صاحب سے اس کی نسبت مشکوک ہے۔'' ۱۲

۴۔ ''نعت کے محققین اور مرتبین نے اُردو نعت کا ارتقائی جائزہ لیتے ہوئے خواجہ گیسو دراز سے منسوب انہی اشعار کو اوّلین نمونہ نعت کے طور پر درج کیا ہے۔'' ۱۳

مزید برآں خواجہ صاحب کی جانب منتسب کلام اگر ان کا واقعی کلام مان بھی لیا جائے تو چونکہ محققین ادب نے ان کا سارا کا سارا کلام ۸۱۵ھ سے ۸۲۵ھ تک قرار دیا ہے اور مانا ہے جبکہ وہ دلّی چھوڑ کر گلبرگہ (دکن) آگئے تھے۔ اس لیے بھی وہ اُردو نعت کے اوّلین تخلیق کار کی دوڑ میں ملا داؤد سے کم از کم ۴۴ سال پیچھے نظر آتے ہیں، کیونکہ ملا داؤد کی ادبی زندگی خواجہ صاحب کی ادبی زندگی سے کم از کم ۴۴ سال بیشتر کی ہے۔

ڈاکٹر افضال احمد انور کے محولہ بالا قول کا یہ جزو کہ ''متعلقہ کلام کی تاریخ دریافت کی جاتی اور تقدم کا فیصلہ کیا جاتا۔'' ۱۴ مبنی بر حق و حقیقت نہیں ہے، کیونکہ راقم نے ملا داؤد کی نعتیہ کلام پر مشمول مثنوی کی وہ تاریخ تخلیق (۷۸۱ھ) اپنے مقالہ ''اُردو شاعری میں نعت'' میں درج کر دی ہے، جس کا اندراج ملا داؤد نے چندائن کے ابتدائی ابیات میں کیا ہے۔ ۱۵ اس بات کے اثبات میں کہ ملا داؤد کی نعت اُردو کی اوّلین نعت ہے اور ملا داؤد اُردو کے پہلے نعت گو ہیں صرف اتنی ادّعائیت کافی ہے کہ اُردو میں ۷۸۱ھ سے پیشتر کی کوئی نعت ہنوز دستیاب نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے ان کی تاریخ پیدائش و وفات کے اندراج کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مثنوی چندائن میں مسائل تصوف کی وضاحت تحقیقی انداز میں کی گئی ہے۔ اس مثنوی میں شامل نعت میں نبی کی ہر دل عزیزی، آپ کا سبب تخلیق کائنات ہونا، آپؐ کے ذکر کا بلند ہونا، آپ کا ہادی اور شافع روزِ جزا ہونا کے مضامین نظم کیے گئے ہیں۔ ان ابیات میں قرآن و احادیث کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ملا داؤد کے مضامین نعت، دنیائے نعت کے عام مرغوب و مقبول مضامین ہیں۔ تخلیق مثنوی کے سن کی بابت متعلقہ ابیات ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

برس سات سے ہوئے اکیاسی تیہ یہ لوی سر سے ابھیاسی
شاہ فیروز دہلی سلطانو جونا شاہ وزیر بکھانو
دلمو نیر و بسے نورنگا اوپر کوٹ تلے بہے گنگا ۱۶

ملا داؤد نے اس مثنوی میں حمد و نعت کے بعد سلطانِ وقت (کمال الدین) فیروز شاہ کی اور اپنے

پیر زین الدین کی تعریف کی ہے۔

واضح ہو کہ چندائن کے سات دستیاب مخطوطات میں سے چار کا رسم الخط عربی اور بقیہ تین کا فارسی ہے۔ مخطوطات کے سارے عنوانات فارسی زبان میں ہیں اور ہر عنوان کے ذیلی ابیات قدیم اُردو زبان میں ہیں، جن کو ان دنوں ''ہندکی'' کہا جاتا تھا۔ ملا داؤد خود ہی رقم طراز ہیں:

پن میں اکھر کی سدھ پائی
ترکی لکھ لکھ ہند کی گائی ۱۷

اُردو زبان اپنے ارتقائی سفر میں ا۔ ہندکی، ۲۔ ہندی، ۳۔ دکنی، ۴۔ ہندوی، ۵۔ ہندوستانی، ۶۔ ریختہ اور ۷۔ اُردوئے معلیٰ کے ناموں سے جانی جاتی تھی اور اخیر میں اس کا نام اُردو پڑا۔

واضح ہو کہ اہل عرب ہندی کی یائے نسبتی سے پیشتر کاف جوڑ کر ہندکی بمعنی ہندی استعمال کرتے تھے اور انھوں نے اس (ہندکی) کی جمع ھنادک بنالی تھی۔ عرب کے مشہور شاعر کثیر کا درج ذیل مصرع ملاحظہ ہو!

ع طماطم یو فون الوفود ھنادکا

نبی اکرم ﷺ کے عم محترم جناب ابو طالب نے اپنے ایک شعر میں ''ھندکیہ'' لفظ بمعنی ھندیہ استعمال کیا ہے۔ 'ھندکیہ'، 'ھندکی' کی مونث کا صیغہ ہے (تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو 'اردو شاعری میں نعت''، جلد اول، صفحہ ۲۴، ۲۵، جناب ابو طالب کا محولہ بالا شعر ملاحظہ ہو۔)

نبی ام محبوبة ھند کیه
نبی جمع عبید قیس بن عاقل

(ابن ہشام، ج ا، ص ۲۹۸)

اس زمانہ تک ہندی اور اردو کی تقسیم نہ ہوئی تھی۔ دونوں زبانیں ایک تھیں اور دو الگ الگ رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں۔ (موجودہ اُردو فارسی رسم الخط میں اور موجودہ ہندی دیوناگری رسم الخط میں)

واضح ہو کہ قدیم اور جدید اُردو میں تخمیناً وہی فرق ہے، جو انگریزی ادب (قدیم) کے جافری چوسر کی ''پرولاگ ٹو دی کینٹر بری ٹیکس اور جدید انگریزی ادب کے شاعر براؤننگ کی ربی بن عذرا (Rubbi Ben Ezra) اور مشہور ناول نگار ٹامس ہارڈی کی ٹس آف دی ڈر برولے میں ہے۔ اس طرح ملا داؤد چوسر کے ہم عصر اور ملا روم کے بعد کے ہیں۔ واضح ہو کہ خواجہ صاحب کے نعتیہ کلام کا واقعی سن تخلیق کوئی بھی محقق دریافت نہیں کر سکا۔ یہ بات بھی محقق نہیں ہے کہ خواجہ صاحب کا نعتیہ کلام معرض وجود میں ہے بھی یا نہیں اور فی الواقع ان کے کسی ''رسالہ پر نہ سال تصنیف درج ہے اور نہ سال

کتابت'' (بقول ڈاکٹر جمیل جالبی) اس طرح ماسبق کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ محققین ادب نے خواجہ صاحب کے نعتیہ کلام کی اوّلیت کے دعوے بلا کسی استوار دلیل و برہان اور بلاتعین سن تخلیق کیے ہیں، عالم تحقیق میں اس قبیل کے دعوے نامقبول ہوا کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بوقت تخلیق چندائن خواجہ صاحب کی عمر کے اکسٹھویں برس ہونے سے ضروری نہیں کہ وہ یا اکسٹھویں برس کا کوئی شخص یا کوئی عارف باللہ اپنی زندگی کے اکسٹھویں برس میں یا اپنی زندگی کے آخری ایام میں شاعری یا نعتیہ شاعری کرے۔ اس استقرائی وظنی دلیل سے اُردو نعت میں نہ خواجہ صاحب کی اوّلیت ثابت ہوتی ہے اور نہ راقم کے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے کہ چندائن میں مشمول نعت اُردو کی اوّلین نعت ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان (خواجہ صاحب) کے اکسٹھویں برس یا اس سے پیشتر کا اُردو کا کوئی نعتیہ شعر یا نعتیہ نمونہ مع تعین سن تخلیق پیش کیا جاتا اور پھر اُردو نعت میں ان کی اوّلیت کا دعویٰ کیا جاتا لیکن بات یوں نہیں کی گئی۔

جہاں تک مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف فخر دین نظامی کے اُردو کے اولین نعت گو ہونے کا دعویٰ ہے کہ تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ مثنوی کدم راؤ قدم راؤ کے زمان تخلیق کو قیاس و استقراء کے سہارے متعین کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی مرتب مذکور نے صاف صاف اعلان کیا ہے کہ اس مثنوی میں کہیں تاریخ تصنیف درج نہیں ہے لیکن مثنوی میں یہ دو مقامات قابل توجہ ہیں۔

۱۔ نعت رسولؐ کے بعد مدح علاء الدین بہمنی نور اللہ مرقدہ کے عنوان کے تحت مثنوی میں مدحیہ اشعار آتے آتے ہیں جس کا پہلا شعر یہ ہے:

بڑا شاہ وہ شاہ، جس شاہ جگ
رہیں سیوتے جرم تس پائے لگ (شعر ۵۲)

۲۔ بارہ اشعار کے بعد اسی مدح میں یہ شعر ملتے ہیں:

بڑا شاہ احمد کنوار پرت پال سنسار کرتا رادھار (شعر ۶۴)
دھنیں تاج کا کون راجا ابھنگ کنور شاہ کا شاہ احمد بجنگ (شعر ۶۵)
لقب شہ علی آل، بہمن ولی دلی تھی بہت بدھ ترا گلی (شعر ۶۶)
جہاں گیر توں شاہ گڑوا کبیر سمندر منوکت سمندر و سریر ۱۸ (شعر ۶۷)

ان اشعار سے نصیر الدین ہاشمی نے یہ نتیجہ نکالا کہ علاؤ الدین بہمنی کا انتقال ہو چکا تھا اور اشعار ماقبل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ احمد شاہزادہ تھا۔ ۱۹ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں ''مثنوی علاء الدین بہمنی کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے اور اس کا ولی عہد احمد تھا۔ خاندان بہمنی کے سلسلے یہ واضح ہوتا ہے کہ سوائے

گیارہویں حکمراں علاء الدین ہمایوں شاہ کے کوئی ایسا حکمراں نہیں ہوا، جس کا لقب علاء الدین ہو اور احمد شاہ اس کے ولی عہد کا نام ہو۔ یہ احمد شاہ ثالث ۸۶۵ھ۔ ۸۶۷ھ تک حکمران رہا۔ اس لیے اس مثنوی کی تصنیف بھی اسی زمانہ میں قرار دینی چاہیے۔''

پھر خود ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ ''اگر چہ تاریخ فرشتہ میں احمد شاہ ثالث کا لقب نظام شاہ بہمنی لکھا ہے، مگر جو سکّے ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ تک مضروب ہوئے ہیں، ان پر بادشاہ کا نام احمد شاہ مسکوک ہے۔ مولوی عبدالحق کا بھی یہی خیال ہے۔'' ۲۰

سخاوت مرزا صاحب کا خیال یہ ہے کہ ''بہر حال نظامی کا علاء الدین احمد شاہ ثانی ۸۳۸ھ۔ ۸۶۲ھ کا معاصر ہونا تو قطعی ہے لیکن علاء الدین حسن گنگو بہمنی کے دور سے اس کا تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ حسن گنگو بہمنی کے بیٹوں میں احمد شاہ نامی کوئی شہزادہ نہیں تھا۔ البتہ احمد شاہ ولی البہمنی اس کا پوتا اور اس سلسلہ کا نواں بادشاہ تھا۔ ۲۱ اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی کو اس بات سے اختلاف نہیں ہے یہ مثنوی بہمنی دور میں لکھی گئی ہے البتہ اختلاف اس بات میں ہے کہ یہ کس بادشاہ کے دور میں لکھی گئی۔ ہاشمی صاحب اور عبدالحق صاحب اس مثنوی کی تصنیف کا زمانہ ۸۶۵ھ کے درمیان کا زمانہ بتاتے ہیں۔ ۲۲

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نظامی کے حالات کسی تاریخ و تذکرہ میں نہیں ملے۔ مثنوی کی داخلی شہادت کے پیش نظر صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ احمد شاہ ولی البہمنی کے دورِ حکومت ۸۲۵ھ مطابق ۱۴۲۱ء تا ۸۳۹ھ مطابق ۱۴۳۵ء میں اردو زبان کی پہلی (جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کا نظریہ ہے (معلوم مثنوی کدم راؤ پدم راؤ لکھی گئی۔ ۲۳ گمان غالب ہے کہ یہ مثنوی بیدر میں لکھی گئی۔ واضح ہو کہ احمد شاہ ولی نے ۸۳۴ھ/ ۱۴۳۰ھ/ ۱۴۳۰ء اور ۸۳۹ھ/ ۱۴۳۵ء کا درمیانی عرصہ متعین ہوتا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے مصنف کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی دربار سے وابستہ تھے یا نہیں، لیکن وہ فارسی داں ضرور تھے، اس لیے کہ مثنوی کے سارے عنوانات فارسی میں لکھے گئے ہیں۔

قدیم شعرا میں کسی اور کا نام نظامی نہ تھا سوائے ایک نظامی کے، جس نے خوفنامہ تصنیف کیا۔ جس میں روزِ قیامت اور میدان حشر کے حالات بیان کر کے درس اخلاق دیا گیا ہے۔ خوفنامہ کے زبان و بیان کو دیکھتے ہوئے بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ خوف نامہ اس نظامی کا نہیں ہے، جو مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا تخلیق کار ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''خوفنامہ اس دور کی تصنیف ہے جب اُردو زبان ہندی روایت کے سارے امکانات جذب کر کے فارسی روایت کے راستے پر چل چکی تھی۔ ۲۴ بطور جملہ ہائے معترضہ عرض ہے کہ مثنوی کدم راؤ پدم کے مصنف کا نام فخر دین اور تخلص نظامی ہے نہ کہ فخر الدین نظامی جیسا کہ پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد انور نے اپنے محولہ وقیع مضمون میں گیارہ بار متن مضمون ایک بار

ماحصل و خلاصہ میں اور ایک بار حوالہ جات و حواشی میں کل تیرہ بار یہی غلط نام درج کیا ہے۔ فخر دین نظامی نے اپنی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں ہر جگہ اپنا نام فخر دین اور تخلص نظامی رقم کیا ہے۔ چنانچہ بطور مثال حمد کے دو اختتامی ابیات ملاحظہ ہوں۔

سنوئے فخر دیں توں بسر آنکھیا محمد نبی خاتم النبیاء
نظامی کہنہار جس یار ہوئے سنن ہارسن نغز گفتار ہوئے

باز آمدم برسر مطلب! ڈاکٹر جمیل جالبی کے مرقومہ بالا بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ مثنوی کی تصنیف کے دور کا تعین ۸۲۵ھ اور ۸۳۹ھ مطابق ۱۴۲۱ء اور ۱۴۳۵ء کے درمیانی عرصہ میں کرنے کا فیصلہ قیاس و استقراء کے سہارے کیا گیا ہے، جبکہ مثنوی چندائن کا سن تخلص مصنف نے خود ہی ۷۸۱ھ بتلا دیا ہے۔ ملا داؤد نے اپنے تین ابیات میں سے دوسرے بیت میں اس امر کی نشاندہی کر دی ہے کہ یہ مثنوی اس عہد میں تخلیق کی گئی ہے جبکہ دہلی سلطنت کا حکمراں فیروز شاہ تغلق تھا (جو محمد تغلق کے چھوٹے بھائی سیّد سالار رجب کا بیٹا تھا اور جس کی ماں رائے انمل بھٹی کی بیٹی نالا (بی بی نائلہ) تھیں۔ ۲۵ واضح ہو کہ فیروز شاہ کا عہد حکومت ۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ مطابق ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء کل ۳۸ سال ہے۔ جونا شاہ اپنے والد مقبول خاں جہاں کے ۷۷۰ھ تا ۷۹۰ھ میں انتقال کے بعد سے کرسیٔ وزارت پر متمکن تھا۔ ملا داؤد نے اپنے محولہ بالا تین ابیات سے دوسرے بیت میں اپنے عہد کے زعمائے مملکت میں سے صرف جونا شاہ کا تذکرہ کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ (ملا داؤد) اپنے عہد کے ملکی حالات سے مکمل طور پر باخبر اور آگاہ تھے۔ ان دنوں خان جہاں کا عہدہ بہت اہم ہوتا تھا، اس کا تقرر بہ حیثیت وزیر ہوتا تھا، ہم عصر مورخ عفیف کا قول ہے کہ دیوانِ وزارت (وزارت عالیہ) کے تمام اُمور خان جہاں کے تجربہ اور ذہانت سے انجام پاتے تھے۔ فیروز شاہ کہا کرتا تھا کہ ”دہلی کا حقیقی بادشاہ اعظم ہمایوں خان جہاں ہے۔“ ۲۶ ریاست کی پالیسی کا معاملہ سلطان سے متعلق تھا، لیکن وہ وزیر کے مشورہ کو مناسب وزن دیتا تھا۔ فیروز شاہ جب دربار منعقد کرتا تھا، تو اس کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت صرف دس یا بارہ افسروں کو حاصل تھی، جن میں سے تین ہندو رائے ہوا کرتے تھے۔ خاں جہاں کی نشست تخت شاہی کی بائیں جانب مقرر تھی، تخت کی دائیں جانب تاتار خاں بیٹھا کرتا تھا، جو ممتاز عالم اور مذہبی اُمور کا زعیم تھا۔ خانِ جہاں کے عہدے کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ وہی نائب غیبت تھا یعنی سلطان کی عدم موجودگی میں وہی اس کا قائم مقام ہوا کرتا تھا۔ عفیف کے مطابق جہان اوّل کا نام مقبول تھا، اس کا پرانا نام کنول تھا۔ اس کی مہر پر ”مقبول محمد تغلق کا غلام“ منقش تھا۔ اس نے بہ حیثیت وزیر اٹھارہ سالوں تک خدمت انجام دی اور اسی سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوا۔ خاں جہاں اوّل کے ۷۷۰ھ میں انتقال کے

بعد اس کی جگہ اس کے بیٹے نے لی، جس کو سلطان محمد ابن فیروز شاہ نے جونا شاہ کا نام اور فیروز شاہ نے خان جہاں کا خطاب عطا کیا تھا۔ جونا شاہ تاریخ میں خاں جہاں ثانی کے نام سے مشہور ہے۔ مثنوی چندائن کی تخلیق کے دوران یہی جونا شاہ وزیر خان جہاں تھا۔ ملا داؤد نے اپنی مثنوی چندائن میں اس کا ذکر ''وزیر بکھانو'' الفاظ سے کیا ہے۔

ملا داؤد نے اپنی مثنوی کے ان تین ابتدائی ابیات میں سے تیسرے بیت میں اپنی جائے سکونت کی بھی وضاحت کردی ہے کہ وہ ڈلمو کے نزدیک کا باسی ہے جہاں (ڈلمو کا قلعہ ہے اور اس کے نیچے گنگا بہتی ہے۔ واضح ہو کہ ملا داؤد کے زمانے میں ڈلمو فتح پور کا ایک حصہ تھا اور گنگا قلعہ کے اس پار بہتی تھی۔ اس طرح ملا داؤد نے مثنوی کے ان تین ابیات میں مثنوی کے سن تخلیق، اس کے عہد تخلیق اور اس کے مقام تخلیق تینوں کا تعین کردیا ہے۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں یہ حقائق دیکھنے کو نہیں ملتے۔ اس مثنوی کا نام بھی ایک کتاب فروش کا رکھا ہے۔ ۲۷

بطور تلخیص کہا جاسکتا ہے کہ مثنوی چندائن کی تخلیق کا زمانہ متعین ہے۔ ملا داؤد نے مثنوی کی ایک بیت میں لکھا ہے:

برس سات سے ہوئے اکیاسی
تیہ یہ کوی سر سے ابھیاسی

اس طرح مثنوی کے سن تخلیق کا تعین خود مصنف نے کردیا ہے، جبکہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے عرصہ تخلیق کا تعین قیاس واستقراء اور ظن وگمان کے سہارے کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کو اُردو کی پہلی تصنیف بتلانے والے محقق ڈاکٹر جمیل جالبی نے مثنوی کا عرصہ تخلیق کرنے والے دو محققوں کی رایوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افسر صدیقی نے اس مثنوی کا زمانِ تصنیف ۸۲۵ھ اور ۸۳۸ھ کے درمیان کا عرصہ متعین کیا ہے، جبکہ ہاشمی صاحب اور بابائے اُردو عبدالحق نے اس مثنوی کی کا زمانہ ۸۶۵ھ۔ ۱۴۳۵ء کا درمیانی عرصہ متعین کیا ہے، جو ۷۸۱ھ کے بہت بعد کا ہے۔ اس طرح مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں مندرجہ نعت اُردو کی اوّلین نعت کی دوڑ میں کافی پیچھے چھوٹ جاتی ہے۔

خواجہ بندہ نواز گیسودارز کی پانچ تصانیف اور ان کے شعری کلام کی بابت کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہے کہ وہ کس سنہ کی تصانیف ہیں یا یہ کہ وہ نفس الامر اور واقع میں ان کی تصانیف یا تخلیقات ہیں بھی یا نہیں؟ سبھی علمائے ادب کی تحقیق کی رو سے خواجہ صاحب کا سارا کا سارا کلام ۸۱۵ھ اور ۸۲۵ھ کے مابین کا ہے اور یہ مدت چندائن کے سن تخلیق سے کم از کم ۳۴ سال بعد کی ہے۔

اس طور سے لے دے کر ملا داؤد کی چندائن ہی واحد ایسی تصنیف بچتی ہے جس میں مشمول نعت کا

زمانِ تخلیق (۸۱۷ھ) خود مثنوی میں درج ہے، اس لیے وہ اُردو کی اوّلین نعت ہے اور اس کا تخلیق کار کا اوّلین نعت گو ہے۔

واضح ہو کہ اُردو کے اوّلین نعت گو کی دوڑ میں شامل ان تینوں ذی علم و ذی منزلت نفوسِ قدسیہ میں سے سب سے زیادہ ذی علم و صاحب مرتبت و جلالت قدسی نفس مُلا داؤد ہیں جیسا کہ ان کے نام کے سابقہ مُلا سے عیاں ہے۔ مُلا طاہری علوم کا منتہی ہوتا تھا۔ زمانہ ماسبق میں مُلا تعلیم و تعلّم کا آخری نردبان ہوا کرتا تھا۔ اور اس پر فائزین کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی۔ مثلاً مُلا روم، مُلا داؤد، مُلا اسحاق سرہندی، مُلا حکیم علیم الدین، مُلا تبریزی، مُلا محمد تقی، مُلا نظیری، مُلا محمد سعد بن قطب شہید، مُلا نظام الدین محمد اور مُلا کمال الدین فتح پوری وغیرہ ہم۔

چندائن اپنے عہد کی معروف و مقبول مثنوی ہے۔ مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی نے اس مثنوی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''یہ مثنوی دلچسپ ہے۔ اس میں اللہ والوں کے لیے غور وفکر کا سامان ہے۔ یہ معارف اور اسرار سے لبریز ہے۔ بہت سی قرآنی آیات کے رموز حل کرنے میں معاونت کرتی ہے اور ہندوستان کے مترنم گیتوں سے روشناس کرتی ہے۔''

"Rare Fragments of Chandaen and Mergawati"

(بحوالہ چندائن، ص ۷، پہلی اشاعت، ۱۹۶۷ء بنارس وشو ودیالیہ پرکاشن)

آخر میں، اس سلسلہ میں اس حقیقت کا اعلان لازمی و ضروری ہے کہ یہ مثنوی چندائن اُردو کی پہلی تخلیق و اُردو کی پہلی مثنوی ہے اور چونکہ مثنوی میں شامل نعت، مثنوی کا جزو ہے اس لیے وہ اُردو کی سب سے پہلی نعت ہے اور اس کا تخلیق کار اُردو کا سب سے پہلا نعت گو ہے۔

واضح ہو کہ ہندوستان سے شائع ہونے والے ایک ہندی اخبار ''ہندوستان'' کے ۷ر دسمبر ۲۰۱۷ء کے شمارے نے آگاہی ہوئی کہ پٹنہ سے ۳۰ کلومیٹر دوری پر واقع قصبہ منیر کی مشہور خانقاہ میں ملا داؤد کی چندائن اور ملک محمد جائسی کی پدماوت کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ جن کا رسم الخط فارسی ہے۔ یہ نسخے ۲ ربیع الاول کو عوام کی زیارت کے لیے منظر عام پر لائے جاتے ہیں۔ یہ نسخے رجسٹر ناپ کے نصف حصے کے مساوی کاغذ پر مرقوم ہیں۔ اس طرح اب ملا داؤد کے آٹھ نسخے دستیاب ہیں، جن میں سے چار نسخوں کا رسم الخط عربی اور بقیہ چار کا فارسی۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ دکن میں اُردو، بار ششم ۱۹۶۳ء، مصنفہ نصیر الدین ہاشمی، صفحات ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶

۲۔ اُردو میں نعتیہ شاعری، اکتوبر ۱۹۷۶ء مصنفہ ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق، صفحات ۱۲۵، ۱۲۶

۳۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، ۱۹۷۳ء نیا ایڈیشن ۱۹۷۹ء مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۳۲
۴۔ اُردو میں نعتیہ شاعری، مصنفہ ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق، صفحہ ۱۲۵
۵۔ ایضاً، ص ۱۲۶
۶۔ ''اردو کا اوّلین نعت گو''، مضمون مشمولہ رسالہ نعت رنگ، شمارہ ۲۷، مصنفہ ڈاکٹر افضال احمد انور، صفحہ ۳۵
۷۔ ایضاً ۳۳
۸۔ دکن میں اُردو مصنفہ نصیر الدین ہاشمی، صفحہ ۲۹
۹۔ اُردو میں نعتیہ شاعری، ص ۱۲۶
۱۰۔ تاریخ ادب اُردو، جلد اول، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۱۶۰، بحوالہ اُردو میں نعت گوئی، مصنفہ ڈاکٹر ریاض مجید، ص ۱۶۸
۱۱۔ اُردو میں نعت گوئی، مصنفہ ڈاکٹر ریاض مجید، ص ۱۶۸
۱۲۔ ایضاً، ص ۱۷۰
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۶۹
۱۴۔ ''اردو کا اوّلین نعت گو''، مضمون مشمولہ رسالہ نعت رنگ، شمارہ ۲۷
۱۵۔ اُردو شاعری میں نعت، جلد اوّل (ابتدا سے عہدِ محسن تک)، مصنفہ ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد، ص ۴۲
۱۶۔ مثنوی چندائن مصنفہ ملا داؤد، وشوودیالیہ پرکاشن وارانسی، ۱۹۶۷ء ص ۱۵، بند نمبر ۱۷
۱۷۔ ایضاً، ص ۸، بند نمبر ۹
۱۸۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، مصنفہ فخر دین نظامی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، دیباچہ ص ۱۳
۱۹۔ دکن میں اُردو، مصنفہ نصیر الدین ہاشمی، ص ۳۴، مطبوعہ اُردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۰ء، بحوالہ کدم راؤ پدم راؤ، ص ۱۳
۲۰۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، صفحات ۱۳، ۱۴
۲۱۔ سہ ماہی اُردو ادب، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، شمارہ ۲، ص ۴۴، بحوالہ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، ص ۱۴
۲۲۔ مثنوی کدم راؤ پدرم راؤ، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص ۱۴
۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶ ۲۴۔ ایضاً ص ۱۸
۲۵۔ جامع تاریخ ہند، پہلی اشاعت، ۱۹۸۴ء تیسری اشاعت، ۲۰۱۱ء، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی، مصنفہ محمد حبیب خلیق احمد نظامی، ص ۷۹۹
۲۶۔ ایضاً، ص ۸۱۱
۲۷۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، ص ۱۶
۲۸۔ مثنوی چندائن، ص ۱۵، بند نمبر ۱۷
۲۹۔ "Rage Fragments of Chandaen and Mergawati"
(بحوالہ مثنوی چندائن، ص ۷، پہلی اشاعت ۱۹۶۷ء وشوودیالیہ پرکاش وارانسی)

☆☆☆

مبین مرزا، کراچی

اقبال: حرفِ نعت اور تشکیلِ افکار

ABSTRACT: Basic spark for creative discourse of Iqbal has tried to be explored in this article. Iqbal's priority was indeed to find treatment of religious experience, as a source of Divine knowledge, and his entire thought system was based on exploiting the centrifugal source of energy for dynamism. For achieving this end, he concentrated upon the basic sensational element of LOVE which transformed into an all time's living legend of human history i.e. MUHAMMAD (S.A.W). In this scenario, the entire poetic work of Iqbal presents NAAT in its original form or in different shapes of poetic version, in order to invite attention towards the only binding source for each and every living society of the world.

واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کے بحرِ ناپیدا کنار میں اقبال کی مثال ایک جزیرے کی سی ہے۔ وہ اس بحر کا حصہ ہے، لیکن اس میں گم نہیں، بلکہ اس سے الگ اپنی ایک قائم بالذات شناخت رکھتا ہے۔ اس بحر میں سر برآوردہ موجیں اُمڈتی رہی ہیں، لیکن یہ جزیرہ اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ اس کے رنگ اور موسم سب اس کے اپنے ہیں اور الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ سمندر کی موجوں کا اپنا اپنا خروش اور اپنی اپنی گونج ہے اور اس جزیرے کی ہواؤں کا اپنا ایک آہنگ۔ سمندر کی لہروں کے دامن میں ہیرے موتی ہیں تو اس جزیرے کی مٹی میں اپنے پوشیدہ خزانے۔ یوں تو یہ دونوں باہم مربوط ہیں، لیکن دونوں کی الگ ہستی ہے اور جداگانہ شناخت۔

اہم بات یہ ہے کہ ہماری تنقید نے بھی اس حقیقت کو سمجھا اور تسلیم کیا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جن زاویہ ہائے نگاہ، جیسے موضوعات اور جن تناظرات میں کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا گیا ہے، بلاشبہ اردو کے کسی دوسرے شاعر کا نہیں ہوا۔ یقیناً اس کا سبب اقبال کے حرفِ سخن اور اس کے معجزۂ فن کی نمود ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کے باوجود آج بھی اگر کوئی اک ذرا توجہ سے شعر و فکرِ اقبال پر نگاہ ڈالے تو اُسے کچھ ایسے نکات بہر حال فراہم ہو جاتے ہیں جو اس کی تفہیم کے نئے پہلو اجاگر کرتے ہیں۔ اس میں کہیں عصرِ حاضر کے افکار و نظریات سیاق فراہم کرتے ہیں تو کہیں تہذیب و تمدن کے تصورات۔ یہی وجہ ہے

کہ اقبال کی شاعری اور افکار آج بھی اپنے مطالعے کا جواز رکھتے ہیں۔

یوں تو اسے سخنِ اقبال کی بلند اقبالی ہی کہا جائے گا کہ مختلف الخیال افراد اپنے اپنے زاویہ ہائے نگاہ سے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد نہ صرف شاد کام رہتے ہیں، بلکہ اپنے فکر وخیال کے ذیل میں انھیں یہاں سے حوالے اور مثالیں بھی میسر آ جاتی ہیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں، وہ اہلِ مذہب ہوں یا انقلابی، قوم پرست ہوں یا سماجی و معاشی مساوات کے داعی، تہذیب کے خوگر ہوں یا آزادیِ انساں کا نعرہ لگانے والے، فطرت پسند ہوں یا خودی کے پرستار، فلسفہ وحکمت کے جویا ہوں یا لطفِ زبان و بیاں کے رسیا— اقبال کے یہاں سبھی کو تسکین وطمانیت کا سامان حسبِ مراد میسر آ جاتا ہے۔ تاہم اگر شمس الرحمٰن فاروقی اس صورتِ حال سے نالاں ہیں کہ اس طرح اقبال کو افکار کے سانچوں میں بانٹ کر پڑھنا زیادتی ہے تو ٹھیک ہے، وہ اقبال کا لفظیاتی اور عروضی نظام پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنا شوق پورا کرلیں۔ آزاد ذہن کے ساتھ ادب پڑھنے والے لوگ آخر نقادوں یا اُن کی تنقید کی انگلی پکڑ کر چلنے کے پابند تو نہیں ہوسکتے۔ ویسے تو اقبال کو اُن کے افکار کے تناظر میں پڑھنے کی شکایت سلیم احمد نے بھی کی تھی اور کہا تھا کہ افکار کی اہمیت کو اس درجہ بڑھا دیا گیا ہے کہ شاعر (یعنی اُن کے بہ قول اصل) اقبال کہیں دب کر رہ گیا ہے۔

ناقدینِ اقبال پر سلیم احمد اور شمس الرحمٰن فاروقی کے اعتراضات اپنی جگہ۔ ظاہر ہے، یہ اعتراضات ان سب لوگوں کے مقالات وتجزیات اور ان سے حاصل شدہ تأثرات اور نتائج کے حوالے سے کیے گئے ہیں جو غیر ضروری طور پر اقبال کے افکار پر مرکوز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایسے لوگ باقی سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف ومحض اقبال کے یہاں سے فلسفہ برآمد کرنے یا اُس سے فلسفے کے نکات اور دلائل و براہین اخذ کرنے کو اصل کام سمجھ لیتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ کسی بھی بڑے شاعر کا متوازن اور جامع مطالعہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب اس کے افکار وخیالات کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کے ساتھ اُس کی طرزِ احساس، تشبیہاتی و استعاراتی علائم، فنی اوصاف اور جمالیاتی خواص کو بھی تہ بہ تہ کھولنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام ذرا دقت طلب ہے اور اُس وقت ہوسکتا ہے جب نقاد اُس مرکز ومحور تک پہنچنے کی جستجو کرے جہاں سے زیرِ مطالعہ شاعر کا نظامِ فکر و احساس تحریک حاصل کرتا اور نمو پاتا ہے۔

دقّت اپنی جگہ، لیکن کسی فن کار کے بنیادی داعیے اور مرکزی مسئلے کو اس کے فن کارانہ اظہار کی اعلیٰ ترین سطح پر سمجھنے کے لیے یہی طریقہ سب سے زیادہ موزوں ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ فکر واحساس کا مرکز ہی اصل میں وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر فلسفے کے دقیق مسائل بھی جمالیاتی پیرائے میں اس طرح بیان ہوتے ہیں کہ فکرِ محسوس کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ کام دقت طلب اس لیے ہوتا ہے کہ اِس میں فن کار

کی کلّیتِ کار کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ بڑے فن کار کا تخلیقی عمل یا فنی نگارخانہ اصل میں ایک طلسم کدے جیسا ہوتا ہے اور اس کی کلید یا اسمِ اعظم اُس کا مرکزی مسئلہ ہوتا ہے۔ اس طلسم کدے میں داخل تو کہیں سے بھی ہوسکتے ہیں، فکر و فلسفے کے راستے، طرزِ احساس یا اسلوب کی راہ سے، تشبیہات، استعارات یا علامات کے دروازے سے، اور اگر ایک بار داخل ہو جائیں تو اِس کے بعد سیرِ گلگشتِ مصلّیٰ کا لطف بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اٹھایا جاسکتا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ فن کار کا فکری اور جمالیاتی طلسم پوری طرح کھلتا انھی لوگوں پر ہے جنھیں اس کا اسمِ اعظم حاصل ہو جائے۔

اب مثال کے طور پر اقبال ہی کو سامنے رکھ لیجیے۔ یہاں نظریات ہیں، افکار ہیں، زمان و مکاں، تہذیب و تمدن، بقا و ارتقا، انہدام و زوال کے تصورات ہیں، تشبیہات و استعارات کا ایک وسیع نگارخانہ ہے، اسلوبیات اور لفظیات کا نظام ہے، لہجہ ہے، انداز ہے، تیور ہیں — غرضے کہ وہ سب کچھ ہے جو ایک بڑے شاعر کے یہاں ملتا ہے یا اس کی اثر آفرینی اور فسوں کاری کو قائم کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں مختلف پڑھنے والوں پر اپنے اپنے انداز اور تناسب سے اثر کرتی ہیں۔ کوئی فکر و فلسفہ کی داد دیتا ہے تو کوئی زبان و بیاں کی، کوئی لہجے کا قتیل ہوتا ہے تو کوئی گھن گرج پر فریفتہ۔ تاہم اگر آپ نتیجہ مجموعی صورت میں دیکھنا چاہیں تو بس وہ یہ نکلتا ہے کہ پڑھنے یا سننے والا اقبال کا قائل ہے۔ چناں چہ اقبال کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف یہ نکلا کہ وہ قائل کر لیتی ہے، یا چلیے یوں کہہ لیجیے کہ اپنے اثر میں لے آتی ہے۔ یہ وہ معاملہ ہے جس میں اقبال پوری اردو شاعری میں سب سے آگے نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ میرؔ اور غالبؔ سے بھی۔ اب اگر بات اقبال کا قائل یا قتیل ہونے پر ہی ختم ہو جاتی ہے تو یہ الگ معاملہ ہے، لیکن اگر کوئی ان کے افکار و تصورات، اسلوب و آہنگ اور مزاج و احساس کو اس طرح سمجھنا چاہتا ہے کہ اُن کے تخلیقی عمل کی کنہ تک پہنچے اور اُن کے فکری نظام اور جمالیاتی تجربے کو تہ در تہ کھول کر دیکھ سکے تو اسے لامحالہ اُس مرکز تک پہنچنا ہوگا جہاں سے یہ اکھوا پھوٹتا اور سخنِ اقبال میں رنگ و نور کی شعاعوں کی صورت ظہور کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ہوئے اُن کے فکر و فن کی ایک جہت قدرے اختصاص کے ساتھ روشن نظر آتی ہے، اور وہ ہے اُن کی نعت گوئی۔ چوں کہ بیشتر ناقدینِ اقبال اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اُن کے افکار و خیالات کے دوسرے نکات کو موضوعِ گفتگو بناتے رہے ہیں، اس لیے اقبال کے شاعرانہ مقام و مرتبے کے تعین میں اس جہت پر عام طور سے توجہ ہی نہیں دی گئی۔ یہی سبب ہے کہ اگر کچھ ناقدین نے اس حوالے سے کلامِ اقبال پر نگاہ ڈالی اور جائزہ لیا تو ان میں بھی زیادہ تر لوگ وہ ہیں جنھوں نے اسے اُن کے عشقِ رسول ﷺ کا حاصل گردانا اور عقیدتِ محض کے زمرے میں

شمار کیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اقبال کی شاعری میں راہ پانے اور بیان ہونے والے افکار و تصورات کو نعت کے فکری اور اسلوبیاتی زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔

معدودے چند اہلِ نظر نے اقبال کے یہاں نعت کو صنفی سطح پر اور فنی خصوصیات کے ساتھ دیکھا ہے، اور اُس کے جمالیاتی پہلوؤں اور ادبی محاسن کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ویسے اقبال کے بہت سے ناقدین جن میں بڑے بڑے ثقہ لوگ بھی شامل ہیں، کلامِ اقبال کی اس جہت کو درخورِ اعتنا ہی نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ افکارِ اقبال کی تعبیر و تشریح کے باب میں آپ کو مشرق و مغرب کے کتنے ہی فلسفیوں، تاریخ دانوں اور سماجی مفکرین کے حوالے قدم قدم پر ملتے ہیں، لیکن اگر نہیں ملتا تو اِس نکتے پر غور و خوض کا کوئی حوالہ نہیں ملتا کہ سخنِ اقبال میں راہ پانے والے افکار و تصورات اجزا کی صورت میں یہاں وہاں سے ماخوذ ہیں یا کوئی ایک منبع ہے جس کی کرنوں نے اقبال کے افکار و آثار کی عمارت کے ہر گوشے کو منور کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے اگر مختلف افراد کے تصورات و خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنا ایک نظامِ افکار ترتیب دیا ہے تو بھی یہ اپنی جگہ ایک بڑی بات ہے، لیکن اگر یہ ساری روشنی ایک ہی مرکز سے حاصل کی گئی ہے جس سے اس کا پورا ایوانِ فکر جگمگا اٹھا ہے تو یہ اُس سے بھی کہیں بڑا اور اہم کام ہے۔ اس صورت میں اقبال کی جامع تفہیم کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس منبع و ماخذ کو دیکھا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اقبال کے یہاں یہ تجلی کس طرح ظہور کرتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا، بالعموم فکرِ اقبال کا مطالعہ جن اساسی نکات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اُن میں نعت گوئی شامل ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے، اِس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ مطالعۂ اقبال کے لیے یہ قرینہ توجہ طلب محسوس نہیں کیا ہوگا، ورنہ اتنے بڑے اور اہم ناقدین و شارحینِ کلامِ اقبال اپنے موضوع کی اس جہت سے بھلا کیوں کر صرفِ نظر کر سکتے تھے۔ تاہم اس امر کا فیصلہ بہتر طور سے اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم براہِ راست شعرِ اقبال سے رجوع کریں اور دیکھیں کہ وہ اس باب میں کس نوع کی شہادتیں پیش کرتا ہے۔ ہماری یہ طالب علمانہ تفتیش کسی گہری چھان پھٹک اور بہت باریک بینی کا مطالبہ بھی نہیں کرتی۔ محض ایک طائرانہ نگاہ ہمیں اس معاملے کو سمجھنے کا موقع فراہم کر دیتی ہے، اور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کے افکار و تصورات کی تشکیل و تعمیر میں جس جوہر نے بنیادی کردار ادا کیا ہے، وہ رسالت مآب ﷺ کی سیرت و کردار ہے۔ اقبال نے فکر و احساس کی ہر سطح پر اس کا نہایت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ چناں چہ اقبال کے فکر و فن کا مرکزی دھارا اسی اثر کی قوت سے متعین ہوتا ہے۔

تاہم غور طلب بات یہ ہے کہ اقبال کے فکری سانچے میں برقی رو کی طرح دوڑنے والے اس احساس نے ان کے یہاں مجرد تصور کے طور پر راہ نہیں پائی۔ اس کے برعکس یہ اُن کے یہاں ایک زندہ

تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال نے اس تجربے کو ایک طرف تو اس کی تاریخی، تہذیبی اور سماجی جہت سے دیکھا اور دوسری طرف ایک ایسے مابعد الطبیعیاتی تناظر میں جہاں کونیاتی امور ظہور کرتے ہیں اور کائناتی سطح پر تغیر و تبدل کا نقشہ ترتیب پاتا ہے۔ اقبال کے یہاں اس کا اظہار اُن کے اوّلین مجموعے ''بانگِ درا'' سے ہی سامنے آنے لگتا ہے۔ ویسے تو اِس مجموعے میں ہمیں کم و بیش اُن سارے افکار و تصورات کے نقوش مل جاتے ہیں جو بعدازاں فکرِ اقبال کے نام سے موسوم ہوئے، لیکن یہ افکار و تصورات پہلے مجموعے میں محض ابتدائی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ تاہم قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس ابتدائی مرحلے میں بھی اقبال کے یہاں عشقِ رسول ﷺ اور آپ ﷺ کی سیرت و کردار کے اثر کا اظہار جس پختگی اور وارفتگی سے اور جس درجہ بلند فکری سطح پر ہوتا ہے، اس میں حقیقتِ محمدیہ ﷺ کا شعور بھی کارفرما ہے، اور یہ شعور اپنے کونیاتی مضمرات کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ''جوابِ شکوہ'' کا ایک شعر دیکھ لیجیے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کردے

اس نظم کے مطالعے کے دوران آپ غور کیجیے تو وہاں نعت کا ماحول ہے اور نہ ہی وہ فضا ملتی ہے جس میں آپ ﷺ کی سیرت کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہو، بس ایک شعر آتا ہے، اور اس کے بعد موضوع یا سلسلۂ فکر و خیال یکسر بدل جاتا ہے۔ اب یہ ہوتا ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ سے ایک مسلمان کے حقیقی رشتے کی نوعیت اور اُس کے ذاتی و اجتماعی زندگی پر اثرات کا وہ منظرنامہ ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں جو دراصل ایک یگانۂ روزگار تہذیب کے نقوش روشن کرتا چلا جاتا ہے۔ اقبال کے یہاں رسمی نعت کا کوئی قرینہ ہمیں نہیں ملتا، لیکن نظم کے مسلسل چار بند اسی موضوع سے تعلق رکھتے ہیں، اور پھر اس شعر پر یہ نظم پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شعر اپنے معنی کی وسعت اور گہرائی کا اظہار جس سیاق میں کرتا ہے، اس کو مابعد الطبیعیاتی رموز و علائم کے ذریعے ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ خیر، اس موضوع پر آگے چل کر بات کریں گے۔ یہاں ہمارے سمجھنے کا نکتہ یہ ہے کہ کم و بیش وہ سب اہم فکری عناصر جو کلامِ اقبال کی جداگانہ شناخت قائم کرتے ہیں اور ان کے خیالات و تصورات کی صورت گری کرتے ہیں، وہ اپنے بلیغ ترین بیانیے کے کسی نہ کسی مرحلے پر یا تو نعتِ رسولِ کریم ﷺ کا کوئی پیرایہ اختیار کرلیتے ہیں یا پھر وہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر یا نعت کا کوئی شعر آکر اس حقیقت کو واضح کردیتا ہے کہ فکرِ اقبال کا یہ منظرنامہ کس ماخذ سے رنگ و نور اخذ کررہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایسے دوسرے شعرا جو اپنا ایک فکری تناظر رکھتے ہیں، ان کے

برخلاف اقبال کے یہاں مابعد الطبیعیاتی افکار کا دائرہ بھی نعتیہ اسلوب کی وجہ سے مجرد نہیں رہتا، محسوس بن جاتا ہے۔

عقل و عشق، خودی و خود آ گاہی، حیات و مرگ، فنا و بقا، اجتہاد و انقلاب اور عروج و زوال سے لے کر اقبال کے عہد تک کے فکری، سیاسی، سماجی اور معاشی تصورات و نظریات جیسے مابعد الطبیعیات، سوشلزم، سیکولرزم اور جمہوریت تک آپ جس زاویے سے چاہے دیکھ لیجیے، اُن کی دانش و بینش کا تقریباً سارا نمایاں منظر نامہ اور اُن کے افکار و تصورات کا دائرہ جس سرچشمے سے روشنی حاصل کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ لہٰذا مطالعے کے لیے فکر و شعور اور جذبہ و احساس کا جو رُخ بھی سامنے رکھا جائے، سخنِ اقبال پر اسی سرچشمے کی چھوٹ پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اب اگر اس لحاظ سے غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ نعت گو شعرا میں اقبال کا مقام کس قدر بلند اور کتنا منفرد ہے۔

وہ لوگ جو شعر و فکرِ اقبال کا مطالعہ نعت کی جہت سے کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا پھر کسی بھی اور وجہ سے ایسا نہیں کرنا چاہتے، انھیں اس نکتے کو تسلیم کرنے میں تامّل ہو سکتا ہے اور ان کی طرف سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ دعویٰ بے محل ہے۔ اس لیے کہ اقبال کا تو نعت گو شعرا میں شمار ہی نہیں ہوتا، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ جب انھوں نے باضابطہ نعت کہی ہی نہیں۔ اب اگر بات رسمی اندازِ نعت کی ہے تو یہ رائے بالکل درست ہے۔ اقبال نے واقعی اُس مزاج اور اسلوب کی نعت نہیں کہی جو عام طور سے ہمارے یہاں رائج ہے اور جس سے عامۃ الناس خوب مانوس ہیں۔ یہ اردو نعت کی عوامی روایت ہے۔ یقیناً اس کے اپنے کچھ موضوعات و مضامین ہیں۔ اسی طرح اس کا اپنا ایک پیٹرن اور ڈکشن بھی ہے۔ عوامی حلقوں میں مروّج اس نعت کے مضامین، موضوعات، طرزِ اظہار اور اسلوبِ بیاں میں عقیدے اور عقیدت کو نسبتاً فوقیت حاصل ہے۔ ظاہر ہے، یہ عوامی مزاج کا معاملہ ہے۔

تاہم دیکھا جائے تو یہ مزاج صرف اور صرف اردو اور مسلمانوں سے مخصوص بھی نہیں ہے۔ دوسری زبانوں میں بھی عوامی نعت کا رنگ و آہنگ یہی ملتا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت یحییٰؑ، حضرت مریم اور حضرت عیسیٰؑ کے لیے محبت و عقیدت سے لکھی گئی نظموں کا بھی کچھ ایسا ہی مزاج نظر آتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ دنیا کی قدیم تہذیبوں، مثلاً چینی یا ہندی تہذیب میں بھی اگر دیکھیے تو ایسے ہی رنگ و اسلوب کی مذہبی شاعری ملے گی، جس میں اوتاروں سے عقیدت و محبت کا اظہار اسی انداز سے کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ معاملہ کسی مذہب، قوم یا خطے سے مخصوص نہیں ہے۔ تہذیبوں اور اقوامِ عالم کی تاریخ ہر تفریق سے بالاتر ہو کر عوامی عقیدت کو اسی رنگ میں ابھارتی نظر آتی ہے۔

بایں ہمہ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ عربی اور فارسی کی طرح اردو میں بھی فکری و فنی دبازت رکھنے

والی نعت کی ایک مستحکم اور مہتم بالشان روایت موجود ہے۔ یہاں موضوعات کا دائرہ قدرے وسیع ہو جاتا ہے جس میں مذہبی افکار، کونیاتی امور اور مابعد الطبیعیاتی عناصر ملتے ہیں۔ ساتھ ہی لہجہ اور اسلوب بھی بدلا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دنیا کے دوسری زبان وادب کے قارئین کی طرح اردو میں بھی فکری جہت والے نعتیہ ادب کے قارئین ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ اب رہا معاملہ اقبال کا تو واقعہ یہ ہے کہ اردو نعت کی شعری تہذیب میں بھی وہ اُسی طرح انفرادیت کے حامل ہیں جیسے اردو شاعری کی روایت میں۔ ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' میں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، لیکن خود ان کے پہلے مجموعے کا مطالعہ بھی ذرا توجہ سے کیا جائے تو وہ بجائے خود اقبال کی انفرادیت کا اوّلین نقش نظر آتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ''بانگِ درا'' کی کچھ نظمیں یا آپ کہہ لیجیے، اس کا ایک حصہ اسی جدید نظم کا تسلسل محسوس ہوتا ہے جس کی طرح حالی اور آزاد نے ڈالی تھی۔ تاہم اس کتاب کا ایک وقیع حصہ قطعی طور پر مختلف ہے۔ یہاں اقبال کی انفرادیت کا واضح طور پر احساس ہوتا ہے، صرف موضوع کی حد تک نہیں، بلکہ طرزِ سخن، کنایات، اشارات، استعارات، تشبیہات، تلمیحات اور علامات تک آپ کو بہت کچھ ایسا ملے گا جو یہ بات قطعی طور پر ثابت کردے گا کہ اقبال کا کلام ایک الگ شے ہے اور اسے اُس طرح پڑھا ہی نہیں جاسکتا جس طرح ہم اس سے پہلے اپنی شاعری کو پڑھتے رہے ہیں۔ اس کے بعد ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' کی شاعری کو دیکھ لیجیے اور غور کیجیے کہ اس کا اردو کی شعری روایت سے کیا تعلق ہے۔

اقبال سے پہلے اردو کی شعری روایت دراصل غزل کی روایت ہے، اور یہ اتنی توانا اور ایسی مستحکم روایت ہے کہ اس نے ہند اسلامی تہذیب اور ثقافتی مظاہر کی صورت گری میں بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔ تاہم اقبال کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے کہ غزل کا قوام ہی بدل گیا ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی غزلیں پڑھ کر غور کیجیے کہ وہ اپنے مزاج، رنگ، اسلوب، آہنگ، موضوعات اور کیفیات میں اردو غزل کی روایت سے کیا علاقہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح ''شکوہ''، ''جوابِ شکوہ''، ''مسجدِ قرطبہ''، ''ذوق وشوق'' اور ''ساقی نامہ'' جیسی نظموں کو دیکھ کر فیصلہ کیجیے کہ ہماری شعری روایت کے تسلسل میں یہ نظمیں کس طرح دیکھی جاسکتی ہیں۔ بعینہٖ معاملہ اقبال کی نعت کا بھی ہے۔ یہ اردو نعت کی عوامی روایت سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ یہ اس روایت کا حصہ ہے جو مابعد الطبیعیاتی اور فکری تصورات کو معرضِ بیاں میں لاتی ہے۔ تاہم اپنے موضوعات، یعنی فکری content اور اپنے اسلوب و آہنگ، یعنی جمالیاتی اظہار میں مکمل طور سے اپنی انفرادیت کا ثبوت دیتی ہے۔ شعرِ اقبال کا یہ دریچہ جس سمت میں کھلتا ہے، اس کا منظرنامہ تمام تر اقبال ہی سے موسوم ہے۔ بات کی وضاحت کے لیے محض چند اشعار دیکھیے:

لوح بھی تو قلم بھی تو ، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ ، تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پاگئے
عقل غیاب و جستجو ، عشق حضور و اضطراب

حقیقت یہ ہے کہ صرف یہی چند اشعار بھی اقبال کی نعت کے فکری تناظر اور اسلوبیاتی مزاج کو سمجھنے کے لیے کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ کسی فن کار کی بنیادی تفہیم یا اُس کے فکر و فن کی نادرہ کاری اور بلندی سے عمومی آگہی کے لیے اُس کا ہر فن پارہ سامنے رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اُس کی تمام جہات کا بہ نگاہِ غائر تجزیہ درکار ہوتا ہے۔ دیکھا بس یہ جاتا ہے کہ اپنے فن کی اعلیٰ ترین سطح پر وہ کن فکری مسائل سے سروکار رکھتا ہے اور دقیق ترین سوالات کی جستجو کرتے ہوئے وہ فنی اور شعری جمالیات کے کن معیارات کا حامل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اقبال کی یہ نعت صرف اُن کے شعری حاصلات ہی کا نہیں، بلکہ اردو کے بہترین نعتیہ ادب کا بھی ایک نادر نمونہ ہے۔ ایک ایسی بلند پایہ مثال جس میں شاعر کا فن ہی درجۂ کمال کو نہیں پہنچا، بلکہ فکری سطح پر دینی روایت اور تہذیبی نشانات بھی اپنی اعلیٰ ترین صورتوں کے ساتھ اس میں ظہور کرتے ہیں۔ اقبال کی نعت نے یہ آواز، یہ لہجہ، یہ آہنگ، یہ فکر، یہ شعور، یہ اسلوب اور یہ جمالیات کس طرح حاصل کی ہے، اس پر ہم ذرا بعد میں بات کرتے ہیں، اس سے پہلے ایک اور نکتے کو دیکھ لیتے ہیں۔

اقبال جیسے ایک بڑے شاعر کا مقام و مرتبہ اور اُس کے فن کی قدر و منزلت کا تعین اُن تصورات کی تشکیل اور سوالات کے جوابات پر منحصر ہوتا ہے جو اِس جہانِ رنگ و بو میں انسان کی حیثیت اور کائنات اور خالقِ کائنات سے اُس کے رشتے کی بابت تخلیقی سطح پر اس کے یہاں اظہار پاتے ہیں۔ یہ سوالات اُس شاعر کے یہاں انسانی وجود اور اس کی روح کے رشتے، کائنات میں اس کی زندگی کی معنویت اور اس کی تقدیر کی نوعیت اور حقیقت کا تعین کرتے ہیں۔ چوں کہ ہر بڑا شاعر اپنا ایک تہذیبی سیاق رکھتا ہے،

اس لیے اُس کے فن کی صورت گری کرنے والے تصورات وسوالات اسی سیاق میں مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے عہد تک تہذیب کے سفر، اسے پیش آنے والے حالات اور آئندہ کے امکانات کا نقشہ بھی اسی سیاق میں ترتیب پاتا اور اسی سے اپنے لیے معنی اخذ کرتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اسی معنویت کے تناظر میں شاعر کے پیش کردہ تصورات وسوالات اس کی تہذیب کو ایک نئے تاریخی تناظر میں استحکام فراہم کرتے ہیں اور اس کی اقدار کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں۔

بادی النظر میں ان تصورات اور سوالات کا متن شاعر کے تخلیقی بیانیے میں سامنے آتا ہے، یعنی وہ بہ ظاہر انفرادی شعور واحساس کا زائیدہ ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ساری انفرادیت کے باوجود بڑے شاعر کی آواز کو محض ایک ذاتی یا شخصی کلامیہ نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اُس کے تخلیقی بیانیے کے پس منظر میں روحِ عصر اور تہذیبی ضمیر کی گونج بھی لازماً موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ جن تصورات کی تشکیل اور جن سوالات کے جوابات کی جستجو کرتا ہے، وہ دراصل اُس کی تہذیب کی فی نفسہٖ نقش گری کا وہ عمل ہے جو ایک زمانی دائرے میں اُس کے لیے سامانِ بقا کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بنیادی اصولوں، معیارات، حقائق اور ضوابط کے حوالے سے تو بے شک تبدل کا کوئی نشان نہیں ابھرتا، لیکن دیکھا گیا ہے کہ تہذیبوں پر گزرنے والے مختلف زمانوں میں یہ عمل نہ صرف یہ کہ اپنی بقا کے مختلف مراحل میں صوری ومعنوی تغیرات سے ہم کنار ہوتا رہتا ہے، بلکہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اس کا لحن، اسلوب اور منہاج بھی کسی حد تک بدل جاتا ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ ومطالعہ فارسی شاعری میں سعدی، رومی، جامی، عراقی اور حافظ کے کلام میں اور اُدھر انگریزی میں چوسر، شیکسپیئر، ملٹن، جون ڈن، ورڈز ورتھ، بائرن، ییٹس، براؤننگ اور ایلیٹ وغیرہم کے تخلیقی بیانیے میں صراحت سے کیا جاسکتا ہے۔ اس نوع کے مطالعے کے لیے اردو کی ایسی ہائر آرکی میں جن شاعروں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے گا ان میں اب تک آخری بڑا شاعر اقبال ہے۔

اب یوں تو اصول کی بات یہ ہے کہ ایک بڑے شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن کو کشادہ اور غیر متعصب رکھنا ضروری ہوتا ہے، تاکہ اُس کے خیالات یا نکاتِ سخن ذرا سہولت کے ساتھ اور وسیع تناظر میں روشن ہوسکیں، لیکن اقبال کے سلسلے میں یہ ضرورت کچھ سوا ہوجاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال کے ساتھ پہلے ہی سے بہت سے سابقے اور لاحقے جوڑ لیے گئے ہیں، مثلاً حکیم الامت، شاعرِ مشرق، مصورِ قوم، روایت وتہذیب کا نقیب، انسانی اقدار کا علم بردار، مفکرِ اسلام، ترجمانِ حقیقت، مردِ خود آگاہ، پیغمبرِ حیات وغیرہ۔ اِدھر آپ اقبال کا نام لیجیے، اور اُدھر یہ سابقے لاحقے آپ کے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے ہماری تنقید نے ان سب کو اس طرح اور اتنی بار دُہرایا ہے

کہ اب یہ اُن کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے ہیں۔ بات صرف یہاں بھی ختم نہیں ہوتی۔

مسئلہ اس کے بعد یہ پیش آتا ہے کہ ان عنوانات کے تحت اقبال پر جو مطالعات مرتب کیے جاتے ہیں، وہ حتمی اور فیصلہ کن بیانات سے لبالب چھلکتے ہوئے ملتے ہیں اور ساتھ ہی ان میں حوالوں اور مثالوں کا انبار بھی ہوتا ہے۔ بار بار کے دیے گئے حوالوں اور دہرائی گئی مثالوں کو ان کے معروف اور مروجہ سیاق و سباق سے نکال کر نئے تناظر میں رکھنا اور نئی جہت اور نئے مفہوم کا تعین کرنا سہل نہیں ہوتا، لیکن اگر آپ اقبال جیسے شاعر کو معمول کے ڈھرے سے ہٹ کر دیکھنا، پڑھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ آپ اپنا context خود بنائیں اور اس کے توسط سے مطالعے کا نیا پیراڈائم قائم کریں۔

وہ عنوانات اور حوالے جن کا ذکر سطورِ گزشتہ میں کیا گیا، مطالعۂ اقبال کے ضمن میں اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں۔ تاہم اگر کچھ اور پہلوؤں کو بھی ہم پیشِ نظر رکھیں تو اپنے مؤقف کو زیادہ محکم طور پر سامنے لا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کے سیاسی تصورات کو دیکھ لیجیے۔ ویسے تو اس موضوع پر اتنا کام نہیں ہوا جتنا فکرِ اقبال کے دوسرے عنوانات پر ہوا ہے، اس کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ خود اقبال نے بھی اپنے سیاسی افکار کسی تصنیف، رسالے یا خطبے کی صورت میں یک جا اور جامعیت کے ساتھ پیش نہیں کیے ہیں۔ تاہم اُن کے یہاں نظم و نثر میں یہ موضوع بار بار ابھرتا ضرور رہا ہے۔ ظاہر ہے، اس کا سبب فرد سے لے کر عالمی سطح تک انسانی زندگی کا وہ منظرنامہ تھا جس میں اقبال کے شعور نے آنکھ کھولی اور حالات و حقائق کا مشاہدہ کیا۔ اقبال کی امنگوں کا مرکز مشرق تھا، لیکن اُس کا زوال بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ مغرب کی برتری ہر میدان میں تسلیم کی جا چکی تھی۔ چناں چہ ہمارے یہاں اقبال کے سیاسی تصورات کا مطالعہ مغربی افکار کی روشنی میں کرنے کا رُجحان عام رہا ہے۔ افلاطون، ارسطو، کانٹ اور ہابز وغیرہم کے تناظر میں اقبال کے سیاسی نظریات کو دیکھنے اور سمجھنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، وہ تمام تر بے مصرف تو چلیے نہیں ہیں، لیکن ان کے ساتھ، بلکہ اُن کے مقابلے میں اگر ہم غزالی، رازی اور ابنِ خلدون اور سب سے بڑھ کر قرآن و سنت کے تناظر میں اقبال کے سیاسی تصورات اور رجحانات کا جائزہ لیں تو کہیں بہتر سطح کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اندازِ نظر اور طریقِ کار اقبال کی سیاسی فکر کو اس کے ملی اور قومی سروکار کے ساتھ صراحت سے اجاگر کر سکتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اقبال نے مغرب کا مطالعہ بہت انہماک سے کیا تھا، اس کے نمائندہ اہلِ دانش و بصیرت کو توجہ سے پڑھا تھا اور ممکن ہے کسی سطح پر کوئی اثر بھی قبول کیا ہو، لیکن اُن کے یہاں یہ معاملہ سیاسی حقائق کی تفہیم اور سماجی و گروہی حالات کے تحلیل و تجزیے کی حد تک تھا۔ اس نے اقبال کے یہاں مغرب کی قبولیت کی راہ قطعاً ہموار نہیں کی تھی۔ مغربی تہذیب اور اس کے سیاسی و سماجی مظاہر و مسائل پر

اقبال کی گہری نظر تھی اور وہ دیکھ رہے تھے کہ مغرب کے بلند اور روشن میناروں کی بنیادوں میں وہ تموج خیز لہریں پیدا ہو چکی ہیں جو بالآخر تہذیب کے اخلاقی و روحانی زوال و انہدام کا جواز بنتی ہیں۔ اس کا دوسرا اہم سبب یہ بھی تھا کہ مدینے کی فلاحی ریاست کے انتظام و انصرام نے یہ بات اقبال کے دل میں بٹھا دی تھی کہ کوئی بھی نظامِ سیاست و مملکت کسی ملک و قوم کے لیے اس وقت تک فلاح و بقا کی ضمانت نہیں دے سکتا، جب تک کہ اُس کا ڈھانچا مضبوط اخلاقی و روحانی بنیادوں پر استوار نہ ہو۔ اقبال نے اپنے خیالات و افکار کو قدیم مسلمان صوفیا اور حکما کا تکملہ، بلکہ تفسیر کہا ہے۔ ان سب حقائق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سوچنا چاہیے، ایسا کس وجہ سے ہوا؟ اصل میں یہ ہوا سیاست اور اخلاق کے باہمی ناگزیر رشتے کے شعور کی وجہ سے۔ اس رشتے کی نوعیت اور حقیقت کا ادراک اقبال کو سیرتِ رسول ﷺ، شعائرِ دین اور تاریخِ اسلام سے حاصل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کا سیاسی شعور مغرب کا نکتہ چیں ہے۔ اس سلسلے میں اقبال کے یہاں کوئی اشتباہ یا ابہام نظر نہیں آتا۔ وہ صاف انداز میں اور پوری قطعیت سے کہتے ہیں:

جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

دوسری طرف اقبال اپنی روایت و تہذیب کا وہ شعور بھی رکھتے ہیں جو انھیں اپنے انسانی (اور بالخصوص بحیثیت مسلمان) مقام و منصب کی ماہیت سے بخوبی آگاہ کرتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنے یہاں اختیار و اقتدار کی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

سروری در دینِ ما خدمت گری ست   عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری ست
در ہجومِ کار ہائے ملک و دیں   با دلِ خود یک نفس خلوت گزیں

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند   در شہنشاہی فقیری کردہ اند

ہستیِ مسلم ز آئین است و بس   باطنِ دینِ نبی این است و بس

ساتھ ہی جب وہ مشرق و مغرب کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر   خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار   قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری

تو یہ اُس شعور کا اظہار ہے جو اپنی دینی روایت نے اُن کے اندر پیدا کیا ہے۔ ادراک کی یہ سطح انھیں اصل میں اُس فکر و نظر کے تحت حاصل ہوئی ہے جس نے آپ ﷺ کے کردار اور آپ ﷺ کے تربیت یافتہ خلفاے راشدین کے حکومتی ادوار کو مطالعے نہیں تجربے کے طور پر دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اسی وجہ سے آپ توجہ سے پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ 'خاص ہے ترکیب میں.....'' والا مصرع اصل میں درود و سلام کا لہجہ رکھتا ہے۔ یہ نعت ہی کا تو فیض ہے جو اقبال کے یہاں اِس رُخ سے رونما ہوتا ہے اور اُن کے فکر و سخن کی معنویت کا سیاق متعین کرتا ہے۔

یہ بات ذرا طویل ہوگئی، لیکن فکرِ اقبال کی اس جہت کو ذرا تفصیل سے دیکھنا اس لیے ضروری تھا کہ وہ بنیادی پہلو جو اُن کے فکر و نظر کو ترتیب دیتا ہے، اپنے طول و عرض میں سامنے آجائے۔ اس کے بعد اقبال کے دوسرے افکار و تصورات کو اجمالی طور پر دیکھتے ہوئے ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ سکتے ہیں۔ چناں چہ اب وہ مرحلہ آگیا ہے۔ یہاں ہم اُن کے چند ایک بڑے تصورات پر طائرانہ نظر ڈال کر اپنے نتائج مرتب کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر عقل و عشق اقبال کے نظامِ خیال کے بہت بنیادی استعارے ہیں۔ اس جہانِ رنگ و بو میں انسانی تگ و تاز کی ساری معنویت کا انحصار اقبال کے نزدیک اس امر پر ہے کہ اُس کے مرکز میں عشق کارفرما ہو۔ مرکز کا یہ اصول بھی اقبال نے کہیں اور سے نہیں طواف میں مرکز کی معنویت سے لیا ہے۔ چناں چہ عشق اقبال کے یہاں ایمان کے درجے میں آجاتا ہے، یعنی یقین اور وابستگی کی ایک غیر مشروط اور کامل حالت۔ اب اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہے، یعنی بنیاد عشق پر نہیں ہے تو وہ اقبال کے یہاں اوّل تو سراسر منفی شے ہے اور اگر منفی نہیں تو کم سے کم لایعنی ضرور ہے۔ مثال کے طور پر ذرا یہ اشعار دیکھ لیجیے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشاے لبِ بام ابھی

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

عشق دمِ جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

اب دیکھیے، عشق خواہ آتشِ نمرود میں کودرہا ہو، مسلمان ہونے کی علامت ہو یا سر بسر مصطفیٰ ﷺ ہو، مراد یہ ہے کہ اقبال کے یہاں عشق دراصل خیرِ کامل ہے۔ وجہ یہ کہ اس کی نسبت کلیتاً آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ ہمارے یہاں بیشتر ناقدین اس نوع کے اشعار کو اقبال کے عشقِ رسول ﷺ سے موسوم کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ "عشق تمام مصطفیٰ ﷺ..." بجا کہ عشقِ رسول ﷺ کا اظہار ہے، اور اس سے بھی انکار کفر کے مصداق ہے کہ ایک صاحبِ ایماں کے لیے عشقِ رسول ﷺ دین ودنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔

اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ اگر ایک سوال پر بھی غور کرلیا جائے تو کیا مضائقہ ہے، وہ یہ کہ اقبال کے یہاں فکری تشکیلات کا ماخذ بننے والا یہ عشق کیا وہی یا اُس سے ملتی جلتی کوئی شے ہے، جسے ہم عشق کے عنوان سے اردو شاعری، بلکہ دنیا کی ساری شاعری میں پڑھتے آئے ہیں؟ سوال ذرا بڑا ہے، لیکن جملہ تفصیلات سے حذر کرتے ہوئے ایک اصولی، سادہ اور مختصر جواب سے ہمارا کام چل سکتا ہے۔ لہٰذا جواب یہ ہے کہ قطعاً نہیں۔ یہ عشق فی الاصل ایمانِ کامل کا مجمل اظہار ہے، اور اقبال کے یہاں یہ ایمان پیدا ہوا ہے شعائرِ اسلام کی جامع تفہیم اور تاریخِ انسانی کے اس گہرے ادراک سے کہ آپ ﷺ تمام جہانوں، سب زمینوں اور سارے زمانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ سے پہلے کی ارضی تاریخ آپ ﷺ کے بعد کے زمانی دائرے سے مل کر کونیاتی امر کی تکمیل کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ یہ ایک مسلمان کا ایمان ہے — اور اُس وقت جب بندۂ مومن، مردِ آگاہ کو تکوینِ الٰہیہ کا شعور القا ہوجائے تب اسے یہ ایمان نصیب ہوتا ہے۔ اس لیے "عشق تمام مصطفیٰ ﷺ..." یا "عشق خدا کا رسول..." دراصل مدحِ رسولِ کریم ﷺ ہے، یعنی نعت کا قرینہ ہے۔ یہ قرینہ اسی بندۂ مومن کو عطا ہوتا ہے جس کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

نہ چینی و عربی وہ نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مردِ آفاقی

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اب سوال یہ ہے کہ وہ انسان جسے اقبال نے بندۂ مومن، مردِ آفاقی، مردِ آگاہ اور مسلمان کہا ہے، اس شعور و ادراک کی منزل کو تو رحمتِ الٰہی کی ودیعت سے حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس حقیقتِ حقہ کو وہ خود بھی کسی کسوٹی پر جانتا پرکھتا ہے، یا محض جو اُسے حاصل ہو جائے اُس پر اکتفا کر کے بیٹھ رہتا ہے۔ اس کا جواب ملتا ہے، ہمیں کلامِ اقبال میں اُن اشعار سے جو عہدِ حاضر کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ 'عہدِ حاضر' اقبال کے یہاں ایک استعارے اور ایک اصطلاح کا درجہ رکھتا ہے۔ چناں چہ یہ وہ تناظر ہے جس میں بندۂ مومن اپنے عہد کے حقائق اور تجربات کے رُو بہ رو اپنے ایمان کی تصدیق اور استحکام کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ کس طرح گزرتا ہے اور اس کے بعد کن نتائج تک پہنچتا ہے، دیکھ لیجیے:

طلسمِ عصرِ حاضر را شکستم　　ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم　　بنارِ او چہ بے پروا نشستم

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود　　مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے، فقط جوہرِ خودی کی نمود　　کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل علیہ السلام

اقبال کے افکار و تصورات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ حوالے اور مثالیں درکار ہوں تو اور بھی بہت کچھ نہایت آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مسئلہ مگر یہ ہے کہ بات طول کھینچتی رہے گی۔ یوں بھی اوراقِ گزشتہ میں جو چند نکات پیش کیے گئے اور جو مثالیں درج کی گئیں، وہ ہماری بات کی وضاحت اور مؤقف کی تائید و استحکام کے لیے کافی ہیں۔ علاوہ ازیں فی الوقت افکارِ اقبال کا احاطہ و تجزیہ مقصود بھی نہیں ہے۔ اصل میں وہ جو ایک بات اقبال کی نعت کے حوالے سے کہی گئی تھی، ہمیں تو صرف اُس کی تصدیق کے لیے اقبال کے یہاں سے نعت کے فکری و اسلوبیاتی تناظر میں کچھ نکات اور اشارے حاصل کرنا

مقصود تھا۔ وہ کام کیا جاچکا ہے، سواب ہمیں مزید حوالوں کی ضرورت نہیں ہے۔

چناں چہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کی نعت اپنی فکر اور اسلوب دونوں لحاظ سے اردو نعت کی شعری روایت میں اسی طرح انفرادی حیثیت کی حامل ہے جس طرح اقبال کی شاعری ہماری پوری شعری روایت میں۔ گفتگو کے اس اختتامی مرحلے پر ہمیں یہ بات بھی فیصلہ کن طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ اقبال کی نعت اپنی یگانگت اور انفرادیت کا ایک اور بہت اہم حوالہ یہ رکھتی ہے کہ اقبال نے جس طرح نعت کی موضوعاتی وسعت کو کائناتی سطح تک پھیلایا اور اس کی لے کو سوزِ دروں اور جذبِ باطن سے ہم آہنگ کیا ہے، اسی طرح انھوں نے نعت کی صنفی اور ہیئتی قیود کو بھی کراں تا بہ کراں کشادہ کیا ہے کہ اُس میں وجود و شہود، زمین و زماں، شاہد و مشہود اور حضوری و سپردگی کے تصورات سے تجربات تک تہ در تہ عناصر مل کر ایک ایسا کلامیہ تشکیل دیتے ہیں کہ جو کشف و الہام کی سطح کو پہنچا ہوا معجزۂ فن بن جاتا ہے۔ فن کی یہ نمود بھلا کیوں کر ایک روایتی پیرائے میں معرضِ بیاں میں آسکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے یہاں رواں دواں نظم کے کسی ایک مرحلے پر نعت کا ایک شعر آتا ہے اور نظم کی پوری کیفیت و معنویت کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے مروجہ سانچے میں نعتیہ اشعار پیش نہیں کیے ہیں کہ وہ جانتے ہیں، دو ایک شعر یا چند ایک مصرعے نظم کے مکمل سلسلۂ خیال کو حضوری کے تجربے سے ہم کنار کر سکتے ہیں، پورے کلام کو نعت کے اسلوب میں ڈھال سکتے ہیں اور سارے فکری تصورات کو نعت کی تحویل میں دے سکتے ہیں۔ فن کی یہی نمود شعر و فکرِ اقبال کی بلند اقبالی کا جواز ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کیا شے ہے جو اقبال کے حرفِ سخن میں شامل ہوتی ہے اور اس کی تاثیر کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ یہ سوال اس مقام پر بہت سادگی سے اور بہت سرسری انداز میں پوچھ لیا گیا ہے، لیکن یہ بہت بنیادی نوعیت کا استفسار ہے۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس کلید سے تفہیمِ اقبال کا نیا در کھل سکتا ہے، وہ تو خیر کھل ہی جائے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعے ہند اسلامی ادب و شعر کی وہ جہت بھی آشکارا ہوتی ہے جو بلا تفریقِ رنگ و نسل اور بلا امتیازِ ملک و قوم پوری ملتِ اسلامیہ کے شعور و احساس کو ایک مشترک مرکز سے جوڑ دیتی ہے۔ اقبال کی طرزِ سخن میں شامل ہونے والی وہ شے ہے، حجازی لے۔ یہاں حجازی لے سے مراد ہے آنحضور ﷺ سے نسبت و تعلق کا وہ اظہار جو زمانوں اور زمینوں کے تعینات سے ماورا کرتے ہوئے صرف شاعر کو ہی نہیں، بلکہ اُس کے قاری کو بھی سر بہ سر حضوری کی بے پایاں اور وجد آفریں سرشاری سے ہم کنار کرتا ہے۔ تبھی تو اقبال نے افتخارِ جاں کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری

یہی وہ لے ہے جو کلامِ اقبال میں آثار و افکار سے لے کر اسلوبیات و جمالیات تک تخلیقِ فن کے پورے منظرنامے میں برقی رَو کی طرح زندگی کی وہ حرارت جگاتی ہے جو شعور و احساس کی تشکیل و تعبیر اور اظہار و ابلاغ کو معجزۂ فن بنا دیتی ہے۔ یہی لے اس حقیقت کو بھی نمایاں کرتی ہے کہ اقبال کے یہاں حرفِ نعت محض رسمِ محبت و عقیدت کا مظہر نہیں ہے، بلکہ یہ اُس مرکز سے رشتے کا اظہار ہے جسے اقبال نے عشق کہا ہے، جو انسان کے سینے میں دل کی طرح دھڑکتا ہے، اُس کی رگوں میں خون کی گردش اسی عشق کی قوت پر منحصر ہے، اور یہی ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کی اس محیط و بسیط کائنات میں انسان کے وجود کو بلند رتبہ بناتی ہے۔ اس شعور کا اظہار اقبال کے کلام میں جابہ جا ہوتا ہے اور اُن کیفیات و علائم کے ساتھ کہ جو اُن کے فن کی سطح اور سخن کی معنویت کے دائرے کو کائنات گیر بنا دیتے ہیں۔ لاریب، یہ صرف اور صرف حرفِ نعت کا فیضان ہے۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال کی ساری شاعری اسی حرفِ نعت کی دولتِ پرمایہ سے مالا مال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ہماری ہند اسلامی تہذیب اور اُس کی ادبی و فکری روایت میں جس حجازی لے کو شامل کیا اُس نے اردو کی شعری روایت کے کیف و کم کو اُس تغیر سے آشنا کیا کہ وہ کچھ سے کچھ ہوگیا۔ اسی کیف و کم کا اثر ہے کہ اقبال کی شاعری سر بہ سر ایک ایسے سانچے میں ڈھل گئی کہ جس نے اُن کے حرفِ شعر کو حرفِ نعت کی اُس معراج تک پہنچا دیا کہ جہاں اُن کے بڑے بڑے افکار و تصورات کی تشکیل نعت کے حرفِ باریاب سے ہوئی۔ یہ اسی جوہر کی نمود ہے کہ اقبال کی شاعری تاریخ و تہذیب کے حقائق و تجربات اور مذہب و فلسفہ کے تصورات، اشارات اور کنایات کو اس طرح اپنے اندر سمو لیتی ہے کہ وہ مجرد نہیں رہتے، بلکہ فکرِ محسوس کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں۔ یوں وہ بہ یک وقت قلب و نظر دونوں کے لیے بالیدگی اور روشنی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط، بھارت

شمالی ہند کا اوّلین معراج نامہ: 'زبدۃ الاخبار'

(معروف بہ معراج نامۂ منظوم)

ABSTRACT: Poem reflecting sacred Night journey of Prophet Muhammad (S.A.W) penned by an unknown poet Qasim in the year 1204 Hijrah, has been introduced in this article. The poet belonged to Northern India. This poem regarding Night Journey of Prophet Muhammad (S.A.W) seems to be first Maeraj Nama composed in Northern India. The poet has touched various steps of Night journey, besides reflecting some Islamic bindings such as alms giving to needy people of society. Salient characteristics of poem have also been discussed in terms of finding out changes emerged in the Language, from time to time.

شمالی ہندوستان میں مستقل معراج ناموں کی روایت جنوب کے بالمقابل بہت کم رہی ہے۔ ضمیر لکھنوی کا معراج نامہ ۱۲۴۸ھ میں مکمل ہوا تھا۔ ضمیر نے بادشاہ نصیرالدین کی ایماء پر یہ معراج نامہ لکھا تھا ۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے اس کے ملک میں پھیلے ہوئے مختلف نسخوں کی نشان دہی اپنی کتاب ''اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء'' میں کی ہے۔ رشید حسن خان نے ناسخ کے غیر مطبوعہ معراج نامے کی نشان دہی اپنی مرتبہ کتاب ''انتخاب ناسخ'' کے تعارف میں کی ہے۔ یہ معراج نامہ ۱۲۵۸ھ سے قبل منصۂ شہود پر آ گیا تھا۔ گو کہ تا حال اس کے اشاعت کی نوبت نہیں آئی ۔ زبدۃ الاخبار کی تاریخ تصنیف اس کے شاعر نے یوں رقم کی ہے۔

قصہ یہ موزوں کیا با ایں صفا — تا صلہ دیں اس کا حضرت مصطفیٰ
پھر طبیعت نے کہا اے نیک خو — نا م اس کا زبدۃ الاخبار ہو
اور وہ دن تھا روز ِ عید المومنیں — وقت تھا وقت ِ حج اے صاحب یقیں
آخر ایام تشریق اے جواں — ماہ ذی الحجہ سے وہ دن تھا عیاں
سال ہجری تھی بصد عزو تمیز — ایک ہزار و دو صد و چار اے عزیز

(قاسم: زبدۃ الاخبار، مطبع کریمی، بمبئی ۱۳۳۰ھ ص ۱۶۹)

اس معراج نامہ کا مادۂ تاریخ میں ذیل کا شعر کہا گیا۔ اس سے ۱۲۰۴ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ؎

قطع کر دورِ فلک کو پھر تو دیکھ
قصۂ معراجِ خیر الانبیا

اس اعتبار سے ''زبدۃ الاخبار'' کو شمالی ہند کا پہلا معراج نامہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے قلمی نسخوں کا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ اس کے مطبوعہ نسخے مل جاتے ہیں۔ اس وقت میرے پیش نظر مطبع کریمی بمبئ سے ۱۳۳۰ھ میں شائع ہوا نسخہ ہے۔ 'زبدۃ الاخبار کا شاعر غیر معروف ہے اس نے اپنا نام قاسم بتایا ہے۔ اس منظوم معراج نامے سے اس کی خاندانی معلومات کا علم ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ سے ایک فرسنگ کی دوری والے گاؤں عرب سرائے کا باشندہ تھا۔ اس کے آبا واجداد وہاں معزز و محترم مانے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی معلومات اس رسالے سے نہیں ملتی۔

سببِ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ معراج کی ایک رات میں ہم چند احباب بستی حضرت نظام الدین کی ایک مسجد میں بیٹھے تھے۔ ایک بزرگ واقعات معراج بیان کر رہے تھے۔ رات بیت چلی تھی نیند کا خمار دور کرنے کے لیے قہوے کا دور چلا۔ کلام سید چونکہ اردو میں نہ تھا۔ اس لیے اکثر لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ مجلس کی اس کیفیت کو دیکھ کر میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ ایک معراج نامہ ریختہ میں منظوم کیا جائے تا کہ تمام لوگ اسے سن کر سمجھ سکیں۔

اوس گھڑی اوس مردِ خوش کردار نے — یوں کیا مجھ سے خطاب اس یار نے
ریختہ میں کیجئے موزوں اگر — ذکرِ معراجِ رسولؐ راہ بر
عالم و جاہل کو ہو یعنی مفید — ہر ایک اس دولت سے ہو پھر مستفید
اجر دیں اوس کا مجھے حضرت رسولؐ — بات کو میں نے کیا اوس کے قبول

(قاسم: زبدۃ الاخبار بمبئ ۱۳۳۰ھ ص ۱۲)

معراج نامہ لکھنے کی ابتداء رجب المرجب کی چھبیسویں تاریخ سے ہوئی تھی۔ شاعر نے اس کے اختتام کے متعلق بھی بیان کر دیا ہے، جس کا ذکر درج بالا اشعار میں ہو چکا ہے۔ شاعر نے معراج کے واقعے کو دو مہینے بیس دن میں مکمل کر دیا تھا۔

ماجرا میں نے یہ سرتا پا — دو مہینے بیس دن میں ہے لکھا (ایضاً ص ۱۶۹)

شاعر نے اس منظوم معراج نامے کے اشعار کی تعداد بھی بتا دی ہے۔

میں نے بیتوں کا کیا اس کے شمار
پائیاں بتیس، سو اور سات ہزار (۷۱۳۲ اشعار)

معراج نامے کی ابتداء مروجہ طریقے کے مطابق حمدِ رب اللہ سے ہوتی ہے۔ شاعر خدا کی تعریف

کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ

حمد ہے سب موجدِ افلاک کو　　اوج بخش صاحب لولاک کو
پاک ہے وہ خالقِ جن و ملک　　نور سے اوس کے منور ہے فلک
پاک ہے وہ بادشاہ بے زوال　　اوس نے احمد کو کیا والا کمال
پاک ہے وہ صاحب لوح و قلم　　مصطفےٰ کو اوس نے رکھا محترم (ایضاً ص۲)

شاعر نے اس حمد میں عشق کی اہمیت گیارہ اشعار میں بیان کی ہے۔ حمد کے بعد نعت رسول ﷺ اور مناقبِ اہل بیت اور غوث الاعظم نقل کی گئی ہیں۔ اس کے بعد بستی عرب سرائے وہاں کی مسجد اور حوض مسجد کو بیان کیا گیا ہے۔ معراج کا واقعہ بیان کرنے سے قبل حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی مدحت میں چند اشعار قلم بند کیے گئے ہیں۔ واقعہ معراج جس شب ظہور پذیر ہوا شاعر نے اس کی تعریف کی۔ شب کے بیان میں شاعرانہ صنائی کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ شاعر نے ظلمت شب کو مردم چشم اور خالِ رخسار کہا ہے پھر اس شب کی نورانیت کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ

نور اوس شب کا یہ دیکھو دیکھ کر　　آسماں پر داغ ہے یارو قمر
شمس کو آنکھیں دکھائیں ہیں کہیں　　تھر تھراتا ہے سدا اے ہم نشیں (ایضاً ص۱۳)

اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے کہ آپ ﷺ حضرت ام ہانیؓ کے مکان میں استراحت فرما رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت جبرئیلؑ کو یہ حکم ملا کہ 'تم اور تمام فرشتے عبادت چھوڑ دیں اور ملائک سے جنت کو آراستہ کرنے کا حکم دیں اور تم جنت کا نہایت خوب صورت گھوڑا لے کر حضور ﷺ کو عرش پر لانے کے لیے زمین پر جائیں۔ شاعر نے اس معراج نامے میں بعض ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جو کتب سیر اور احادیث میں نہیں ملتے۔ مثلاً جنت میں براق کی تلاش میں جب جبرئیل نکلتے ہیں تو

عدن میں آیا جو پیکِ کردگار　　مرغزارِ جنتی میں چل ہزار
چرتی پھرتی تھیں براقِ خوش قدم　　سب کے ماتھے پر محمدؐ تھا رقم
ایک دیکھا ان میں غمگین و حزیں　　یک طرف روتا نہایت خشمگیں
یوں کہا جبرئیل نے اوس سے وہاں　　کیوں تو روتا ہے یہ مجھ سے کر بیاں
تب کہا اوس نے کہ سن اے نامدار　　سال گزرے ہیں یہاں پورے ہزار
ہے مجھے نامِ محمدؐ گوش زد　　اوٹھ گیا ہے امتیازِ نیک و بد
عشق میں اون کے نپٹ ہوں بے قرار　　ہو سکے تو ہو تو میرا غمگسار
سن کے اوس ناموسِ حق نے اس زماں　　لے لیا ساتھ اپنے وہ شیریں زباں

اس براق کو اپنے ساتھ لے کر حضرت جبرئیلؑ حضرات میکائیل و اسرافیل کے ہمراہ ستر ہزار

فرشتوں کے جلو میں زمیں پر اترتے ہیں اور گھر کی چھت توڑ کر آپ کے روبرو حاضر ہو جاتے ہیں اور حق کا پیغام سناتے ہیں۔ آپؐ بہشت سے لائے ہوئے زمرد کے طاس میں بیٹھ کا حوض کوثر کے پانی سے غسل فرمانے کے بعد لباس بہشت زیب تن کرتے ہیں جبرئیل امین آپ کو گھر سے حطیم کعبہ میں لاتے ہیں وہاں آپ کا سینۂ مبارک چاک کر کے زمزم کے پانی سے صاف کرتے ہیں اور آپ کی سواری قریب لائی جاتی ہے۔ شاعر نے اس کے بعد براق کی تعریف کی ہے۔ اس کی تیز رفتاری کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔

کیا کہوں میں تھا سبک رو اس قدر — ایک جس کا گام تھا مدّ بصر
آ سکے اس کے اگاڑی برق کیا — لگ سکے اس کے پچھاڑی کب صبا
صرصری • یوں ہی چلے گر اپنی چال — باد پہنچے ساتھ اس کے کیا مجال

(یہاں اگرچہ لفظ ''سرسری'' کا تقاضا تھا مگر معنی آفرینی کی خاطر شاعر نے ''صرصر'' کا استعمال کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کو الفاظ کے استعمال کا گہرا شعور ہے)

شاعر براق کا سراپا بھی بیان کیا ہے مگر اس میں کوئی ندرت نہیں وہی موضوع روایتوں کو اسطوری فکر میں رنگنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے

آدمی چہرہ و لیکن فیل گوش — شیر گردن، گاؤ سم پاکیزہ دوش
دیکھئے سینہ اگر استر مثال — دم جو دیکھو آئے اشتر کا خیال
پنڈلیاں دیکھو تو ما تندِ بقر — رانوں پر دیکھو تو پیدا دو ہیں پر
ان پروں کو جس گھڑی وہ کھول دے — شرق سے لے غرب تک بس گھیر لے (ایضاً ص ۱۹)

شاعر نے براق پر سواری کرتے ہوئے حضور کو اپنی امت کے لیے غم کا اظہار کرتے ہوئے دکھایا ہے لیکن حضرت جبرئیلؑ آپ کو تسلی دیتے ہیں۔ یہ غیر معروف روایت ہے۔ میلاد خوانی میں اکثر ایسی موضوع روایتیں بیان کی جاتی رہی ہیں۔

مکہ سے بیت المقدس کے سفر کے دوران یثرب اور وادی طور وسینا میں دو دو رکعت نفل پڑھنا اور راستے میں دنیا کا حسین عورت کی شکل میں آنا، شیطان کا بوڑھے کی شکل میں دکھائی دینا، سفید اور کالے بال والے تو ام کا نظر آنا اور خضرؑ سے ملنے کی روایتیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ دیگر معراج ناموں میں میری نظر سے اس قسم کی روایتیں نہیں گزریں۔ جبرئیلؑ، حضرت محمدؐ سے ہر ایک واقعہ کی وضاحت کرتے ہیں اور ان سے اغماض برتنے کی وجہ سے امت کو کونسے فوائد حاصل ہوں گے، انھیں بیان کرتے ہیں۔ راستے میں ایک جگہ حضورؐ نے دو شخص دیکھے ایک کمر پر اتنا بوجھ لادے ہوئے تھا کہ وہ اس کی

طاقت سے زیادہ تھا، اسکے باوجود وہ شخص اور بھی بوجھ لادنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ دوسرا شخص خالی ڈول پر ڈول کھینچ رہا تھا مگر اس میں پانی نہیں آتا تھا۔ حضرت جبرئیل نے ان دونوں تمثیلوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ان میں سے ایک شخص حریص ہے اور دوسرا ریاکار۔ اس سفر میں آپؐ جب آگے بڑھتے ہیں تو انھیں ایک پتھر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے سوراخ میں سے پانی نکل کر بہہ رہا تھا مگر پانی واپس اس سوراخ میں نہیں جاتا تھا۔ اس تمثیل کی وضاحت کرتے ہوئے جبرئیلؑ کہتے ہیں کہ اسی طرح منہ سے نکلی ہوئی بات بھی واپس منہ میں نہیں لوٹ سکتی۔ بالآخر براق بیت المقدس پہنچتا ہے فرشتے ایک پتھر سے اس کی باگ باندھ دیتے ہیں اور حضورؐ تمام نبیوں کی امامت فرماتے ہوئے دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں پھر آپؐ کا علوی سفر شروع ہوتا ہے۔ جس پتھر سے براق کی باگ باندھی گئی تھی اسی پتھر (صخرہ) پر قدم رکھ کر آپؐ براق پر سوار ہوجاتے ہیں۔ اسی دوران دودھ اور شہد کے دو پیالے نمودار ہوتے ہیں۔ آپؐ ان میں سے دودھ کے پیالے میں سے تھوڑا سا دودھ نوش فرماتے ہیں تو جبرئیلؑ آپؐ سے یہ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فطرتِ اسلام کو پسند فرمایا ہے۔ اس کے بعد آپؐ جیسے ہی نردبان (سیڑھی) کی بلندی پر پہنچتے ہیں تو زمین و آسمان کو اٹھائے ہوئے ایک فرشتہ دکھائی دیتا ہے وہ آپ کو سلام کرتا ہے۔ جب آپؐ آگے بڑھتے ہیں تو آپ کو سبز رنگ کا دریا دکھائی دیتا ہے وہ آسمان میں معلق ہے اور اس کی گہرائی دو سو برس کی راہ کے برابر ہے آسمان کبودی رنگ کا اسی دریا کی وجہ سے دکھائی دیتا ہے۔ اس دریا میں بحری اور بری جانور ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ بعض لوگ اس دریا کا نام 'ملفوف' بتاتے ہیں۔ یہاں سے براق جبرئیلؑ کے ساتھ فلک اول کے دروازے پر پہنچتا ہے۔ جبرئیل دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں، اپنا تعارف اور آپؐ کی آمد کی خبر سناتے ہیں تو دروازہ کھول دیا جاتا ہے وہاں آپؐ فرشتوں کے مختلف گروہ سے ملاقات کرتے ہیں۔ پھر آپ کی ملاقات حضرت آدمؑ سے ہوتی ہے۔ آسمان اول پر شاعر نے معراج سے متعلق اکیس واقعات بیان کئے ہیں۔ ان میں فرشتوں کا تسبیح کرنا، حضورؐ کی حضرت آدمؑ سے ملاقات، زراعت کے کام میں مشغول لوگ، جو ایک دانہ بوتے اور اس سے سات سو دانے اگاتے تھے۔ جبرئیل کے مطابق یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے اطاعت گذار ہیں۔ پھر بے نمازیوں کو دئے جانے والے عذاب کا ذکر ہے، جنھیں پتھروں سے کچلتے ہوئے شاعر نے دکھایا ہے۔

پانچویں واقعہ میں زکوٰۃ نہ دینے والوں کا ذکر ہے کہ وہ دوزخ کی وادی میں جانوروں کی طرح کھاتے پیتے چر رہے ہیں۔ یہ وہ سخت دل اور شقی القلب لوگ ہیں جو دنیا میں کسی بھوکے کو کھانا اور پیاسے کو پانی تک نہیں پلاتے تھے۔ ان کے نزدیک دولت ہی خدا اور رسول تھی۔ ان معذب لوگوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔

ہیں یہ وہ بے رحم اے نیکو صفات مال کی اپنے نہیں دیتے زکات

نے خدا کا ڈر نہ کچھ خوفِ رسول
ان کو بدلے زر کے جی دینا قبول
کس کا پیغمبر میاں کس کا خدا
ہم تو جانیں زر ہی یاں سب سے بڑا
ان میں سے کہیے کسو کو یوں اگر
حق نے تجھ کو دی ہے نعمت خیر کر
یہ کہے وہ حیلہ جو سب میں پکار
کون ہوں میں دوں بھلا کہہ تو ہی یار
حق نہ دے میں دوں میرا مقدور ہے
اور کچھ کہیے یہ کیا مذکور ہے
نے کسو پر رحم و نے افسوس ہے
مہر ان کے دل سے کوسوں دور ہے

(ایضاً ص ۳۸۔۳۷)

ان اشعار میں نہ ندرت خیال ہے نہ معنی آفرینی، بس سپاٹ انداز میں واقعات پیش کردئے گئے ہیں۔ ہاں! البتہ ناسخ نے جن الفاظ کو خارج از شعروادب کردیا تھا، قاسم کے یہاں ان کا استعمال دکھائی دیتا ہے۔ جیسے سوں، کسو، اوس، اون، وَھاں وغیرہ۔ یہ قدیم املا ناسخ کے زمانے میں منسوخ ہوگیا تھا۔ شاعر نے اس طرح آسمان اول پر اکیس عذابات کا ذکر کیا ہے۔ ان میں جفتِ حلال کو چھوڑ کر سوئے حرام کی جانب مائل ہونے والوں کو دیا جانے والا عذاب، راہ زن، ظلم سے یتیموں کا مال کھانے والے، زانی و بدکار، غیبت کرنے والے، سودخور، موسیقی کے دل دادہ، جھوٹے گواہ، شوہروں کو ناراض کرنے والی عورتیں، منافقین، والدین کو ستانے والے لوگوں کے عذابات کا خود آپؐ نے مشاہدہ کیا۔

اب آپ کی سواری چرخ دوم پر پہنچتی ہے۔ اس سفر کے احوال بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

بعد ازاں وہ مصدرِ اوجِ صعود
مخزنِ اسرارِ موجود و وجود
آشنائے بحرِ عرفانِ خدا
رازدانِ عالمِ ارض و سما
آسماں پہلے کو طے کر بالمرور
اور اس دریا سے بھی کر کر عبور
با ہزاراں شان پہنچا یک بیک
آسمانِ دویمی کے در تلک
ہے درِ یکدانہ وہ در بے دغا
قفل ہے ایک نور کا اوس پر چڑھا
خازن اوس کا ایک فرشتہ ہے وہاں
نام اوس کا بھی ہے اسرافیل میاں

....

اوس نے اوٹھ کر پھر کیا دروازہ واز
اور سلام اوس کو بصد عجز و نیاز
اور یہ بولا فرشتہ با صفا
یا نبیؐ اھلاً و سہلاً مرحبا

(ایضاً ص ۴۵۔۴۴۔۴۳)

الغرض آپ کی سواری دوسرے آسمان پر پہنچتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اس آسمان کا نام ''قیدوم'' ہے اور سرخ طلا سے بنا ہوا ہے۔ آپؐ نے وہاں فرشتوں کے ایک گروہ کو دیکھا جو تسبیح بیان کررہے تھے

۔ان کی زبانیں ایک پل کو بھی ساکت نہیں رہتی تھی ۔اسی آسمان پر آپ کی ملاقات حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہم السلام سے ہوئی۔ آگے بڑھے تو آپ کو ایسا فرشتہ نظر آیا جس کے ستر ہزار سر تھے اور ہر سر میں ستر ہزار ہی چہرے تھے اور ہر چہرے میں اتنے ہی منہ تھے نیز ہر منہ میں اتنی زبانیں تھیں ۔وہ جب بات کرتا تو ہر زبان کا تلفظ جدا جدا ہوتا۔ حضرت جبرئیل امین نے فرمایا کہ یہ رزق کا فرشتہ ہے۔ ہر شخص کے مقدر میں جتنا رزق ہوتا ہے یہ اسے نہ بیش نہ کم پہنچا دیتا ہے۔

وہاں سے آپ کی سواری چرخ سوئم پر پہنچتی ہے ۔اس آسمان کا نام زیلون ہے اور یہ صاف موتیوں سے بنا ہے ۔اس آسمان پر آپ کی ملاقات حضرات یوسف، داؤد اور سلیمان علیہم السلام سے ہوتی ہے۔ان میں آخری دو پیغمبروں کے متعلق شاعر کہتا ہے کہ آپ یہ دونوں کے پانچویں آسمان پر ملنے کی بھی روایت ملتی ہے۔ وہاں آپ کی ملاقات ایک فرشتے سے ہوتی ہے شاعر اس کا نام صوحائیل بتاتا ہے ۔اسی آسمان پر آپ ایک دریا سے گزرتے ہیں جس کا نام "قم" ہے ۔اسی دریا میں آپ نے نیر اعظم دیکھا۔اس کے متعلق شاعر نے دو روایتیں بیان کی ہیں ۔ایک یہ کہ سورج کا قرص اتنا طویل ہے کہ ہماری زمیں، آفتاب کے ایک سو ساٹھ جز و میں سے ایک جز و کے برابر ہے۔ دوسری روایت شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ کوئی اگر سورج کی رفتار سے آسمان میں محوسفر ہو جائے اور ایک سال میں اسی ہزار بار سفر کرلے تو سورج کے گرد اس کا ایک سفر ہوگا۔ شاعر نے یہ بھی کہا ہے کہ دریائے قم میں زر خالص سے بنائی ہوئی کشتی میں سورج محو سفر ہے اس کشتی میں ایک تخت ہے جس کے تین سو ساٹھ پیر ہیں اور ہر پیر کو تھامے ہوئے ایک ایک ہزار فرشتے ہیں وہ کشتی دریائے قم میں رواں ہے ۔سورج کے متعلق شاعر کا یہ بیان اسطوری فکر کا حامل ہے ۔احادیث معراج سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ البتہ شاعر نے قرآن مجید کی آیت "وَ الشَّمسُ تَجرِ ی لِمُس تَقَرٍّلهَا" (اور سورج چلا جاتا ہے اپنی ٹھہری راہ پر) سے استنباط کیا ہے۔ یہ آفتاب یوں ہی محوخرام ہے لیکن روز محشر یہ مغرب سے طلاع ہوگا۔اس وقت کسی کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ پھر شاعر نے قول رسولؐ منظوم کیا ہے کہ

پھر کہاں توبہ ، کدھر تو بے خبر	دم غنیمت ہے کہیں سمجھے اگر
معصیت سے ہاتھ اوٹھا خانہ خراب	ڈوبنے میں ہے یہ تیرا آفتاب
آفتابِ عمر جوں بدرِ کمال	دن بدن گھٹتا ہے اے خسرانِ مآل
حق نے دی ہے عمر جس کا ایک روز	عقل ہو تو ہے بہ از صد نیم روز
دادِ حق عمری کہ ہر روزی ازاں	کس نداند قیمتِ او در جہاں (ایضاً ص ۵۲)

آپ کا براق اس کے بعد چوتھے آسمان کی جانب محو پرواز ہوتا ہے ۔اس آسمان کی خصوصیت

بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا کہ ''اگر چہ یہ آسمان نقرۂ خام کا نظر آتا ہے مگر یہ لوٗلوٗتر سے بنا ہوا ہے۔ اس کا دروازہ نور کا اور قفل بھی نوری ہے۔ اس آسمان کا دربان موضائیل فرشتہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے علم کلیات سے سرفراز کیا ہے۔ اس فرشتے کے ساتھ چار لاکھ ملائک رہتے ہیں۔ وہاں آپ ﷺ نے لاکھوں فرشتوں کو تسبیح وتہلیل میں مشغول پایا۔ اسی آسمان پر آپؐ کی ملاقات حضرات نوح وادریس علیہم السلام، زنِ فرعون، مادر عیسیٰ وامّ موسیٰ سے ہوتی ہے۔ آپؐ آگے بڑھتے ہیں تو سامنے ملک الموت یعنی حضرت عزرائیلؑ نظر آتے ہیں۔ جبرئیل اسے ''ہادم اللذات'' کہتے ہیں۔ یہ فرشتہ لوگوں کی روح قبض کرنے پر مامور ہے۔ شاعر نے اس کی کارگذاری کا ذکر کیا ہے وہ فرشتہ آپؐ سے کہتا کہ 'میں آپ کی امت کے لئے ماں سے زیادہ محبت رکھتا ہوں'۔ عزرائیل سے ملاقات کے بعد آپؐ کی سواری کا دریائے برف پر گزر ہوتا ہے شاعر اس کا نام 'بحر الثلج' بتاتا ہے۔ اس کی برف اتنی سرد ہے کہ اگر تھوڑی سی بھی زمین پر گر جائے تو ساکنانِ ارض وسما سردی سے ہلاک ہو جائیں گے۔

اس کے بعد آپؐ سوئے فلک پنجم روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس فلک کا نام 'لبیا' مشہور ہے اور یہ یاقوت احمر سے بنا ہوا ہے۔ اس فلک کا نگہ بان سقطائیل فرشتہ ہے اور اس کے جلو میں پانچ لاکھ فرشتے تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ اس آسمان پر آپ کی ملاقات حضرات لوط، اسمٰعیل،، یعقوب اور ابراہیم علیہم السلام سے ہوتی ہے۔ وہیں آپؐ مشرکوں کو عذاب دینے والے فرشتے کو بھی دیکھتے ہیں۔ اسی آسمان پر آپؐ نے آگ کا دریا بھی دیکھا جس کا نام 'بحر الصعق' ہے۔ وہاں سے آپؐ چھٹے آسمان پر پہنچتے ہیں۔ اس فلک کا نام 'عاردس' ہے۔ وہاں آپؐ نے اس آسمان کے عابدوں سے ملاقات کی۔ وہاں سے باب الاماں کا قصد کیا۔ اس دروازے کی بائیں طرف تحت الثریٰ اور دہنے جانب عرش جیسا منظر تھا۔ حضرت جبرئیل نے اس دروازے کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب دوزخ تیار ہوگئی تو اس کی لپٹیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں آگ کی ان لپٹوں سے حفاظت کی خاطر اللہ رب العزت نے یہ دروازہ پیدا کیا تاکہ نیکوکاروں کو امان نصیب ہو جائے اس لئے اس کا نام باب الامان ہوگیا۔ اسی آسمان پر آپؐ نے مالک دوزخ کو دیکھا۔ یہاں آپؐ کی ملاقات حضرت موسیٰ علیہ السلام، میکائیل علیہ الاسلام وغیرہ سے ہوئی۔ بحر اخضر اور بحر اسود کا مشاہدہ کرنے کے بعد آپؐ فلک ہفتم کی جانب روانہ ہوئے۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسرافیلؑ سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ بیت المعمور پہنچے۔ یہاں آپؐ نے فرشتوں کی امامت فرمائی۔ شاعر نے بیت معمور کی منظر کشی بڑے اچھے انداز میں کی ہے۔

ایک گھر دیکھا نہایت خوش لقا ہے طلائے سرخ سے جس کی بنا
یوں روایت ایک ہے اے با خبر ہے بَنا یاقوتِ احمر سے وہ گھر

ایک دانہ سے ہوا ہے وہ عیاں		یک قلم یک دال ہے بس بے گماں
دو زمرد سبز کے ہیں اس کے در		ہے ہر ایک میں قدرتِ حق جلوہ گر
بے نہایت لے جواہر اور در		کی ہے بنیاد اوس کی وہاں کہتے ہیں پُر

(ایضاً ص ۷۷)

بیت معمور سے آپؐ سدرۃ کی جانب سفر کرتے ہیں۔شاعر نے سدرہ کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں۔اس درختِ پُرنور پر آپؐ نے مقام جبرئیل دیکھا۔سدرہ کے نیچے آپ کو چار نہریں دکھائی دیں استفسار پر جبرئیل نے کہ ان میں ایک دریائے نیل دوسری جیحون تیسری سیحوں اور چوتھی دریائے فرات کی نہر ہے۔اس کے بعد آپؐ نے چشمۂ سلسبیل اور جوئے کوثر کو دیکھا۔بعدہٗ نہر الرحمہ پر آپ کا گزر ہوا۔ایک جگہ آپ کے سامنے دودھ، شہد اور شراب کے پیالے لائے گئے تو آپ نے ان میں سے دودھ کا پیالہ پسند فرمایا۔فلکِ ہفتم سے آپ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہوئے تو روح الامین آگے بڑھنے سے عاجز نظر آئے۔وہ بس اتنا کہتے ہیں کہ

بس میری خدمت کا گذرا وقت اب		آگے یاں سے اڑ سکوں ہے تاب کب
تو مرا بگذار و زیں بس پیش راں		حدّ من ایں بود اے سلطانِ جاں
یک قدم کیا بلکہ یک انگشت اگر		میں بڑھوں تو جل بجھیں میرے یہ پر

(ایضاً ص ۸۴)

شاعر نے اس کے بعد آپکے عرش پر پہنچنے کی چار الگ الگ روایتیں بیان کی ہیں۔ایک روایت شاعر یوں بیان کرتا ہے کہ صدرہ سے تھوڑی دور حضرت جبرئیل آپؐ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے اور ایک جگہ رک گئے جہاں سے ستر حجاب نظر آرہے تھے ہر حجاب کا درمیانی فاصلہ پانچ سو برس کی مسافت کا تھا۔وہاں سے ہر حجاب کے فرشتے نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے حجاب تک پہنچایا۔اس طرح آپؐ عرش تک پہنچے۔ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جہاں جبرئیل آگے بڑھنے سے عاجز نظر آئے تو انھوں نے بجائے براق کے آپ کو رفرف کی سواری پیش کی جس پر سوار ہو کر آپؐ نے ستر حجاب عبور کیے اور عرش کے قریب پہنچ گئے جہاں آپ کو حجاب الٰہی نظر آیا اور رفرف غائب ہو گیا۔وہاں آپؐ نے حاملانِ عرش اعظم کو دیکھا۔جب آپؐ عرش اعظم کا مشاہدہ فرما رہے تھے تو ایک مقرب فرشتے نے آپ کو لؤلوئے بیضا سے بنی ایک کرسی پر بٹھایا۔وہاں آپؐ نے ندائے خداوندی کو سماعت فرمایا تو آپ اس آواز سے گھبرا گئے اتنے میں آپ کے منہ میں ایک قطرۂ آبِ رحمت ٹپکایا گیا اور فی الفور آپ کو عرش پر پہنچا دیا گیا۔

عرش را باشد بزرگی بس مزید
لیک صورت کیست چوں معنی رسید

یہ وہ مقام تھا جہاں جن و ملک کوئی نہ تھے۔ آپ تنہائی محسوس کر رہے تھے کہ اتنے میں آپ کو حضرت ابو بکرؓ کی صدا سنائی دی کہ، آپ تھوڑا انتظار کیجئے، آپ کا رب صلوٰت میں مشغول ہے۔ اس آواز سے آپ ﷺ کو تسلی ہوئی تھی کہ اللہ رب العزت کی آواز ''اُدنُ مِنّی'' آپ کو سنائی دی۔ آپؐ جب اس آواز کی سمت بڑھے تو شاعر نے اس عمل کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

پھر وہ سلطانِ ابد میرِ ازل — بادشاہِ لا یزال و لم یزل
گرم راہِ وصل تھا با ذوق فوق — گام زن ہر آن تھا ما فوق فوق
تھی ترقی اوس کو یہ ہر ہر قدم — اور صدائے 'اُدنُ مِنّی' دم بہ دم
اس قدر پہلے قدم میں تھا عروج — کسکے افلاک اور کہانکے یہاں بروج
دوسرا تھا اس قدر گام اوسکا یار — تھی ترقی یوں ہی اوس کو تا ہزار
لے 'دنیٰ' سے تا 'تدلّٰی' یک بیک — یوں ہی پہنچا وہ شہِ جن و ملک
کرترقی وہاں سے جب آگے بڑھا — قاب قوسین کا ہوا رونق فزا
نے فلک تھا نے ملک، نے عرش واں — یا خدا تھا یا رسولؐ راز دار (ایضاً ص ۹۵-۹۴)

آگے عرش کے حالات اور راز و نیاز کی باتیں بیان کرنے کی استطاعت نہ پا کر شاعر کہتا ہے:

قاسمؔ ان باتوں سے حاصل تجھ کو کیا — کر بیاں رازِ و نیازِ مصطفےٰ

پھر چند واقعات سناتا ہے کہ:

ہیبتِ حق سے زبس اے موموناں — لال تھی اون کی زبانِ در فشاں
اوس گھڑی تھا وہ رسولِ تیز ہوش — غنچہ ساں گلزارِ حیرت میں خموش
حق تعالیٰ نے بہ چندیں اغتن — درمیانِ شانہ ہائے مصطفےٰ
دستِ قدرت کو دھرا پھر ران پر — تا رہے حیراں نہ وہ خیر البشر
اس یدِ قدرت کی ٹھنڈک اے جواں — دل میں پاتا تھا وہ شاہِ انس و جاں
علم گوناگوں ہوئے اوس کو نصیب — ابتداء سے انتہا تک اے حبیب
علم ایک ایسا ہوا پھر وہاں عطا — جس کو فرماتے ہیں یوں خیر الوریٰ
عہد حق نے یہ لیا ہے تا کہوں — حشر تک اوس کو نہ میں ظاہر کروں
قابل اوس کے مجھ سوا کوئی نہیں — تا زباں سے میں اوسے لاؤں کہیں

اور سرور کو ملا ہے علم ایک ہے مخیر او سکے کہنے میں وہ لیک (ایضاً ص ۹۶)

عرش اعظم سے لوٹنے کے وقت بعض ملائکہ آپؐ سے استفسار کرتے ہیں۔ آپ ﷺ ان کے جوابات دیتے ہیں، حتیٰ کے اللہ رب العزت کی جانب سے آپ کی امت کے لیے صوم وصلوٰت کا تحفہ دیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ تحفہ لے کر جب آپؐ خوشی خوشی لوٹے تو چھٹے آسمان پر موسیٰ علیہ السلام حضرت محمدؐ کو پچاس نمازوں میں تخفیف کر کے لانے کا کہا۔ آپؐ پانچ بار بارگاہ ایزدی میں پہنچ کر نمازوں میں تخفیف کراتے ہیں جب صرف پانچ نمازیں باقی رہ جاتی ہیں تو پھر حیا مانع ہو جاتی ہے اور آپ پانچ نمازیں لے کر واپس لوٹ آتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کو جنت کی سیر کرائی جاتی ہے۔ شاعر نے جنت کی زینت وآراستگی کو بیان کرنے کے بعد ایک بے جوڑسی حکایت لیلیٰ مجنوں کی بیان کی ہے۔ قصہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن مجنوں کے عشق صادق کا امتحان لینے کے لیے لیلیٰ نے شہر کی اپنی نہایت حسین کنیزوں کو خوب سجنے، سنورنے اور مجنوں کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ شاعر نے بلا وجہ ان کنیزوں کی آرائش وزیبائش کے بیان کو طول دیا ہے۔ مگر جب لیلیٰ کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تو وہ اکیلی صحرا میں مجنوں سے ملاقات کرتی ہے اور جامِ وصال سے دونوں لطف اٹھاتے ہیں۔ لیلیٰ، مجنوں کو اپنی حسین کنیزوں کے دام حسن سے بچنے کا بچاؤ دیتی ہے۔ اس پر مجنوں کہتا ہے کہ میری نظر میں تو بس تو ہی تو ہے سارے جہاں میں مجھے تو ہی نظر آتی ہے تو پھر بھلا میں غیر کو کیوں دیکھوں۔ یہ تمام واقعہ معراج کے قصے سے لگا نہیں کھاتا۔ شاید شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ''اے محمدؐ! یہ جنت جس کا تم نظارہ کرنے والے ہو، تمھاری امت کو دیئے گئے تحفے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں''۔ بہر حال! لیلیٰ مجنوں کا یہ واقعہ یہاں غیر ضروری سا محسوس ہوتا ہے۔

اس قصے کو بیان کرنے کے بعد شاعر جنت کے باغوں کی منظر کشی کرتا ہے۔ جنت میں آپؐ کی ملاقات رضوانِ جنت سے ہوتی ہے۔ قاسم نے جنت کے درختوں اور پرندوں کے احوال بیان کئے ہیں کہ جنتی کو کسی پھل کی خواہش ہو تو وہ خود بخود ٹہنی سے جدا ہو کر اس کی گود میں گر جائے گا۔ یہی حال وہاں کے پرندوں کا ہے کہ وہ ہوا ہی میں کباب بن کر اس شخص کیے ہاتھوں میں آجائیں گے۔ جنتی اس پرندے کے کباب سیر ہو کر کھالے گا تو پرندہ دوبارہ زندہ ہو کر اڑ جائے گا۔ اس تفصیل کے بعد شاعر نے آٹھوں بہشت کے نام اور ان کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ شاعر کے نزدیک آٹھوں بہشت کے نام یہ ہیں ۱) عدن ،۲) ماوا، ۳) فردوس، ۴) نعیم ،۵) دار القرار ،۶) دار الخلد، ۷) دار السلام اور ۸) دار الجلال۔ اس کے بعد وہاں کے خیموں ار محلوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے محلوں کی تفصیل کچھ طویل ہے۔ پھر آپؐ کی

امت کے لوگوں کو ان کی ادنیٰ نیکی کی وجہ سے دیئے جانے والے محلوں کا حال بیان ہوا ہے اور انھیں دی جانے والی حور و قصور کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ جنت کی سیر کا ذکر کرتے ہوئے شاعر نے جوئے کوثر اور دیگر نہروں کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ اس نے قرآن کے حوالے سے 'رحیق'، 'سلسبیل' 'تسنیم' اور 'زنجبیل' کے بہشتی چشموں کا ذکر کیا ہے اور حاشیہ میں قرآن کی ان آیتوں کی نشاندہی بھی کر دی ہے جن میں ان چشموں کا ذکر ہے۔

جنت کی سیر کے دوران آپ کی ملاقات حضرت ادریسؑ سے ہوتی ہے وہ آپ کی امت میں پیدا ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ بہشت کی سیر کے بعد آپ کو دوزخ دکھائی جاتی ہے۔ اس کے ساتوں طبقات کے نام بھی شاعر نے بیان کیے ہیں۔ دوزخ کا پہلا طبق 'وکما'، دوسرا 'لظی'، تیسرا 'حطمہ'، چوتھا 'سعیر'، پانچواں 'سقر'، چھٹا 'جحیم' اور ساتواں 'ہاویہ' ہے۔ ان تمام طبقات کے دروازوں پر قرآنی آیات مرقوم ہونے کی طرف اشارہ بھی شاعر نے کیا ہے کہ پہلے طبقے کے دروازے پر ''ویل للمصلین الذین ھُم عَن صَلوٰتھم ساھون''، دوسرے دروازے پر وَیلٌ لِلمشرکین''، تیسرے پر ''وَیلٌ للمکذبین''، چوتھے پر ''وَیلٌ للمطففین''، پانچویں پر ''وَیلٌ لکل ھمزۃ''، چھٹے پر ''وَیلٌ للقاسیۃ قُلوبھم'' اور ساتویں پر وَیلٌ للذین یکتبون بایدیھم'' مرقوم ہے۔ ان طبقات میں رہنے والے معذب لوگوں کے حالات بھی بیان ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ ان لوگوں کی شفاعت کرتے ہیں۔

بالآخر رب العزت حضرت محمد ﷺ کو رخصت فرماتے ہیں اور امت کو تعلیم فرمانے کا طریقہ بتاتے ہیں۔ آپ مختلف آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے زمین کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں۔ مکہ پہنچ کر جب وہ اپنے بستر پر دراز ہوتے ہیں تو اسے اسی طرح گرم محسوس کرتے ہیں جیسا اسے چھوڑا تھا۔ آپؐ نے اپنے اس علوی سفر کی روداد لوگوں کو سنائی تو بوجہل نے انکار کیا لیکن ابوبکرؓ نے تصدیق فرمائی۔ آپؐ نے بیت المقدس کے راستے میں ملنے والے قافلے کے احوال بھی بیان کر دیئے جو مکہ پہنچنے والا تھا۔ شاعر نے معراج کے واقعے کی تصدیق کرنے والوں کے نام بتائے ہیں، ان میں خلفائے راشدین، حضرت عبداللہؓ، ابوہریرہؓ، انس، جابر اور بلال رضی اللہ عنہما، ابوسعید و مالک رضی اللہ عنہم، حذیفہ و ابوسلمہ رضی اللہ عنہم، ابوایوب، ابوامامہ، عمران اسامہ ابوذر، ابودزدائی اور عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہما مشہور صحابہ ہیں صحابیات میں حضرت حمیرہ، ام ہانی اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا شمار تصدیق کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ آخر میں معراج کا واقعہ ختم کر کے شاعر نے طویل مناجات نقل کی ہے۔ پھر تاریخ تصنیف کے ساتھ یہ منظوم معراج نامہ ختم ہوتا ہے۔

معراج نامے کی لسانی و ادبی خصوصیات:

(۱) اس معراج نامے کی زبان کے متعلق کہا گیا کہ اس کی زبان ریختہ ہے۔ اس معراج

نامے کی تاریخ تصنیف سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۰۴ھ میں یہ مکمل ہوا یہ زمانہ ناسخ کا دور مانا جاتا ہے جس میں ان کی اصلاحات کو مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ چنانچہ رشید حسن خاں نے انتخاب ناسخ کے مقدمے میں صفیر بالگرامی کی کتاب ''جلوۂ خضر'' کے حوالے سے یہ بات لکھی ہے کہ:

اول۔ ''یہ کہ زبان اردو کو ریختہ کہتے تھے اور اطلاق اس کا کبھی فقط نظم پر ہوتا تھا اور کبھی زبان پر۔ ناسخ کے وقت اس کا نام اردو مقرر ہوا۔ اور ریختے کا لفظ اڑ گیا۔ مگر دہلی میں غدر بعد تک رہا۔''

دوم۔ ''غزل کو لوگ ریختہ کہتے تھے۔ ناسخ نے غزل کا لفظ رائج کیا اور ریختے کا لفظ ہر معنی کے لیے متروک کیا''۔

(ناسخ: [مرتبہ رشید حسن خاں] ''انتخاب ناسخ'' مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۲ء تعارف ص ۸۳)

مگر قاسم نے ناسخ کی اصلاحات کو قبول نہیں کیا اور لفظ ریختہ کو بطور زبان اپنے معراج نامے میں استعمال کیا۔ قاسم نے ناسخ کے تذکیر و تانیث کے اصولوں کی بھی کچھ زیادہ پروا نہیں کی، جیسے صندوق کو اس نے مونث باندھا، جبکہ بالعموم اسے مذکر ہی باندھا جاتا ہے۔ شاعر نے متروکاتِ ناسخ پر پوری طرح عمل نہیں کیا۔ اس نے ہر جگہ نون غنہ کی جگہ اعلانِ نون کا استعمال کیا ہے۔ قاسم نے اپنے معراج نامے میں لفظ 'رکھا' کو بروزن ''رہا'' باندھا ہے جو ناسخ کے نزدیک متروک ہے۔

قاسم نے حرف اشارہ ''یہ'' کو ہر جگہ ''یہہ'' کے ساتھ باندھا ہے جبکہ ناسخ کے یہاں یہ املا رائج نہیں تھا۔ اس نے اردو تراکیب میں بھی ناسخ کی کوئی پروا نہیں کی۔ مثلاً ''یک بیک'' کو ایک بیک''، ''ایک دم''، یعنی ''اچانک'' کے لیے ''ایک دم میں'' وغیرہ

قاسم نے بعض جگہ غلط محاورے استعمال کئے ہیں مثلاً ایک جگہ ''آتش کی جھڑی'' کو بطور محاورہ استعمال کیا ہے۔

سرنگوں تسبیح خواں ہے ہر گھڑی
ہے لگی آنکھوں سے آتش کی جھڑی

یہاں قرینہ ''آنسوؤں کی جھڑی لگنے'' کا تھا، مگر شاعر نے اسے آتش کی جھڑی باندھا ہے۔
بعض جگہ قاسم نے نحو کا بھی خیال نہیں رکھا۔ جیسے

سر پہ اوس کے بے تکلف مومناں
ساٹھ سو ہیں شاخ آتش کے عیاں

یہاں شاخ کی جگہ جمع کا صیغہ شاخیں ہونا چاہئے تھا۔

قاسم نے ضرورت شعری کے تحت بعض جگہ فارسی عربی الفاظ کے حروف بھی گرائے ہیں جیسے ''فراموش'' کی جگہ ''فرامش'' وغیرہ اور ضرورت شعری کے تحت تقریباً ہر جگہ حضرت محمدؐ کے لیے تعظیمی صیغہ استعمال نہیں کیا۔ کہیں کہیں بھرتی کے الفاظ بھی شعری حسن کو مجروح کرتے نظر آتے ہیں، جیسے ع ''تھا کلیم اللہ یہ تسبیح خواں''

قاسم نے اس معراج نامے میں جگہ جگہ مدحت رسولؐ میں جو اشعار کہے ہیں، وہ واقعی ان کے نعتیہ شعور کے غماز ہیں۔ معراج کے اس سفر میں آپؐ جس فلک پر پہنچے، شاعر نے اس مقام پر ان کی مدحت میں چند اشعار قلم بند کئے ہیں۔ ان تمام کو یکجا کر دیا جائے تو ایک طویل نعت بن سکتی ہے۔ ان نعتیہ اشعار کی تراکیب، حسنِ شعری، ان میں پایا جانے والا تغزل کا عنصر، معنی آفرینی غرض کہ شاعری کی تمام خوبیوں سے اسے آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعر فلک اول کے سفر کی تیاری کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی مدحت میں یوں گوہرافشانی کرتا ہے۔

الغرض وہ مصدرِ لطفِ الٰہ
سرورِ کونین و شاہِ دیں پناہ

فلک دوم پر:

بعد ازاں وہ مصدرِ اوج و صعود — مخزنِ اسرارِ موجود و وجود
آشنائے بحر عرفانِ خدا — رازدانِ عالمِ ارض و سما

فلک سوئم پر:

دوستاں وہ بادشاہِ دو جہاں — خسروِ کونین و شاہِ انس و جاں
شافعِ روزِ جزا محبوبِ رب — خسروِ والا حشم عالی لقب
سرورِ عالم شہِ دنیا و دیں — شہسوارِ یثرب و بطحا زمیں
مالکِ ملکِ عجم، میرِ عرب — سیّدِ ارض و سما عالی نسب

فلک چہارم پر:

اے عزیزو وہ امام المرسلیں — پیشوائے آخرین و اولیں
مشرقِ انوار حی لم یزل — مطلعِ صبحِ سعاداتِ ازل
معدنِ الطافِ خلاقِ جہاں — مخزنِ اسرارِ کون و لا مکاں
مقصدِ ایجادِ ذُکران و اناث — سرّ تولیدِ موالیدِ ثلاث

فلک پنجم پر:

مومناں وہ سرّ ابداعِ جہاں — رازدانِ عالمِ کون و مکاں

منبعِ علم و کمالاتِ بزرگ — مخزنِ حلم و عنایات سترگ
نور مطلق ، شافعِ روزِ جزا — شاہِ عالم صاحبِ تاجِ ولو
معدنِ سوز و گداز و کانِ حسن — فخرِ موجودات و اصلِ چار رکن

فلک چھٹے پر:

پھر وہ اصلِ کائنات خوش خصال — صاحبِ لولاک و سرِّ ذوالجلال
آفتابِ مشرقِ رازِ قدم — نیرِ چرخِ عنایات و کرم
بدرِ گردونِ نمودِ دو جہاں — نورِ مہرِ آسمانِ لا مکاں
شہسوارِ عرصۂ روزِ جزا — تاجدارِ کشورِ جود و سخا
سرورِ جن و ملک انجم سپاہ — بادشاہِ شش جہت ، گیتی پناہ

فلک ساتویں پر:

پھر یکایک وہ شفیع المذنبیں — سیّدِ عالم امام المرسلیں
افتخارِ آدم و جن و ملک — فخرِ ارضین و سماوات و فلک
مظہر و کشافِ راز و ذوالمنن — واقف و آگاہ ہر سرّ و علن
لالہ زارِ داغِ عشقِ بے نیاز — نو بہارِ گلشنِ سوز و گداز
آسمانِ عزت و جاہ و حشم — آفتابِ ہمت و جود و کرم
مہبطِ جبرئیل و محبوبِ خدا — بہترینِ خلق ، خیر الانبیا
سرورِ ارض و سما خیر الانام — بادشاہِ ہفت کشور لا کلام

ان نعتیہ اشعار کی ترکیب پر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں قصیدے کے الفاظ کی سی شوکت، ندرت اور ایک طرح کا ملا جلا جلال و جمال دکھائی دیتا ہے۔ ان نعتیہ اشعار کو پڑھتے ہوئے بے ساختہ درود تاج کی یاد آجاتی ہے۔ ان اشعار میں شانِ نبویؐ کے بیان میں غلو کا شائبہ ہوتا ہے مگر شاعر نے محتاط انداز میں اسے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

شمالی ہند کے اس نعتیہ پارے کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ مجھے علم نہیں کہ اس کے مطبوعہ نسخے اور بھی ہوں گے۔ میرا یہ ذاتی نسخہ نہایت بوسیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ بعض صفحات کے حاشیے اور فٹ نوٹس غائب ہو گئے ہیں۔ میں اپنی بساط بھر کوشش سے اس کی حفاظت کر رہا ہوں۔ دوبارہ اس کی طباعت ہو جائے تو قاسم کا یہ کارنامہ محفوظ رہ جائے گا۔

☆☆☆

پروفیسر محمد اقبال جاوید۔گوجرانوالہ

نعتیہ تبرکات (فارسی) ماہنامہ ''صوفی'' کے آئینے میں
(۱۹۱۰ء-۱۹۴۷ء)

ABSTRACT: An Urdu monthly journal 'SUFI' was first published from Pindi Bahauddin (Punjab) in 1909 and continued even after Pakistan came into existence. The Sufi first published Poetry and Prose of writers who, thereafter, gained popularity and fame in literary world like Akbar Ilah Abadi, Abdul Haleem Sharer, Allama Iqbal, Abdul Kalam Azad, Simab Akberabadi. Naatia Persian poetry of several poets traced from the files of Sufi is placed herein this article in order to show literary standard and poetic beauty of devotional poetry written by poets in praise of Prophet Muhammad (S.A.W).

میں نے پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''صوفی'' کی دستیاب فائلوں سے اردو نعتوں کا ایک انتخاب کیا تھا جو میری تعارفی سطور کے ساتھ ماہنامہ ''نعت'' لاہور کے ایک مکمل شمارے (مارچ ۱۹۹۹ء) کی شکل میں چھپ چکا ہے۔ ماہنامہ ''صوفی'' کا اجراء ۱۹۰۹ء میں ہوا اور وہ قیام پاکستان کے بعد تک شائع ہوتا رہا ہر دور علم ونظر کے اعتبار سے ثروت مند اور رشک آفرین تھا۔ اہلِ قلم کو عربی کی بلاغتوں اور فارسی کی حلاوتوں سے کماحقہ آشنائی ہوتی تھی اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آج تعلیمی اداروں میں عربی کی تدریس بالکل ختم اور فارسی نہ ہونے کے برابر ہے اور یہ بھی ایک صداقت ہے کہ ہمارا دینی ادب عربی کے بعد فارسی میں محفوظ ہے اور اُن کے مطالعہ سے دینی شعور نکھرتا اور دنیاوی شعار سنورتا ہے اور اُن کی آغوش میں تعلیم وتربیت پانے والی ''اردو'' رنگ ونور کی کہکشاں بن کر جلوے بکھیرتی ہے۔ دورِحاضر کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ عربی اور فارسی سے کٹ کر ''اردو'' بے رنگ بھی ہو چکی ہے اور بے نور بھی اور ''اردو دانوں'' کی اکثریت کسی فارسی شعر کو بغیر اردو ترجمے کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ عربی کا پڑھنا اور سمجھنا تو دور کی بات ہے۔ ماہنامہ ''صوفی'' میں بہت سی فارسی نعتیں بھی موجود ہیں جن کا محفوظ ہو جانا زبان وادب کی نہ سہی، صنفِ نعت کی خدمت ضرور ہے۔ عہد حاضر (حکم ہمیشہ اکثریت پر لگایا

جاتا ہے) رسالہ "صوفی" کے نام سے ممکن ہے آشنا ہو مگر کام سے کم وبیش نا آشنا ہے۔ آج ذوق وشوق کی دنیا ویران اور جذبہ وجنون کا بانکپن افسردہ ہے۔

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

رسالہ "صوفی" کا تاریخی پس منظریوں ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمان علمی، سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے دب کر رہ گئے تھے، انگریز نے اُن کی عافیت تنگ کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس یاس انگیز عالم میں کچھ اردو رسائل نے مسلمانوں کی پریشاں حالی کو سہارا دینے کی کوشش کی۔ جن میں "نظام المشائخ"، "معارف"، "طریقت" اور "صوفی" قابل ذکر ہیں۔ "صوفی" نے اسلامی تصوف، دینی قدروں اور ادبی رجحانات کو فروغ دینے کی بھرپور سعی کی "صوفی" کا اجراء جنوری ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ یہ رسالہ پیر سید غلام حیدر شاہ جلالپوری کی یاد میں جاری کیا گیا اور قیمت بارہ آنے سالانہ رکھی گئی کہ مالی مفاد پیش نظر نہ تھا۔ ۱۹۳۴ء میں سالانہ قیمت ۲ روپے تھی اور فی پرچہ چار آنہ اس کے مدیر و مالک، ملک محمد الدین اعوان، حضرت سید غلام حیدر شاہ جلالپوری کے مرید خاص تھے اور حضرت جلالپوری ہی نے "صوفی" کے اجراء کی اجازت دی تھی اور دعا بھی فرمائی تھی۔

یہ بات ہے ۱۹۰۸ء کی مگر اسی سال (۶ جولائی ۱۹۰۸ء) اُن کا وصال ہو گیا یوں "صوفی" کا اجراء معرض التوا میں چلا گیا، چناں چہ جنوری ۱۹۰۹ء کو اس کا پہلا شمارہ اشاعت پذیر ہوا۔ اور اس میں حضرت جلالپوری کے ملفوظات اور مناقب پیہم چھپتے رہے۔ جائے اشاعت پنڈی بہاؤالدین ضلع گجرات ہے۔ یہ مقام منڈی بہاؤالدین کے مضافات میں واقع تھا تب اِسے "پرانی پنڈی" بھی کہتے تھے۔ آجکل یہ منڈی بہاؤ الدین ہی کا ایک حصہ ہے۔ جنوری ۱۹۰۹ء سے جون ۱۹۰۹ء تک "صوفی" کے سرورق پر طالب آملی کا یہ شعر لکھا ہوتا تھا۔

کفر است در طریقت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

اس شعر ہی سے "صوفی" کے مقاصدِ اجرا پر روشنی پڑتی ہے۔ احترامِ انسانیت، اعتدال، بے تعصبی اور خیر وفلاح کی روش کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اصلاح واحیاء پر بھی توجہ مرکوز رہی۔ بعد میں وقتی اور ہنگامی طور پر سیاسی رنگ بھی آتا گیا۔ ہندوؤں اور عیسائیوں کے اسلام دشمن رویے کا رد بھی ہوتا رہا؟

"صوفی" ۸/ ۳۶×۲۳ کی تقطیع اور کتابی سائز میں چھپتا رہا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جون ۱۹۱۳ء میں اس کی اشاعت آٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اور یہ تعداد دیگر تمام

ماہناموں سے زیادہ تھی۔اس کے مدیر اعلیٰ تو ملک محمد الدین اعوان ہی تھے مگر مختلف اوقات میں نور الدین، محمد اسلم خاں، علامہ ابوالارشاد مشہدی، ملا رموزی، حکیم خورشید حسن، ملک نصر اللہ خاں عزیز اور ملک حسن علی جامعی بھی حلقۂ ادارت میں شامل رہے۔

ملک حسن علی جامعیؒ کے بعد مدیر "صوفی" کے فرزند اکبر ملک محمد اسلم خاں اعزازی مدیر معاون بنے۔وہ بی۔اے کیمبرج تھے۔سید عابد علی عابد، سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی، محمد دین تاثیر اور خواجہ غلام السیدین سے اُن کے ذاتی روابط تھے۔وہ مغربی ادب سے متاثر تھے۔انھوں نے "صوفی" کو جدید ادبی رنگ دینا شروع کر دیا۔انھوں نے اپنے ایک شذرہ میں حضرت سید فضل شاہ سجادہ نشین جلالپور شریف سے بوجوہ اختلاف کیا جس پر مدیر "صوفی" نے ان کے بجائے اپنے چھوٹے بیٹے محمد اکرم خاں اعوان کو نائب مدیر کیا اور اپنی پیرانہ سالی کے باوجود "صوفی" کی پرانی روش بحال کرنے اور رکھنے کی بھرپور سعی کی۔

۱۹۳۸ء میں "صوفی" کچھ عرصہ کے لیے بند رہا۔ ۱۳ر جنوری ۱۹۴۰ء کو دوبارہ شائع ہونا شروع ہوا۔مگر اس کی مقبولیت اور تعداد اشاعت کم سے کم ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ معیار بھی گرتا چلا گیا اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی کچھ سالوں تک صوفی رسماً اور روایتاً چھپتا رہا یا دوسرے لفظوں میں اپنی زندگی کے آخری لمحات جوں توں پورے کرتا رہا اور مدیر "صوفی" کی وفات کے ساتھ ہی یہ بھی اپنے طبعی انجام کو پہنچا۔

مدیر "صوفی" ملک محمد الدین اعوان ،۹ر اگست ۱۸۸۱ء کو مہوٹہ کلاں ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ماجد کا نام حکیم سلطان علی تھا۔والدین بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے،آپ کا بچپن اور شباب مصائب و آلام کے نرغے میں رہا۔ابتدائی تعلیم جلالپور اور چکوال میں حاصل کی۔اپریل ۱۸۹۶ء میں انجمن حمایت اسلام سے متعلق اسلامیہ ہائی اسکول لاہور میں داخل ہوئے۔یہ دور بے سروسامانی کا تھا مگر آپ نے ہمت اور صبر کے ساتھ یہ دور گزارا۔آپ کو ادب سے لگاؤ تھا۔شاعرانہ ذوق فطرتاً عطا ہوا تھا۔آپ 'موج' تخلص کرتے تھے۔زمانۂ طالب علمی میں حمایت اسلام لاہور کے ایک حصے میں آپ نے اپنی ایک نظم بھی پڑھی اور داد پائی۔ یہاں تک کہ علامہ اقبالؒ نے بھی اپنے ایک مکتوب میں اُن کے ادبی اور شعری ذوق کی تعریف کی ہے۔گو ارتجالاً شعر کہنے میں بھی آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔گو بوجہ علالت میٹرک نہ کر سکے مگر انگریزی زبان پر خاصا عبور تھا۔زندگی غربت و عسرت کا شکار تھی۔ ۱۹۰۶ء میں صاحبزادہ محمد الدین سیالوی کی وساطت سے پیر غلام حیدر شاہ جلالپوری کی خدمت میں دعا کے لیے حاضر ہوئے۔انھوں نے بھی آپ کی علمی و شعری صلاحیتوں کی تعریف کی۔اُن کی توجہاتِ گرامی قدر سے اللہ تعالیٰ نے مالی تنگی کو فراخی میں بدل دیا۔آپ نے "صوفی" کے علاوہ نورتن اور اعوان بھی جاری کیے۔رسالے

کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ آپ تھانہ بھون حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ آپ کی صحت قابل رشک رہی مگر بعض خاندانی مناقشات نے آپ کو انتہائی مغموم کر دیا۔ ذہنی صدمات، علالت کا پیش خیمہ ثابت ہوئے اور آپ ۱۷ دسمبر ۱۹۶۴ء کو وفات پا گئے۔

اللہ تعالیٰ ملک محمد الدین اعوان کو جوار رحمت میں جگہ دے کہ وہ ایک دور افتادہ دیہاتی علاقے میں بیٹھ کر، محدود وسائل اور مسدود ذرائع کے ساتھ، ایک ایسا رسالہ باقاعدگی سے شائع کرتے رہے جو خانقاہی مزاج رکھنے کے باوجود ایک عہد کو علمی، ادبی اور شعری اعتبار سے متاثر کر گیا۔ جس نے قارئین کا ایک وسیع حلقہ پیدا کیا اور بہت سے نوخیز ذہنوں کو بال و پر عطا کیے۔ اس کے آخری شماروں میں اُن شخصیات کی ابتدائی نوعیت کی تحریریں بھی ہیں جو آج علم وادب کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہی ہیں اور یہ نتیجہ تھا ملک محمد الدین اعوان کی خوبصورت ادیبانہ، شاعرانہ، مدیرانہ اور متصوفانہ صلاحیتوں کا انہوں نے اپنے دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز کو علم وعرفان کے چراغ روشن کرنے اور روشن رکھنے کے لیے وقف رکھا، وہ فی الواقع لالہ صحرائی تھے مگر ان کا رنگ، روپ دُور دُور تک دیکھا گیا اور ان کا سوز و گداز دور دور تک محسوس کیا گیا اور ان تعارفی سطور کا مقصود بھی یہی ہے کہ ان کے اس رنگ اور اس آہنگ کی یاد دیر تک باقی رہے۔

کہیں ایثار غم جاتا ہے ضائع
چمن شاداب ہے، شبنم نہیں ہے

ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے الفاظ میں:

"پنجاب کے ادبی اور صحافتی منظرنامے پر مجلہ صوفی کا نام کئی زاویوں سے اہم ہے، علامہ اقبال کے فکروفن کے تعارف کے حوالے سے اور تحریکِ پاکستان سے متعلق قومی ادب کی نسبت سے، اردو صحافت کی تاریخوں نے اس طویل المدت مجلے کی قدرشناسی اور اہمیت کے تعین میں بخل سے کام لیا ہے، مجلہ "صوفی" پنجاب میں تاریخ صحافت کا سنہری باب ہے۔ البتہ اسے ایک ایسی گمشدہ کڑی بھی کہنا چاہیے جو پنجاب کی صحافت میں مذاق سلیم اور عہد ساز علمی وادبی فضا کی ضامن ہے۔"

محترمہ صبغہ فاروق نے ایم۔فل کے لیے "علامہ اقبال اور مجلہ صوفی" کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے انتہائی قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں۔ اُن کے الفاظ میں "مجلہ "صوفی" نے عام شماروں کے علاوہ انیس خاص شمارے پیش کیے۔ جن میں پانچ رسول نمبر گیارہ

عرس نمبر، ایک عید نمبر، ایک ماتمی نمبر اور ایک سلور جوبلی نمبر شامل ہیں، جنہیں "صوفی" کے شاندار ماضی کی دلیل سمجھنا چاہیے۔ ان نمبروں کی تفصیل یہ ہے:

رسول نمبر : دسمبر ۱۹۱۸ء، نومبر ۱۹۱۹ء، نومبر ۱۹۲۰ء نومبر ۱۹۲۱ء، اگست و ستمبر ۱۹۲۸ء

عرس نمبر : جون ۱۹۱۰ء، مئی ۱۹۱۲ء، اپریل ۱۹۱۵ء، اپریل ۱۹۱۶ء، فروری مارچ ۱۹۱۷ء، مارچ ۱۹۱۸ء، فروری ۱۹۱۹ء فروری ۱۹۲۰ء، جنوری فروری ۱۹۲۱ء، جنوری ۱۹۲۲ء، نومبر ۱۹۲۸ء عید نمبر : اپریل و مئی ۱۹۲۸ء ماتمی نمبر : جنوری ۱۹۳۰ء جوبلی نمبر : اپریل ۱۹۳۵ء

ماہنامہ "صوفی" کو اپنی اشاعت کے طویل دور میں برصغیر کے نامور شعراء مصنفین و محققین کی معاونت حاصل رہی۔ جو اس کے سنجیدہ معیاری علمی مجلہ ہونے کا ثبوت ہے۔ "صوفی" کے قلمی معاونین کی فہرست اگر مرتب کی جائے تو بہت طویل ہو جاتی ہے۔ اس لیے چیدہ چیدہ نام پیش خدمت ہیں۔ اکبر الہ آبادی، الطاف حسین حالیؔ، دِلو رام کوثریؔ، نیاز فتحپوری، سید سلیمان ندوی، خلیق دہلوی، غلام قادر گرامیؔ، سیماب اکبر آبادی، عبدالحلیم شررؔ، نوح ناروی، قاضی حمید الدین احمد، وجاہت جھنجھانوی، اخترؔ جونا گڑھی، ناصر نذیر فراقؔ دہلوی، خواجہ حسن نظامی، علامہ اقبالؔ، محسنؔ لاہوری، اصغر علی روحیؔ، میر ولی اللہ، مولانا ظفر علی خاں، خواجہ عبدالحی فاروقی، اصغر حسین خاں، نظیرؔ لودیانوی، ظہور احمد وحشیؔ، مرزا سلطان احمد، نظام الملک آصف جاہ میر عثمانؔ علی خاں، جوشؔ ملیح آبادی، حکیم احمد شجاع، مولانا حسرتؔ موہانی، شاکر صدیقی، محمد اکبر منیرؔ، ماہرؔ القادری، مرتضی احمد خاں میکش، افضلؔ جعفری، پیرزادہ احمد شاہ ندیم علوی قاسمی اعوان (احمد ندیمؔ قاسمی)، سید جماعت علی شاہ، مرزا عزیز فیضانی دارا پوری، شوقؔ قدوائی، صاجزادہ فضل شاہ، مقبول احمد نظامی سیوہاروی، منشی محمد الدین فوقؔ، مولانا عبدالسلام ندوی، نادر کاکوروی، ضیاء الدین احمد برنی، طالبؔ بنارسی، عزیز الرحمن بلگرامی، سفیرؔ کاکوروی، منشی تلوک چند محرومؔ، حکیم احمد حسن سیوہاری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی محمد سعید الحق لکھنوی، نواب سر بلند جنگ حاجی حمید اللہ خاں، ڈاکٹر نکلسن، اسلم جیراجپوری، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، محمد بخش مسلم، تمکین کاظمی، منظور حسین منظور، سید طفیل احمد، عبدالرزاق حیدر آبادی، جلال الدین اکبر، اختر شیرانی، شیخ سر عبدالقادر، مولانا اشرف علی تھانوی، غلام احمد پرویز، ملک نصر اللہ خاں عزیز، حسن علی جامعی، علامہ ابوالارشاد مشہدی، حکیم نیر واسطی، یوسف سلیم چشتی، کیفی چڑیا کوٹی، علم الدین سالک، مولانا عبدالمجید سالک، سید عابد علی عابد، سید نذیر نیازی، محمد الدین تاثیر، نذر سجاد حیدر، حجاب امتیاز علی، عبدالماجدؔ دریا آبادی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ۔ جس مجلّے کو خوش قسمتی سے ایسے مصنفین کا تعاون حاصل ہو، اس کی کامیابی مسلم ہوتی ہے۔ وہ بام عروج حاصل کیے بغیر نہیں رہتا۔ یقیناً "صوفی" نے ان قلمی معاونین کی مدد سے وہ منزلیں سر کیں، جن کی توقع اس سے کی جا سکتی تھی۔

اب نعتیہ انتخاب، شعراء کے سوانحی اشارات کے ساتھ۔ ملاحظہ کیجیے:

منشی شنکر لال، ساقی:

تاریخ پیدائش ۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۲۰ء مقام پیدائش، سکندر آباد، تاریخ وفات ۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۰ء ۔آپ کے والد کا نام خوب چند تھا اور آپ منشی ہرگوپال سہائے تفتہ (۱۷۹۹ء۔۱۸۷۹ء) کے چچیرے بھائی تھے۔قوم کے کائستھ بھٹنا گر تھے۔سہارنپور کی ایک عدالت میں ملازم تھے۔شعری ذوق فطری طور پر ودیعت ہوا تھا اور حب رسول ﷺ اُس ماحول کا فیض تھا جس میں اس ذوق نے نکھار و وقار پایا۔آپ منشی بالمکند بے صبر (۱۸۲۰ء۔ ۱۸۹۰ء) کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔مگر غالب اور تفتہ کی توجہات نے آپ کے شعری رنگ کو ایک دل آویز آہنگ عطا کیا۔اُن کا یہ شعر اس امر کا ثبوت ہے۔

رغبت نہیں کلام سے اردو کے ساقیا
ہوں لینے والا غالب و تفتہ کے نام کا

جبکہ تفتہ کا ایک خوبصورت نعتیہ شعر ہے ۔

چوں دمِ محشر، زمحشر برخود عرصہ تنگ دید
تفتہ گریاں آمد و دامانِ پیغمبر گرفت

ساقی اپنے زمانے کے معروف شعراء (غالب، مومن اور ذوق) کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔آپ نے شیخ سعدیؒ کی کریما کا بھاشا میں منظوم ترجمہ بھی کیا جو ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا دوسری تصنیف "انتخاب کلیات" ہے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں انہوں نے نعتیں کہی ہیں۔مگر اردو اور فارسی کے دیوان طبع نہیں ہوسکے۔آپ کی درج ذیل فارسی نعت "صوفی" مارچ ۱۹۲۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے ۔

روشن دلم زجلوۂ روئے محمد است — جانم فدائے نام نکوئے محمد است
یادِ خدا است ہمدمِ روئے لطیف من — دل درخیال مدحت خوئے محمد است
ایں بوئے خوش کہ مشک ختن یافت درجہاں — بے شبہ از عطیۂ موئے محمد است
دردیر ہم قبول تواں شد نمازِ من — گر روئے دل زصدق بسوئے محمد است
ساقی اگرچہ جامۂ ہنداست برتنم — خاکم مگر زیثرب وکوئے محمد است

ڈاکٹر اسمٰعیل آزاد اور ماہنامہ نعت لاہور (غیر مسلموں کی نعت گوئی) کے مطابق تیسرے شعر کے دوسرے مصرع میں "بوئے محمدؐ" ہے۔جبکہ ماہنامہ "صوفی" میں "موئے محمدؐ" ہے اور میرے خیال میں یہی درست بھی ہے اور بلیغ بھی۔محترم راجا رشید محمود نے لفظ "شبہ" کو شعری اعتبار سے غلط اور "شبہ" کو درست قرار

دیا ہے جبکہ "نورِسخن" میں "شبہ" ہے اور "صوفی" میں بھی۔"بہرزماں، بہرزباں" میں "بہ شبہ" ہے جبکہ "اردو شاعری میں نعت" میں "شبہہ" ہے۔اور یہی املا درست ہے کہ اس لفظ کے آخر میں دو"ہ" ہیں دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں "روئے لطیف من" کے بجائے "روح لطیف من" درست ہے "نورِسخن" میں یہی ہے۔جبکہ ماہنامہ "صوفی" میں غلط ہے۔

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوریؒ:

۱۸۶۷ء میں ریاست پٹیالہ کے قصبہ منصور پور میں پیدا ہوئے۔آپ کے جدامجد قاضی معزالدین سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ سے منسلک، ایک صاحب طریقت بزرگ شاہ غلام علی دہلویؒ سے بیعت بھی تھے اور ان کے خلیفہ بھی۔آپ کے والد قاضی احمد شاہؒ ریاست پٹیالہ میں محکمہ مال میں ملازم تھے۔ایام شیر خوارگی میں آپ کو حضرت سائیں توکل شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا جنہوں نے انتہائی شفقت کے ساتھ آپ کے لیے دعا فرمائی تھی۔آپ مدت العمر پٹیالہ میں بطور مجسٹریٹ درجہ اول اور سیشن جج کام کرتے رہے۔آپ حج بیت اللہ سے واپسی پر (۳۰ مئی ۱۹۳۰ء بروز جمعہ) بحری جہاز میں وفات پاگئے۔آپ کی نماز جنازہ مولانا محمد اسمٰعیل غزنویؒ نے پڑھائی اور آپ کے جسد خاکی کو سمندری لہروں کے سپرد کر دیا گیا۔آپ ہی کا ایک شعر ہے۔

نظر آتا نہیں قسمت میں مجھ کو لوٹ کر آنا
مجھے عمرِرواں، آبِ رواں معلوم ہوتی ہے

نبی کریم ﷺ کی سیرت "رحمۃ للعالمین ﷺ" آپ کی معروف تصنیف ہے، اس کا ایک ایک لفظ آپ کے دل کی محبتوں کا آئینہ ہے کہ آپ نماز تہجد کے بعد اللہ تعالیٰ سے توفیق تحریر مانگا کرتے تھے اور پھر قلم اٹھاتے تھے۔یوں آپ نے پھول کے تذکرے کو خوشبو کا لب ولہجہ دیا ہے آپ مسلکاً اہل حدیث تھے مگر طبیعت میں تعصب کا کوئی سا، سایہ اور تنگ دلی کا کوئی سا، شائبہ بھی نہ تھا۔آپ اہل بیت کے ثناخواں، صوفیاء کی عظمتوں کے قائل اور مختلف ائمہ کی فقیہانہ بصیرتوں کے معترف تھے۔آپ کی طبیعت موزوں، دل گداز اور فکر پاکیزہ تھی۔ شاعری اور نثر میں رعنائی اسی موزونیء طبع کا ثمر تھی۔آپ نے فن شاعری کی طرف باقاعدہ توجہ نہیں دی اور نہ اس سلسلے میں فکری ریاض کیا بلکہ شستہ و برجستہ طبیعت کے پیش نظر، گاہے گاہے۔نظر کو نواز نے والی اور دل میں اترنے والی کیفیات بے ساختہ شعر میں ڈھلتی رہیں۔

درج ذیل نعتیہ قصیدہ رسالہ "صوفی" کے شمارہ نومبر ۱۹۲۵ء میں چھپا تھا تب آپ کی منظومات "صوفی" اور ماہنامہ "مسلمان" میں شائع ہوا کرتی تھیں۔

قصیدہ در نعت مصطفوی

در دلم جوشد ثنائے رحمۃ للعالمیں — آفتابِ عالمِ جان و ضیائے چشمِ دیں
ہست صدق و صدق آورد و کلامش نیز صدق — دینِ او حق ہست و او حق ہست حق جز مبیں
او دلیلِ صد ہزاراں واصلانِ قربِ رب — او کلیدِ صد علومِ اولین و آخریں
مسند آرائے نبوت بود او در قدس گاہ — منجدل چوں بود آدم درمیان ماء و طیں
ہ کلامِ او حیاتِ تازۂ دلِ مردگاں — پنجۂ اش در دست دارد چشمۂ ماء معیں
اُسوہ اش ہدیٰ مبین است و کلام اللہ علم — قلب او بیں علم و عمل را یافت شیر و انگبیں
از دلِ او ہر چہ خیزد قدسیاں را زمزمہ — از لبِ او ہر چہ ریزد صادقیں را دل نشیں
احتشامِ او ہویدا از کلامِ ذوالجلال — نورِ او پیدا و ہم پنہاں بآیاتِ مبیں
اسمِ او مہرِ سلیماں را دہد شانِ جلیل — نامِ او روشن تغیر یابد سیہ بختِ نگیں
درس گاہِ قدس او را ابجدِ دیگر بود — حرفِ آغازش بود ایمان و انجامش یقیں
منکرِ او دور ماند از رحمتِ پروردگار — رحمۃ للعٰلمیں خواند رب العالمیں
جرعہ جامِ ولائے او بہ بخشد زندگی — رفت بے بہرہ ازیں سکندرِ ظلمت نشیں
اتباعش کرد لازم بر ہمہ آموزگار — ایں رساند قلب و جاں را بفردوسِ بریں
خائب و خاسر نماند مذنب خائف ذکر — خیر مقبلین ہست خالق او شفیع المذنبیں
حق تعالیٰ را بود در حشر مردم حکمتے — تا نماند جاہِ او بر آخرین و اولیں
خت او تصدیق فرمایندۂ پیشینیاں — خلقِ او را ترجمانی کرد قرآنِ مبیں
یں تمام نعمت دہم ایں کمالِ معرفت — نوعِ انساں یافت از وے خلعتِ ضمانِ دیں
م شد بر او نبوت یافت دیں از وے کمال — نشست اندر خانقاہ سدرہ واش روح الامیں
ح او چوں آب بر تو ارہ ریزد بر زباں — نامِ او چوں مہر ماہ را نور بخشِ ذاکریں
ہوائے شہرِ او چوں ذرہ پرد پیکرم — در خیالِ مسجدِ او سجدہ رقصد در جبیں
بِ او از ہر چہ باشد برتر و خوش تر بود — غایتِ ایماں ہمیں ہست ہمیں است و ہمیں
غمِ دوری او چشم سرشکے چند ریخت — گفت رضواں زینتِ حور است ایں دُرِّ ثمیں
امامِ مرسلاں اے حاملِ امّ الکتاب — بخشش و بخشائش بود خبر تا برا اہلِ کیں
مقامِ برتر محمود یابد تا کنند — انبیا زیرِ لوائے محمد جائے خود گزیں
ہ از داور کہ در راہت شوم صحرا نورد — اے غبارِ آستانت سرمۂ چشمانِ عیں

آں سیہ نامم کہ خاکِ آستانِ پاکِ تو
کرد مستغنی مرا از تختِ دیہیم و نگیں

علامہ اقبالؒ:

ماہنامہ ''صوفی'' کے دستیاب شماروں میں علامہ اقبالؒ کی دو فارسی نعتیں بھی شائع ہوئی ہیں جبکہ اردو کلام باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ پہلی نعت جون ۱۹۲۵ء میں چھپی جبکہ دوسری ستمبر ۱۹۲۹ء میں۔ یہ دونوں نعتیں علامہ کے کلام میں قبل ازیں چھپ چکی تھیں پہلی نعت ''اسرار و رموز'' میں ایک طویل نظم میں شامل ہے۔ عنوان ہے ''در معنی ایں کہ جمعیت حقیقی از محکم گرفتن نصب العین ملیہ است ونصب العین امت محمدیہ حفظ ونشر توحید است'' یاد رہے کہ اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں اور دونوں یکجا صورت میں ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھیں، دوسری نعت، غزل کی ہیئت میں ہے۔ جو''پیام مشرق'' کی غزلیات میں شامل ہے جبکہ ''پیام مشرق'' ۱۹۲۳ء میں چھپی تھی۔ رسالہ ''صوفی'' میں اس نعت کا عنوان ہے ''ارمغان مختصر بہ بارگاہِ آقائے دو جہاں ﷺ'' گمان غالب ہے کہ یہ عنوان شاعر مشرق نے خود ہی لکھا ہوگا۔ ویسے علامہ اقبال کو بھی متعارف کرانے میں رسالہ ''صوفی'' کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ صبغہ فاروق کے ایم۔فل کے مقالے کا عنوان ہی ''علامہ اقبال اور مجلّہ صوفی'' ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے الفاظ میں:

> ''علامہ اقبال کے قومی اور فکری پیغام کو ہر طبقۂ زندگی سے متعارف کرانے میں دو شخصیتوں کا نام آب زر سے لکھا جائے گا، ان میں سے ایک ''مخزن'' کے مدیر سر عبدالقادر اور دوسرے مجلّہ ''صوفی'' کے مدیر ملک محمد الدین اعوان ہیں ان دونوں کی خدمات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں، اپنے اپنے دائرہ کار میں دونوں کی مساعی ناقابل فراموش ہیں۔ سر عبدالقادر پر تو گزارے لائق تھوڑا بہت کام ہو چکا ہے لیکن ملک محمد الدین اعوان پر نہ صرف یہ کہ کوئی اہم کام تاحال منظر عام پر نہیں آیا، بلکہ علامہ اقبال کے تعلق سے خود اقبال شناس بھی پوری طرح ان سے آشنا نہیں ہیں، مجلّہ ''صوفی'' علامہ اقبال اور عصر اقبال کا ایک اہم ماخذ ہے۔''

رسالہ ''صوفی'' میں شائع ہونے والے علامہ اقبالؒ کے نعتیہ اشعار درج ذیل ہیں

اُمی پاک از ہویٰ گفتار او	شرحِ رمز ما غویٰ گفتار او
تابدست آورد نبض کائنات	وانمود اسرار تقویم حیات
از قبائے لالہ ہائے ایں چمن	پاک شست آلود گیہائے کہن
در جہاں دربستۂ دینش حیات	نیست ممکن جز بہ آئینش حیات
اے کہ می داری کتابش در بغل	تیز ترنہ پا بہ میدانِ عمل

☆☆☆

شعلہ در آغوش دارد عشق بے پروائے من
برنخیزد یک شرار از حکمت نازائے من

چوں تمام افتد سراپا نازمی گردد نیاز
قیس را لیلیٰ ہمی نامند در صحرائے من

بہر دہلیز تو از ہندوستان آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردیدہ در سیمائے من

تیغ کا در پنجہ ایں کافر دیرینہ دہ
باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الّائے من

گردشے باید کہ گردوں از ضمیر روزگار
دوش من باز آرد اندر کسوت فردائے من

از سپہر بارگاہت یک جہاں وافر نصیب
جلوۂ داری دریغ از وادیٔ سینائے من

باخدا در پردہ گویم باتو گویم آشکار
یارسول اللہ! او پنہاں وتو پیدائے من

شیخ عبداللطیف تپش:

تپش لاہوری کے سوانحی کوائف، باوجود کوشش کے، مجھے مل نہیں سکے، سوائے اس کے کہ اُن کی ولادت ۲۹/ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پسرور کے مقام پر ہوئی۔ بشارت علی خاں فروغ نے اردو شعراء اور ادباء کے سوانحی حالات سے متعلق "وفیات مشاہیر اردو" کے نام سے ایک مبسوط تالیف شائع کی ہے۔ اس میں انہوں نے پسرور کا ضلع لاہور لکھا ہے۔ شیخ عبداللطیف تپش کا سال وفات ۱۹۴۲ء ہے اور مقام وفات ملتان۔ رسالہ "صوفی" میں اُن کے اسم گرامی کے ساتھ لیکچرار گورنمنٹ کالج پسرور تحریر ہے اور رسالہ جولائی، اگست ۱۹۲۲ء سے متعلق ہے۔ نہیں معلوم کہ ۱۹۲۲ء میں پسرور میں گورنمنٹ کالج تھا یا نہیں۔ بہر کیف اُن کی یہ نعت حضرت محمد جان قدسیؒ کی معروف نعت پر ۹ بندوں پر مشتمل ایک خوبصورت تضمین ہے۔ قدسیؒ کا سن ولادت ۹۹۲ھ ہے۔ مقام ولادت مشہد مقدس ہے۔ اسی نسبت سے قدسی تخلص ہے۔ قدسیؒ ہندوستان بھی تشریف لائے۔ کب آئے اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۱۰۴۲ھ لکھا ہے۔ ۱۰۴۳ھ میں شاہجہان کے ساتھ کشمیر بھی گئے۔ سال وفات ۱۰۵۶ھ ہے۔ مقام وفات لاہور۔ کلیم کاشانی کا یہ شعر قدسیؒ ہی کی وفات کے بارے میں ہے ؂

شد بہ لاہور گراں گنج معانی درخاک
رفت تاطوس ولی غلغلۂ نوحہ گرش

قدسیؒ کی معروف نعت پر اردو اور فارسی میں اتنی تضمینیں لکھی گئی ہیں کہ یہ گمان، یقین کی حد تک پہنچ جاتا کہ اس نعت کو حضور ناز میں پذیرائی کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اس میں فکری جمال، شعری کمال سے ہم آہنگ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ نعت لکھی نہیں گئی بلکہ لکھوائی گئی ہے۔ حب رسول ﷺ خوشبو بن کر لفظ لفظ کو مہکا رہی ہے اور یہ مہکتی فضا، ایک ایسے فیضان کا پتا دیتی ہے جو فی الواقع متاع گرانمایہ ہے۔ برادر محترم

راجا رشید محمود، نے ماہنامہ نعت کا ایک مکمل شمارہ (جولائی ۱۹۸۸ء) حضرت قدسیؒ کی اس نعت پر کی گئی تضمینوں کے لیے مختص کیا ہے۔ اپنے خوبصورت اسلوب میں، حرف آغاز کے طور پر یوں لکھتے ہیں:

> "قدسیؒ نے سگ سرکار سے نسبت کی، پھر اس پر سخت ندامت محسوس کی۔ اس خیال سے کہ آقا حضور (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے تو کوچے کے کتے سے نسبت کرنا بھی بے ادبی ہے۔ ایسے مؤدب نعت گو کے حالات میرے آپ کے سامنے ہوں یا نہ ہوں۔ اس کے آقا و مولا (علیہ الصلوٰۃ والثناء) کی نظر میں تو ہیں وہاں تو اس کی اس نعت کی پذیرائی یوں ہوگئی کہ یہ نعت بچے بچے کی زبان پر جاری رہی ۔بڑے بڑوں نے اس کی تضمین کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اردو اور فارسی میں اس نعت کی اتنی تضمین ہوئی ہیں کہ اس سے پہلے یا بعد میں کسی اور نعت کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا۔ اس نعت میں الفاظ کی شوکت اور صنائع بدائع کی بھرمار نہیں ہے۔ جذبے کی کارفرمائی ہے۔ محبت کی فراوانی ہے، عقیدت کا عمل دخل ہے ۔اس نعت کا شاعر بارگاہِ رحمت ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ہاتھ باندھے کھڑا نظر آتا ہے اور، مدحت سرکار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے باب میں یہی سعادت فن کی معراج ہے۔"

ماہنامہ 'نعت' کے اس خصوصی شمارے میں ۹۲ شعراء کی تضمینیں شامل ہیں اور ۴۰ کے قریب اُن شعراء کا ذکر ہے جن کی تضمینیں بوجوہ اس میں شامل نہیں ہوسکیں۔ شیخ عبداللطیف تپش کی درج ذیل تضمین، ان میں شامل نہیں ہے، یوں یہ کمیاب ہی نہیں، نایاب بھی ہے یہ ماہنامہ "صوفی" کے جولائی اگست ۱۹۲۲ء کے شمارے سے لی گئی ہے۔

حبّذا جانِ جہاں نازشِ عالی نسبی　　شورشِ حسنِ بتاں۔ مظہرِ سِرِّ عجبی
آب و رنگِ چمنِ ہاشمی و مُطّلبی　　مرحبا سیّدِ مکی مدنی العربی
دل و جاں بادِ فدایت چہ عجب خوش لقبی

پنجۂ شیرِ نہیبِ تو بیا فشرد دلم　　خاکِ کویت ہمہ نوراست کجا آب و گِلم
میگزم دست بدنداں وز حیرت خجِلم　　نسبتِ خود بسگت کردم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی

جلوہ کرد از تہِ ہر سنگِ حرم آتشِ طور　　ساغرِ نابِ زمیں شد زمئے دیں معمور
شاہدِ کعبۂ حق یافتہ صد خلعتِ نور　　ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

روز ہا مضطربم گر ہمہ شب حیرانم　　گاہ از عجز و گہ از پاسِ ادب حیرانم

شاہدِ کعبہ حق یادتہ صد طلعتِ نور | ذاتِ پاکِ تو دریں ملکِ عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

روزہا مضطربم گر ہمہ شب حیرانم | گاہ از عجز و گہ از پاسِ ادب حیرانم
صورتِ آئینۂ صبح طلب حیرانم | منِ بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

ہرکس از قندِ عطائے تو بود شیریں کام | بارور از تو نہالِ چمنِ عیش مدام
شاہدِ دعویِ من گلشنِ خلد است تمام | نخلِ بستانِ مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی

اے کہ حق گفتہ بہ اوصافِ تو مازاغ بصر | از برائے شبِ ماہر نگہ ات مثلِ سحر
بنگر بر کرمِ خود بہ گناہم منگر | چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی

مبتلایم بصد تلخیٔ زہرِ سکرات | بدہ از لعلِ لبِ خود شکر و قند و نبات
المدد المدد اے خضرِ بیابانِ نجات | یا ہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ ز حد میگزرد تشنہ لبی

از تجلی طلبانِ رخِ پاکت موسیٰ | مدح خوانِ لبِ اعجاز بیانت عیسیٰ
نورِ روئے تو کجا یوسفِ [illegible] | نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
رر از ادم و عالم تو چہ عالی نسبی

اے خطا پوشِ ... اے گلِ باغِ ازلی | بر درت آمدہ ام از پئے فریادرسی
جز تو ام نیست کسے قاضیِ حاجاتِ دلی | سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ پیشِ تو قدسی پئے درماں طلبی

(خاص)

اختر جوناگڑھی:

نام۔قاضی احمد میاں۔والد محترم کا نام۔قاضی عبداللہ۔سال ولادت۔ ۱۸۹۰ء مقام ولادت۔جونا گڑھ صوبہ گجرات۔تاریخ وفات۔ ۱۶ اگست ۱۹۵۵ء مقام وفات۔کراچی۔

تصانیف:

اسلام کا اثر یورپ پر۔انارکلی۔اسلامی کتب خانے۔اسلامی کتب خانے اور اُن کا نظم ونسق۔اقبالیات کا تنقیدی جائزہ۔ترجمات۔حیات نظامی۔زرگل۔سیپارۂ دل۔علم اور اسلام۔علامہ شبلی بحیثیت شاعر۔لمعات اختر۔مسلمانان سلف میں کتب کا شوق۔اختر جوناگڑھی کی درج ذیل نعت "صوفی" کے شمارہ اپریل ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی۔

ہردوعالم قطرۂ ازابرِ نیسانِ شما
سبز باغ روزگار از فیضِ بارانِ شما

پرتوے از چہرۂ انور بود ماہِ تمام
عکسے آمد آفتاب ازروئے رخشانِ شما

کردہ شیریں کام عالم شکّریں لعلِ شما
ریخت آبِ لعل وگوہر آبِ دندانِ شما

کف بریدے خودزلیخا گربدیدے ایں ذقن
می شدے یوسف بحیرت از زنخدانِ شما

حضرت بوبکرصدیقؓ وعمرؓ عثمانؓ علیؓ
ہر یکے زیں چارشد شمعِ شبستانِ شما

اخترِ عاصی کہ سنجد نغمۂ مدح وثنا
کمترین کمتران است از غلامانِ شما

سحابی نجفی (حالات زندگی مل نہیں سکے) کی ایک فارسی نعت اختر جونا گڑھی نے اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ رسالہ "صوفی" کو بھیجی تھی۔ جو اگست، ستمبر ۱۹۲۸ء کے رسول ﷺ نمبر میں شائع ہوئی۔

رباعیات سحابی نجفی کا ایک قلمی نسخہ میرے کتب خانہ میں موجود ہے جس کے شروع میں دیباچہ نثر سے پہلے ذیل کی نعتیہ غزل درج ہے۔ چوں کہ سحابی کا غیر مطبوعہ کلام ہے اس لیے امید ہے کہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

السلام اے نہ فلک سرگشتۂ درکارِ شما
عقلِ کل دیباچۂ دیوانِ اسرار شما

السلام اے ہرچہ گویند وکنند اہل کمال
شرحِ گفتارِ شماو وصفِ کردار شما

السلام اے...... روح القدس یعنی مسیح
بستہ نطق ازخجالت پیش گفتار شما

السلام اے کلُّ شیئٍ ہالک الّا وجہہٗ
ہست ازروئے حقیقت مغزاشعار شما

السلام اے پادشاہانِ جہاں را سرورے
بہر فخر سر بلندی نقش دیوار شما

السلام اے رہروانِ راہ اسرار تمام
شوق دیدار شما،معراج رفتار شما

السلام اے معدن دریا شدن تحقیق را
نکتہ کافی ازاں لعلے کہ دربار شما

السلام اے بندۂ سرگشتہ را یعنی سحاب
کردہ آزاد ازدوعالم شوقِ دیدار شما

مولانا ظفرعلی خاںؒ:

مولانا ظفرعلی خاںؒ (۱۸۷۳ء۔۱۹۵۶ء) کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ ایک عہد کے شعروادب اور سیاست وخطابت پر چھائے رہے۔ اُن کا قلم ان کے لیے کبھی ڈھال کا کام دیتا رہا کبھی تلوار کا۔ قوت ایمان نے انہیں زندگیٔ مستعار کے ہر سنگین مرحلے میں سربلند رکھا، وہ فرنگی کے ظلم واستبداد سے ٹکرائے۔ انہوں نے خواب غفلت میں مدہوش ملت اسلامیہ کو جھنجھوڑا۔ غیرت وحمیت کو بیدار کیا کہ وہ تب عفت کی قبروں کا غازۂ شب تاب بن چکی تھی، انہوں نے اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکنے پر مجبور کیا اور اُس دستار فضیلت کے بل کھولے جو رہن میخانہ ہو چکی تھی، انہوں نے اپنے قلم کو سوزِ جادو دانی اور اپنی تقریروں کو

دریاؤں کی روانی دے کر حضور ﷺ کی ختم المرسلینی پر شب خون مارنے والوں کو غبارِ معصیت بنا کر اڑادیا۔ نبیٔ کریم ﷺ سے انہیں جو محبت تھی وہ ان کی شاعری کی جان ہے، جو عقیدت انہیں اس نام اور اس ذات ﷺ سے رہی، ان کی نعتیں اسی کا والہانہ اظہار ہیں۔ اُن کی نعتیں قبولِ عام کا شرف پا چکی ہیں۔ اُن کے بعض اشعار زبان زدِ عام ہو کر ضرب الامثال کی سی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جب کسی نعت یا نعت کے کسی شعر کو مقبولیت نصیب ہو جائے تو سمجھیے کہ گدازِ فکر اور رنگینیٔ ادا کے ساتھ ساتھ اُسے بارگاہِ ناز میں باریابی کی عزت حاصل ہو چکی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی اردو شاعری کے پرشکوہ انداز، خطیبانہ آہنگ اور دل آویز اسلوب سے تو سبھی آشنا ہیں مگر کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہے کہ مولانا گاہے گاہے فارسی میں بھی یکساں رعنائی اور روانی کے ساتھ شعر کہہ لیا کرتے تھے، اُن کی ارتجالی صلاحیتوں سے تو ایک دنیا واقف ہے۔ رسالہ "صوفی" میں اُن کی ایک فارسی نعت جون ۱۹۲۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی جو درج ذیل ہے:

خواجۂ ما محمدؐ عربی　　لقبش خاتم النبین است
مصطفیٰؐ ماہ دامنش پروین　　ماہ رونق فزائے پروین است
عرب آغوش عالمے باشد　　بستہ دامنش دل ودین است
مسلم از سجدہ گنجہا اندوخت　　دولت او جبین یمین است
نعمت حق بما شد ارزانی　　شرع ما را شعار و آئین است
ہست اسلام خوشترین انجام　　خنک آنکس کہ عاقبت بین است
بادہ اش تند و شکر افشاں ہم　　شور در جاں فگند و شیرین است
جوشد اندر خم حجاز ایں مے　　جام ایں مے مگر جہاں بین است
پارہ اش پرورد مراکش را　　جرعہ اش ریزش لب چین است
تو زنیساں توقعے داری　　گوہر ما ز کان یٰسین ست

علامہ نیاز فتحپوری:

ماہنامہ "صوفی" کے حلقۂ تحریر میں وہ لوگ بھی تھے جو تب اپنی علمی حیثیت سے مؤقر سمجھے جاتے تھے اور اُن لوگوں کی مبتدیانہ تحریریں بھی ہیں جو اب ہماری ادبی دنیا میں معتبر جانے جاتے ہیں۔ اقبال سے لے کر اکبر الہٰ آبادی تک۔ مولانا حسن نظامی سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد تک اور مولانا ظفر علی خاں سے لے کر احمد ندیم قاسمی تک، کتنے ہی عہد ساز اور جہت نما وجود ہیں جن کی علمی وجاہت مسلم ہے، اور جنہوں نے "صوفی" کی وساطت سے، تعارف سے تعریف تک کی منزلیں طے کیں۔ نیاز فتحپوری کی ادباء

کے اس نظام شمسی میں شامل تھے۔انہوں نے "نگار" کے اجراء سے قبل "صوفی" کے لیے مسلسل اور بے تکان لکھا۔اُن کی ان نایاب نثری اور شعری تحریروں سے اُن کے اُس اسلوب کا بھی واضح اندازہ ہوتا ہے جس نے بعد میں انہیں ایک صاحب طرز رومانی ادیب کے طور پر متعارف کرایا۔ان تحریروں میں اُن کی بہت سی نعتیں بھی ہیں، جنہیں پڑھ کر قدیم فارسی قصیدہ گو شعراء کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ان میں خیالات کا تموج، مفاہیم کی صداقتوں سے ہم آہنگ ہے اور قلم کی بے پناہ روانی فکری حسن سے بہرہ ور ہے۔دورِ حاضر کو نعت کا دور کہا جاتا ہے اور اہل دل توصیف رسالت مآب ﷺ کا لفظ لفظ محفوظ کرنے کی دھن میں ہیں اس لیے نیاز کے نعتیہ کلام کا محفوظ ہونا ضروری ہے۔اور یہ اس لیے بھی لازم ہے کہ دورِ حاضر کو علم ہوسکے کہ آج سے کم وبیش پون صدی قبل اس عظیم نثر نگار کے نعتیہ انداز کے تیور کیا تھے اور اس لیے بھی ضروری ہے کہ نیاز فتحپوری کی سوچ کے اس رخ کی طرف کسی مبصر اور ناقد نے اشارہ تک نہیں کیا اور احقر کو یقین ہے کہ اُن کی جملہ "روشن خیالیوں" سے صرف نظر کرتے ہوئے، روز حشر، میزان عمل میں یہ چند نعتیہ بول گرانمایہ سمجھے جائیں گے اور اُن کا خلوص رحمت حق کو آواز دے گا کہ اس دربار رحمت میں مغفرت بہانہ جُو رہتی ہے۔یہ ایک ادبی صداقت ہے کہ نیاز ایک ایسے عہد آفرین، تاریخ ساز، جہت نما اور صاحب طرز ادیب تھے جن کی تحریروں سے کم وبیش تین نسلوں نے شعر و ادب کی رعنائی لی اور ایک دنیا اختلاف کے باوجود اُن کے اسلوب کی شگفتگی کی معترف رہی ۔

کہاں سے لائیں گے اہل سخن، طرز سخن تیرا
کہ ہے جان ادب، روح ادب، انداز فن تیرا

نام ۔نیاز محمد خاں، تاریخی نام ۔لیاقت علی خاں بن محمد امیر خاں ۔بانی ومدیر، ماہنامہ نگار۔ ولادت ۔ ۱۸۸۴ء ۔مقام ولادت، رام سنہی گھاٹ ضلع بارہ بنکی، وفات، ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء مقام وفات ۔کراچی ۔بعارضہ سرطان ۔کم وبیش ۳۵ کتابوں کے مصنف، اور ماہنامہ نگار کے بہت سے خاص نمبروں کے مرتب ۔فی الواقع ایک دیو قامت ادبی شخصیت اور فی الحقیقت اپنی ذات میں ایک انجمن ۔حضرت قدسیؒ کی معروف نعت پر نیاز کی تضمینیں نایاب نوعیت کی ہیں ان کا طویل نعتیہ قصیدہ قابل تحسین بھی ہے اور قابل قدر بھی، یہ نظمیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ نیاز کے دل کی دھڑکنوں اور قلم کی نواؤں میں حضور ﷺ کی محبت لَو دیتی رہی ہے۔

تضمین کلام قدسیؒ

از رسولانِ اولوالعزم چہ برنا چہ صبی   افضلی، اکملی و منتجبی منتجبی
روزِ میلادِ تو در عالم روز است نبی   شب معراجِ تو پیغمبرِ اقلیم شبی

کردہ حاضر بہ جنابِ تو براقِ طلبی — گفت جبریل فدایت من و امی و ابی
زود برخیز و بمن عفو کن ایں بے ادبی — چشم بر راہِ قدومت چہ ملائک چہ نبی
مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان با فدایت چہ عجب خوش لقبی

روئے بے مثل ترا لالہ و گل چون خوانم — یک ازان داغی و مجروح، دگر نادانم
شمع گوید کہ من از غیرت او گریانم — گفت آئینہ من از چہرہ شدن حیرانم
از مثال قمر و شمس بخود لرزانم — کان بود در کلف و این ہمہ تف می دانم
ذکر داغِ مہ کنعان نہ بود ایمانم — صورتت ساختہ بر صورت خود یزدانم
من بیدل بہ جمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدین بوالعجبی

اے بہ دیوانِ قدَر صدر نشین اعلیٰ — ثبت توقیع رضایت سر فرمان قضا
نہ فقط کوثر و تسنیم ترا کرد عطا — تا فترضیٰ ست بہ تو وعدۂ اعطا ز خدا
مظہرِ شان خدائی، بخدا صل علیٰ — نورِ اول توئی اے صاحب لولاک لما
بوالبشر، نوح، براہیم و شعیب و موسیٰ — پیشبازانِ تو بودند ہمہ تا عیسیٰ
نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را
زانکہ از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

انتسابے بہ کلابت چو بود در سجلم — نیست غم گر بہ گنہ از ہمہ تن مشتغلم
بندۂ دل منم و بندۂ نفس است دلم — نفس من بندۂ شیطاں کہ براہش عجلم
نہ گہے شرم مرا بودہ نہ این دم خجلم — کذب و کید است کہ گویم زگنہ منفعلم
درچہ تیرۂ گستاخی و شوخی مہلم — کہ بہ ناگاہ فتادہ تہ آن پا بہ گلم
نسبتِ خود بہ سگت کردہ و بس منفعلم
زان کہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

نقص و تحریف چو شد داخل تورات و زبور — یافت انجیل بہ پے صحت شان عز صدور
اندر آن بود بہ سریانی و عبری مسطور — نام و اوصاف تو با چار معظم دستور
پس تصلیبِ مسیح امتش از زور و غرور — کردہ گم اصل و غلط ترجمہا را مشہور
آن زبانہا نہ پسندید دگر ربِّ غیور — بعثت ختم رسل ہم نہ ازاں قوم کفور

ذاتِ پاکِ تو کہ در ملک عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآن بہ زبان عربی

کارِ غسل تو چو از کیسۂ دلاک گذشت — صاف زالائش تن، روح وتن پاک گذشت
مرکبت از حرم و ایلیا دزاک گذشت — شد بر افلاک و ازین دائرۂ خاک گذشت
از حدِ خود چو براقِ تو عرفناک گذشت — تا سرا پردۂ جان رفرفِ چالاک گذشت
ما عرفناک کجا ہم ز عرفناک گذشت — مرکز سیر تو از حیطۂ ادراک گذشت

شب معراج ، عروجِ توز افلاک گزشت
مرکز سیر تو از حیطۂ ادراک گذشت

باغبانِ چمن دہر بہ تزئین تمام — بہ بہ گلگشتِ تو آراستہ بستانِ انام
یاسمن روئے سحر، سنبل طرۂ شام — صوتِ خندیدن گل نغمۂ بلبل گلبام
گل میزاں، گل خورشید گل ماہ تمام — چو نبودہ بہ گلے نکہت و رنگے ز دوام
گرد گل خاص پیۓ سرِ تو باغِ اسلام — در جہاں تابہ قیام و بہ جناں بعد قیام

نخل بستان مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیرین رطبی

گر نہ بودے بہ تمنا مزۂ قند و نبات — متمنی ترا تلخ شدے شہدِ حیات
شامِ زندانیٔ ما دامِ حیاتِ درکات — بضیائے مہ و مہرت سحرِ روز نجات
اے بدستت نعم و نہرِ کرم تشریفات — امت گرسنہ و تشنہ و عریاں ہیہات
الغیاث المدد اے منبع فیض و برکات — صدقۂ خون شہیدانِ لب نہرِ فرات

ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آب حیات
رحم فرما کہ ز حدمی گزرو تشنہ لبی

صورتم مظہر حال است زمن حال مپرس — بہر حسینؑ بہ رویم نگر احوال مپرس
کاہلم، جاہلم از حالتِ افعال مپرس — شغل من نفس پرستی ست ز اشغال مپرس
ترسِ عصیاں زمن عاصی و بطال مپرس — نیست ہولے ز گناہم دگر احوال مپرس
راستی، حسنِ عمل ، خوبیٔ افعال مپرس — از شرف ہیچ ازین ارذلِ ارذال مپرس

عاصیانیم ز ما نیکیٔ اعمال مپرس
سوئے ما روئے شفاعت بکن از بے سببی

تا نہادی بہ سرِ اہلِ جہاں پا افراز — سرکشاں جملہ فتادند بہ پستی زفراز
آں کہ بر پائے تو فرسود سرِ عجز و نیاز — یافت از دستِ غلامانِ تو تاجِ اعزاز
بین قطبین جن و انس چہ کوتہ چہ دراز — شرق تا غرب بہ راہِ حرمت در تگ و تاز
ایشیا، یورپ و افریقہ و چین و شیراز — بر ہمہ دستِ شرف یافت ز دستِ تو حجاز

بر درِ فیض تو استادہ بصد عجز و نیاز
رومی و طوسی و ہندی، یمنی و حلبی

اے شہِ بندہ و آزاد و جواں، شیخ و صبی — سابقی، عاقبی وز ہر دو جہاں منتخبی
ابطحی، یثربی و ہاشمی و مطلبی — ہم چو اعلیٰ بہ نسب از ہمہ والا نسبی
گیر آداب ز ما بے خرداں بے ادبی — کہ بود بہر عطائے تو سبب بے سببی
اے حکیم الحکمائے عجمی و عربی — ہم مریض تو چو قدسی اسیر[۱۱] تعبی

سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درمان طلبی

(صوفی، اپریل ۱۹۹۲ء)

چشمِ رحمت بکشا سوئے من اندازِ نظر

جائے شکرانۂ انعام خداے دادہ — بندہ دیگی گناہے کہ نہ از من زدہ سر
فرستم دادہ بے رازقی و ستاریئے — آخر افگند تو الی خطایم ز نظر
جو درت نیست کنوں ما من و ملجائے دگر — حالت ما بین ناکس و بیکس بنگر
من نخواہم ز تو گنج و گہر و نقرہ و زر — ہاں و لے قدرِ ضرورت کہ بود زادِ سفر

چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی

کارِ ناساخت بہیے غلط انداز نظر — ترکِ چشمت چہ کند باز بہ مستانہ نظر
نصرت یافتہ از خالق اعجاز نظر — بر دلِ ہم ز الطاف یکے باز نظر
چشمت امید جہاں، کار جہاں ساز نظر — دستگیری بکنے از کار کسے باز نظر
ملنے کہ دعائی ممکن خمار ز آغاز نظر — عاقبت کار بہ تحیر از نظرم باز نظر

چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی

نفس و ابلیس بہ دو تار راہزن انداز نظر — گرد شیطاں بدل من و ظن انداز نظر
ہر دو عمل شدہ بر قصہ من انداز نظر — جانبِ یزداں بہ عقوبت آبرویم انداز نظر

بدلم یار رباط کس انداز نظر / عاشق حق شدہ بیت الوسعت انداز نظر
بکشید از تن بیماں بغض انداز نظر / برمنم خانہ اصلاح بت شکن انداز نظر
چشم رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی

بر دل سرکش و بدخوئے من انداز نظر / کہ بدر رفتہ ز قابوئے من انداز نظر
برو غیر و تنہا پوئے من انداز نظر / کہ نہ تو ہمدم نہ بلاجوئے من انداز نظر
زمرا بین و نہ بر روئے من انداز نظر / بنگر درد و بدار وئے من انداز نظر
طرف عجز کے وکوئے من انداز نظر / سوئے شاں گیر نہ بر سوئے من انداز نظر
چشم رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی

اے شہِ شاہ و گدا سوئے من انداز نظر / چارہ سازِ مرضا سوئے من انداز نظر
اے خدیوِ دوسرا سوئے من انداز نظر / دستگیرِ ضعفا سوئے من انداز نظر
اے انیسِ غربا سوئے من انداز نظر / یک نظر بہرِ خدا سوئے من انداز نظر
اے جلیسِ فقرا سوئے من انداز نظر / صدقۂ آلِ عبا سوئے من انداز نظر
چشم رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی، ہاشمی و مطلبی

(صوفی، فروری ۱۹۲۲ء)

قصیدہ در نعت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

گراں ہے ست بدوشِ ضعیف انسانی / نشک زبارِ نشاطِ ددکون ابنہ انی
چہ ارض و کوہ نہ احمال بوشند ستوہ / سپہر ہم زسبک مغزی و گراں جانی
تمر بہ بچو تحمل بزورِ من سادگی / قوی زروزِ ازل بود زورِ انسانی
اگر زعرضِ امانت بکوہ وارض و سماء / غرض نہ بود ظلوم و جہول پنہانی
قوی ضعیف توانا ضعیف زار و نزار / چہ تاب داشت کہ بر دلِ شکستہ آسانی
بریں کہ از چہ شکستند کوہ بر سر کاد / بہ کوہ کوہ مرا بود کاہشِ جانی
کہ تا گماں متنبہ شدم ز عالمِ غیب / چہ چیست اشرفِ مخلوق نوعِ انسانی
خصوص افضل از اولادِ آدم و حوا / بہ فضلِ ثانیِ اول ز آدمِ ثانی
مسیح یافت زدرا شفائے اعجازش / زد نسخہ مرض الموت و دردِ ندعانی

ز جسم و روح جدا بُد بہ مارِ طین آدم   زداد بہ کشورِ جاں تختِ چار ارکانی
نقود معجزہ از کاروانِ اعجازش   مسیح یافتِ حق خدمتِ حُدی خوانی
نمک ز شورشِ شورِ ملیح گفتارش   بہ بادۂ حِکَم خم نشینِ یونانی
احد بہ صورتِ آدم ادق معما بود   شد آں ز احمدِ بے میم حل بہ آسانی

مطلع ثانی

محمد عربی رازِ امرِ ربانی   امین و محرمِ اسرارِ روحِ انسانی

مطلع ثالث

بہ مہد کرد ترا مہدِ مہد جنبانی   نسیم باد کشی مروحہ مگس رانی
کنارِ اُمّ و ثویبہ، حلیمہ سعدیہ   بہ ایں سہ پردہ بغذاے تو بود در وطنی
بہ دورِ حکمتِ تو در خمول خم زدہ است   شرابِ فلسفۂ خم نشینِ یونانی

بہ حکمِ اعتبارِ تو خبر بہ قدرِ بشر   نماندہ فرق بہ ستانی و سیانی
دو نونِ کن فیکون منقۂ نبوتِ تست   بود بدایرۂ صفاتِ سلیمانی
گرفتہ وام بہ اظہارِ حق جنسیت   اثر ز خاکِ درت سرمۂ سلیمانی
ز نغمہ ہاے بہ اخلاص تست مخلص را   اسیرِ شانی شانِ تو دید پریشانی

قطعۂ سہ بیت

چو اینکہ بر بہ بہ زیر آیہ او درست آیہ   بہ دیرِ تست دگر راز ہاے پنہانی
براے ختمِ رسالت ز انبیاء و رسل   در انتخابِ تو شد غور و خوض طولانی
بود بہ علتِ زینۂ انتخاب کامل بود   [illegible]ی نے ذوالیمینِ یزدانی
کنز آں وجودِ تو پیش از رسل نہ شد موجود   تو ثانیِ ہمہ باشی نباشدت ثانی
بہ حفظِ نورِ تو از بطنِ مادرِ طوفان   دوبارہ زاد بہ فُلک خود آدمِ ثانی
بچرخِ رشتۂ اعجاز گرد ما زدی   بہ تنگ روزنِ سوزن مسیح گنجانی
بہ پیشِ حسنِ ملیحِ تو قدرِ حسنِ جمیل   کہ بود مدتِ عمرے غلام و زندانی
ز گوہرِ تو گرفت آب جوہرِ اول   چہ تابِ جوہرِ عقل و جوہرِ ثانی
بود ز دامنِ دریاے جود و احسانت   گہ فشانیِ دستِ سحابِ نیسانی
عیاں ز صورتِ تعمیرِ حسنِ تقویم   جہانِ معنی تخصیصِ تو بہ پنہانی
جہاں مطلعِ صبح ز ترتیبِ ذاتِ تو   بیک مطالعۂ نقطے زبابِ ربانی

بہ کاوشے کہ عدو داشت از تو بعد از مرگ
ز گور رفت بہ قعرِ جحیم پنہانی
بہانہ داری شرعِ تو منطقی نہ خرد
مشرّعِ حکمتِ یونان بہ فلسفیِ یونانی
بپیشِ موئے تو بیننده بین و ہست تبسم
سوادِ موئے تو سودا سوادِ ثعبانی
سوادِ شامِ خصمت ز بیاضِ صبحِ عذار
خطِ براعتِ ایماں بہ خطِ ریحانی
ز بادِ تندِ غضب تو غرقِ کشتیِ کفر
بہ چار موجۂ طوفانِ جوشِ طغیانی
ز نعتی ست چہ گویم کہ در صفت بہ تو
گرفتہ روحِ اولی العزم قالبِ ثانی
اسیرِ زلفِ تو از بندِ دامِ غم آزاد
عقیقِ سلسلۂ موئے گشت زندانی
بہ مہربانیِ مہرِ تو سہل بر دشوار
بہ قہرمانیِ قہرِ تو مشکل آسانی

قطعہ ۳ بیت

توئی کہ کاملی در ہر کمال بے نقصاں
منم کہ کاملم اندر کمال نقصانی
شنیده ام کہ کند قدر کاملے کامل
چہ یا کمال دگر بشکند بہ آسانی
نگویمت کہ بکن از پئ دو کار بہ من
تو بر دو کن کہ کمالِ تو ہست لاثانی

قطعہ ۱۱ بیت

برائے آلِ گرامی صحابِ عظمانی
کہ بوده اند ہمہ بر تو عاشقِ جانی
بجملہ اجزوِ انصار و اہلِ بدر و احد
بہ اہلِ بیعتِ رضوان بحقِ رضوانی
بخاص عظمتِ شیخین و قربتِ ختنین
طفیلِ شبّر و شبیّر و بہر دو ثانی
بدردِ عشقِ بلال و بہ سوزِ سازِ اویس
بہ خدمتِ انس و قربِ زید و سلمانی
بشیخِ بصره و معروف و بایزید و جنید
بہ نقشبندِ بخاری و قطبِ جیلانی
ابنِ ادہم و سرّی و نوری و شبلی
بہ ہر دو بوالحسن شاذلی و خرقانی
بشیخ احمد فاروق و جانشینانش
بہ شمسِ دین حبیب اللہ جانانی
پئے ائمہ و ہم جملہ اولیائے کبار
بریں گدا ز کرم یک نگاہِ سلطانی
ز محنت طلب یا خاتم رسل داور
چہ غم گذاشتہ در گرفتہ رشانی
بود عدوئے تو در غم دو دست بہ پیار

میر عثمان علی خاں، تاجدار دولت آصفیہ دکن:

نواب میر عثمان علی خاں حیدر آباد دکن کے آصفیہ خاندان کے آخری حکمران تھے۔ آپ کا سن ولادت ۱۸۸۴ء اور سن وفات ۱۹۶۷ء ہے۔ والد کا نام نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ تھا۔ آپ ۲۷ برس کی عمر میں ۲۸ اگست ۱۹۱۱ء کو تخت نشین ہوئے۔ آپ کے عہد میں حیدر آباد دکن نے ہر شعبے میں قابل قدر ترقی کی۔ پاکستان میں شمولیت کے خواہاں تھے۔ قیام پاکستان پر آپ ہی کی امداد نے پاکستان کو مالی بحران سے بچایا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو بھارت نے حملہ کر کے حیدر آباد پر قبضہ کر لیا۔ آپ نے آخری ایام انتہائی کس مپرسی میں بسر کیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علمی، ادبی اور شعری ذوق سے نوازا تھا۔ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ آپ کی نعتیں ماہنامہ "صوفی" میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ آپ کی پانچ فارسی نعتیں درج ذیل ہیں:

پیش تو من داستان خونچکاں آوردہ ام — شکوہا از انقلاب آسماں آوردہ ام
آسماں می گویدم کاں موسم گل درگزشت — من بہارت را پئے صرف خزاں آوردہ ام
طالعم گوید کہ من بہر تو از شاہ رسل — سرفراز یہائے لطف بیکراں آوردہ ام
چیست دردستم کہ آرم از برائے نذر تو — یک دل پُر درد با آہ و فغاں آوردہ ام
رنج ناکامی و محرومی بہ بزم شاہؐ نیست — شاد مانم گر دل ناشادماں آوردہ ام
زندہ گردم او چو آہنگ مسیحائی کند — در حضورش شکوہ از درد نہاں آوردہ ام
اے زہے قسمت کہ من عثمان پئے عفو گناہ — رو بسوئے درگہہ شاہ شہاں آوردہ ام

(اکتوبر ۱۹۱۸ء)

ہوائے یثرب ایں گوید گل تازہ دمید ایں جا — بپائے سربیا عثماں! محمدؐ آرمید ایں جا
توطن کن تو در بطحا کہ ہرکس جاہمی خواہد — رسول ایں جا، نبی ایں جا، ولی ایں جا، شہید ایں جا
شبے چوں باریاب روضہ اش گشتم ادب گفتا — نہ ایں دربار آں باشد، کنی گفت و شنید ایں جا
الا اے عازمان خلد، فتح باب آساں شد — ریاض طیبہ می گوید، کہ می باشد کلید ایں جا
در تو سجدہ گاہِ جن و انس و حور و غلمان است — امیدم ہر زماں گوید، نباشی ناامید ایں جا
زہے اے جنس عصیانم شفاعت شد خریدارت — طفیل احمد مرسل ببیں کارم رسید ایں جا
نہ من تنہا شدم محو جمالش، بلکہ اے عثماں — زخود وارفتہ منصورؒ و جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

(جولائی ۱۹۲۴ء)

درد دل راچوں دوائی یاحبیب — چوں درون دل نیائی یاحبیب
از ہزاراں سجدہ برتر دیدہ ام — بردرِتوجبہ سائی یاحبیب
وقت مردن جاں باآسانی دہم — روئے خود راگرنمائی یاحبیب
باعث آہ وفغان من شدہ — بے کسی ونارسائی یاحبیب
چوں توشافع دادعثمان راحشر — ہست ایں شان خدائی یاحبیب

(ستمبر ۱۹۲۶ء)

شہ ملک ورسالت، صاحب تاج وسریرآمد — ضیابارو جہاں افروز، چوں مہر منیر آمد
امین وخازن رحمت، معین وشافع امت — وزیر راز دارونائب ربِّ قدیر آمد
رسول ہاشمی، خیرالوریٰ صلی علیٰ احمد — کریمؐ، صادقؐ، نورؐ، نذیرؐ والبشیر آمد
چوخوش چشمے کہ مازاغ البصر نازل بشان او — زقلب پُر صفا، وزدیدۂ حق بیں نصیر آمد
خوشا پیغمبر برحق کہ بہر ماگنہگاراں — رؤفؐ والرحیم آمد، کفیلؐ والنصیر آمد
نہ ماند تاحجا بے، جلوۂ روئے حقیقت را — پئے کشف رموز غیب، علام وخبیر آمد
بنام آں شہ لولاک صدجان ودلم قرباں — کہ عثمان از طفیلش برمسلماناں امیر آمد

(دسمبر ۱۹۲۸ء)

جان ودلم ندائے جمال محمد است — خاکم نثار کوچۂ آل محمد است
دیدم بعین قلب وشنیدم زگوش ہوش — درہرمکاں ندائے جلالِ محمداست
دریائے معرفت کہ کنارش پدید نیست — یک قطرۂ ز بحر کمال محمد است
دارم چودر گرہ گہر آبدار دیں — ایں آب من زآب زلال محمد است
پرنور کرد آنکہ حریم دل مرا — عثمان ضیائے شمع خیال محمداست

(مارچ ۱۹۳۰ء)

ماہرالقادری:

نام۔منظورحسین، والدگرامی قدرکانام محمدمعشوق علی ظریف، جواپنے وقت کے معروف شاعر بھی تھے، ادیب بھی اورصحافی بھی۔تاریخ ولادت ۔ ۳۰ جولائی ۱۹۰۷ء، مقام ولادت۔کیسر کلاں ضلع بلندشہر ۔وفات ۔ ۱۲فروری ۱۹۷۸ء، مقام وفات ۔جدہ، سعودی عرب، ایک مشاعرہ کے دوران میں دل کادورہ پڑا۔ماہنامہ'فاران' کراچی کے مدیراورکم وبیش ۱۷ کتابوں کے مصنف ۔اللہ تعالیٰ نے ماہرالقادری کوفکر ونظر کی صالحیت، شعروادب کی نزہت اورتحقیق وتدقیق کی عظمت سے نوازاتھا۔گھرانادینی بھی تھااورادبی

بھی۔ ان کی بیشتر نثری اور شعری تحریریں الوہی فرمودات اور حبِ رسول ﷺ سے رعنائی، سچائی اور زیبائی لیتی رہیں۔ اردو میں ان کی بہت نعتیں معروف و مشہور ہیں اور ان کی نعتوں کے بہت سے اشعار ،زبان زد عام ہیں، ان کے نعتیہ دیوان ''ذکر جمیل'' میں دو نعتیں فارسی میں بھی ہیں، ماہنامہ ''صوفی'' میں ان کی نثری تحریریں بھی شائع ہوتی رہیں اور شعری تخلیقات بھی۔ ان کی درج ذیل نعت نہ ان کے نعتیہ دیوان میں ہے اور نہ ان کی کلیات میں، اس نعت سے ماہر القادری کے اس ادیبانہ وزن و وقار، اس شاعرانہ لطف و لطافت اور اس ناقدانہ ظرف و ذوق کے ابتدائی رنگ و آہنگ کا پتا چلتا ہے جو بعد میں ان کا اعتبار اور افتخار بنا، وہ بعد میں غالباً اپنی اس ابتدائی نعت کو خود بھی بھول چکے تھے۔ اس نعت کے آخری تین بند فارسی میں ہیں:

خورشید رسالت ﷺ

سطحِ دنیا پر اندھیرا چھا رہا تھا کفر کا — آدمی پتھر کے ٹکڑوں کو سمجھتا تھا خدا
خون کے چھینٹوں سے تھا رنگین دامانِ فنا — اس طرح کچھ بزمِ ہستی کی مکدر تھی فضا
انتہائے ظلم تھی عنوانِ بابِ زندگی
زخمۂ عشرت سے بجتا تھا ربابِ زندگی

دامنِ شرم و ادب کی اُڑ رہی تھیں دھجیاں — بادۂ نخوت سے تھا مخمور ہر پیر و جواں
تھیں شبابِ حسن پر بدعات کی رنگینیاں — کفر کے کانٹوں سے تھا لبریز صحنِ گلستاں
مبتلا ہر آدمی امراضِ روحانی میں تھا
زندگانی کا مزا ذوقِ تن آسانی میں تھا

بڑھ رہی تھیں روز و شب آتشکدوں کی گرمیاں — پتھروں سے ہو رہے تھے کفر کے چشمے رواں
ریگِ ظلمت میں پہنچے تھے حق پرستی کے نشاں — منجذب تھیں فطرتِ انساں میں خوں آشامیاں
رحم کا جلوہ نمایاں ناخدا ترسی میں تھا
افتخارِ جذبۂ انساں تنگ ظرفی میں تھا

مٹ گیا تھا اس طرح کچھ امتیازِ خیر و شر — یعنی کعبہ میں بتوں کے سامنے جھکتے تھے سر
تھا خمارِ زعم سے مخمور ہر فرد بشر — اہلِ دنیا کا تھا نعرہ الامان والحذر
بدلیاں چھائی ہوئی تھیں ہر طرف بدعات کی
ایسی حالت میں ضرورت تھی تجلیات کی

بے نیازِ جلوۂ توحید تھے شاہ و گدا — ایسی حالت دیکھ کر محسوس قدرت نے کیا
رہبری کے واسطے بھیجے محمد مصطفےٰ — مطلعِ نورِ قدم، شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ
جگمگا اٹھیں یکایک چوٹیاں فاران کی
اُس کے ہر ذرہ سے چمکیں بجلیاں ایمان کی

مہرِ وحدت کی چمک سے کفر کی ظلمت مٹی — بارک اللہ ایک ہی مرکز پہ دنیا آ گئی
خاورِ توحید کی اللہ رے جلوہ گری — ظلمتیں ثابت ہوئیں آخر کو سحرِ سامری

جلوۂ توحید بے پردہ نمایاں ہوگیا
ذرہ ذرہ خاک کا ظلمت بداماں ہوگیا

مرنقش و بت ہوگئے ایوانِ کسریٰ ہل گیا
کس قدر نخوت شکن تھا غلغلہ توحید کا
بتکدوں میں دہر کے طوفان برپا ہوگیا
جُھک گئے سجدے خدا کے سامنے باطل خدا

پھر فضا میں پرچم اسلام لہرانے لگا
رفعتِ قسمت پہ اب کعبہ بھی اترانے لگا

اے جہاں۔ مژدہ! کہ انسانِ مکمل آگیا
مشعلِ نور ہدایت پیکرِ حلم وحیا
وہ کہ جس کی بارگہ میں ایک ہی شاہ وگدا
وہ کہ جس کی بات کیا ہے؟ مستقل درسِ وفا

ذرہ ذرہ نور شد از تابشِ انوارِ او
بالیقیں لاریب دیدارِ خدا دیدارِ او

آمد آں ہستی از و وابستہ نظمِ کائنات
آمد آں کز دولتش ساجد شدہ لات و منات
آمد آں شیریں زباں بر لفظِ او رشکِ نبات
آمد آں عیسیٰ نفس شد زندہ مُردہ حسیات

نازِ یوسف آمدہ فخرِ سلیماں آمدہ
در حقیقت وجہ ناز و عزِ انساں آمدہ

شاد اے دُنیا کہ آمد غمگسارِ دو جہاں
مرجع شاہ وگدا پُشت پناہِ بیکساں
ناصرِ اہلِ صفا و قوتِ اسلامیاں
رحمۃ اللعالمیں یعنی امامِ مُرسلاں

مژدہ اے دل باعثِ تکوینِ عالم آمدہ
مہر وحدت آمدہ نورِ مجسم آمدہ

فرقِ مُسلم حیف خالی شد ز تاجِ عزّ و ناز
المدد اے شافعِ اُمت شہِ ذرہ نواز
آمادہ بر در گہت بیچارگاں را سرفراز
بہرِ اہلبیتِ اقدس یک نگاہِ دلنواز

چشمۂ جود و سخا از لطفِ خود دلشاد کن
اے شفیع المذنبیں! امداد کن امداد کن

قصیدہ نعتیہ

ترا رسد ز رسل اعتلا بسرداری
کہ تاجِ ختم وصلے از ازل بسرداری
تراست رتبہ محبوبئ خداوند پاک
کہ عرش پاک بنازد بکفش برداری
اگر بکوچہ زلفت گذر کند یوسف
فتد بہ چاہ بلا از سر گرفتاری
بطینت از سگِ اصحاب کہف پاک ترا ند
بہ کوچہ ہائے مدینہ سگانِ بازاری
دہد جراحت آزارِ عشق تو راحت
چہ راحتے کہ میسر شود بخونباری
شہید ناز تو گردد آنو خہ بجو غسیل
اگر بمعرکہ از تیغ تیز خونباری
محبت تو اگر حالِ دل بگرداند
جلاد تش دہد نزد دشمناں دل آزاری

کنی نگہ تو بے زاری و تو در غم او | اگرچہ ہر نفس از ہمہ گناہ بے زاری
اگر تو ناز فروشی کنی ز محبوبی | بکثرت آمدہ وحدت کنہ خریداری
بہ پیش نازئی ارواح امتت ہر دم | ملائکہ ز فلک ہا کنند تیاری
سواد دیدۂ آدم بیاض عارض تست | ظہور اول و نور قدم بدیداری
توئی کہ تخلیہ آرائے لی مع اللہی | صفای وقت چو زر آمد و ز معیاری
الم نجعلک تیا چو آیتے زید لاست | ولے بہ نص فادنی ولایت باری
نوید تہ غفرت دادۂ شہیداں را | کہ مرہمیت مفید از پئے دلافگاری
فدائے پاک بتو عہد بستہ از دلسوف | کہ پاسداری امت کنند بسیاری
ندائے نصرت غیب از نصرت بالرعب است | بہ ہر طرف کہ تو با احتشام رو آری
رسیدۂ بمقامے ز سیر لاہوتی | کہ جبرئیل بجاں آمد از پرستاری
ز نور روئے تو ہست آیتے کہ شکوا تو | ز آفتاب فروزندہ تر با تاری
بروز حشر کہ ہنگامہ برانگیزند | کنی حفاظت یک یک نشان قہاری
فراغ بال یدانند معجزت بنمود | کہ حق بداد بہ جعفر دو بال طیاری
عزیز بر درت آمد بروسیاہی ہا | بچشم آنکہ نظر سوئے عاصیاں داری

مطلع

ایکہ وارث جنت بآل اطہاری | قضا رضای تو جوید بخواب بیداری

ولا لسوئے کہ روز ازل مقدر کرد | قضا رضای تو جوید بخواب بیداری
بجنبش لب لعلت خبر نگہ ز رحیم | کہ رو سپید کنی عاصی از سیہ کاری
ناعتدال نبی یافت ہیچ یک بہرہ | فیوضت ار بعناصر نبیشیدی ساری
پہ شہیدی کہ تو ہاشی بدلبری شاہد | ز ہر ثواب سبق می برد گنہگاری
ولایت ار ہل مذہبے بود راسخ | بہ عفو اجر مبدل شود بد اطواری
چو تخم ز خاک بسائی بجوش دل فردا | گر از تجنبش ایں جا چو جام سرشاری
ستائیش ز حجاب و ندیدہ جنبش | ز نکہت تو چہ خیزد کہ رو بہ ہمواری
بمسلک تو شتا بند بیشتر منعفا | کہ تر کتاز نیاید ز کار پرداری
اگر تو جلوہ کنی بے نقاب یا احمد | آب دیدہ ہمہ خون دل شود جاری

بلاکشان تو آہستگی گزیننده — عند کنند ز ہر جا بجی و طراری
نہ بے نصیب کسے کز وفور رحمتش — محبت تو بخشد مشیت باری
سرور ہر دو جہان انگشت می فگند — زمانے کہ شود از لمعت بدل طاری
بجز تو کیست کہ لولاک شان او باشد — تو آں کہ شاہد و مشہود حق باظہاری
ہر آنچہ در خبر است از تو اصل ایمان است — تو آں کہ مخبر صادق بحکم اخباری
تو سیدی و سیادت فروغ می خواہد — بجلوہ ہائے درخشندہ تر درابراری
ز نیش ہیش بہ تنبیہ ہست بے شبہ — ثنایت انچہ نے خصمان تو بہشاری
نمی کنند ز نام تو جنبشے قطبین — کہ ہمچگانہ بتاسیس ہر دو مساری
مودة تو بجائے رساند انسان را — کہ یکطرف ز غم آزادی و گرفتاری
ز نور پیکر پاک تو پرتو لیست زمیں — ز رنگ سبز تو عکسے سپہر زنگاری
نمایہ ایست ز اعجاز مقدم پاکت — کہ یافت جامگہ بشری ز خواب بیداری
ز ار تفلاح دید باب جبرئیل نشاں — کہ خاص تر شدہ از خاصگان سرکاری
ہیچ دورے نیست جز تو ختم رسل — بفخر گشت نبیا محیط او داری
سپردہ اند مفاتیح ہر دو کون ترا — تو بے نیاز ز درہم غنی ز دیناری
ز رنگ و بوئے تو سر سبز کائنات ہمہ — شگفتہ ساز بہاراں بجوش ازہاری
مدار کار دو عالم بدست آمنا — وسیلہ ہمہ کس ہر زماں بہر داری
کسے کہ خرقہ فقرش دہی بہ تمکینت — ز جائے خود نکند جنبش از گرانباری
براق تو شب معراج با تمالش کرد — بساط چرخ کہ گستردہ شد بہ پرکاری
بجز تو کیست حمایت گر گنہگاراں — کہ ہر نفس بہ شفاعت نسق دل اصراری
بچشم آنکہ بہ بینی و آبرو بخشی — سحاب بر در رت استادہ میکند زاری

مطلع

کلیمی و متکلم ز حق بگفتاری — بدور تو ارنی شد فسانہ پاری
ثنائے تو کہ تواند کہ از علو ہستی — بے بعید ز نظامی وز نثاری
ملاقاتے بعبادات نیست بے نامت — بذوق و شوق و محبت معین و رازگاہی

اگرچہ پر عجزم در امید یک نظرم
زشیوۂ تو کہ ہست آشتی و دلداری

بہمہ نہ بہا نگرد مصحف رخت گوید
چہ غم ز کفر کہ عقدہ کشائے زناری

تو آفتابی و از نور تو ہمی آید
حکایتے بہمہ از کمی و بسیاری

ز اشتیاق تو بیتاب میکند دلہا
قرار کے کہ بہ نعت تو میکند قاری

توئی کہ با ہمہ زشتی و زشتکاری ہا
گناہگاری مارا بہ ہیچ نشماری

چہ انبیاء کرام و چہ اولیائے عظام
دو کار ۔۔ بہر کاروان تو سالاری

تو دیمۂ کرمی و منزہ از تشبیہ
کہ خود ۔۔ نبرد در عطا د اشاری

حدیث ہائے تو شیریں کند مذاق ہمہ
بتو شمائے حلاوت علم در امصاری

فراہمی جنود است حیلۂ ظاہر
بہاریست تنزل نگین بجفاری

ز ہر طرف کہ گذشتے شد از سیہ مستی
نسیم صبح خراماں بکبک رفتاری

بہ نصرت تو فرستادہ شد صبا ز سما
نمود پشت گروہ عدا بفراری

ببام سدرہ فرماندہ جبرئیل زبیم
تو با عروج ہمہ برترک ز انکاری

بہ جنگ بدر حنین و بہ خیبر و باحد
قوی بقوت تو مرتضے بکراری

نبود ہیچ و نمی بود ہیچ از عالم
نمود یافتہ از ہستیت نموداری

بلحن دلکش مزمار آل داود ی
نوائے زیر و بم عاشقاں بہ تاری

الست میکدہ تو سقاہمش جام است
حواس ہست ہمہ ۔۔ باکمال ہشیاری

چہ گوسفند چہ آہو چہ سوسمار چہ گرگ
ملاذ و ملجا ہر یک ز مور تا ماری

بہر لباس کہ پوشی فزوں کنی جنبش
تو ماہ پیرہنی آفتاب دستاری

وجود تست کہ نیرنگہا پدید آورد
بنور ظاہر و باطن شہود داداری

فزونتر است کرامات از شمار ہمہ
اگر حساب کنندش ہزار آباری

توئی بشارت عیسیٰ دعائے ابراہیم
ستودہ ہمہ پیشینیاں بہ اشعاری

تو قاطع زمن الکافرون دیارا
کہ دار دار بقا آمد و تو دیاری

ز استماع کلام آمیہ دلشادم
کہ منبسط بمذاق از سماع اشعاری

امید ہست کہ چوں ایں قصیدہ گوش کنی
عزیز راز محبان مذہب انکاری

بحال عزعزہ رحم آوری بر جانش
بنام پاک تو آساں کنند دشواری

زباں بہ نعت تو میگردد از قصور الکن
کریمی و بکرم میکنی کفالت ما
بصر بنور بصیرة چو بنگرد بیند
تو باطنی بہ بطون و تو ظاہری بظہور
بیا کہ وقت خرابست و عافیت گم شد

بیا کہ وقت برآید ہست فتنہ بپاست
طفیل تست کہ داور برستخیز عظیم
ز رنگ و بوئے تو شاداب کائنات ہمہ
فروغ مہر و مہ و ہر ستارہ پرتو تست
اگرچہ کوثر و پیمانہ ہاش خاص بہ تست
خطاب تست بہر یک کہ باشفیع توئیم
در اختیار تو ہست آنچہ از رضا خواہی
رخ تو کرد سپید و سیاہ را روشن
رواں بیا چو روالم ز تن برون آید
بشاہتے بود از ہیچ اکبر و اجرش
ترا بہ چشم تو دید و بنور دل بشناخت
توئی کہ نامن آفاق از بلیاتی
حق است معطی و تو قاسمی تعالی اللہ
اگر خیال تو در دل گذشت با اخلاص

بجا نمردی و یاری دہی سرافرازی
ز رعب تو دو زباں منہمک بیکروئی
ہزار دانہ ز اعجاز تو بدل شود
نظر کنند بہ نظارہ تو نور جمال
ز عشق تو نکشد رنج از خمار عذاب
جہان و ہرچہ درو ہست جملہ از پئے تست

چنانکہ ناطقہ از نطق می‌شود عاری
زبستہ عہد و بہ بے ذمتے در اقراری
پیمبراں ہمہ نور و تو نور انواری
بجمع جمع ز اول تو گنج اسراری
ببار نامہ اقبال بار ادباری

تواں کسے کہ بسکدوش کن فی اوزاری
کند درست شکست ہمہ بجباری
بسبز رنگی جنت بہار انظاری
تو ثابتی بہ ثبات و بسیر سیاری
بہر بہشت فرط برلب گل انہاری
اگر بمرکز اخلاص پا بیفشاری
کہ برگزید خدایت بعز مختاری
بیاض عین بصیرت سواد ابصاری
کہ تو آب خباثت بخاک بسپاری
گر از کرم متوجہ بسوئی زواری
تو روشنائی چشمان کعب احباری
بجز در تو نیاید پناہ زنہاری
علی الدوام ز رحمت بجوش ادراری
فروگذاشت مزوّر بہ بدزداری
تو حرز اقیاں مندرج در اسفاری
بذوالفقار سر انداز خیل اشراری
بدانہ متصرف اگر زانباری
اگر بدیدۂ عشاق پائے بگذاری
محب تو کہ شود مشتغل بہ میخواری
توئی کہ خاتمہ دور چرخ دواری

شہید لعل لبت را بسر خرد ئی ہا
عطا کنند بہ محشر لباس گلناری

تسلی ہمہ عالم بنام نامی تست
انیس و مونس ہر تندرست و بیماری

خدائے پاک خداوند غالب و قہار
مخالفان ترا کرد از ازل ناری

براق تو بہوا رفت و در جلو جبریل
کنارہ کش تو ز پست و بلند و ہمواری

ز کنت کنزاً نت اندر دلست گوہر ہا
سرایر تو کہ داند کہ گنج اسراری

برون ازاں کہ خبر دادہ اند جمع رسل
تو مشتہر با ساطیر و باسماری

تو صبح صادقی و صادق است آنچہ بہ تست
نوید بخش ازیں رو بخواب اسحاری

بہر زمین کہ بود خاتم النبیین
باستدارۂ ہر دور نوک پرگاری

حلاوتے کہ بباغ بہشت ہست از تست
بآفتاب سخت پختہ ساز اثماری

در انتہائے ظہورات مظہر اکمل
و ز ابتدائے جہاں سر گروہ اخیاری

بحرمت تو در افراد منفرد باشم
بفرد اتیانم اگر تو بنگاری

چہ شاہدے کہ آراستہ حسن مست کنی
نشاط بخش بجوش خمار خماری

چو آفتاب درخشے بروشنائی روز
چو ماہ روشنی دیدہ در شب تاری

نہ جنبشے بہ تن آمد نہ بیش و بیش بدل
چہ استوار بہ پشت براق رہواری

بلیغ رتبہ برائج نہ فلک ز عروج
بلند نام بروئے زمین و اقطاری

ز پیکر تو بہر سمت نوری جوشد
کم است سایہ کہ از چار سو در انواری

سحاب مغفرتے بے کران و بے پایاں
بہ چکہ کہ بریزی بروں ز مقداری

سرے کہ بر سر نقش رسی بہ لطف کنی
بر آمدش بہ کلہداری از نگونساری

کسیکہ خاک شود از گناہ پاک شود
سبق ربود بکویت ز آبرو خواری

بہر زمیں کہ تو باشی کنی گلستانش
تو آں گلی کہ بہار آفرین گلزاری

غلو نماند و غلو شد بہ نعت چوں بر لیست
کہ ماہ چاردہم با فروغ رخساری

ز پا در آمدی از دست او ہمی بستی
چہ زہرہ از تو عزازیل را بمکاری

نہ ز آبیاری تو گل برنگ و بو تنہا است
کہ قطرہ بار ز شبنم بنوک ہر خاری

چہ مستی است کہ از حق نمیکند غافل
بوجد آمدہ از مستی تو ہشیاری

چو جاں براد باخلاص بو خدائے قدیر — چہ رتبہ داد بہ سعد معاذ انصاری
چہ زر چہ سیم بخود ار انجم فلکی — کہ بس فنی ز چنیں صد ہزار غرواری
فراہمش بکنی گرچہ ریزہ ریزہ بود — شکستہ کہ کنی ہادر ستیش یاری
زگیسواں دلاویز تست ہر لمحہ — تو عطر پاش درا کناف چین تا تاری
کریم تر ز کریماں بزرگتر بجرم — کہ جرم بخش پس از صد نزاع و انکاری
کمینہ حلقہ بگوشیم زخیل امتیاں — گرم ز حلقۂ اہل خلوص پنداری
سیاہ رو ہزاراں گناہ آمدہ ام — کہ چشم پوش ز آنام زشت کرداری
عزیز کے بتوانے ستود نش حاشا — اگرچہ ہر نفس از فکر تازہ سرخاری
نوائے نعت چہ سنجی بہ لحن موسیقار — کجا لے نوائی اگر باہزار منقاری
چو نیست چارہ بکارت جز اعتراف قصور — بر آستانہ او سر بنہ بنا چاری
شوی بوقت دردسر بختا زیں فریح — اگر تو تخم غمش در زمین دل کاری
بکن ز مہر دورنگی بدل بیکرنگی — کہ یاریش نتواں یافتن بعیاری
درود پاک مرفوع بر احمد و آلش — ہمیشہ باد منزل ز حضرت باری

(صوفی، نومبر ۱۹۲۵ء)

اشک نیاز بحریم حجاز

از جناب محمد سلیم صاحب (منشی فاضل) مقیم امراوتی

نظرے ز لطفِ تو بر دلم ای نگاہِ آئینہ سازِ من! — کہ ز سنگِ فتنہ ہر نفس جہد جہد شرارۂ راز من
صبا! اگر گذرت شود بحریم قبلہ منزشیاں — بفشاں ز لطف بخاکِ او دو سہ اشک ہائے نیاز من
بہ سیرایں دو سہ تبِ گلِ مرا کردہ عشقِ تو خون دل — چہ ز خونِ دل گنہی کنم بہ رسم بگو ہر راز من
بہ پہلوئیم بتِ آذری بنگاہ جادوئی سامری — تو کیے بکعبہ من در آ، ای خلیل مونی نواز من
بجو نور والدی ایمنی تا رسی بسر دیا نیش — کہ سیل اشک چنیں شود نرسد بہ بادہ حجاز من

جہاں پُر ز فتنۂ کافری تو بخواب گنبد لخضری
زجانب لغزمیں بر آی صباح ماہ حجاز من

(صوفی، نومبر ۱۹۲۵ء)

قلندر علی خاں ولی، ایڈیٹر ضمیمۂ حق جھنگ

اے ضیائے چرخ ملت، قبلۂ ایمان ما — از ہلال واخترِ تو شد منور شان ما
کرد انوار تجلی نام تو نور الہدیٰ — شعلۂ صد طور گشت آں جلوۂ فرقان ما
اے عروج پایۂ تو رفعت عرش بریں — وے خطاب تو حبیب ایزد سبحان ما
خاک ہائے تو اگر در دیدۂ ما جا کنند — طاقت اکسیر یابد سرمۂ چشمان ما
بسکہ یک ناز نگاہِ فیض تو شد جانفزا — جاں بلب آمد بیا، اے داروئے درمان ما
تشنۂ آب حیات ہستیم در ظلمات دہر — از کرم برما نگر، اے چشمۂ فیضان ما
خاطر خو کردۂ حب علیؓ کردم ولی — بہر شان او نوازی شاہ عالی شان ما

(جون ۱۹۱۹ء)

محمد عبداللہ، لاہور

جلوہ گر شد نور حق در طلعت شمس الضحیٰ — آشکارا شد جمالش بر رخ بدر الدجیٰ
شمس عرفاں شد طلوع و ظلمت کفر و ضلال — سوختہ شد ہمچو برق از تابش نور الہدیٰ
شاہد نصر من اللہ دوستدارِ دل شدہ — شد انیس جاں، نسیم روضۂ صدق و صفا
راز دار عرش گشتہ صاحب خلق عظیم — منزل عرفاں شدہ نزہت گہِ کہف الوریٰ
یافتہ در بارگاہش شرف معراج کمال — شمع بزم قدسیاں شد نور چشم مصطفیٰ
آتش دوزخ شدہ برعشقبازانش حرام — جنت رضواں بگشتہ بہر شاں دار البقا
پس طفیل آں کریم ایں بندۂ مسکین را — عاقبت محمود گرداں محسن خیر الوریٰ

(ستمبر ۱۹۲۳ء)

محمد عبدالمالک

قصیدۂ سلامیہ

السلام اے نیّر تابندۂ بُرج وجود — السلام اے گوہر رخشندۂ انعام وجود
السلام اے نخل بند گلستان شرع و دیں — از نسیمت باغ ابراہیم را رونق فزود
السلام اے مرسل جن و بشر روحی فداک — بے عدد ہر لحظہ بادا از خدا بر تو درود
السلام اے آنکہ از انگشت تو شق القمر — السلام اے آنکہ پیش تو شجر اندر سجود
السلام اے در ازل چوں خلعت تو بافتند — رنگ او بر صبغۃ اللہ نور حق بر تار و پود

السلام اے در شب معراج از تشریف تو — آسماں از ہرطرف باب سعادت درکشود
السلام اے آنکہ بہرخدمتت حق آفرید — آفتاب وماہتاب وانجم وچرخ کبود
نیم جاں بہر نثار مرقدت آوردہ ام — نادم بامن بجزایں چیز کہ چیزے نبود
السلام اے آنکہ ازبوسیدن خاک درت — طرۂ دستارمن برکنگرافلاک سود
السلام ازمالک بیچارہ ومسکین غریب — بردرت آمد کہ یابد بہرہ از فیض وجود
از ادب ترساں ولرزاں گوئمت صدہا سلام — برامید یک جواب اے سید عالی مقام

(اپریل ۱۹۱۵ء)

راضی مارہروی

مدینہ روضۂ محبوب رب العالمین دارد — چہ چرخ ہفتمیں آں پایہ برعرش بریں در
شوم قربان آں جائے کہ مسجود ملائک شد — سراز عجز ادب برآستاں روح الامیں دارد
نہ باشد غم زمحشر ہیچ عصیاں کارامت را — کہ از بہر شفاعت آں شفیع المذنبیں دارد
جہاں ازہربلائے آسماں مصون و ایمن شد — کہ آں حصن حصین از رحمۃ للعالمیں دارد
بہ بحر وبرہمہ لعل وگہر بے آبرو گشتند — مدینہ آں چناں برخاتم ایماں نگیں دارد
زفرزندان آدم ہرکہ محبوب خداباشد — بجز خواجہ کجاایں مادرِ گیتی حسیں دارد
الٰہی، درحضور سرور عالم رسدراضی — زچشم خوں چکاں آں بے نوا ترآتیں دارد

(اگست، ستمبر ۱۹۲۸ء)

ممتاز رفیع بیگم مارہروی

بیرون ہست حسنِ تواز وسعت خیال — حقاکہ نیست مثل تو درخوبی وجمال
یا مصطفیٰؐ! جمال وکمال وخصال تو — واللہ کس نیافت بہ مخلوق حق تعال
یوسف نمودہ بودکہ بازارحسن گرم — آں یک کرشمہ بود زنورِ تودر مثال
صورت ، نہ بست حسن چوحسن تویارسولؐ — ختم است برتو صنعت صنائع لایزال
محبوب کردگارتوئی باکمال حسن — آں خود جمیل بود بہ بخشیدت ایں جمال
نورتو یانبیؐ چوبہ عالم ظہور کرد — ظلمت شدہ زروئے زمیں جملہ پائمال
امّی لقب بہ نطق چہ اعجاز داشتی — شرمندہ ہر فصیح عرب بود ازمقال
فاخلع کلیم رابہ سرطور شدندا — بودی بہ عرش درشب اسریٰ تو بانعال

بعداز خدابزرگ توئی قصہ مختصر — بسیار خوب گفت کسے بازبان حال
نعت شریف راچہ مجال بشر بود — وقت رقم ازدجہ برآید جزانفعال
پرتوفگن زمہر بہ ممتازِ مضطرب — اے آنکہ ردنہ می شود ازآستاں سوال

(جولائی ۱۹۲۹ء)

ہدایت بہ دنیا شعار محمد — شفاعت بہ عقبیٰ ست کار محمد
تمنائے دل ہست ہر لحظہ گردو — سر ماوسنگِ مزار محمد
بہ توصیف اوتاب انساں نہ باشد — خدا خوب داند وقار محمد
دعا دارم و چشم دارم زرحمت — بگرداں خدا ، بیقرار محمد
چہ چیز ہست یک جان ممتاز مسکیں — بادا دو صد جاں نثار محمد

(اکتوبر ۱۹۲۸ء)

من کوئے توباملک سلیماں نہ فروشم — خاروخس راہ توبہ بستاں نہ فروشم
روشن کنم ازجلوہ نہاں خانۂ دل را — حسن توچوآں یوسف کنعاں نہ فروشم
ہرگز نہ فراموش کنم لذت زخمش — دل چیست خدنگے تو بصدجاں نہ فروشم
زنداں چومیسر شودم ازکرم عشق — باراحت فردوس بریں ہاں نہ فروشم
منت کش اغیار نہ باشم بہ رہ شوق — ہرگز خلش خار بیاباں نہ فروشم

(فروری ۱۹۲۹ء)

مولاناشاہ محمد سجاد قادری

این است بحضرتت سوالم — روزے بکنی نظر بحالم
بے مائیکم مراست مایہ — بے علمی و جہل من کمالم
تا عرش زفرش گفتگویت — وابستۂ دامنت دو عالم
اے چارۂ دردِ درد منداں — رحمے کہ اسیر صد ملالم
سیراب شوم نہ زآب شیریں — من تشنۂ چشمۂ وصالم
جزیا دتو ، ہیچ دردلم نیست — ازہجر توروز و شب بنالم
نگہے بوفائے رویا ہے — اے سوئے رخت نگاہ عالم

(اپریل ۱۹۲۵ء)

محمد عادل، عادل مولوی فاضل سہارنپوری

برآسمان رفعت، نجم الہدیٰ محمد — دربزم دین وملت، صدرالعلیٰ محمد
ہمراز جذب الفت ہم ساز راز وحدت — دمساز بزم خلوت ،کہف الوریٰ محمد
آں رونق دوعالم ،آں زیب عرش اعظم — آں شمع فضل آدم ،ماہِ لقامحمد
آمدربیع الاول، درگلشن دوعالم — بشنوزغنچہ وگل،صل علیٰ محمد
ہم لالہ ارغوانی ازفرط شادمانی — نرگس بہ کامرانی ،جلوہ نما محمد
سرویست ایستادہ،مومن جبیں نہادہ — غنچہ دہن کشادہ،صد،مرحبا محمد
بلبل زفرطِ شوقے،قمری بہ حسن ذوقے — طوطی زجذب عشقے ،نغمہ سرامحمد
بسیار ہدیہ عادلؔ بہ نیاز عاشقانہ — دل ودیدہ وجگر بردر مصطفیٰ محمد

(دسمبر ۱۹۲۴ء)

صوفی غلام مصطفیٰ اصغر امرتسر

اے حسن توصدجلوہ دہد نورنظررا — شرمندہ کندپر توروئے توسحررا
ازتابش سیمائے توخورشید درخشاں — وزعارض زیبائے تو تنویر قمررا
اے سرور عالم،کہ سرورِ دل وجانی — ازیمن توسرمایۂ نطقست حجررا
زیبائی انگشت ہلالی چوں نمائی — وحشت بکند چاک گریبان قمررا
ازآمدنت گلشن تن شاخ وگل آورد — وز رفتن توروضۂ جاں برد ثمر را
خالی نگذاری صدف دامن اصغر — چوں راسر محشر کنی آں دُرج گہررا

(اکتوبر ۱۹۲۰ء) (یہ نعتیہ اشعار جناب پروفیسر صوفی تبسمؔ کے ہیں،وہ پہلے اصغرؔ صہبائی کے قلمی نام سے شاعری کرتے تھے۔بعد میں اپنے استاد فیروز الدین طغرائی امرت سری کے کہنے پر تبسم تخلص اختیار کیا۔آپ کے والدِ گرامی کا نام صوفی غلام رسول تھا۔آپ بہترین شاعر،خوبصورت ادیب، قابل قدر نقاد اور قابل تقلید معلم تھے۔گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ فارسی کے صدر تھے۔تصانیف :انجمن (مجموعہ غزل) انتخابِ کلامِ اقبال، جھولنے، جاہ وجلال، دامن دل، روحِ غالب، صد شعر اقبال، کلیاتِ طغرائی، مسلمانوں کا علمِ جغرافیہ، شوقِ سیاحت، نقشِ اقبال، یک ہزار و یک سخن...... تاریخ ولادت ۴ :راگست ۱۸۹۹ء[امرتسر]۔تاریخِ وفات : ۷رفروری ۱۹۷۸ء[لاہور]۔

حرف اختتام:

مجلہ "صوفی" میں شائع ہونے والی فارسی نعتوں کا یہ مختصر سا انتخاب اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہمارے اسلاف سوزِ دل، شوکت زبان اور ندرت فکر کے اعتبار سے کس قدر سرمایہ دار تھے اور ہم کس قدر مفلس ہیں اور یہ بھی کہ اُن لوگوں نے نعتوں کے ڈھیر لگانے اور تلوار کی دھار پر بے دھڑک چلنے کی کوشش نہیں کی، وہ خوب سمجھتے تھے کہ نعت کا بے سوز ساز، گنبدِ اخضر کی ناراضی کا سبب ہوسکتا ہے وہ بخوبی جانتے تھے کہ ہر گام پھسلنے والے قدم، تلوار کی دھار پر تادیر نہیں چل سکتے۔ نعت کہتے ہوئے اُن کے دل دھڑکتے اور لفظ لرزتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے فرشتوں کی ہمزبانی ہر کسی کے بس کی بات نہیں، ادب و احترام، حزم و احتیاط اور خوف و خشیت کی یہی کیفیت نعت گوئی کے لیے اولین شرط ہے۔

نعت میں کیسے کہوں ان کی رضا سے پہلے
میرے ماتھے پہ پسینہ ہے ثنا سے پہلے

بحیثیت مجموعی، رسالہ "صوفی" میں شائع ہونے والی اردو اور فارسی نعتوں کا انداز گو قدیم ہے مگر وہ آج کے شعراء کے لیے ایک معتبر اساس کا کام دے سکتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ادبی اور شعری دنیا میں نعت بطور صنفِ سخن، مسلّم، مقبول اور معروف نہیں تھی۔ نعت کے لمحہ موجود کو اِن قدیم دینی رسالوں کا ممنون احسان رہنا چاہیے کہ انہوں نے ناقدری کے دور اور نامساعد فضا میں نعت نگاری کی روایت کو سنبھالا دیا۔ حق یہ ہے کہ "صوفی" میں شائع ہونے والی نعتیں اپنے معیار کے اعتبار سے شعر و سخن کا افتخار ہیں۔ بعض طویل نعتیہ قصائد بھی ہیں جن میں آمد کی شاعرانہ کیفیتیں، دل کی ارادتمندانہ دھڑکنیں، روح کی عاجزانہ لرزشیں، حاضری کی شدید آرزوئیں اور حضوری کی پُر کیف ساعتیں، نگاہوں کو نور اور دلوں کو سرور عطا کر رہی ہیں۔ واردات قلب و نظر کی یہ سچی داستانیں، اس قابل ہیں کہ انہیں محفوظ رکھا جائے۔ ان شعراء کو اللہ تعالیٰ نے شعر و سخن کی بہترین خوبیوں سے نوازا تھا اور یہ بھی اسی کا فضل ہے کہ انہوں نے اِن صلاحیتوں کو خیالی محبوب کے عارض و رخسار کی توصیف میں صرف نہیں کیا۔ وہ بے نام زاویوں میں بے کار سرگرداں بھی نہیں رہے۔ اُنہوں نے دروغ کو فروغ کا رنگ دینے کی کوشش بھی نہیں کی بلکہ انہوں نے اُس آفتاب عالمتاب ﷺ کی مدح و ستائش کا حق ادا کرنے کی، اپنی سی سعی کی جس نے اپنے کردار و عمل کے حسن فکر و نظر کے تقدس اور قلب و زبان کی رفاقت سے تاریخ انسانی کو نئی جہتیں اور نئے جہان عطا کیے۔

لوگ کہتے ہیں اُنہیں تاریخِ انسانی کے موڑ
راستے جب جھوم اُٹھتے ہیں تری رفتار سے

ہم علمی افلاس اور اخلاقی ادبار کے جس ظالم دور سے گزر رہے ہیں، اس میں سنبھلنے، سنورنے اور نکھرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم قرآن و حدیث کو اردو تراجم کے ذریعے سمجھیں اور نعت رسول پاک ﷺ سے دل لگائیں کہ ہمارے انحطاط کی ایک ہی وجہ ہے کہ ہم دل تو رکھتے ہیں مگر دل کے اندر محبوب کا کوئی سا تصور بھی نہیں ہے۔ ہمارا دل محض دھڑکتا ہے۔ ضروری ہے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کی یاد میں دھڑکے، یہ یاد دل کی زندگی کے لیے لازم ہے۔ یہی تعلق خاطر بصارت کو بصیرت عطا کرے گا۔ ورنہ آنکھیں تو کور نہیں ہوا کرتیں، سینوں کے اندر دل اندھے ہو جایا کرتے ہیں، حق یہ ہے کہ قرآن پاک نبض تقدس اور روحِ حرم ہے۔ وہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے کہ جو بھی رہنمائی کی نیت سے اسے پڑھے گا اس کی زندگی کا ہر راستہ پُر انوار ہوتا چلا جائے گا اور اس راستے پر چلنے کا انداز، حدیث واضح کرتی چلی جائے گی جبکہ نعتِ رسول پاک ﷺ سے زنگ آلود دل، آئینہ بنتے چلے جائیں گے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی محمد ﷺ کا لفظ سنتے ہی، گنہگار سے گنہگار مسلمان کے دل کی دھڑکن ضرور تیز ہو جاتی ہے، زبان گنگ ہو کر رہ جاتی ہے اور آنسو بولنے لگتے ہیں۔ یوں وہ محبت انگڑائی لیتی ہے جو ایمان کی اساس ہے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے غمِ حیات کی سیاہ رات کٹ سکتی اور ظلمت کی ہر گھٹا چھٹ سکتی ہے ؎

فصیلِ زیست پہ بجھتا ہوا دیا ہوں میں
منارِ نور، ترا عکس چاہتا ہوں میں
میں خاکِ محض، میں انبارِ گل، میں مشتِ غبار
تری نگاہ جو پڑ جائے کیمیا ہوں میں
درود ہو تری رحمت مآب کملی پر
ردائے یاس میں لپٹی ہوئی خطا ہوں میں
تو رحمتوں کا تجمل، تو شفقتوں کا جمال
یہ میری سوچ کا محور نہیں کہ کیا ہوں میں

حرفِ اعتذار:

تاریخی کوائف کی صحت کے بارے میں امکانی سعی کی گئی ہے، جب کہ ہر انسانی سعی میں لغزش کا امکان ہوا کرتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ریاض مجید، فیصل آباد

برسبیلِ نعت: انتخاب و پیشکش

ABSTRACT: The article, placed below, highlights shortcomings in recitation of Naatia poetry on different events, in social gatherings, congregations, assemblies, and seminars in our Society. Various wrong practices have been pointed out in reciting Naat, such as selection of couplets without considering standards of assembly, category of audience, relating the couplets to poets other than original poets and not arranging sound system according to the need of the space of venue of assembly. Attention has also been invited towards commercial trends of reciting Naat, for the sake of pondering into to secure purity of intentions of arranging such congregations. Need has been emphasized for taking appropriate steps to maintain sacredness of the atmosphere for reciting Naat.

(برسبیل نعت کے عنوان سے نعت رنگ میں جو سلسلہ گزشتہ کچھ شماروں سے چلا آرہا ہے اس میں اس عنوان 'انتخاب اور پیشکش' کو سب سے آخر میں آنا تھا مگر پچھلے کچھ مہینوں میں بعض اجتماعات میں نعت خوانی اور نعت خوانوں کے کچھ تجربات ایسے ہوئے جن کے سبب اس موضوع کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنے کی باری جلد آ گئی نعت کے دائرہ کا تخلیق سے ترسیل تک جن امور و مسائل سے واسطہ پڑتا ہے ان میں نعت خوانی آخری اہم مرحلہ ہے لہٰذا اس بارے میں کچھ ضروری باتیں اس 'خود کلامی' میں آ گئی ہیں اس کے بغیر شاید یہ سلسلہ ادھورا رہتا)

نعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ضمن میں ایک مسئلہ اجتماعات میں نعت کے انتخاب اور پیشکش کا بھی ہے۔ اِس کا تعلق نعت خوانوں سے اور اُن نعت نگاروں سے ہے جو محافل میں اپنی نعت ترنم اور لحن کے ساتھ پڑھتے ہیں بظاہر یہ مسئلہ ہمارے زیرِ گفتگو (بلکہ خود کلامی) برسبیلِ نعت کا مسئلہ نظر نہیں آتا لیکن اگر

نعت کے انتخاب اور پیشکش کے مسئلہ پر ذرا توجہ کریں تو فی زمانہ یہ مسئلہ بھی اہم اور توجہ طلب ہے نعتیہ مجالس محافل، ریڈیو اور ٹی وی کے مشاعروں، سیرت کے سیمیناروں، کانفرنسوں اور اجتماعات میں قریباً گزشتہ نصف صدی کے میرے ذاتی تجربات سے اس بارے میں کئی توجہ طلب امور سامنے آئے جن پر کچھ گفتگو ضروری ہے۔

پہلا مسئلہ نعت کے انتخاب کا ہے۔ نعت خوانوں اور نعت کے شاعروں کو نعت کا انتخاب موقع ومحل اور وقت کی مناسبت سے کرنا چاہئے قرآن کریم کی تلاوت کے بعد نعتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام ہمارے اکثر اجتماعات کا لازمی حصہ ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ نعت خواں اجتماع کی مناسبت سے نعت کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ اپنی کوئی معروف نعت پڑھتے ہیں واضح رہے کہ اجتماعات کی کئی قسمیں ہوتی ہیں سیرت کی بین الاقوامی کانفرنسیں، ملکی، صوبائی یا ضلعی سطح کے سیمینار، یونیورسٹیوں، کالجوں اور تعلیمی اداروں کے اجتماعات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاعرے وغیرہ اسی طرح مذہبی اداروں اور مسجدوں میں منعقد ہونے والی نعتیہ مجلسیں ہوتی ہیں۔ ___ بعض خاص مہینوں (ربیع الاوّل) راتوں (لیلۃ القدر، شب معراج وغیرہ) اور ایام (محرم، ذی الحج) کی مناسبت سے بھی محافل کا انعقاد ہوتا ہے۔ نعتیہ محافل کا خصوصاً ربیع الاوّل میں اور عموماً سارا سال بعض لوگ گھروں میں بھی اہتمام سے کرتے ہیں۔ ___ اردو شاعری میں سینکڑوں نہیں بلکہ موقع ومحل اور وقت کی مناسبت سے ہزاروں نعتیں دستیاب ہیں تاثیر آفرینی، محافل نعت کا مرکزی مقصد ہونا چاہیئے۔ نعت خواں (اگر وہ شاعر خود ہو تو اسے اور زیادہ) اس بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ بقول کسے

دانند آں کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد

(یہاں فصاحت کی جگہ تاثر، سخن کی جگہ ثنا اور نکتہ کی جگہ نعت پڑھیں تو میری بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔)

جس طرح اجتماعات کی بیسیوں قسمیں ہیں اسی طرح نعت خوانی کے بھی متعدد اسالیب ہیں۔ سیرتی نعتیں، سلام و درود والی نعتیں، میلادیہ نعتیں، معراجیہ نعتیں، معجزاتی نعتیں، علمی انداز کی نعتیں، شمائلِ حضورؐ کے حوالے سے لکھی گئی نعتیں، عوام کے لئے لکھی گئی سادہ انداز کی نعتیں وغیرہ وغیرہ۔ نعت خواں کو موقع کی مناسبت سے نعت کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ نعتیں سبھی اچھی ہوتی ہیں لیکن بین الاقوامی کانفرنسوں اور گھروں میں منعقد کی جانے والی نعتیہ مجالس کے سامعین مختلف ہوتے ہیں۔ کسی معروف فلمی طرز پر لکھی گئی نعت کسی گھریلو مجلسِ نعت میں تو بڑی مؤثر ہو سکتی ہے لیکن کسی بین الاقوامی کانفرنس میں اسے پڑھنے سے

پرہیز کرنا چاہیئے۔ اسی طرح بعض عوام کی بہت پسندیدہ اور مقبول نعتیں سیرتی سیمینارز وغیرہ کے لئے مناسب نہیں۔ یہ بات ذوق کی ہے اور نعت خواں کو اپنے ذوق کی تربیت کے لئے کوشاں رہنا چاہیئے۔

نعتوں کے کتاب میں پڑھنے اور مجلس میں سننے کے جداگانہ اثرات ہوتے ہیں اس کا بھی لحاظ رکھا جانا چاہیئے مثلاً ادیب رائے پوری صاحب کی ایک معروف نعت

خدا کا ذکر کرے ، ذکرِ مصطفیٰ نہ کرے

ہمارے منہ میں ہو ایسی زباں' خدا نہ کرے

محافل میں جب اسے پڑھا جاتا ہے تو نعت خواں اس کا پہلا مصرع عموماً تین بار پڑھتے ہیں اور پھر دوسرے مصرعے کو اس کے ساتھ ملاتے ہیں ایسی صورت میں ...... ذکرِ مصطفیٰ نہ کرے...... کی تکرار ایک اور طرح کا تاثر چھوڑتی ہے بلاشبہ شعر کا معنوی حسن بھی اسی نکتہ میں ہے لیکن اگر دوسرا مصرع ایک بار پہلے پڑھ لیا جائے تو تاثر کی نوعیت زیادہ بہتر ہو جائے مَیں یہ لکھتے ہوئے خود اپنے موقف میں دلیل کی کمی محسوس کر رہا ہوں مگر یقین جانیے کہ ''ذکرِ مصطفیٰ نہ کرے'' کا یہ تکرار مترنم اظہار مطلوبہ تاثر کے بجائے ایک اور طرح کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ نعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور ذکر مبارک کے اظہار کی تکرار سے جو حسن تاثر پیدا ہوتا ہے وہ آپ کی کسی صفت کے منفی اظہار کی تردید سے پیدا نہیں ہوتا۔ مَیں اپنی بات کی وضاحت پھر نہیں کر پا رہا لیکن ان مصرعوں کے اوپر نیچے کرنے سے تاثر میں تبدیلی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ (مَیں نے یہ نعت ایک مجلس میں جس انداز میں، جس نعت خواں سے ،جس وقت سنی اِس نعت کے مطلع سے پیدا ہونے والی کیفیت کے حوالے سے مَیں اس بات کا اظہار کر رہا ہوں ورنہ یہ نعت نہ صرف ادیب رائے پوری صاحب بلکہ اردو کی معاصر نعتیہ شاعری میں ایک اہم نعت ہے واضح ہو کہ مَیں یہاں بات صرف نعت خواں کے مترنم لب و لہجہ کے حوالے سے کر رہا ہوں۔) اس انداز کی نعت کے ایسے مصرعوں کی تکرار کرتے ہوئے نعت خواں کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر مجھے عبدالرحمٰن کیانی کی قائداعظمؒ پر لکھی ایک طویل نظم یاد آ رہی ہے یہاں وضاحت کے لئے اس کے طویل اقتباسات دہرانے کا وقت نہیں۔ یہ نظم اگرچہ بڑی محبت اور جذبے سے لکھی گئی ہے مگر اس نظم میں اظہار کا فارمیٹ منفی صفات کی تردید ہے اور سننے والے پر یہ نظم اچھا تاثر نہیں چھوڑتی بہرحال یہ میرا اپنا خیال ہے دوسروں کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

اگرچہ بعض نعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی اہمیت ، تازگی اور تاثر مقام اور وقت سے ماورا ہوتا ہے وہ کسی بھی دن یا اجتماع میں پڑھی جائیں تو مؤثر ہوتی ہیں۔ لیکن نعت خوانوں اور نعت نگاروں کو موقع و محل اور اجتماع کی نوعیت کے اعتبار سے کلام کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ ربیع الاوّل، رمضان المبارک، معراج

شریف کے ایام میں اگر ان دنوں کی مناسبت سے نعتیں پڑھی جائیں تو زیادہ موثر ثابت ہوں گی۔ یہاں موقع و مناسبت کے لحاظ سے ایک طویل فہرست پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ممکن ہے وہ دوسروں کے ذوق کے مطابق نہ ہو۔ کیونکہ ہر نعت خواں اور شاعر کا اپنا ایک مخصوص ذوق اور مزاج ہوتا ہے۔ لیکن اس امر کی نشاندہی بھی غیر مناسب نہ ہوگی کہ سیرتی کانفرنسوں میں فلمی طرز پر لکھی گئی نعتوں یا میلادیہ عوامی نعتوں مثلاً سوہنا آیا تے سج گئے گلیاں بازار...... کی بجائے ''لوح بھی تو قلم بھی تو، ترا وجود الکتاب''...... جیسی نعتیں پڑھنا زیادہ مناسب ہے ورنہ یہ ایسے ہی ہوگا جیسے کسی عوامی محفل میلاد میں ''سوہنا آیا تے سج گئے گلیاں بازار'' کی جگہ ''لوح بھی تو قلم بھی تو، ترا وجود الکتاب'' پڑھنا...... مختصراً ہر نعت کے پڑھنے کا موقع محل ہوتا ہے اس پر توجہ رکھنی چاہیئے۔

بعض نعت خواں اپنی نعت کا پہلا مصرع پڑھتے ہی سامعین کو بھی اپنے ساتھ ترنم کے ساتھ پڑھنے اور ٹیپ کے مصرعے سے ہم آہنگ رہنے کی دعوت دیتے ہیں۔ گھریلو نعتیہ مجلسوں اور عوامی محفلوں میں تو یہ اچھا لگتا ہے کانفرنسوں اور سیمینارز میں یہ مناسب نہیں۔

انتخاب کے بعد دوسرا مسئلہ نعت کی پیشکش کا ہے جس کا تعلق ساؤنڈ سے ہے اس میں جگہ کمرہ، ہال یا کھلے میدان کے حوالے سے سپیکرز کا اہتمام ہونا چاہیے بعض اوقات ایک چھوٹے سے کمرے میں محفلِ نعت منعقد ہو رہی ہوتی ہے جہاں ساؤنڈ سسٹم / سپیکرز وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی مگر اہلِ خانہ یا منتظمین بضد ہوتے ہیں کہ سپیکرز ضرور لگائے جائیں اور وہ بھی بڑے بڑے جو ظاہر ہے سامعین پر خوشگوار اثرات ڈالنے کی بجائے اپنی بلند آہنگی کے سبب بہت قریب بیٹھے ہوئے سامعین کی سماعت کے لئے تکلیف کا سبب ہوتے ہیں منتظمین کی توجہ اس طرف دلائی جائے تو اکثر جواب یہ ہوتا ہے کہ ساؤنڈ سسٹم منگوا بیٹھے ہیں اب اسے استعمال تو کرنا ہی ہے خیال رہنا چاہئے کہ کمرے اور کھلے میدان کے لئے سپیکرز ایک جیسے نہیں ہوتے ساؤنڈ سسٹم والوں کو اپنے پیسے بنانے ہوتے ہیں لہٰذا وہ محفل کے لئے زیادہ سے زیادہ سپیکرز یا بڑے سپیکرز بھجوا دیتے ہیں ____ اسی طرح مائیک کا مسئلہ بھی بعض اوقات محفل کے تاثر میں حارج ہوتا ہے یا تو مائیک درست نہیں ہوتا یا اسے ٹھیک فاصلے پر فکس نہیں کیا جاتا کئی جگہوں پر روسٹرم اور نعت خواں کے درمیان میں سٹینڈنگ مائیک کھڑا کر دیا جاتا ہے یہ بظاہر معمولی باتیں محفلوں کے تاثر کی خرابی کا باعث بنتی ہیں بار بار مائیک کو بدلنا اور آگے پیچھے کرنا بدمزگی کا سبب بنتا ہے مائیک اگر روسٹرم کے سامنے والے حصے پر مناسب طریق سے فکس ہو تو بہتر ہے یوں بار بار اس کی جگہ بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی کئی محفلوں میں آخر تک مائیک خصوصاً ہینڈ مائیکروفون سیٹ نہیں ہوتا محفل کے دوران اسے آن آف اور اس کی آواز کم اور زیادہ کرنے میں ہی کافی وقت لگ جاتا ہے۔

سپیکرز کی سب سے اچھی شکل یہ ہے کہ وہ چھوٹے ہوں مناسب فاصلے پر ہوں اور نمایاں نہ ہوں بیرونی ممالک میں سپیکرز کو نمایاں نہیں کیا جاتا بڑے ہالوں میں مناسب فاصلوں پر دیواروں کے ساتھ اکثر تصاویر یا کسی ستون کی اوٹ میں ا کھلے میدانوں میں پودوں اور گملوں وغیرہ میں انہیں ملفوف رکھا جاتا ہے سامعین کی سیٹوں سے مناسب فاصلے پر ___ ساؤنڈ سسٹم کے حوالے سے ہماری محفلوں میں ایک بڑا مسئلہ اِیکو یا آواز کی بازگشت کا ہے قرآن کی تلاوت اور نعت خوانی میں ساؤنڈ سسٹم کو احتیاط سے کنٹرول میں رکھنے کی ضرورت ہے کئی مساجد میں جہری نمازوں کی قرآت کے دوران میں آخری الفاظ کی آٹھ سے دس بار تک کی بھی تکرار بہ آسانی سنی جاسکتی ہے مثلاً بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے م م م م ...... کی تکرار آتی رہتی ہے۔ جس سے آیاتِ قرآنی کی بے ادبی کی صورت پیدا ہوتی ہے نعت خوانی میں بھی ردیف کے آخری حصہ کی تکرار ہوتی رہتی ہے یہ مناب نہیں شاید فلمی گانوں یا انسٹرومینٹل میوزک میں اس سے کوئی خاص صوتی تاثر پیدا کرنا پسندیدہ قرار دیا جاتا ہو مگر قرآن کی قرأت اور نعت خوانی میں تو کسی لفظ یا لفظ کے کسی حصے کی صوتی تکرار بے ادبی کے علاوہ ذوقِ سلیم پر بھی گراں گزرتی ہے۔

واضح رہے کہ آواز ...... طبیعات کا ایک باقاعدہ شعبہ ہے۔ جس کے مختلف پہلوؤں اور پیشکش کے ذریعوں پر ہر سال کروڑوں ڈالرز کی سرمایہ کاری ہوتی ہے ایک کمرے سے ایک وسیع پنڈال، میدان یا لاکھوں کے اجتماعات میں آواز کے ثمرات کو کس طریقے سے پہنچانا ہے اس کے بارے میں لاکھوں مضامین اور ہزاروں کتابیں موجود ہیں اگر نعت خواں یا نعتیہ اجتماعات کا انعقاد کرانے والے آلاتِ آواز (مائیک سپیکرز وغیرہ) استعمال کرنے پر بضد اور آرزومند ہیں تو اس سسٹم کو سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے اگرچہ یورپی ممالک میں ان کا استعمال زیادہ تر موسیقی کے لئے ہوتا ہے لیکن لیکچرز، تقاریر وغیرہ کے لئے بھی ان کا استعمال عام ہے حرمینِ شریفین میں ان آلات کا استعمال بہت مؤثر طور پر ہو رہا ہے۔ امام صاحبان کی قرأت اور خطبات کی آواز اس قرینے اور شائستگی سے ہر مقتدی اور سامع تک پہنچتی ہے کہ ایک ایک لفظ حرمین کے ہر گوشے اور کونے میں بغیر کسی رکاوٹ کے بخوبی اور بہ آسانی سنا جاتا ہے۔ آواز کے خوشگوار تاثر اور شور میں کیا فرق ہے؟ ہمارے اکثر نعتیہ اور میلادی بزم آرا (Event Organizers) اس سارے سلسلے سے بے خبر ہیں ایک چھوٹے کمرے اور وسیع و عریض پنڈال میں لاؤڈ سپیکرز کی سیٹنگ کے فرق سے بالکل بے بہرہ ___ ہمارے ہاں سٹیج کے اوپر صدر اور مہمانِ خصوصی کے دائیں بائیں دو بڑے سپیکرز رکھ دیئے جاتے ہیں جن کی وہاں قطعاً ضرورت نہیں ہوتی سامعین اور سپیکرز کا درمیانی فاصلہ ضرورت کے مطابق نہیں ہوتا ساؤنڈ سسٹم والے کی مرضی بلکہ دستیاب تاروں کی لمبائی پر ہوتا ہے جن سپیکرز کو سامعین سے پچاس فٹ دور ہونا چاہیئے وہ عام طور پر سامعین پر جھکے ہوتے ہیں یہاں مطلوبہ

لمبائی کی تاروں کی کمی کے ساتھ منتظمین کی عقل کی کمی اچھی خاصی نعت کے تاثر کو نا قابل برداشت شور میں بدل دیتی ہے۔

ترنم کے ساتھ نعت پڑھنا اور سننا خوشگوار اور سکون بخش تاثیر سے وابستہ عمل ہے غیر ضروری سپیکرز کے ذریعے اسے نا قابل برداشت نہیں بنانا چاہیئے۔

ایکوسٹیک کیمسٹری (لحن کاری) با قاعدہ ایک فن ہے آواز کی ایک اکائی Decibel کہلاتی ہے کمروں کی لمبائی اور چوڑائی کی مناسبت سے سپیکرز کا استعمال ہونا چاہیے اس کے سکیل (Scales) کے مطابق پینل لگا کر کمروں میں آواز کو کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ سامعین کے لئے خوشگوار تاثر کا حامل بھی بنایا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ خوشگوار آواز کے پیمانے کی اکائی 70-80 ڈیسیبل تک ہے۔150 پر کانوں کے پردے پھٹ سکتے ہیں اور 185 سے 200 پر انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے اس پچ پر قرآن کریم کی تلاوت بھی سامع کے لئے تکلیف دہ اور مہلک ہے انسانی کان اور سپیکر میں مناسب تاثیر بخش فاصلہ بہت ضروری ہے کھلے میدانوں میں بڑے سپیکرز سامعین سے دور__ مناسب فاصلوں پر ہونے چاہئیں اگر کچھ قارئین اس کا عملی نمونہ دیکھنا چاہیں تو نیٹ پر معروف یونانی ہارمونسٹ یانی (Yaani) کی اس پرفارمنس کو دیکھیں جو اس نے تاج محل (آگرہ) کے وسیع سبزہ زار میں پیش کی__ آواز کے اتار چڑھاؤ کی تفصیلات معروف آواز سائنس دان جوہن کولڈر (John Colder) کے لیکچرز سے لی جا سکتی ہیں جو نیٹ پر دستیاب ہیں۔

نعت پڑھنا اور اپنے لحن سے اس کی تزئین کرنا ایک بڑا مبارک اور موثر عمل ہے لحن میں سنی جانے والی نعت سے مفاہیم کے بھی کئی در کھلتے ہیں سامع کے دل میں گداز اور جذباتی گھلاؤ میں کیفیات پیدا ہوتی ہیں مرزا غالب کے یہ شعر آواز اور لحن گر کی اسی کیفیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

نعت کے ذیل میں (چنگ و رباب کے بغیر) آواز سامعین کو متاثر کرتی ان کے دلوں کو گرماتی اور دماغوں کو روشن کرتی ہے۔

ہمارے نعت خوانوں کو خارجی آلاتِ آواز کی بجائے اپنے باطن میں سوز اور گداز کی تلاش، فراہمی اور دوسروں تک اس کی خوشگوار ترسیل پر زور دینا چاہیئے۔ یہ سارا عمل ایک مکمل ضابطے کا پابند ہے۔ اچھا کلام، صحیح تلفظ، الفاظ کی درو بست کی صحیح ادائیگی، دستیاب آلاتِ صدا مستزاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ منتظمین کو اس بارے میں 'کشف المحجوب' کا وہ باب پڑھ لینا چاہیئے جو سماع کے آداب سے متعلق ہے سر راہے، بازاروں میں اور نمازوں کے اوقات میں نعتیہ مجالس کا انعقاد نہیں کرنا چاہیئے۔

نعت خواں اور ان کے چُنویا (روپیہ جمع کرنے والے) کو مجلس کے صوتی بہاؤ میں مزاحم نہیں ہونا چاہیے بعض نعت خواں نعت خوانی کے دوران بعض بے جا تفصیلات دینی شروع کر دیتے ہیں ایسی تقریر نما وضاحتیں ___ کیمرے کی طرف دیکھنا اور کیمرہ مین کو اپنی طرف متوجہ کرنا، روپے اکٹھے کرنے والے کا بار بار آگے سے گزرنا ___ یہ سارے امور مجلس کے تاثر کو ضائع کرتے ہیں۔ ریا سے پڑھی گئی نماز کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک سے تعبیر کیا ہے تو ریا اور نمائش سے کیا گیا اور کوئی عمل کیسے پسندیدہ ہو سکتا ہے؟ نعت خواں کو حرص سے بچنا چاہیئے عوام میں اس کے بارے میں یہ تاثر نہ ہو کہ وہ نعت صرف روپے پیسے کے لئے پڑھتا ہے۔ بقول شاعر

نیازی پھوک دے دولت اوہ، جیہڑی
نبیؐ دے نام تے واری نہ جاوے

(نیازی وہ دولت جلا دے جو حضورؐ کے نام پر واری نہ جائے) اس قسم کے اشعار مجلس میں اس نیت سے نہیں پڑھنے چاہئیں کہ لوگ اپنی جیبیں خالی کرنے کو کارِ ثواب سمجھیں یاد رہے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے ___ اگر نعت خواں کی نیت ہی حصولِ زر ہے تو وہ اس کے نتیجہ پر خود غور کر سکتا ہے ___ افسوس ہے ہمارے ہاں نعت خوانی کے نام پر نعت فروشی ہو رہی ہے اس سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئے۔

نعت خوانوں کو اپنے معاملات پر بھی توجہ دینی چاہیے کیا حرج ہے اگر وہ نعت خوانی کے عمل (کاروبار؟) سے حاصل ہونے والی رقم کا ٹیکس بھی دے دیا کریں وہ ملک جس کی ہواؤں اور جس کے باشندوں میں وہ نعت خوانی کر رہے ہیں، وہ ٹیکس کے ذریعے اسے کچھ سہولیات بہم پہنچانے کا ذریعہ بن جائیں نیز جن شاعروں کے کلام سے وہ اپنا کاروبارِ نعت خوانی چمکا رہے ہیں کبھی ان کے بارے میں حقیقت پسندیدہ ردِّ عمل کا مظاہرہ بھی کر لیا کریں اگر وہ فوت ہو چکے ہیں تو ان کے نام پر کچھ صدقہ و خیرات کر دیا کریں تا کہ ان کے کلام کی قرات کے صدقہ جاریہ سے ان کو ثواب پہنچتا رہے سیدنا حسان بن ثابتؓ اور امام بوصیری سے لے کر مولینا حالی، شیخ سعدی، مولینا احمد رضا خاں کے نام پر صدقہ و

خیرات کی جانے والی رقم کا نہ صرف نعت خوانوں کو بھی ثواب پہنچے گا بلکہ اس باب میں ان کی عدم توجہی اور غفلت کا ازالہ بھی ہو جائے گا اسی طرح جس علاقے میں مجلس برپا ہوتی ہے اپنی 'آمدنی' کا کچھ حصہ اس کی کسی مسجد کو بھی دے دیا کریں تو یہ بھی اُن کے لئے بہت بہتر ہوگا۔

ایک مسئلہ مجالس میں پڑھی جانے والی نعتوں کے نعت نگاروں کے حوالے کا بھی ہیں جس کا نعت خواں عام طور پر خیال نہیں رکھتے۔ نعت خواں، کسی کی نعت پڑھتے ہوئے اگر شاعر کا نام معلوم ہو تو اسے بتا دیا کریں مگر کوئی غلط نام نہیں لینا چاہیئے اس سے کئی بدگمانیاں پیدا ہو جاتی ہیں ایسا ہی ایک واقعہ سنیں۔ پروفیسر غازی علم الدین اپنی کتاب تخلیقی زاویے میں لکھتے ہیں:

''تاریخ یاد نہیں، مگر فروری ۲۰۱۶ء کے پہلے عشرے کی بات ہے کہ مجھے دہلی سے ممتاز ادیب جناب عظیم اختر کا فون آیا انہوں نے فرمایا کہ کل کسی پاکستانی ٹی وی چینل پر نعت خواں عبدالروف روفی نے ایک نعت پڑھی جس کے دو شعر یہ ہیں:

اللہ مرے رزق کی برکت نہ چلی جائے دو دن سے مرے گھر کوئی مہمان نہیں ہے
ہر لفظ کو سینے میں بسا لیں تو بنے بات طاقوں میں سجانے کو یہ قرآن نہیں ہے

عبدالروف روفی نے ان شعروں کو ڈاکٹر ریاض مجید کی طرف منسوب کیا ہے جب کہ میرے علم اور مشاہدے کے مطابق یہ ڈاکٹر ماجد دیوبندی (وائس چیئر مین اردو اکیڈمی دہلی، بھارت) کے شعر ہیں جناب عظیم اختر نے مجھے یہ ذمہ داری سونپتے ہوئے کہا کہ آپ تحقیق کر کے بتائیں کہ یہ اشعار ڈاکٹر ریاض مجید کے کس نعتیہ مجموعے میں ہیں۔ میرے پاس ڈاکٹر ریاض مجید صاحب کی نعتیہ شاعری پر مشتمل کوئی کتاب نہیں تھی۔ مَیں نے مثال پبلشرز فیصل آباد کے مالک محمد عابد سے رابطہ کر کے یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا اور ان سے ڈاکٹر صاحب کی کتابیں طلب کیں۔ انہوں نے جھٹ سے نیٹ کا سہارا لیا اور مجھے بتایا کہ یہ اشعار تو ماجد دیوبندی کے ہیں۔ فروری ۲۰۱۷ء میں جناب ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے مجھے اپنی مطبوعہ شاعری بھیجی تو اُس میں ان اشعار کو دیکھ کر راقم کا یقین، عین الیقین میں بدل گیا۔''

تخلیقی زاویے: پروفیسر غازی علم الدین، مطبوعہ مثال پبلشرز فیصل آباد، ۲۰۱۷ء، صفحہ نمبر ۲۳۰

جانے کتنے دنوں بعد غازی صاحب کی بھیجی ہوئی کتاب کے اس صفحہ پر میری نظر پڑی تو مَیں بہت حیران ہُوا یہ نعت خواں تو خیر کئی سالوں سے مجھے نظر ہی نہیں آئے مَیں نے غازی صاحب کو فون پہ کہا کہ حضرت آپ اس بارے میں پریشان ہو کر اِدھر اُدھر فون کرتے رہے آپ مجھ سے ہی پوچھ لیتے

آپ کے پاس میرا فون نمبر تو ہے ہی ۔۔۔۔۔۔۔خیر میں نے وضاحت سے انہیں بتا دیا کہ یہ نعت خواں کی غلط بیانی ہے۔روفی میری کئی نعتیں اکثر محافل میں پڑھتے ہیں ان کی کئی سی ڈیز بھی ریلیز ہو چکی ہیں میرا دور دور تک ان شعروں سے کوئی تعلق نہیں ۔میری مطبوعہ چھ سات نعتیہ کتابوں میں اس زمین میں بھی کوئی نعت نہیں جس سے کوئی ایسا اشتباہ پیدا ہو ــــــ یہ نعت خوانوں کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ وہ ایک نعت میں بعض اوقات قوالوں کی طرح گرہ بندی کرتے رہتے ہیں اور موقعہ ومحل کے مطابق اشعار کا اضافہ کرتے رہتے ہیں۔نعت خوانوں کی انہی ’غلط بخشیوں‘ کے سبب

ع نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم، امیر خسرو سے،

ع پریشانم پریشاں یارسول اللہ، مولانا جامی سے،

ع نبلبل زتو آموختہ شیریں دہنی را، مولانا جامی سے اور

ع نسیما جانب بطحا گزر کن، والی نعت مولانا جامی سے منسوب چلی آرہی ہے۔

نعت خوانوں کو نعت نگار کا حوالہ دیتے ہوئے ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہئے ’حق الیقین‘ حاصل کرنے والے ناقدین کو بھی چاہئے کہ اپنی تحقیق کا آغاز نعت خوانوں کے مجلسی بیانات سے نہ کیا کریں۔ اگر شاعر تک اِن کی رسائی ممکن ہو تو اُس سے ہی صورت حال کی وضاحت کرلیا کریں۔

☆☆☆

ڈاکٹر عزیز احسن (کراچی)

نعت اور آئینۂ عصری حسیّت!

ABSTRACT: Every creative work, including poetry, contains contemporary sensibility and Devotional Poetry in praise of Prophet Muhammad Sall-Allaho Alaihe Wasallam, has no exception in this regard. Factual information collected through senses from society, conceives greater meaning in creative writing. Naatia poetry presents high sensibility of religiosity and reflects environmental affects with deep emotions in order to invite attention towards cleansing the atmosphere to pave way for pragmatic religious society. History of Urdu Literature has been visited in this article, to see environmental affects of sensibility of poets involved in writing Naat. This poetry is a mirror of expressions of contemporary sensibility of poets towards negativity in vogue in a bid to arouse conscience of society to overcome this situation. Application of Islamic norms in collective behavior of Islamic Society is basic object of such poetry, besides inviting attention towards true faith and infusing courage to discard adverse ideas being spread by the rival forces of Islam and Prophet Muhammad Sall-Allaho Alaihe Wasallam.

ادب کی ہر صنف میں لکھاری کا عصری شعور جھلکتا ہے۔کوئی تحریر بھی نہ تو کسی قلم کار کی ماحولیاتی فضا کے اثر سے باہر رہ کر لکھی جاتی ہے اور نہ ہی زمانے کے سرد و گرم اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ شاعری میں شاعر کے داخلی احساسات بھی خارجی ماحول کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔فکری بوقلمونی اور خیالات کی نیرنگی میں عصری حسیت کی کارفرمائی ہوتی ہے۔عصری حسیت ، عصری آگہی اور عصری شعور...... یہ سب الفاظ کسی خاص عہد کے سیاسی و تاریخی جبر اور معاشرتی و معاشی حالات سے پیدا ہونے والے اجتماعی شعور کے آئینہ دار ہوتے ہیں،جن کے ذریعے روحِ عصر اپنا اظہار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں،عصری حسیت اور تاریخ کے جبر کا احساساتی مرقع، غالباً سب سے زیادہ مؤثر صورت میں، اس وقت سامنے آیا جب راجہ رام نرائن موزوں نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزرا

(بعض جگہ، مصرعہ ثانی یوں ہے...... دوانہ مرگیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری، ع۔ا)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تاریخِ ادبِ اردو میں یہ شعر میر حسن کے تذکرہ شعرائے اردو کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ میر حسن نے اس شعر کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

''جس وقت سراج الدولہ کے شہید ہونے کی خبر شہر میں پہنچی [راجہ رام نرائن موزوں] اسی وقت فی البدیہہ یہ شعر پڑھتا تھا اور خبر دینے والوں سے پوچھتا اور روتا تھا۔ یہی شعر اس سے یادگار رہ گیا'' [۱]

اس شعر کی قدر، سیاسی پس منظر کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ عصری حسیت کے حوالے سے اتنا مؤثر اور متواتر حوالوں میں آنے والا شاید ہی کوئی اور شعر ہو۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے کیا خوب لکھا ہے:

''جس طرح ماہ و سال اپنا نقش ہمارے چہروں پر جھریوں کی شکل میں مرتب کرتے ہیں، اسی طرح سیاسی و تاریخی واقعات، شاعری میں اپنی جگہ بنا ہی لیتے ہیں'' [۲]

ڈاکٹر کشفی نے غالب کے درجِ ذیل اشعار میں سیاسی حالات کے عکس دیکھے ہیں:

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو — وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے
گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے [۳]

فیض احمد فیض نے تو داغ کے کلام میں بھی عصری حسیت کا عکس دیکھ لیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

اگر اسے محض طرزِ ادا سمجھیے تو شعر مہمل نہ سہی پوچ ضرور ہے لیکن اگر اسی شعر کو ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں دیکھیے تو آپ کو اس میں معانی کی کئی تہیں ایسی نظر آئیں گی جن کا تعلق طرزِ ادا سے زیادہ شاعر کے تجربے اور ماحول سے ہے'' [۴]

حسن اکبر کمال نے کیا خوب کہا تھا:

کیا ہوتا ہے خزاں بہار کے آنے جانے سے
سب موسم ہیں دل کھلنے اور دل مرجھانے سے

شاعری کا متن بھی دل کھلنے اور دل مرجھانے کی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

فراقی بیجاپوری کا عہد مسلمانوں میں بہت زیادہ ابتری اور دین سے بیگانگی کا نہ تھا لیکن اس کے باوجود

علمِ حدیث سے وہ محروم رہا جس کا اس نے افسوس کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ فراقی کا شکوہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ اکتسابِ علمِ دین کا رجحان زوال پذیر تھا۔ اس کے عصری شعور نے ہی اس سے یہ مقطع کہلوایا:

نظر ہے علمِ منطق ہور معانی میں فراقی کو
اگر علمِ حدیثِ مصطفیٰؐ ہوتا تو کیا ہوتا [۵]

میرزا مظہر جان جاناں (المتوفی ۱۷۸۰ء) کے عہد میں نعتیہ اشعار بھی کہے جاتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شعراء کی کثیر تعداد شعر برائے شعر کہتی تھی اور نعت کہنے والے شعراء اپنے نبی علیہ السلام کی محبت کے عملی تقاضے پورے کرنے سے قاصر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مظہر جانِ جاناںؒ نے اس رجحان کی لا مقصدیت کو اجاگر کرتے ہوئے شعراء کو زبانی جمع خرچ کے رویئے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا:

خدا در انتظارِ حمدِ ما نیست
محمد چشم بر راہِ ثنا نیست
خدا مدح آفرینِ مصطفےٰ بس
محمدؐ حامدِ حمدِ خدا بس

(اللہ تعالیٰ ہماری شاعری میں اپنی تعریف سننے کے لیے منتظر نہیں ہے۔ اور اس کے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ بھی ہماری طرف سے اپنی تعریف سننے کے لیے ہماری راہ نہیں تک رہے ہیں۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعریف خود اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے وہی کافی ہے اور اللہ کی حمد، محمد مصطفیٰ ﷺ جو کرتے ہیں وہ خود مکتفی ہے)۔ [۶]

میرزا مظہر جانِ جاناں کے یہ دو شعر اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ بالکل ہمارے عہد کی طرح، ان کے عہد میں بھی، نعتیہ شاعری میں زبانی جمع خرچ کی فضا عام ہو گئی تھی یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دوٹوک الفاظ میں شعراء کو بتا دیا کہ حمد و نعت کا معاملہ محض زبانی خرچ کا معاملہ نہیں ہے، یہاں شعراء کو عمل کی کسوٹی پر بھی پرکھا جاتا ہے۔

شاہ ابدال پھلواویؒ (المتوفی ۱۷۸۵ء) کے عہد میں مسلمانوں کی اجتماعی حالت نے انھیں استغاثہ لکھنے پر مجبور کیا ہوگا تب ہی ایسے اشعار وجود میں آئے:

میں ہوں بہت ناچار محمدؐ
ناؤ پھنسی منجدھار محمدؐ
کوئی نہ کھیون ہار محمدؐ
تم ہی اتارو پار محمدؐ
صلی اللہ علیہ وسلم [۷]

دلی کا بدنصیب بادشاہ سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ، ظفر، اپنے عہدِ زوال اور ذاتی مصیبتوں کا احوال اس پیرائے میں بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے:

صیقل سے اپنے لطف و عنایت کے دور کر
آئینۂ ضمیر سے میرے غبارِ غم [۸]

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے میر تقی میر کی شاعری میں دل اور دلی کا ذکر یکجا دیکھ کر ہی ان کی شاعری کو

دل کا نہیں دلی کا نوحہ بتایا۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر صاحب کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے ''دل'' اور ''دِلّی'' دونوں کے کوائف کو اپنی شاعری میں یوں یک جا کر دیا کہ ان کی غزلِ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا سنگم بن گئی ہے

دل و دِلّی دونوں اگر ہیں خراب
پہ کچھ لطف اس اجڑے گھر میں بھی ہیں

یوں دل اور دلّی دونوں مل کر ایک نگر کی تعمیر کرتے ہیں''۔[۹]

اکبرالٰہ آبادی کی ساری شاعری، عصری حسیت کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے فرنگیوں کی اسلام بیزار حکمتِ عملی اور مسلم کش نظریات کو بھانپ کر ہی جگہ جگہ اس ماحول کو قبول کرنے والے مسلمانوں پر طنز کے تیر چلائے۔ مثلاً

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں		میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُن کو		دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں[۱۰]

حالی نے مسدس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی لکھی۔ ان کا یہ پورا مسدس ان کے عصری شعور کا عکاس اور کربِ دروں کا غماز ہے۔ لکھتے ہیں:

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا		ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا		وہ امت لقب جس کا خیرالامم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں		کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں
وگرنہ ہماری رگوں میں لہو ہیں		ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں		طبیعت میں فطرت میں عادت میں خُو میں
نہیں کوئی ذرہ نجابت کا باقی		اگر ہو کسی میں تو ہے اتفاقی
نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت		نہ اپنوں سے الفت، نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت		خیالوں میں پستی، کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں، دوستی آشکارا		غرض کی تواضع، غرض کی مدارا[۱۱]

اقبال نے اپنی عصری بصیرت سے کام لے کر انگریز کی حمایت سے باز رکھنے کی غرض سے مُلاّ پر طنز کیا:

مُلاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد [۱۲]

پھر ان کے عہد میں اسلام دشمنی کی جو فضا انگریز حکمرانوں نے پیدا کی تھی اور روحِ اسلام کو الحاد

سے آلودہ کرنے کے لیے جو مختلف جتن کیے تھے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو [۱۳]

اقبال کی نظمیں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' بھی، عصری شعور اور عصری حسیت کی نمائندہ نظمیں ہیں۔

نعت تو اردو زبان کے ابتدائی شعری نمونوں میں بھی شامل رہی تھی لیکن ایک طویل عرصے تک اس میدان میں ایسے شعراء ہی داخل ہوئے جو محض عقیدت کے اظہار اور حصولِ ثواب کے لیے شاعری کررہے تھے۔ عصری حسیت کا انعکاس تو ادب میں 1857ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد شروع ہوا۔ حالی کے مسدس میں جو نعتیہ اشعار آئے ہیں (وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا......) ان کی مقبولیت ہر سطح پر ہوئی اور آج بھی وہ اشعار نعتیہ شعری سرمائے میں سورج کی طرح ضوفشاں ہیں۔ نعتیہ شاعری میں عصری حسیت یا عصری شعور کا ابتدائی انعکاس دیکھنے کے لیے حالی ہی کا استغاثہ دیکھنا چاہیے، جو انتہائی کرب کے ساتھ اور اپنی بے بسی کے نوحے کی شکل میں لکھا گیا ہے:

اے خاصہء خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے [۱۴]

داغ دہلوی نے عصری کرب سمیٹتے ہوئے نعتیہ شعر میں اپنی ذات سے تعمیم کا پہلو نکالا اور پوری امت کے لیے استغاثہ پیش کیا:

کرو غم سے آزاد یا مصطفیٰؐ
تمھیں سے ہے فریاد یا مصطفیٰؐ
نہ پامال مجھ کو زمانہ کرے
نہ مٹی ہو برباد یا مصطفیٰؐ [۱۵]

احمد رضا خان بریلوی نے بڑے اچھوتے انداز میں اپنے عہد کا آشوب پیش کیا ہے:

اَلْبَحْرُ عَلَا وَالْمَوْجُ طَغٰی من بے کس وطوفاں ہوش رُبا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا، موری نیا پار لگا جانا [۱۶]

حسن بریلوی نے اپنے عہد کے غموں کا مداوا اس طرح چاہا:

سرگزشتِ غم کہوں کس سے ترے ہوتے ہوئے
کس کے در پر جاؤں تیرا آستانہ چھوڑ کر [۱۷]

احسن مارہروی نے حوادث میں گھر جانے کے بعد حضورِ اکرم ﷺ کی یاد کو ناخدا بنایا:

پریشانِ حوادث دیکھ کر بحرِ خوادث میں
پئے تسکیں انھیں کی یاد آئی ناخدا بن کر [۱۸]

شبلی نعمانی نے عصری حسیت کا اظہار اپنی بے شمار نظموں میں کیا ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی پر

ان کی نظم ''اسلام کے تنزل کا اصلی سبب'' ایک بالواسطہ نعت ہی کے ذیل میں پڑھی جانی چاہیے جس میں مسلمانوں کو نصِ قرآن کے تحت بھائی بھائی بتانے اور عملاً اس بھائی چارے سے انحراف کرنے کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

نصِ قرآں سے مسلمان ہیں بھائی بھائی اِس اُخوّت میں خصوصیتِ اعمام نہیں
یاں یہ حالت ہے کہ بھائی کا ہے بھائی دشمن کون سا گھر ہے جہاں یہ روشِ عام نہیں
نہ کہیں صدق و دیانت ہے نہ پابندیٔ عہد دل ہیں ناصاف زبانوں میں جو دشنام نہیں
آیتِ فاعتبروا پڑھتے ہیں ہر روز مگر علماء کو خبرِ گردشِ ایام نہیں [۱۹]

ڈپٹی نذیر احمد المتوفی ۱۹۱۲ء نے اپنے عہد کا آشوب اس طرح آئینۂ سخن میں ڈھالا:

جملہ سامان یاس و غم کا ہے صرف اک آسرا کرم کا ہے
مخلصی بخشیے خرابی سے کہیں کہہ دیجیے شتابی سے
صرف اتنا ہی عرض کرتا ہوں زیادہ ابرام سے بھی ڈرتا ہوں [۲۰]

حضورِ اکرم ﷺ سے غمِ دل کہنے اور آپ سے مسلمانوں کے عہدِ زوال کو ٹالنے کے لیے دعاؤں کی درخواست کرنے کا خیال عصری ماحول کی تاریکیوں میں اجالا کرنے کا ذریعہ بھی تھا اور مذہب بیزاری کی فضا کو گدازِ عشقِ نبوی عطا کرنے کا وسیلہ بھی۔ ریاض خیر آبادی (المتوفی ۱۹۳۵ء) نے غلام ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں اور ہندوؤں کی طرف سے ہونے والی زیادتیوں کا احوال سنا کر استمداد چاہی ہے:

وہ چمک درد کی ہو دل میں کہ بجلی چمکے دامنِ طور ذرا آج یہ سینہ ہوجائے
تو جو چاہے ارے او مجھ کو بچانے والے موجِ طوفانِ بلا اُٹھ کے سفینہ ہوجائے [۲۱]

دلدار علی مذاق بدایونی کا دیوان ۱۲۸۱ھ میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اس میں اپنی اجتماعی جاں کاہی واذیت ناکی کا ذکر بڑے کرب سے کیا ہے:

کیا کہوں آہ یا رسول اللہ ہم ہیں جاں کاہ یا رسول اللہ
قصۂ غم ہے طول کیا کہیے قصہ کوتاہ یا رسول اللہ
راہ تکتا ہوں تیری، نکلے گی کچھ نہ کچھ راہ یا رسول اللہ [۲۲]

حکیم مؤمن خاں مؤمن اپنے قصیدے میں ''روزگارِ نامانوس'' کی شکایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

شہا ستم ہے کہ تیرے مدیح خواں پہ کرے ہزار گونہ ستم روزگارِ نامانوس
کچھ انتہا بھی کواکب کے دَورِ بے جا کی ہمیشہ ہے مرے طالع میں اجتماعِ نحوس

جو اپنی حسرت و ارمان میں بیان کروں
نہ تاب لائے دلِ سخت زاہدِ سالوس
جفا کو آئے مری دل شکستگی پہ رحم
بلا کرے مرے احوالِ زار پر افسوس [۲۳]

حافظ محمد عالمگیر خان، کیف ٹونکی المتوفی ۱۹۴۰ء نے پیرایۂ غزل میں دل کا مطلب اور ناموافق فضا کا احوال نقل کیا ہے:

کیسے ہی جاؤں گا عرضِ مطلب، ملے گا جب تک نہ دل کا مطلب
نہ شام مطلب کی صبح ہوگی ہرگز نہ یہ فسانہ تمام ہوگا
اسی توقع پہ جی رہا ہوں، یہی تمنا جلا رہی ہے
نگاہِ لطف و کرم نہ ہوگی تو مجھ کو جینا حرام ہوگا [۲۴]

جوش ملیح آبادی اپنی رندی و شاہد بازی کے باوجود امتِ مسلمہ کے زوال و اِدبار کی کہانی بارگاہِ رسالت مآب میں پیش کرتے ہیں تو دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے:

تجھ پہ نثار جان و دل مڑ کے ذرا یہ دیکھ لے
دیکھ رہی ہے کس طرح ہم کو نگاہِ کافری
تیرے گدائے بے نوا تیرے حضور آئے ہیں
چہروں پہ رنگِ خستگی سینوں میں دردِ بے پری
آج ہوائے دہر سے ان کے سروں پہ خاک ہے
رکھی تھی جن کے فرق پر تونے کُلاہِ سروری
تیرے فقیر اور دیں کوچۂ کفر میں صدا
تیرے غلام اور کریں اہلِ جفا کی چاکری
طرفِ کلہ میں جن کے تھے لعل و گہر ٹکے ہوئے
حیف اب ان سروں میں ہے دردِ شکستہ خاطری
جتنی بلندیاں تھیں سب ہم سے فلک نے چھین لیں
اب نہ وہ تیغِ غزنوی، اب نہ وہ تاجِ اکبری
اُٹھ کہ ترے دیار میں پرچم کفر کھل گیا
دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحنِ حرم میں ابتری
جوش کے حالِ زار پر رحم کہ تیری ذات ہے
شعلۂ طورِ معرفت شمعِ حریمِ دلبری [۲۵]

احسان دانش نے غزل کے مخصوص مزاج سے ہم آہنگ ایک شعر میں حضورِ اکرم ﷺ کی غلامی کا اعلان کرتے ہوئے آپ ﷺ سے وابستگی کا داعیہ ظاہر کیا ہے۔ ساتھ ہی دنیا کے تمام افراد، اقوام، حکمرانوں اور معاشرے کے بے راہ رو طبقات کے تقاضوں کو رد کرنے کا عزم بھی ظاہر کیا ہے:

جب میں بجز حضورؐ کسی کا نہیں غلام
پھر کیوں کسی کی نازشِ بیجا اٹھائی جائے [۲۶]

نازش اٹھانے کا مطلب ہے ''دوسرے کی بے پروائی یا گھمنڈ کو برداشت کرنا''۔ غزل گو شعراء نے ،عموماً بے پروائی اور گھمنڈ کا مصداق اپنے محبوب کو بنایا ہے۔ غزل گو عاشق تو بقول مؤمن خاں مؤمن، کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل جانے کو تیار رہتا ہے۔ لیکن نعت کہتے ہوئے کوئی بھی شاعر ایسے

کسی محبوب کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ احسان دانش نے بھی ''کسی کا'' کہہ کر یہ بات واضح کردی کہ اس ضمیرِ غائب میں ہر وہ فرد، قوم، حکمران اور معاشرے کا طبقہ آجاتا ہے جو حضورِ اکرم ﷺ کے جادہ ء مستقیم سے ہٹ کر عمل کرنے یا کسی قسم کی رعایت کا مطالبہ کرے۔ جبکہ عصرِ حاضر میں، ایسے مطالبات نے، مسلمانوں کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔

عصری حسیت، عصری شعور یا عصری آگہی کا تقاضا ہے کہ کوئی موضوع بار بار دہرایا جائے۔ کسی موضوع کی تکرار کا عمل معاشرتی سطح پر ذہن نشینی یا INDOCRINATION کا عمل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی خاص صورتِ حال میں شعراء و ادبا کے لیے کوئی موضوع مرکزِ توجہ بن جاتا ہے۔ نعتیہ شاعری بھی مسلمانوں کی ذہنی بیداری اور بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لیجانے کی خواہش کے تحت شعراء کا موضوع بنی اور بن رہی ہے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد، کافی مدت تک، ادبی دنیا پر ترقی پسندی کے نام پر الحادی فکر کا غلبہ رہا۔ ان ادباء و شعراء نے حمد و نعت کے لیے ادبی دنیا کے دروازے بند کردیئے اور حمد و نعت کہنے والے شعراء کو رجعت پسند ہونے کے طعنے دیئے جانے لگے۔ اس ضمن میں شمیم احمد نے لکھا:

''قیامِ پاکستان کے بعد جب مسلم لیگ کا طرزِ عمل اپنے ہی نصب العین کے خلاف حرکت کرتا ہے اور اس سے مایوسی اور شکست خوردگی پیدا ہوتی ہے تو ادب کے ایک طالبِ علم کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ادب کے جدید علم برداروں کی صفوں سے مختار صدیقی، یوسف ظفر، قیوم نظر نکل کر اس ذاتِ گرامی ﷺ کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کر رہے ہیں، جس کا پرتو بھی چند سال قبل تک ان کی شاعری پر نہیں پڑا تھا۔ نعت گوئی نے اُردو شاعری کے جدید اسلوب میں اس طرح اپنی لازوال قوت کا ثبوت دیا ہے'' [۴۷]

مسلمانوں کی دین سے دوری، اصلی اقدار سے بے گانگی، اخلاقی پستی اور دنیاوی بے بسی و لا چارگی کا نقشہ ظہور نظر نے کھینچا ہے:

رسولِ اکرم!
حضورِ صلعم!
خدا سے کہیے!
بزرگ و برتر خدا سے کہیے!
کہ ہم جو اس کی فضیلتوں کو، بشارتوں کو بھلا چکے ہیں
محبتوں کو، عنایتوں کو، نوازشوں کو لٹا چکے ہیں

ہمیں پھر اپنی فضیلتیں دے، بشارتیں دے
محبتیں دے، عنایتیں دے، نوازشیں دے
نہیں تو ہم غفلتوں کے جس تیرہ غار میں محوِ خواب ہیں
بے ضمیری و بے حسی کی جس بے پناہ گہرائی میں پڑے ہیں
ابد کے دن بھی وہیں سے ہم کو اٹھائے گا وہ!! [۲۸]

حافظ مظہر الدین (المتوفی ۱۹۸۰ء) کی نعتیہ شاعری میں ان کے قلب کا گداز اور مسلم معاشرے کی بے راہروی پر کڑھن کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر "میرِ عرب ﷺ" کی جناب میں اس انداز سے عرضِ غم کرتے ہیں:

المدد المدد شہِ کونینؐ — وقتِ نصرت ہے غمگسارِ حرم
الغیاث الغیاث میرِ عرب — آج خطرے میں ہے وقارِ حرم
متحد ہیں یہود بہرِ قتال — منتشر جملہ شہسوارِ حرم
ہیں کلیسا و دَیر شیر و شکر — زہر آلود خلفشارِ حرم
اب دلوں میں نہیں وہ جوشِ عمل — ہوگیا سرد شعلہ زارِ حرم
ہائے انجامِ کار کیا ہوگا — لے نہ ڈوبے یہ انتشارِ حرم
چارہ سازِ شکستگاں فریاد! — دیکھ پامالیٔ بہارِ حرم [۲۹]

ایک نعتیہ غزل نما نظم میں دلِ شکستہ کا حال اس طور بیان میں آتا ہے:

ہوں داد خواہ کہ مغموم و سوگوار ہوں میں — ہے دل شکستہ، جگر ٹکڑے ٹکڑے، سینہ فگار
زبان کھل نہیں سکتی کہ ہے مقامِ ادب — یہ بارگاہِ مقدس، یہ آپ کا دربار
جو دل میں درد ہے وہ قابلِ بیاں بھی نہیں — جو داغ سینے میں ہیں کس طرح ہو ان کا شمار
حضور! آپ پہ ظاہر ہے حالِ قوم و وطن — حضور! جانتے ہیں آپ غیب کے اسرار
حضور! ایک توجہ کہ وقتِ نصرت ہے — حضور! ہوگئے دنیا میں ہم ذلیل و خوار
کرم کی ایک نظر ہو تو سب بدل جائے — نظامِ گردشِ دوراں، نظامِ لیل و نہار [۳۰]

علامہ اقبال کو عصری آگہی نے بے چین کر رکھا تھا۔ ان کی نظر میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا پورا نقشہ تھا اور وہ عہدِ موجود کی ابتلاؤں کا مداوا چاہتے تھے۔ دیکھیے اقبال، حضورِ اکرم ﷺ کو کس کرب سے پکارتے ہیں:

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر — اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے [۳۱]

مولانا عبدالباری معنی اجمیری نے، بساطِ کائنات کو حشر در آغوش پا کر، کس طرح آقا ﷺ کو پکارا، ملاحظہ فرمایئے:

اے رسولِ پاکؐ اے پیغمبرِ قدسی صفات اے حبیبِ ذات اے غارت کنِ لات ومنات
ہے زمیں کا ذرہ ذرہ دشمنِ اسلام آج حشر در آغوش ہے گویا بساطِ کائنات
تل رہی ہیں دوسری قومیں مٹانے کے لیے منقلب ہے امتِ مرحوم کا دورِ حیات
دھوم تھی کل تک جہاں میں جس کے استقلال کی ضعف سے ہے آج لغزش میں وہی پائے ثبات
پھر عطا فرما وہی اسلاف کے جوہر ہمیں اپنا سکہ پھر جما دینا ہے عالم پر ہمیں
قوتِ خالد سے پھر بازو قوی ہوں قوم کے پھر عطا ہو جذبۂ ایمانیٔ بوذرؓ ہمیں
پھر ہمارے نعرۂ تکبیر کا ہو غلغلہ پھر عطا ہو زورِ دستِ حیدرِ صفدر ہمیں
پھر ہمارا نام سن کر آسماں بھی کانپ اٹھے پھر بنادے سطوتِ فاروقؓ کا مظہر ہمیں
نصرت و تائیدِ حق ہو پھر ہمارے ساتھ ساتھ پھر کہے سارا جہاں اللہ کا لشکر ہمیں
پھر اسی سرعت سے طے ہوں ارتقا کی منزلیں دیکھتی رہ جائے پھر حیرت سے دنیا بھر ہمیں
گوش کن این التجائے معنیٔ بیچارہ ر پائے بندِ بندگی کن بندۂ آوارہ را [۳۲]

حکیم احمد شجاع ساحرؔ (المتوفی ۱۹۶۹ء) اپنے دل کا حال اس طرح بارگاہِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں پیش کرتے ہیں:

اے شہِ لولاک، اے شاہنشہِ دنیا و دیں اے شفیع المذنبیں اے رحمۃ للعالمیں
آج تیرے عتبۂ اقبال پر آیا ہوں میں دل کے ٹکڑے نذر کرنے کے لیے لایا ہوں میں
حسن کو چالاک کر، پھر عشق کو بے باک کر کچھ علاجِ گردشِ ایامِ عبرت ناک کر
قلب کو تابِ پرِ پروانۂ بے تاب دے آنکھ کو اشکِ روان و فطرتِ سیماب دے
جامِ صہبائے کہن ہاں دور میں آجائے پھر تیرے دیوانوں کی ہُو سے آگہی گھبرائے پھر
وسعتِ صحرا پہ ہو پھر خندہ زن دیوانگی سرخ رُو ہو جائے وحشت منفعل فرزانگی
نعرۂ حق رازِ شعرِ من بلند آوازہ کن بادِ بزمِ رفتگاں را از فغانم تازہ کن [۳۳]

تاج الدین تاج عرفانی نے حضورِ اکرم ﷺ کی جناب میں، دنیا کی طرف سے امتِ مسلمہ پر

توڑے جانے والے ظلم و ستم کی داستان بیان کی:

آپؐ سے مخفی نہیں حالِ زبوں میرا حضورؐ
معجزے سے اب بدل جائے ذرا نقشِ دِژَم
میرے آنسو کون پونچھے گا تمھارے عشق میں
میں دکھاؤں کس کو جا کر دیدہء لبریز نم؟
آپ کو معلوم ہے، دنیا نے مجھ سے کیا کیا
میں سناؤں کس کو جا کر آہ رُودادِ ستم؟[۳۴]

م۔حسن لطفی نے بھی حقیقت نگاری کی راہ اپناتے ہوئے شکوہء عصرِ غلامی کیا ہے۔اس شعری عمل میں شاعر کا تجربہ اور عصری حسیت کا اندوہِ غم اس طور ہم آمیز ہوئے ہیں کہ کوئی بھی قاری اس شعری و شعوری نقش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا:

کیا کہوں اپنے وطن سے تحفہ کیا لایا ہوں میں
آنسوؤں سے بھیگتی جاتی ہے میری آستیں
پیشکش میری، ہے میری طرح بے برگ و نوا
انفعالِ ہدیہ سے نمناک ہے میری جبیں
آج اُس ہندوستاں سے ہے غلامی کو دوام
آہ! جو ہندوستاں تھا رشکِ فردوسِ بریں
یوں جہالت کے پجاری ہیں دو رکعت کے امام
پوجتے ہیں جس طرح زَر اس وطن کے مشرکیں
آہ! یہ رونا مرا، رونا نہیں اک ہند کا
ہر سوادِ شرق میں یورپ ہے ناسور آفریں
کب سے استیلائے افرنگی سے ہے مشرق خراب
کب سے ہے تلخابہ آمیز آہ! جامِ انگبیں
سلسلہ در سلسہ ہے داستانِ کید و قید
آہ! کب ٹوٹیں گی یہ زنجیر ہائے آہنیں ؟
اک بہانہ دے گئی جنگِ اروپا اس کو آہ!
دشمنِ اسلام قوت تھی جو روپوشِ کمیں
اس طرح لارنس نے پھونکا کچھ افسونِ فرنگ
ہاشمی نے بیچ دی سب عزت و ناموسِ دیں
مل رہی ہے اپنی غداری کی عربوں کو سزا
پہلے جو اشراف تھے دنیا میں، اب ہیں سافلیں
جو مجاہد تھے وہ مذہب کے مجاور رہ گئے
جو کبھی شاہیں تھے اب ہے شان ان کی کرگسیں
جن شتر بانوں کی شمشیریں رہیں کشور کشا
وہ خس و خاشاک و خاکستر کے ہیں اب خوشہ چیں
ہیں نشیبِ صحر کی ڈھلوان پر ساکت نخیل
پا بگل، سرگشتہ، گُم صُم، بے نیازِ آن و ایں
آہ! اک مدت سے وہ سب ہو چکے پیوندِ خاک
خستہ جانوں کی سپر ہوتے جو صائب صالحیں
آپؐ کی فرمودہ آیات آج تک ہیں حرزِ جاں
مژدہء لاتقنطوا پر ہم کو اب تک ہے یقیں
سرورِ کون و مکاںؐ! ہم پر کرم کی اک نظر
نہضتِ ملی کے سائل ہیں جہاں کے مسلمیں
زائل اِدبارو زبوں حالی کے ہو جائیں تمام
کامگارو کامراں ہوں خائبین و خاسریں
ملتِ بیضا کے حق میں حق سے کیجیے یہ دعا
''رحم کر اس قوم پر ربّ رحیم الرّاحمیں''[۳۵]

امت کی ابتری کی سب سے بڑی وجہ اسلامی دنیا پر علمِ دین کے پردے میں خلفشار پھیلانے

والے دو رکعت کے اماموں کا تسلط ہے۔ عبداللہ خاورؔ نے اس دکھ کو محسوس کیا اور حضورِ اکرم ﷺ کی جناب میں کوئی مجدد عطا کرنے کی التماس پیش کردی:

وہ اہلِ فکر جو بدعت کو اجتہاد کہیں
بدل نہ دیں کہیں دینِ حنیف کا منشور

گھرا ہے یورشِ تشکیک و وہم میں مومن
ہوئی ہیں عام جہاں میں رسومِ فسق و فجور

حضورؐ! کوئی مجدد عطا ہو ملت کو
ہو جس کے فیض سے احیائے دینِ حق کا ظہور

چلے زمانے میں بس امرِ آمرِ مطلق
جہاں میں رایتِ دیں ہو مظفر و منصور

حضورؐ! ایک نظرِ التفات سے مملو
بنامِ آیۂ رحمت بنامِ ربِّ غفور

بہت طویل ہیں آلامِ دہر کے سائے
بہت دراز ہے اب دامنِ شبِ دیجور [۳۶]

عبدالرؤف، ادیب سہانپوری (المتوفی ۱۹۶۳ء) نے اپنے عہد کے عالمی منظرنامے کو انسانیت کے لیے ہلاکت خیز بتاتے ہوئے آخر میں امتِ مسلمہ کو بھی اسی ڈگر پر چلتا ہوا دکھایا ہے اور حضورِ اکرم ﷺ سے استمداد چاہی ہے:

پانی پانی ہو رہا ہے دورِ وحشت شرم سے
کارناموں پر ترقی یافتہ انسان کے

ملتوں کو جو چلائے جادۂ تخریب پر
لعنت ایسے علم پر پھٹکار اس تہذیب پر

آہ اے گمراہ مغرب اے گرفتارِ اجل
مجھ سے سُن ناداں یہ ہے مذہب سے بیزاری کا پھل

الاماں مذہب سے بیزاری کا جذبہ الاماں
جس سے چھا جاتی ہیں قلب و ذہن پر تاریکیاں

ذہنیت کو کر کے بیجا خود شناسی کا اسیر
چپکے چپکے گھونٹتا رہتا ہے آوازِ ضمیر

کیوں نہ میں کہہ دوں ادیبؔ آخر جو میرے دل میں ہے
امتِ تہذیبِ حاضر بھی اسی منزل میں ہے

چیخ اٹھنا چاہتی ہے غم سے گھبرا کر زمین
رحمۃ للعالمین یا رحمۃ للعالمین [۳۷]

حفیظ جالندھری نے امتِ مسلمہ کی بیداری کے لیے غزواتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا منظوم ذکر اپنی شاہکار تصنیف ''شاہنامۂ اسلام'' میں کیا۔ انھوں نے بڑی سادی زبان میں براہِ راست فریاد کرتے ہوئے اپنے عہد کے ہوش ربا احوال قلم بند کیے:

وہ جس سے ربط قائم ہے زمینوں آسمانوں میں
وہ جس کا ذکر ہوتا ہے مؤذن کی اذانوں میں

زمین و آسماں ہی جب ستم ایجاد کرتے ہیں
اسی کے نام لیواؤں پہ جب بیداد کرتے ہیں

میں ایسے حال میں تنگ آ کے جب فریاد کرتا ہوں
اسی کا نام لیتا ہوں، اسی کو یاد کرتا ہوں

وہ جس نے ابرِ رحمت بن کے بے جانوں کو جاں بخشی
چمن کو رنگ بخشا اور بلبل کو زباں بخشی

اسی کے باغ پر جب برق شعلہ ریز ہوتی ہے
اسی کے بے زبانوں پر چھری جب تیز ہوتی ہے

میں ایسے حال میں تنگ آ کے جب فریاد کرتا ہوں
اسی کا نام لیتا ہوں، اسی کو یاد کرتا ہوں [۳۸]

پروفیسر منظور حسین شور کی عصری آگہی کا عکس ان کے شعری عمل پر اس طور پڑا کہ انھوں نے اپنے عہد میں طاقتور قوموں کو ضعیف قوموں کا لہو پیتے دیکھا۔ چناں چہ گھبرا کر حضورِ اکرم ﷺ کی نظرِ رحمت کی استدعا کی:

اے وہ کہ غلاموں کو جس نے بخشی ہے زمیں کی آقائی
آفاق کو روندے گا کب تک تلووں سے غرورِ دارائی
جمہور اٹھائے گی کب تک تابوتِ ظلِ سبحانی
جمہور کی زندہ لاشوں پہ ناچے گی کہاں تک سلطانی
بیچیں گے ضمیروں کو کب تک ابنائے حرم بازاروں میں
تکبیر رہے گی گم کب تک زنجیروں کی جھنکاروں میں
قوموں کے لہو سے قوموں کے لبریز پیالے آج بھی ہیں
بازارِ امم میں اپنے خدا کو بیچنے والے آج بھی ہیں
پردے میں تمدن کے کب تک انسان کو انساں کھائے گا
یہ ابر کہاں تک برسے گا، یہ سیل کہاں تک جائے گا
تاریک اُفق کے ماتھے سے کب رات کی ظلمت چھوٹے گی
صبحوں کا اجالا کب ہوگا، سورج کی کرن کب پھوٹے گی
اے پشت پناہِ کون و مکاں اس سمت بھی اک رحمت کی نظر
سن میری فغاں! لے میرا سلام! اے ارض و سما کے پیغمبرؐ [۳۹]

سید ہاشم رضا نے سوشلزم کے شور و غوغا کے زمانے میں اپنی آواز اس طرح بلند کی:

نہ سوشلزم سمجھتے ہیں ہم نہ کیپٹل ازم
ہمارے فہم و فراست کا رخ ہے سوئے رسولؐ [۴۰]

فضل الرحمٰن، نعیم صدیقی نے امتِ مسلمہ کی پستی کی وجوہات کا احاطہ کرتے ہوئے نعت کا آہنگ پیدا کیا ہے اور نعت لکھنے میں اپنی دشواریوں کا ذکر کرکے شعری متن کو ایک نیا رخ دیا ہے:

یہ تیرے عشق کے دعوے یہ جذبۂ بیمار — یہ اپنی گرمیٔ گفتار، پستیٔ کردار
رواں زبانوں پہ اشعار، کھو گئی تلوار — حسین لفظوں کے انبار، اُڑ گیا مضموں

میں ایک نعت کہوں، سو چتا ہوں کیسے کہوں؟

فلک پہ اُڑ کے بھی شاہیں اسیرِ دام رہے | پہن کے تاج بھی غیروں کے ہم غلام رہے
نہ کارساز خرد ہے نہ حشر خیز جنوں | بنے تھے ساقی مگر پھر شکستہ جام رہے

میں ایک نعت کہوں، سو چتا ہوں کیسے کہوں؟

کہاں سے شعر کو اخلاص کا جمال ملے | یہاں کہاں سے مجھے رفعتِ خیال ملے
حضورؐ! ایک ہی مصرع یہ ہوسکا موزوں | کہاں سے قال کو گم گشتہ رنگِ حال ملے

میں ایک نعت کہوں، سو چتا ہوں کیسے کہوں؟ [۴۱]

کامل جونا گڑھی (المتوفی ۱۹۷۷ء) کے عصری شعور کا عکس ان کے جن اشعار میں جھلک رہا ہے ان میں ''خوفِ باطل'' سے نجات دلانے کی دعا ہے۔ اقبال نے خوفِ مرگ سے نجات کی راہ دکھانے کی سعی کی تھی۔ کامل جونا گڑھی نے دعا کی ہے:

الٰہی! طفیلِ محمد تجر لے
ہے آفت پہ آفت یہ امت پہ کب سے
صدا لاتخف کی سنا مؤمنوں کو
ڈرے ہیں یہ غیروں کے شور و شغب سے
وہی تُو پھر اپنے کرم سے دکھا دے
جو تھا دور پہلے کئی سال اب سے
ہر آفت سے ہم خادموں کو بچالو!
یہ ہے عرضِ کاملؔ اِشہِ خوش لقب سے [۴۲]

منور بدایونی نے امت کی زبوں حالی کے تدارک کے لیے حضورِ اکرم ﷺ کو پکارا ہے:

اب حد سے سوا ہیں رنج و الم، یا شاہِ امم ، یا شاہِ امم
مجبور ہیں ہم، لاچار ہیں ہم، یا شاہِ امم ، یا شاہِ امم
بیکس ہیں، سہارا کوئی نہیں، دنیا میں ہمارا کوئی نہیں
اب دشمن ہے سارا عالم، یا شاہِ امم ، یا شاہِ امم
رخ عیش و طرب نے پھیرا ہے، اب یاس و الم کا گھیرا ہے
اس وقت کے ہاتھوں تنگ ہیں ہم ، یا شاہِ امم ، یا شاہِ امم

هم لُٹ بھی چکے، ہم کٹ بھی چکے، اب گھر بھی نہیں، اب در بھی نہیں
اب کس کو سنائیں حالِ غم یا شاہِ امم ، یا شاہِ امم
تقدیر کہاں تک بگڑے گی، کب وقت ہمارا پلٹے گی
اے رازِ حقیقت کے محرم، یا شاہِ امم ، یا شاہِ امم[۴۳]

امتِ مرحومہ کے زوال اور اِدبار کا غم، تقریباً ہر نعت گو کے دل میں ہے۔ غموں کی دھوپ سے بچنے کے لیے اکثر شعراء نے سایۂ دامانِ مصطفیٰ ﷺ میں آنے کی تمنا کی ہے۔ شاہ محمد سبطین شاہجہانی نے بھی یہی فریاد کی ہے:

ترحم یارسول اللہ، عنایت یا رسول اللہ
غموں کی دوپہر ہے، ابرِ رحمت یا رسول اللہ
گھری ہے نرغۂ ظلمت میں امت ایک مدت سے
عنایت یارسول اللہ، عنایت یارسول اللہ [۴۴]

دنیائے شاعری میں براہِ راست کلفتوں کا بیان نہیں ہوتا ہے۔ شعری اظہار میں، صرف اپنے احساسات کا کرب یہ جھلکتا ہے۔ عصری حسیت کے اشارے چند لفظوں میں کیے جاتے ہیں۔ سعید وارثی نے ''سرکارِ دوعالم ﷺ کے حضور!'' کے عنوان سے چند ابیات میں کربِ دروں سمودیا ہے:

بہت فریب دیئے ہیں مجھے زمانے نے
ستم گزیدہ ہوں لیکن بہ اعتبارِ یار
ڈبونا چاہا سفینہ مرا تلاطم نے
مگر کہاں ترا لطف و کرم کہاں منجدھار
خلوص و جذبِ محبت کے آبگینے میں
جھلک رہے ہیں کئی اشکِ غم مرے سرکارؐ
یہ اہلِ دولت و ثروت یہ صاحبانِ حشم
نگوں نہ کرسکے خود داریوں کا میری علم
جبیں جو تیرے نقوشِ قدم پہ جھکتی ہے
وہ بارگاہِ تکبر میں ہوسکے گی نہ خم
یہ اور بات کہ دنیا نے غم دیے مجھ کو
یہ واقعہ ہے کہ مجھ کو عزیز تیرا غم
حجابِ زُہد میں مکروریا کے پُتلے ہیں
یہ صاحبانِ تکلف یہ صاحبانِ حرم
نہ ہوتا تیریؐ محبت کا آسرا مولاؐ
تو رکھتا کون جہاں میں مری انا کا بھرم[۴۵]

ریاض حسین چودھری نے بھی استغاثہ پیش کیا ہے کہ عصری شعور نے انھیں ملتِ بیضا کو غبارِ شب میں ڈوبا ہوا دکھایا ہے:

پھر کوئی سورج ہتھیلی پر جلے یا سیدیؐ
ملتِ بیضا غبارِ شب میں ہے ڈوبی ہوئی
یا رسول اللہ ، گھٹاؤں کا ہدف میرا بدن
سیلِ تند و تیز میں رکھیے سلامت جھونپڑی
آج بھی بادِ مخالف کے نہیں تیور قبول
آج بھی بھیگی ہوئی سب کشتیاں ہیں کاغذی
زندہ لاشوں سے میں کرتا کس طرح صرفِ نظر
خاکِ طیبہ سے ملا ہے مجھ کو ذوقِ آگہی

میں قسم کھاؤں گا کس کی نیک نامی کی یہاں — جب کرپشن میں ملوث ہے فقیرِ راہ بھی
اپنی بستی پر چٹانوں کو برستے دیکھ کر — میرے ہونٹوں پر ہے، آقا! بے بسی کی خامشی [۴۶]

عصری حسیت کے غلبے کی صورت میں، عموماً شعراء میں اپنے ماحول سے ذہنی و روحانی گریز کی کیفیت نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر نعتیہ شاعری میں استغاثے کی صورت، شکایتِ دوراں ہی زبانِ قلم پر آئی ہے۔ تاہم کہیں کہیں رجائی انداز بھی جھلکنے لگتا ہے۔ جیسے یاور وارثی عزیزی نوابی کے ان اشعار میں جھلک رہا ہے:

غلامِ سرورِ دیں کا مکاں رہا محفوظ — اگر چہ شہر میں طوفانِ سنگ آئے بہت
کھلا جو شاخِ تمنا پہ ان کے نام کا پھول — مسرتوں کے سنہرے پرندے آئے بہت
خیالِ گنبدِ خضرا جو ساتھ چلنے لگا — ہراس و خوف کے آسیب تھرتھرائے بہت
جھلستی دھوپ کے سینے پہ لکھ دیا جو وہ نام — نوازشات و عنایت کے ابر چھائے بہت

ان اشعار میں شاعر نے طوفانِ سنگ، مسرتوں کے سنہرے پرندے، ہراس و خوف، جھلستی دھوپ وغیرہ کہہ کر منفی قوتوں کی طرف اشارے کیے ہیں جو عصری حسیت کے آئینہ دار ہیں۔ ان اشعار کے ساتھ ہی یاور وارثی نے ایک شعر میں اپنے عہد میں روشنیوں کی کمی اور سایوں کے بڑھ جانے کا اندیشہ بھی ظاہر کر دیا ہے:

عجیب حال ہے آقا ہمارے کوچے کا
یہاں پہ روشنیاں کم ہیں اور سائے بہت [۴۷]

اقبال عظیم نے زندگی کے اتار چڑھاؤ دیکھے، تو انھیں احساس ہوا کہ اسلامی معاشرہ حرص و ہوا میں کھو گیا ہے۔ چناں چہ ان کو "مشورہ، راہنماﷺ" یاد آیا اور انھوں نے اپنے احساس کو شعری سانچے میں اس طرح ڈھالا:

راستے بھول گئے بانگِ درا بھول گئے — قافلے مشورہء راہنما بھول گئے
ایسے نادان مسافر کہیں دیکھے نہ سنے — اپنی سمجھی ہوئی منزل کا پتہ بھول گئے
داعیٔ حق کو یہ شکوہ ہے حرم والوں سے — جاں نثارانِ وفا عہدِ وفا بھول گئے
ہم یہ کہتے ہیں کہ بندے ہیں خدا کے لیکن — کیا ہے فرمودہء محبوبِ خدا بھول گئے
عیشِ دوراں نے کیا ہم کو خدا سے غافل — کیا ہے اس جرمِ تغافل کی سزا بھول گئے
اپنی تقدیر کو الزام دیئے جاتے ہیں — اور اس فکر میں ہم اپنی خطا بھول گئے
ایسے کھوئے گئے ہم حرص و ہوا میں اقبالؔ — مسلک و شیوۂ تسلیم و رضا بھول گئے [۴۸]

اس کے ساتھ ہی اقبال عظیم، حالات میں زہر کی تلخی محسوس کرتے ہیں تو ان کا شعری لہجہ بھی استغاثہ آمیز ہوجاتا ہے:

زندگی ہے مبتلائے تیرگی پھر عطا ہو اس کو نورِ آگہی
جوہرِ آئینۂ علم و یقیں اے سراپا رحمۃ للعالمیں
زہر کی تلخی ہے اب حالات میں دم گھٹا جاتا ہے اس ظلمات میں
المدد اے سبز گنبد کے مکیں اے سراپا رحمۃ للعالمیں [۴۹]

تاہم اقبال عظیم نے نعت میں رجائی پہلو کی طرف اشارے کرکے یہ بھی ثابت کردیا کہ جبرِ عہد کے باوجود وہ مایوس نہیں:

روکیں ہماری راہ، حوادث کی کیا مجال رکھتے ہیں ربط صاحبِ لوح وقلم سے ہم
لے کر چراغ ہاتھ میں عشقِ رسول کا مردانہ وار گزرے ہیں راہِ ظلم سے ہم
وہ جن کا نام سیدِ خیرالانام ہے وابستہ ہیں انہیں کے نقوشِ قدم سے ہم [۵۰]

حفیظ تائب نے نعتیہ شاعری کو ادبی آفاق پر چھا جانے والا اجالا دیا۔ ان کی شاعری میں عصری حسیت کا ظہور کبھی براہِ راست اور کبھی بین السطور ہوتا ہے۔ استمدادطلبی کا عاجزانہ انداز اور ان کے لہجے کا دھیما پن، سرگوشیوں کی صورت ان کے شعری ایوان میں صبا کی طرح مسلسل گردش کرتا ہے اور خوشبو کی طرح محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کی تمنا ہے:

فتنوں کی تیز دھوپ میں قائم رہیں حواس
خیرالامم کے سر پہ رہے سائبانِ خیر [۵۱]

آج امتِ مسلمہ اسلامی اقدار سے بہت دور ہے اور نظامِ زندگی کو دنیا کے بنائے ہوئے نظاموں کی میزان پر تول کر خود کو دوسروں کا فکری طور پر بھی کاسہ لیس بنا رہی ہے۔ اس طرف توجہ مبذول کروانے کے لیے حفیظ تائب "سبز گنبد" کا حوالہ دیتے ہیں۔ وہ سبز گنبد کو علامت کے طور پر شعری متن میں لاکر، امتِ مسلمہ کو "نظامِ مصطفیٰ ﷺ" کی طرف متوجہ کرتے ہیں:

اس کے ہوتے کس اجالے کی ہے دنیا کو تلاش
سبز گنبد کو برابر دیکھنا اور سوچنا (ایضاً ۲۸۹)[۵۲]

حالات کی نامساعدت اور ناموافقت کا احساس شعری سانچے میں ڈھل کر استغاثہ بن جاتا ہے تو حفیظ تائب اس طرح عرض گزار ہوتے ہیں:

آمادۂ شر پھر ہیں ستم گر مرے آقا امت کی خبر لے مرے سرور مرے آقا

افغانیوں پر کوہِ الم ٹوٹ پڑا ہے خوں ریز ہیں کہسار کے منظر مرے آقا
مسموم و شرر بار ہیں کابل کی فضائیں مغموم ہیں شمشاد و صنوبر مرے آقا
ہے سطوت محمود مسلماں سے گلہ مند غزنی کا ہر اک ذرہ ہے مضطر مرے آقا
پھر بھیک ہمیں قوتِ حیدر کی عطا ہو اک حشر بپا ہے پسِ خیبر مرے آقا
فریاد کناں ہیں درو دیوارِ فلسطیں ہیں نوحہ بلب مسجد و منبر مرے آقا
نبیوں کی زمیں منتظرِ حرفِ اذاں ہے پہنچے کوئی اسلام کا لشکر مرے آقا
سازش سے یہود اور نصاریٰ کی جہاں میں توحید کے فرزند ہیں بے گھر مرے آقا
صیہونیت افرنگ کے بل پر ہے نمو مند غازی ترے دم سے ہیں تونگر مرے آقا
ہر دورِ پُر آشوب میں اک تیری دعا نے بدلا ہے مسلماں کا مقدر مرے آقا
توفیقِ جہاد امتِ آخر کو بھی مل جائے طاغوت صف آرا ہے جو کھل کر مرے آقا
پھر غلبۂ اسلام ہو آفاق میں ہر سو تائب کو یہ حسرت ہے برابر مرے آقا [۵۳]

سعید بدر نے بھی عہدِ رواں میں بے ضمیر و بے اصول لوگوں کو فائز مند دیکھ کر خود کو صلیبِ جَور پر لٹکا ہوا محسوس کیا اور حضورِ اکرم کی جناب میں اپنی عرض داشت پیش کی:

ایک آہِ نارسا ہے طالبِ چشمِ کرم آپ کی قربت کا خواہاں ایک قلبِ ناصبور
ہر نخیلِ کربلا ہے بے ثمر، بے برگ و بار یوسفِ بے کارواں ہے منزل و مقصد سے دور
نام اک جبرِ مسلسل کا ہے ٹھہرا زندگی روح مردہ، جاں فسردہ، شیشۂ دل چور چور
فائز مند ہوئے ہیں بے ضمیر و بے اصول میں صلیبِ جَور پر لٹکا ہوں بے جرم و قصور
ارمغانِ نعت لایا ہوں، بصد عجز و نیاز گر قبول افتد زہے عز و شرف میرے حضورؐ
ایک مدت سے اسیرِ جَور ہے بدرِ حزیں آپ کی بس اک نظر ہے دین و دنیا کا سرور [۵۴]

یزدانی جالندھری نے با قاعدہ عصری آگہی کو پیرایۂ شہر آشوب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ روداد غم اس وقت کی ہے جب لبنان میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھے اور افغانستان پر روس نے قبضہ جمانے کی کوشش کی تھی۔ آج افغانستان پر امریکی قابض ہیں۔ فلسطین کی حالت ویسی ہی ہے جیسی شاعر نے بیان کی ہے۔ امتِ مسلمہ کے افتراق کا عالم جوں کا توں ہے۔ مسلمانوں کے ٹھکانے مسلسل دشمنانِ دینِ اسلام کے نشانے پر ہیں۔ ایسی صورت میں شعراء کیسے خوش رہ سکتے ہیں۔ غالب نے دل کا حال ان الفاظ میں رقم کیا تھا:

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا [۵۵]

اور یزدانی جالندھری نے حالات کی نزاکت کا احوال درجِ ذیل اسلوب میں لکھا ہے:

اپنی امت کی زبوں حالی پہ بھی ہو اک نظر — اے دکھی انسانیت کے چارہ ساز و چارہ گر
دیکھ سوئے مسجدِ اقصیٰ ، امام الانبیاء — قبلہء اول پہ قابض ہے یہودی فتنہ گر
افتراقِ باہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج — بے وطن اہلِ فلسطیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں گھر
ارضِ لبنان آتش و آہن کی بارش میں ہے غرق — خون میں ڈوبے ہوئے بیروت کے ہیں بام و در
سرزمین افغانیوں کی، زد میں ہے الحاد کی — سرخ آندھی چھارہی ہے غزنی و قندھار پر
اس کی بربادی پہ ہیں سب اہلِ باطل متحد — اس حقیقت پر نہیں لیکن مسلماں کی نظر
سوزِ ایماں سے ہوا ہے دل مسلماں کا تہی — راکھ کا اک ڈھیر ہے باقی نہیں جس میں شرر
شعلہء احساسِ غیرت اب کہیں باقی نہیں — صورتِ حالات ہے یاس آفرین و پُر خطر
الغرض حدِ نظر تک حشر کے آثار ہیں — ملتِ بیضا اسیرِ حزن ہے المختصر
سن مری رودادِ غم اے سبز گنبد کے مکیں — لے کے آیا ہوں دلِ اندوہگیں و چشمِ تر
اک اشارہ چارہ سازِ صورتِ حالات ہو — جس سے ہو ضو بار مستقبل کی تابندہ سحر
اتحادِ ملتِ بیضا کی پھر صورت کوئی! — پھر سے ہو یہ خستہ جاں چشمِ جہاں میں معتبر
پھر سے ہو پیدا دلوں میں سوز و سازِ آرزو — ہو پیامِ شاعرِ مشرق دلوں پر کارگر

"ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر" [۵۶]

دنیائے اسلام میں جہاد کا غلغلہ بلند ہوا تو دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں پر عرصہء حیات تنگ کر دیا۔ ایسی صورت میں گوسفندانہ رویہ اپنا کر جہاد کی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے صرف الفاظ کے انبار سے نعتیہ متن تیار کیا جانے لگا۔ لیکن عصری شعور کا تقاضا تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی "نبی الملاحم ﷺ" والی شان بھی ظاہر کی جائے۔ چناں چہ رحمٰن کیانی نے یہ فریضہ انجام دیا۔ انھوں نے اسلام میں عملی جہاد کا شعری منظر نامہ بھی بنایا اور خود مجاہدانہ زندگی بھی بسر کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں نبی ءکریم علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کا تصور "غزوات کے سرور ﷺ" کا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

جب بھی سپاہیوں سے پیمبر کو پوچھیے — خندق کا ذکر کیجیے ، خیبر کو پوچھیے
بدر و اُحد کے قائدِ لشکر کو پوچھیے — یا غزوہء تبوک کے سرور کو پوچھیے

ہم کو حنین و مکہ و موتہ بھی یاد ہیں   ہم امتیء بانیء رسمِ جہاد ہیں
رسمِ جہاد، حق کی اقامت کے واسطے   کمزور و ناتواں کی حمایت کے واسطے
خیر و فلاح و امن و عدالت کے واسطے   خیر الممات مرگِ شہادت کے واسطے
لڑتے ہیں جس کے شوق میں ہم، جھوم جھوم کے   پیتے ہیں جامِ مرگ کو بھی، چوم چوم کے [۵۷]

نعتیہ شاعری کو عصری ماحول کی روشنی میں معاشرتی اصلاح کے پیغام کی علامت بنا کر پیش کرنے میں بھی رحمٰن کیانی نے برہنہ گفتاری اور گھن گرج کے ساتھ اپنا شعری متن تیار کیا۔ اس ذیل میں وہ نعتیہ میدان میں تنہا نظر آتے ہیں۔ ایک طویل نظم ''پیغمبرِ انقلاب ﷺ'' کا اختتام کس شانِ حق گوئی کے ساتھ کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

اے مری قوم کے اہلِ زر دوستو!   محترم! مقتدر! بااثر! دوستو!
یعنی حکام و تجّار و جاگیر دار   اور شاہانِ ذی جاہ و والا تبار
اس سے بہتر نہیں بات کا اختتام   عرض کرتا چلوں پھر بصد احترام
تم بھی سب کی طرح ایک انسان ہو   اس پہ دعویٰ اگر ہے مسلمان ہو
فرق رکھو فقط کفر و ایمان میں   ورنہ اسلام اور اہلِ قرآن میں
کوئی گورا نہیں، کوئی کالا نہیں   کوئی ادنیٰ نہیں، کوئی اعلیٰ نہیں
برتری نسل نے مالِ دنیا کو ہے   یاں فضیلت فقط علم و تقویٰ کو ہے
اس لیے اے عزیزانِ عالی مقام   خود کو سمجھو فقط خادمانِ عوام
اور آقا نہیں بلکہ بن کر غلام   اُس پہ بھیجو درود، اُس پہ بھیجو سلام
جس نے تلقین کی، جس نے تہدید کی   بارہا جس نے لوگوں کو تاکید کی
یاد رکھے یہ میرا ہر اک امتی   تاقیامت جہاں میں کہیں اور کبھی
آدمیت پہ ظلم و ستم ہو اگر   عورتوں کے سوا ہر مسلمان پر
فرض ہے بر بنائے حقوق العباد   الجہاد، الجہاد، الجہاد، الجہاد!

اس نعتیہ نظم میں رحمٰن کیانی کا عصری شعور، قرآن وسنت کا پس منظری مطالعہ، قلمی جہاد کے لیے جراءت اور سچے اور ایک بیباک شاعر کا احساسِ ذمہ داری جھلک رہا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے معاشرے کے مقتدر طبقات کو اپنی طرف سے ڈھیل دینے اور اشرافیہ کے سرکش ہو کر مکر و فریب میں بہت آگے بڑھ جانے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ سورہ ء الانعام ۶، کی آیت ۱۲۴ کی تفسیر میں پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ لکھتے ہیں...... ''شہر کے چودھری اور رئیس اپنے اثر و رسوخ کو بحال رکھنے کے لیے پیغمبروں کے خلاف

الزامات لگاتے چلے آئے ہیں اور لوگوں کو انبیاء سے دور رکھنے کے لیے سارے جتن کرتے رہے ہیں‘‘۔[۵۹]

فی زمانہ مسلمان معاشرے میں ’’اشرافیہ‘‘ کے لوگ یہی کردار ادا کر رہے ہیں کہ دینی اقدار کو پامال کرتے ہوئے اپنے مفادات کے تحفظ اور عوام کے حقوق غصب کرنے کے لیے ہر سطح پر اقدامات کرتے ہیں اور یوں تعلیماتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو پسِ پشت ڈالنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ رحمٰن کیانی نے نظم کے آخری اشعار میں، عالمی منظرنامے اور اپنے وطن کے استحصالی ماحول کے بھرپور شعور کے ساتھ، جہاد کا اصل منشاء پیش کیا ہے۔ قرآنِ کریم کی سورۃ النساء کی آیت ۷۵ میں ارشاد ہوتا ہے ’’اور کیا ہو گیا ہے تمھیں کہ جنگ نہیں کرتے ہو راہِ خدا میں حالاں کہ کئی بے بس مرد اور عورتیں اور بچے ایسے بھی ہیں جو (ظلم سے تنگ آ کر) عرض کرتے ہیں، اے ہمارے رب! نکال ہمیں اس بستی سے، ظالم ہیں جس کے رہنے والے اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی دوست اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار‘‘۔[۶۰]

رحمٰن کیانی کا زورِ کلام اس نکتے پر مرکوز ہے کہ...... جہاد، حق کی اقامت اور کمزور و ناتواں کی حمایت کے واسطے ہے۔

سید شاکر القادری کے عصری شعور نے انھیں یہ احساس شعری سانچے میں ڈھالنے کی طرف مائل کیا کہ ملتِ اسلامیہ کے ہاتھ سے رشتۂ وحدت چھوٹ گیا ہے اور اب اپنے گھر کے چراغ سے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے۔

حضور ہاتھ سے چُھوٹا ہے رشتۂ وحدت
جلا رہے ہیں مرے گھر کو، میرے گھر کے چراغ

تمنائی انداز میں بھی شاکر القادری نے اپنے آئینۂ دل کا عکس پیش کیا ہے: مثلاً:

اللہ کرم کیجیے مجھ پر مرے سرورؐ ہیں درپئے آزار ستم گر، مرے سرورؐ!
بے رنگ ہے پھر روئے گُلِ تر، مرے سرور گلشن کی فضا ہے تہہ و بالا، شہِ والاؐ
ہو گلبنِ اُمید تناور مرے سرورؐ [۶۱] پھر ہو مرا گل زارِ تمنا تر و تازہ

اس کے علاوہ، شاکر القادری نے، برہنہ گفتاری کے روپ میں معاشرے کے مختلف طبقات کے طرزِ عمل کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کے لیے کچھ جارحانہ لہجہ بھی اپنایا ہے۔ شاعر کا یہ رویہ بھی اس کے ادبی خلوص اور دینی حمیت کا تقاضا ہے:

ملا کی قیل وقال غلط گفتگو غلط صوفی کا وجد و حال غلط ہاو ہو غلط

یہ ذکر و فکرِ نیم شبی یہ مراقبے	مستانہ وار نعرۂ اللہ ہو غلط
باطل ہے اہلِ حکمت و دانش کا ادّعا	ہر فلسفی کی فکر غلط جستجو غلط
بے کیف ہیں قیام و قعود و رکوع سب	زاہد تری نماز غلط ہے وضو غلط
یہ شعر و نغمہ ، حسنِ تخیل یہ فکر و فن	یہ آگہی، یہ عشق یہ ذوقِ نمو غلط
یہ ہجر یہ فراق یہ آشفتگی یہ درد	یہ قرب یہ وصال غلط آرزو غلط
وہ سنگِ در جبیں کو میسر نہ ہو اگر	یہ بزمِ کائنات غلط رنگ و بو غلط
ای ارجبینِ دل نہ نہادی بہ درگہش	تو رو بہ قبلہ ای و ترا قبلہ رُو غلط
ای بی خبر ز معنیِ لولاک گوش کن!	بی شاہد این مشاہدۂ رنگ و بو غلط
ای سرکشیدۂ درِ خیرالوریٰ شنو!	از بہر تست مژدۂ لاتقنطوا غلط

تا آن بہ حضرتش نہ رسیدی بصدقِ دل
چیزی درست نیست نگویم بہ تُو غلط [۶۲]

اس نظم میں شاکر القادری نے حضورِ اکرم ﷺ کی ذات کے سایۂ عاطفت میں آکر آپ ﷺ کی کامل اتباع کی دعوت دی ہے جس کے بغیر ہر عمل اور اس کی روشنی میں ہر امید، صرف دھوکا ہے۔ امتِ مسلمہ کی مجموعی بے عملی اور ہر شعبے میں ریاکاری کا مشاہدہ جب دل میں درد اور طبیعت میں گھٹن پیدا کرتا ہے، تب اس طرح کے اشعار کی آمد ہوتی ہے۔ ان اشعار کے آئینے میں پورے معاشرے کے احوال کا عکس نظر آرہا ہے۔

استغاثے کے ضمن میں، میں نے کسی جگہ، ایک معروضہ پیش کیا تھا۔ اس تحریر میں بھی میں اس کا اقتباس دینا چاہتا ہوں تاکہ اس حوالے سے میرا موقف بھی ظاہر ہوجائے اور استغاثے کا جواز بھی نکل آئے:

''استغاثے کے ضمن میں یہ نکتہ پیش کردینا ضروری ہے کہ شعراء کرام حضورِ اکرم سے اپنی دعا کی قبولیت کے لیے شفاعت کے طالب ہوتے ہیں۔ وہ حضورِ اکرم ﷺ سے براہِ راست دعا نہیں کرتے۔ امام محمد بن الجزری رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ''حصنِ حصین'' میں ایک دعا ہے جو خود حضورِ اکرم ﷺ نے ایک نابینا شخص کو سکھائی تھی۔ اُس دعا میں حضورِ اکرم ﷺ سے شفاعت طلبی کا آہنگ ہے۔ نابینا شخص نے وہ دعا حضور علیہ السلام کے بتائے ہوئے طریقے سے کی تو اس کو فوراً بینائی مل گئی تھی۔ دعا یہ ہے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُکَ وَ اَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِحَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ
یَا مُحَمَّدُ اِنِّی اَتَوَجَّہُ بِکَ اِلٰی رَبِّیْ فِیْ حَاجَتِیْ ھٰذِہٖ لِتُقْضٰی لِیْ
اَللّٰھُمَّ فَشَفِّعْہُ فِیَّ O

(اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف تیرے نبی محمد ﷺ کے واسطے سے متوجہ ہوتا ہوں وہ نبی جو رحمت والے نبی ہیں۔ اے محمد ﷺ! میں آپ کا واسطہ دے کر اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اپنی اس حاجت کے بارے میں تاکہ وہ پوری کردی جائے۔ اے اللہ! پس محمد ﷺ کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما![۶۳]

پاکستانی معاشرہ بالخصوص اور اسلامی دنیا کا ماحول بالعموم بیشتر اسلام گریزی کا عکاس بنتا جارہا ہے اس لیے ہر صاحبِ درد شاعر اس معاشرے کی بدصورتی (ugly face) کسی نہ کسی طور اشعار میں دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ نعتیہ قصائد میں حرفِ مدعا، لب پہ لاتے ہوئے شاعر اپنے معاشرے کی بد صورتی کا ذکر اس لیے کرتا ہے کہ وہ اسلامی ماحول کی خوبصورتی کے رنگوں کے ذریعے اپنے معاشرے کی تصویر کشی کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ ایک قصیدے میں سَرو سہارنپوری نے بڑے کرب کے ساتھ، اپنے معاشرے کے خدوخال ابھارے ہیں اور واقعتاً کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اے مطلعِ ایثار و مساوات کے نیر
اب اٹھ کے ترے در سے کہاں جائے گی دنیا
اب کس سے ہو ماحول کی ظلمت کا تدارک
اب تیرے سوا کون یہ ناسور بھرے گا
پھر دورِ جہالت کی طرف پلٹی ہے تاریخ
ہے پیشِ نظر آج وہی رنگ فضا کا
اب قوم پہ وہ سخت گھڑی آئی ہے مولا
جب وقت کے دھارے پہ بہی جاتی ہے دنیا
ایمان کی ضو گردِ مہ و سال میں گم ہے
ہاں حسنِ عمل کا نہیں اب کوئی ٹھکانا
لذت کی صلیبوں پہ ہیں عصمت کے جنازے
معراج پہ ہے وحشتِ انساں کا تقاضا
طاقت ہے فقط حسن و قباحت کی ترازو
دولت کے ذخائر ہیں امارت کا وسیلا
دنیا کی نظر ظلم کو فن جان رہی ہے
ہر جہل کو ہے زعم، کہ ہے علم کا داتا
بت رکھے ہیں رنگ و نسب و قوم و وطن کے
ہے دامنِ اسلام میں یہ شرک کی دنیا
گو آج بھی الحمد سے تا آیۂ والناس
قرآن کا ہر لفظ ہے اذہان پہ کندہ
الفاظ اترتے نہیں حلقوم سے نیچے
پیغام پہنتا نہیں اعمال کا جامہ
ہر جبر پہ سلطانیء جمہور کا عنواں
ہر جہل پہ علمیتِ قرآن کا سایہ
ہر فسق ''ربوبیتِ قرآن'' کا پیکر
ہر شرک کی پیشانی پہ توحید کا چھاپا
منبر پہ رضا جوئیِ حکام کی ترغیب
مسجد میں ثنا خوانیِ جبروت کا چرچا
ہر عامی و عالم کو بہر رنگ و بہر حال
ہے طاعت و تقلیدِ اولی الامر کا سودا
قرآن کی حکمت کو کہاں جا کے سمجھیے
گم ہوگئے آوازۂ ترنم میں معانی [۶۴]

ان اشعار میں ہمارے معاشرے کے چہرے پر موجود مسوں اور مہاسوں کی بھرپوری عکس بندی کی گئی ہے۔ اشعار کی قراءت کے وقت، قاری کو شاعر کے قلب میں درد کی لہر، روح کی بے چینی اور کڑھن کی شدت محسوس ہوتی

ہے۔ دراصل قصیدے کا یہ حصہ شاعر کی فکر کا ذُروہ یا سنام (Climax) ہے۔

قصری کانپوری نے حالات کی عدم موافقت کا احوال مسدس کی شکل میں کیا تھا۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

یوں قوتِ باطل نے زمانے کو ہے گھیرا
ہے صحن میں ہر روز کے ظلمات کا ڈیرا
انسان کی تقدیر نہ بن جائے اندھیرا
آجائے بیدار ہو خوابیدہ سویرا
خوشبو کی طرح لوگ پریشاں رہیں کب تک
بے ربط سے افسانے کا عنواں رہیں کب تک

اے حکمِ خدا، قاسمِ انوارِ الٰہی
اے ہادیء برحق! کوئی اعجاز نگاہی
امت پہ مسلط ہوئی جاتی ہے تباہی
منسوب تری ذات سے کونین پناہی
تسلیم کہ ہر چند گنہگار ہیں ہم لوگ
لیکن تری رحمت کے سزاوار ہیں ہم لوگ [۶۵]

یہود و نصاریٰ کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ کسی طرح امتِ مسلمہ کے دل سے اس کے نبی علیہ السلام کی محبت کم کردی جائے۔ اس کے لیے وہ مختلف مذموم طریقے اپناتے ہیں۔ مثلاً کبھی کوئی حضورِ اکرم ﷺ کی شان میں گستاخانہ خاکے بنا دیتا ہے اور کبھی کوئی ایسی کتاب لکھ مارتا ہے جس میں محبوبِ ربّ کائنات جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کیے گئے ہوں یا آپ ﷺ کے کردار پر مصنف نے اپنے دل کی کالک ملنے کی ناکام کوشش کی ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں نے ہمیشہ جان پر کھیل کر اہانتِ رسول ﷺ کا بدلہ لیا ہے۔ شعراء نے اپنی شاعری میں دشمنانِ اسلام کو للکارا ہے اور ملتِ اسلامیہ کو حبِّ رسول ﷺ کا پرچم بلند کرتے رہنے کی ترغیب دی ہے۔ شہزاد مجددی نے حضورِ اکرم ﷺ سے مخاطبے میں صاف عرض کر دیا ہے:

کرنے کو فدا آپ کی عزت پہ ملے ہیں
یہ جان و بدن نیرِ تابانِ رسالت
بے تاب فدا ہونے کو رہتے ہیں ہمیشہ
سب اہلِ سنن نیرِ تابانِ رسالت [۶۶]

اس کے ساتھ ہی شہزاد مجددی نے برہنہ گفتاری کا قرینہ اپناتے ہوئے دعوتِ عمل دی:

اگر ہے مسئلہ ناموسِ مصطفیٰ کا تو پھر
ہتھیلیوں پہ سروں کو بھی دھر کے دیکھتے ہیں [۶۷]

اس عہدِ تشکیک میں مسلمانانِ عالم کو بھی ایک عارضہ لاحق ہوگیا ہے کہ وہ اپنے مقام کو پہچاننے سے عاری ہیں۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد تو بہت سارے اکابر نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرکے اسلام کے اصل خدوخال کو ظاہر کرنے سے گریز کا راستہ اپنایا تھا۔ حالی نے مسدس لکھ کر اور اقبال نے فلسفۂ خودی پیش کرکے مسلمان کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جوں جوں مغربی تعلیم پھیلی، مسلم دنیا میں بھی فکری و علمی انتشار پیدا ہوتا گیا۔ حفیظ تائب نے ''گنبدِ خضریٰ'' کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی، جس کا ذکر یہیں کہیں آچکا ہے، اب شہزاد مجددی کو دیکھیے کس قرینے سے مسلمانوں کو ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کروا رہے ہیں:

سوائے کوچۂ سرکار کے بِک جائیں ناممکن
اگر اندازہ ہوجائے ہمیں خود اپنی قیمت کا [۶۸]

علامہ بشیر حسین ناظم نے اپنے ایک مصاحبہ! میں ختمِ نبوت کے حوالے سے اعدائے اسلام کی کارستانیوں سے آگاہ فرمایا تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

''انگریزوں نے ...... ایک سو سال تک مسلسل یہ کوششیں کیں کہ کوئی ایک بندہ تلاش کیا جائے جو اسلام کے ایک مسلمہ عقیدے ختمِ نبوت کے قصرِ عالی شان میں نقب لگائے۔ چناں چہ انگریزوں نے اس سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی اور مرزا قادیانی سے قبل ۵۔۶، افراد کے انٹرویوز کیے اور انھیں رد کردیا کہ یہ لوگ مضبوط نہ تھے۔ حتیٰ کہ مرزا سے رابطہ کیا گیا اور اُس نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور کہا کہ میں مجوسی عقایدِ ظلیت اور بروزیت وغیرہ پر کام کرکے دکھاؤں گا اور اُمت میں ایسی دراڑ پیدا کروں گا جو قیامت تک رہے گی۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا اور یہ ساری تحاریک لارنس آف عربیا، بابی، بہائی اور قادیانی ،سوشلزم، نازی ازم وغیرہ وغیرہ چلتی رہیں۔ درحقیقت دشمنانِ اسلام کو معلوم تھا کہ صرف اور صرف ایک ہی چیز ہے جو مسلمانوں کو متحد رکھ سکتی ہے اور وہ ہے عشق و وِلا والفت و مودّتِ مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام

۔سیّد عالم و عالمیان ﷺ کی محبت کے جذبے میں تخفیف کرنے کے لیے یہود و نصاریٰ ہر دم کمر بستہ رہے اور انھوں نے اپنی چالوں اور مکر و فریب سے دنیاے اسلام میں ایسے فرقے پیدا کیے جنھوں نے ان کے اشاروں پر ان کے پٹھوؤں کے روپ میں تحریکیں چلا کر سچے اور سُچے مسلمانوں کے قلوب و اذہان میں شکوک و شبہات پیدا کیے۔ یہود کی ریشہ دوانیاں تو مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست کے قیام کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھیں۔ اٹھارویں صدی میلادی سے لے کر بیسویں صدی میلادی کے پہلے عشرے تک ہمیں خود ساختہ مہدیوں اور مصنوعی پیغمبروں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو ذلت و خواری کے سمندر سے شیطانی انگیخت اور مذلت سے اُبھرتے ڈوبتے رہے۔ چناں چہ ایران میں ان کی ریشہ دوانیاں کامیاب ہوئیں تو وہاں علی محمد باب، حسین علی عرب بہاء اللہ اور برصغیر میں مرزا غلام احمد قادیانی علیہ ماعلیہ اور مہدی جون پوری پیدا ہوئے۔ ان تمام متنبیوں علیہم اللعنہ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور آخری پیغامِ حق قرآن کریم کو ناقابلِ عمل اور منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ بہاء اللہ جس کے پیروکار اسے (معاذ اللہ) جلالہ اور اس کے بیٹے عبدالبہا کو جل شانہ کہتے ہیں، نے اعلان کیا کہ اس کی کتابِ اقدس (معاذ اللہ) ناسخ قرآن ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی علیہ ماعلیہ نے حضور ﷺ کی ختمِ نبوت کے قرآنی احکام کا علی الاطلاق انکار کر کے اپنی ظلی (Adumbral) اور بروزی (Emergent) نبوت کا اعلان کیا جس سے مجوسی اور زرتشتی عقیدے کا اظہار ہوا۔[۶۹]

پاکستان بننے کے بعد، اس مملکتِ عطائے رب میں بھی مرزائیوں کی ریشہ دوانیاں بڑھتی گئیں۔ آج بھی پاکستان کے بظاہر مسلم حکمران، محض اعدائے اسلام کو خوش کرنے کے لیے، ختمِ نبوت کی مسلمہ حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوششیں کرتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے شعراء، ادباء اور دین دار طبقات اس مذموم شازش کے خلاف اپنے اپنے طور پر آوازہ بلند کرتے رہتے ہیں۔ شہزاد مجددی نے شعری متن کو قرآن و سنت کی روشنی سے منور کرتے ہوئے کہا ہے:

کہا اللہ نے قرآں میں ختم المرسلیں ان کو — عقیدہ اس لیے رکھتے ہیں ہم ختمِ نبوت کا
شہ کونین نے فرما دیا ہے ''لا نبی بعدی'' — عقیدہ اس لیے رکھتے ہیں ہم ختمِ نبوت کا
کسی کذاب کو جراءت نہ ہو پھر ایسے دعوے کی — عقیدہ اس لیے رکھتے ہیں ہم ختمِ نبوت کا
کسی کاذب سے کوئی معجزہ مانگے تو کافر ہے — یہ فتویٰ ہے بہت مشہور سلطانِ فقاہت کا
نیا کوئی نبی شہزادؔ ہو اب غیر ممکن ہے — رسولِ آخریں پر ختم ہے منصب رسالت کا[۷۰]

عبید اللہ علیم، ایک قادیانی شاعر تھا۔ وہ اگر صرف شاعری کرتا رہتا تو ادبی دنیا میں اسے پذیرائی ملتی رہتی۔ اس کے بعض اشعار ادبی دنیا میں مشہور بھی ہیں۔ لیکن اس نے زندگی بھر قادیانیت کی تبلیغ کی تو

ختم نبوت کے پروانوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ عبید اللہ علیم کا ایک شعر بڑا مشہور ہے:

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

ادبی سطح پر کسی شاعر کو سراہنے کے باوجود حساس شعراء کسی شاعر کے عقائد سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہوتے ہیں۔ اسی لیے جب ڈاکٹر آفتاب مضطر نے اس کے مصرع پر گرہ لگائی تو بڑی خوبصورتی سے اپنے عقیدے کا رنگ چڑھایا دیا اور خوب داد پائی، ملاحظہ ہو:

ہوائے ختمِ نبوت کے سامنے گئے کیوں
''جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی''!
علیم ہو کے بھی منکر ہو جو محمدؐ کا
تو اس کے علم سے ٹپکیں جہالتیں کیسی [۱۷]

شاعری میں حقائق جس قدر جمالیاتی اظہار سے مملو ہوں، جذبات و احساسات کا ہالہ اسی قدر وسیع ہوتا ہے اور جذبات و احساسات کا ہالہ جس قدر وسیع ہوتا ہے، قاری کے لیے، شاعری کی قراءت میں اسی قدر اثر پذیری کا رنگ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ عصری ماحول سے شاعر کے تخلیقی ذہن پر جتنے گہرے نقوش مرتب ہوتے ہیں، شاعری میں استعمال کی جانے والی زبان میں اُسی قدر احساسات کی تجسیم کی صلاحیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ سلیم کوثر کی ایک نظم بعنوان ''سید المرسلین ﷺ کے حضور'' کی قراءت، احساسات کی لہروں اور جذبات کے رنگوں کو کس طرح قاری تک پہنچاتی ہے؟؟؟...... اس کا ادراک اس نظم کی چند لائنیں پڑھ کر ہی کیا جاسکتا ہے:

سید المرسلین ﷺ
میں کہیں بھی نہیں
نیک نامی سے تہمت جھلکنے لگی
صرف رسوائیاں میرے اطراف ہیں
میرے چاروں طرف بھیڑ ہی بھیڑ ہے
پھر بھی تنہائیاں میرے اطراف ہیں
جسم جن کا نہیں، روح جن کی نہیں
کیسی پرچھائیاں میرے اطراف ہیں
محفلوں کے تسلسل میں زندہ ہوں میں

جھکے کج کلاہوں کے سر
اپنے خالق کے آگے
حضورؐ آج پھر مٹ رہی ہے
اندھیروں کی یلغار سے
آدمیت کے چہرے کی اجلی کرن
ناؤ منجدھار میں ہے
طلب گار ہیں ایک نظرِ کرم کے [۷۴]

اصغر عابد نے تخلیقی کرب محسوس کیا اور اپنے وجدان کو اسمِ محمد ﷺ سے سجا کر دنیا بھر کے انسانوں کے لیے ایک تمنا کو شعری متن میں ڈھالا۔ ایک تمنا! کہ پوری انسانیت اس مبارک نام سے منسلک ہو جائے:

اسمِ محمد، اسمِ مکرم
صلی اللہ علیہ وسلم
اس آفاقی نام کا پرچم ٹھنڈا، میٹھا، دھیما مدھم
دنیا بھر پر سایہ فگن
جنگیں بلوے بغض بغاوت
اسلحہ سازی، اسلحہ خوری والی عادت
دولت کا اک ہاتھ میں آنا
بھوکے اور بے دولت خطّوں کا پھر ایک محاذ بنانا
عدم توازن، ٹھنڈی جنگیں
یورپ ہو یا امریکہ یا ایشیا اور افریقہ ہو
بلکہ دنیا بھر کے انسانوں میں وہی قرینہ، وہی سلوک
اور وہی عظیم سلیقہ ہو
تو سارے جھگڑے مٹ جائیں
شاطر ذہن اور داؤ لگانے والے خطے پٹ جائیں [۷۵]

آفاق احمد نے بھی بے قدری کی سرد ہوائیں محسوس کرتے ہوئے، حضورِ اکرم ﷺ کے دامنِ عاطفت میں آکر سکون پانے کا اظہار کیا ہے:

قریۂ ناپرساں میں
اپنے زخموں کو سینے سے لگائے
بے حس اور بے رحم فضا میں
بے قدری کی سرد ہوا میں
اپنا ٹھٹھرتا جسم سمیٹے
اپنے ہوش و حواس بچاتا
اپنی بے ڈھب چال سے چلتا
جب میں چُور سا ہو جاتا ہوں
جیون کے بے سمت سفر سے
جب میں سخت اکتا جاتا ہوں
تیرے نام کا تازہ موسم
میرے ویراں ویراں دل میں
جذبے نئے کھلا دیتا ہے
جینے کے پھر سب ارمان جگا دیتا ہے
تیرے نام کا تازہ موسم
میرے جیسے ہر اک دل کی بیساکھی ہے
میرے سارے امکانوں کی
ساری حدوں پر حاوی ہے[۷۶]

جدید عہد میں نعت کی تخلیق میں ہر سطح کے شاعر نے حصہ لیا اور نعتیہ ادب میں تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی متن کی کہکشاں سج گئی۔ نعتیہ ادب کی طرف رجوعِ عام کی اس فضا میں عصری شعور، عصری آگہی یا عصری حسیت کا حصہ واضح ہے۔ بین الاقوامی طور پر اسلام دشمنی کی گھناؤنی سازشیں سامنے آنے لگیں تو ایک طرف تو حضورِ اکرم ﷺ کی شان و عظمت کے بیان اور آپ ﷺ کی یکتائی کے اظہارات کی ضرورت دامن گیر ہوئی دوسرے طرف مسلمانوں میں بے عملی کی روش کو بدلنے کی ترغیبی شاعری کرنے کا رجحان پیدا ہوا۔ اس طرح حضورِ اکرم ﷺ کے لائے ہوئے نظام کی طرف مسلمانوں کو بالخصوص اور پوری دنیا کو بالعموم متوجہ کرنے کے لیے شاعری کی جانے لگی۔

بتلا دو گستاخِ نبی کو غیرتِ مسلم زندہ ہے
ان پر مر مٹنے کا جذبہ، کل بھی تھا اور آج بھی ہے [۷۷]

کب مانتے ہیں کوئی ہدایت حضور کی
پھر بھی ہمارا خواب ، شفاعت حضور کی [۷۸]

سروں کی بھیڑ میں انسان ڈھونڈنے والو
جمالیات کے ایوان ڈھونڈنے والو
نظر اٹھا کے تو دیکھو! جمال سامنے ہے
محمدِ عربی کی مثال سامنے ہے [۷۹]

ضیاء الدین نعیم نے عہدِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی جانب توجہ مبذول کروانے کے لیے کہا:

پہلے آئے تھے نہ ویسے کبھی آئے شب و روز
عہدِ پیغمبرِ آخر نے جو پائے شب و روز [۸۰]

عصری شعور، تخلیقی سطح پر شعری متن کو مختلف ہیئتی شکلوں میں پیش کرنے کے رجحان سے بھی جھلکتا ہے۔ نعتیہ ادب میں بھی متعین شعری سانچوں میں، عہد بعہد جو جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان ہیئتی اصنافِ سخن کا بھرپور انداز سے استعمال کیا جارہا ہے۔ نعتیہ غزلیں، نعتیہ نظمیں، نعتیہ مسدس، نعتیہ مثنویاں، نعتیہ قطعات، نعتیہ نظمِ معریٰ، نعتیہ آزاد نظم، نعتیہ ہائکو، نعتیہ ماہیے، نعتیہ نثری شاعری..... غرض کون سی شعری ہیئت ہے جس میں نعتیہ متن کے تخلیقی نمونے موجود نہیں ہیں۔ یہ سب شعری لوازمہ (Matter) اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ نعتیہ شاعری میں فکری (Intellectual) اور فنی (Artistic) سطح پر عصری حسیت کا واضح انعکاس ہو رہا ہے۔

سرشار صدیقی نے Decline and Fall of Roman Empire کے مصنف گبن کی چند سطور کو آزاد نظم کی شکل دی ہے، وہی ملاحظہ ہو:

محمدؐ کا مسلک
ہر ابہام سے
سارے شبہات سے پاک ہے
اس کی وحدانیت اور یکتائی کی
ایک روشن دلیل [۸۱]

سوچنے والے ذہن اور حساسیت سے لبریز دل کے حامل شعراء نے ہمیشہ انسانیت کا غم کھایا ہے۔

مسلمان ہونے کے ناتے انھوں نے اسلامی دنیا میں اسلامی اقدار اور احترامِ انسانیت کا وہی معیار دیکھنے اور اپنے معاشرے میں رائج کرنے کی تمنا کی ہے جس نے غلاموں کو سلطان بنا دیا تھا اور انسانوں کے درمیان نسل و رنگ اور دولت و عسرت کے امتیاز کو ختم کر دیا تھا۔ اسلامی دنیا میں جس کردار کے باعث مسلمانوں کو عروج نصیب ہوا تھا وہی کردار ہمارے بیشتر نعت گو شعراء کے لیے مثالیہ (Ideal) رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ مسلم معاشرے میں انسانیت کی تذلیل ہوتے دیکھتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کو ہر میدانِ عمل میں مغلوب اور معتوب دیکھتے ہیں تو ان کا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ وہ دامنِ مصطفٰی ﷺ کے سائے میں آکر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کی جناب میں اپنے غم کی روداد سنانے سے انھیں سکون بھی میسر آتا ہے اور ان کی تمناؤں کے بر آنے کے امکانات بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ استغاثہ، شہر آشوب اور حالِ دل سنانے کی خواہش ہی نے شعراء کے لیے عصری آگہی کے انعکاس سے نعت کا شعری متن تیار کرنے کی راہ ہموار کی ہے۔ دعاؤں میں دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی ہوک اور جبرِ حالات سے پیدا ہونے والی بے چارگی کا احساس جھلکتا ہے تو ان دعاؤں کی قبولیت کا قرینہ جنابِ رسالت مآب ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے قلبی تعلق پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کی جناب میں بالواسطہ درخواست کی جاتی ہے کہ ہمارے حالات بہتر کر دے۔ ایک دعا ہے:

یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ وَ الْاَبْصَارِ یَا مُدَبِّرَ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ یَا مُحَوِّلَ الْحَوْلِ وَالْاَحْوَالِ، حَوِّلْ اَحْوَالَنَا اِلیٰ اَحْسَنِ الْاَ حْوَالِ وَالْمَآلِ بِجَاہِ سَیِّدِ الْاَبْرَارِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ وَسَلَّمُ

اللہ کی جناب میں دعا و التماس کرنے میں بھی نبی علیہ السلام کا واسطہ دینا لازمی ہے اور حضورِ اکرم ﷺ کی جناب میں اپنی عرضداشت پیش کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ کے پاس جو التجا پہنچے وہ مُداوا طلبی کے لیے اللہ کی جناب میں پیش کر دی جائے۔ یہی اسلوبیاتی روش ہے جس نے قدسی سے یہ کہلوایا:

سیدی انت حبیب و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی [۸۲]

اور حالی نے اسی انداز سے درخواست کی:

اے خاصہء خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے [۸۳]

پھر اقبال نے بھی براہِ راست حضورِ اکرم ﷺ کے دربار میں اپنی عرض داشت پیش کر دی:

"حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں" [۸۴]

آج کی دنیا میں ذہنی بے چینی، قلبی بے سکونی اور حالات کی ناموافقت کا مُداوا صرف نبیِ کریم علیہ السلام کی ذات سے سچی وابستگی میں ہے۔ ہر حساس اور تعلیماتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے آگاہ شاعر، جب اپنی حساس طبیعت پر ماحول کا حبس محسوس کرتے ہوئے انقباضی کیفیات کو حاوی دیکھتا ہے تو امجد اسلام امجد کی طرح، ذہنی و قلبی آسودگی کے لیے آپ ﷺ کی ذاتِ پاک سے روحانی تعلق قائم کر کے سکون پانے کی کوشش کرتا ہے:

اداسی کے سفر میں جب ہوا رک رک کے چلتی ہے — سوادِ ہجر میں ہر آرزو چپ چاپ جلتی ہے
کسی نادیدہ غم یکا گہر میں لپٹا ہوا سایہ — زمیں تا آسماں پھیلا ہوا محسوس ہوتا ہے
گزرتا وقت بھی ٹھہرا ہوا محسوس ہوتا ہے — تو ایسے میں تریؐ خوشبو
محمد مصطفیٰ صلِ علیٰ کے نام کی خوشبو — دلِ وحشت زدہ کے ہاتھ پر یوں ہاتھ رکھتی ہے
تھکن کا کوہِ غم ہٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے — سفر کا راستہ کٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے [۸۵]

حالات کی ناموافقت نے ہر حساس انسان کو اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار بنا دیا ہے۔ زمین کے بیشتر حصے پر نفرتوں کے جنگل اور عداوتوں کے صحرا ہیں۔ اور اگر کہیں محبتوں کا نخلستان ہے بھی تو وہ مسلسل خزاں کی زد میں ہے۔ ایسی صورت میں شعراء کریں تو کیا کریں اور پکاریں تو کسے۔ بس ایک ہی در نظر آتا ہے، جس کی طرف سچے مسلمان شعراء کی نظر اُٹھتی ہے۔ صبیح رحمانی کی پکار سنیئے:

نفرتوں کے گھنے جنگلوں میں شہاؐ
عہدِ حاضر کا انسان محصور ہے
مشعلِ علم واخلاق سے دور ہے
کتنا مجبور ہے
اے نویدِ مسیحاؑ
دعائے خلیلؑ
روک دے نفرتوں کی جو یلغار کو
پختگی ایسی دیں میرے کردار کو
آپ کا لطف و رحمت تو مشہور ہے! [۸۶]

مسلم امہ کے مفکرین، دانشور اور شعراء نے اسلام کے ابتدائی ادوار ہی سے مسلمانوں کی بے عملی اور سہل پسندی کے آثار دیکھ کر بے چینی کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ کیوں کہ ہر سچے مسلمان اور محب رسول ﷺ کا آدرش اور مثالیہ (Ideal) حضورِ اکرم ﷺ کا اسوہ پاک رہا ہے۔ خود رب تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے اسوۂ مبارک کو تمام عالمِ انسانیت کے لیے نمونۂ عمل قرار دیا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کے عملی اقدامات اور آپ ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں جو معاشرہ وجود میں آیا تھا۔ جب اس معاشرے میں اخلاقی زوال آیا اور حرص و آز نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما کر دیا تو ہر مخلص مسلمان کی یہی خواہش ہوئی کہ مسلم معاشرہ، عہدِ نبوی ﷺ اور عہد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا آئینہ بن جائے۔ حضرت مولانا جامی (المتوفی ۱۸ محرم الحرام ۸۹۸ھ) نے چند اشعار میں جس قلبی انقباض اور ذہنی الجھن کا احوال پیش کیا تھا، اس احوال اور استغاثے کے ابیات سے معلوم ہوگا کہ بہتری کی...... ع یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے (فیض احمد فیضؔ)...... مولانا جامیؔ فرماتے ہیں:

اگر نبود چو لطفت دست یارے — زدستِ ما نیاید ہیچ کارے
قضا می افگند از راہ مارا — خدا را از خدا در خواہ مارا
کہ بخشد از یقیں اوّل حیاتے — دہد آنگہ بکارِ دیں ثباتے

(ترجمہ: ۱۔ اگر آپ ﷺ کے الطافِ کریمانہ کی مدد شاملِ حال نہ ہوگی تو ہم عضوِ معطل و مفلوج ہو جائیں گے اور ہم سے کوئی کام انجام نہ پا سکے گا۔ ۲۔ ہماری بدبختی ہمیں صراطِ مستقیم و راہِ خدا سے بھٹکا رہی ہے۔ خدارا ہمارے لیے خداوندِ قدوس سے دعا فرمائیے۔ ۳۔ کہ خداوند قدوس اولاً ہم کو پختہ یقین اور کامل اعتقاد کی عظیم الشان زندگی بخشے اور پھر احکامِ دین میں مکمل استقلال اور پوری ثابت قدمی عطا فرمائے۔ (آمین)! [۸۷]

عصری حسیت کے تمام شعری نمونے پیش کرنے میں جو اجتماعی تأثر بنا ہے اس تأثر کو دو اشعار میں ظاہر کرنے لیے سید سلیمان ندوی کے شعری متن کا سہارا لیتے ہوئے بات کو ختم کرتا ہوں:

عشقِ نبوی دردِ معاصی کی دوا ہے
ظلمت کدۂ دہر میں وہ شمعِ ھدیٰ ہے
لے جائے گا منزل سے بہت دور بشر کو
جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے [۸۸]

منابع رماخذات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادبِ اردو، جلد دوم مجلسِ ترقی ادب، لاہور، طبع پنجم، اگست ۲۰۰۷ء ص ۸۳۲

۲۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، ص ۱۹۱
۳۔ ایضاً ص ۲۱۳
۴۔ میزان، ص ۸۳
۵۔ ارمغانِ نعت، ص ۹۶
۶۔ ایضاً ص ۹۹
۷۔ ایضاً ص ۱۰۲
۸۔ ایضاً ص ۱۲۷
۹۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، ص ۱۳۹
۱۰۔ اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر، حصہ سوم، ص ۲۹۵
۱۱۔ الطاف حسین حالیؔ، کلیاتِ حالی، ص ۸۰۰
۱۲۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، ص ۴۹۸
۱۳۔ ایضاً ص ۶۰۸
۱۴۔ الطاف حسین حالیؔ، کلیاتِ حالی، ص ۲۷۸
۱۵۔ ارمغانِ نعت، ص ۱۴۷
۱۶۔ شرحِ کلامِ رضاؒ، ص ۱۱۹
۱۷۔ ارمغانِ نعت، ص ۱۵۱
۱۸۔ ایضاً ص ۱۷۸
۱۹۔ کلیاتِ شبلی، ص ۸۹
۲۰۔ نقوش۔ ص ۴۹۰
۲۱۔ ارمغانِ نعت، ص ۱۷۳
۲۲۔ اردو ساعری میں نعت (ابتدا سے محسنؔ تک)، ص ۲۱۰
۲۳۔ نقوش، ص ۴۲۸
۲۴۔ ارمغانِ نعت، ص ۱۸۰
۲۵۔ نقوش، ص ۴۷۱
۲۶۔ مستند نعتیہ کلام، ص ۱۵۱
۲۷۔ سیارہ ڈائجسٹ، ص ۴۷۴
۲۸۔ نقوش۔ ص ۵۴۵
۲۹۔ ایضاً ص ۴۷۴
۳۰۔ کلیاتِ مظہر، ص ۸۳۷
۳۱۔ کلیاتِ اقبال اردو، ص ۵۱۰
۳۲۔ نقوش۔ ص ۵۳۴
۳۳۔ ایضاً ص ۵۳۸
۳۴۔ ایضاً ص ۶۰۸
۳۵۔ ایضاً ص ۶۱۴
۳۶۔ نقوش۔ ص ۶۲۲
۳۷۔ ارمغانِ نعت، ص ۲۱۷
۳۸۔ ایضاً، ص ۲۵۵
۳۹۔ ایضاً ص ۲۶۲
۴۰۔ ایضاً ص ۲۶۵
۴۱۔ ایضاً ص ۲۸۲
۴۲۔ کراچی کا دبستانِ نعت، ص ۴۴۳
۴۳۔ کلیاتِ منور، ص ۱۷۳
۴۴۔ قلزمِ انوار، ص ۱۴۲
۴۵۔ ورثہ، ص ۴۶
۴۶۔ تحدیثِ نعمت، ص ۱۱۳
۴۷۔ سحابِ نور، ص ۱۰۱
۴۸۔ زبورِ حرم، ص ۲۱۳
۴۹۔ ایضاً ص ۱۸۴
۵۰۔ ایضاً ۱۸۲
۵۱۔ کائناتِ حفیظ، ص ۲۸۵
۵۲۔ ایضاً، ص ۲۸۹
۵۳۔ ایضاً ص ۳۰۸
۵۴۔ شام و سحر ۶، ص ۵۲۷
۵۵۔ نوائے سروش، ص ۵۷
۵۶۔ شام و سحر ۴، ص ۲۶۱
۵۷۔ اذان، ص ۲۹
۵۸۔ ایضاً ص ۵۶
۵۹۔ ضیاء القران، ص ۵۹۸
۶۰۔ ایضاً ص ۳۶۵
۶۱۔ چراغ، ص ۷۸
۶۲۔ ایضاً ص ۱۰۶
۶۳۔ حسنِ حسین، ص ۳۰۲
۶۴۔ زخمہ دل، ص
۶۵۔ نورِ ازل، ص ۵۷
۶۶۔ کلیاتِ شہزاد مجددی، ص ۶۱۰
۶۷۔ ایضاً ص ۵۸۷
۶۸۔ ایضاً ص ۵۷۲
۶۹۔ حمد و نعت کے معنیاتی زاویے، ص ۲۰۷
۷۰۔ کلیاتِ شہزاد مجددی، ص ۵۷۲
۷۱۔ القا، آفتاب مضطر، زیرِ طبع
۷۲۔ میں نے اسمِ محمدؐ کو لکھا بہت، ص ۵۷
۷۳۔ نعت کائنات، ص ۴۶۳
۷۴۔ ایضاً ص ۴۳۵
۷۵۔ ایضاً! ص ۴۴۰
۷۶۔ ایضاً ص ۴۳۶
۷۷۔ خوابوں میں سنہری جالی ہے، ص ۱۸

۷۸۔ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعات حمد و نعت، ص ۱۹۲

۷۹۔ایضاً ص ۱۹۳

۸۰۔ایضاً ص ۱۸۹

۸۱۔اساس، ص ۹۷

۸۲۔ارمغانِ نعت، ۸۹

۸۳۔کلیاتِ حالی، ص ۸۷۲

۸۴۔کلیاتِ اقبال اردو، ص ۱۹۷

۸۵۔نعت کائنات، ص ۴۴۴

۸۶۔خوابوں میں سنہری جالی ہے، ص ۶۲

۸۷۔مستند نعتیہ کلام، ص ۴۴۵

۸۸۔ارمغانِ سلیمان، ص ۴۲

کتابیات:

☆ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ، ضیاء القران، جلد اول، ضیاء القران پبلی کیشنز، لاہور

☆ حصنِ حصین، مع ترجمہ و شرح: مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری، دارالاشاعت، کراچی۔

☆ سید محمد ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۷ء۔

☆ فیض احمد فیضؔ، میزان، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، بار دوم: ۱۹۶۵ء

☆ شفیق بریلوی، ارمغانِ نعت، مرکزِ علومِ اسلامیہ، کراچی، نقشِ ثانی، مارچ ۱۹۷۵ء

☆ الطاف حسین حالؔی، کلیاتِ حالی، مرتبہ: ڈاکٹر سید تقی عابدی، ناشر: گگن شاہد، امر شاہد، بک کارنر، جہلم، س۔ن۔

☆ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، سروسز بک کلب، ۱۹۹۵ء

☆ شبلی نعمانی، کلیاتِ شبلی، مرتبہ: علامہ سید سلیمان ندوی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، پہلا پاکستانی ایڈیشن، ۱۹۸۵ء

☆ محمد طفیل، نقوش [۱۰] رسول ﷺ نمبر، ادارہ فروغِ اردو، لاہور، جنوری ۱۹۸۴ء

☆ مستند نعتیہ کلام، مرتبہ: قاری محمد اسحٰق ملتانی، ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ، چوک فوارہ، ملتان، محرم الحرام ۱۴۳۱ء

☆ سیارہ ڈائجسٹ، رسول ﷺ نمبر، جلد دوم، لاہور، نومبر ۱۹۷۳ء

☆ حافظ محمد مظہر الدین، کلیاتِ مظہر، مرتبہ: ارسلان احمد ارسل، ارفع پبلشرز، اردو بازار، لاہور، اشاعتِ اوّل: فروری ۲۰۱۳ء

☆ منظر عارفی، کراچی کا دبستانِ نعت، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، ۲۰۱۶ء

☆ منور بدایونی، کلیاتِ منور، مرتبہ: سلطان احمد ابنِ منور بدایونی، جہانِ حمد پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۸ء

☆ اقبال عظیم، زَبورِ حرم، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، ۲۰۱۰ء

☆ رحمٰن کیانی، اذان، مرتبہ: میر واصف علی، رحمٰن کیانی میموریل سوسائٹی، کراچی، اشاعتِ دوم: اکتوبر ۲۰۱۳ء

☆ ریاض حسین چودھری، تحدیثِ نعمت، انٹرنیشنل نعت مرکز پبلی کیشنز، لاہور بارِ اول: ۲۴ر دسمبر ۲۰۱۵ء

☆ حفیظ تائب، کائناتِ حفیظ تائب، مرتبہ: محمد نعمان تائب، القمر انٹر پرائزز، لاہور، اشاعتِ اول: ستمبر ۲۰۱۷ء

☆ شیخ صفدر علی، ماہنامہ شام و سحر، لاہور، نعت نمبر ۶، جلد ۱۳، جنوری، فروری ۱۹۸۷ء، شمارہ ۲،۱

☆ دیوانِ غالب، از غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، س۔ن

☆ یاور وارثی عزیزی نوابی، سحاب نور، اکادمی فروغِ نعت پاکستان، اٹک، بارِ اول: ۲۰۱۷ء

☆ سید شاکر القادری چشتی نظامی، چراغ، اکادمی فروغِ نعت پاکستان، اٹک، ۲۰۱۶ء

☆ قصری کانپوری، نورِازل، مکتبہ قصری کانپوری، لیاقت آباد، کراچی، بارِسوم: ۱۹۸۶ء
☆ سلیم کوثر، میں نے اسمِ محمد ﷺ کو لکھا بہت، امیرہ پبلی کیشنز، کراچی، بارِاول: 2015ء
☆ شاہ محمد سبطین شاہجہانی، قلزمِ انوار، حلقہ جعفری رحمانی چشتی صابری پاکستان، اسلام آباد، اشاعتِ اول: ۲۰۰۶ء
☆ شیخ صفدر علی، ماہنامہ شام وسحر، لاہور، نعت نمبر۴، جلد ۱۱، جنوری، فروری ۱۹۸۵ء، شمارہ ۱، ۲
☆ سرو سہارنپوری، زخمۂ دل، القمر انٹر پرائزرز، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۵ء
☆ آفتاب مضطر، ڈاکٹر، القا، زیرِطبع، کراچی
☆ علامہ محمد شہزاد مجددی، کلیاتِ شہزاد مجددی، انٹرنیشنل نعت مرکز، لاہور، مارچ ۲۰۱۷ء
☆ راجا رشید محمود، نعت کائنات، جنگ پبلشرز، لاہور، اشاعتِ اول: اکتوبر ۱۹۹۳ء
☆ صبیح رحمانی، خوابوں میں سنہری جالی ہے، مرتبہ: عزیز احسن، فضلی سنز، اردو بازار، کراچی، اشاعتِ دوم: نومبر ۱۹۹۷ء
☆ سرشار صدیقی، اساس، اثاثہ ناشرینِ ادب، کوئٹہ، ۱۹۹۰ء
☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادبِ اردو، جلد دوم، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، طبع پنجم، اگست ۲۰۰۷ء
☆ ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری، اردو شاعری میں نعت (ابتدا سے محسن تک)، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، اشاعتِ دوم ۲۰۱۸ء
☆ اکبرالٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر، حصہ سوم
☆ ڈاکٹر عزیز احسن، حمد و نعت کے معنیاتی زاویے، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، مئی ۲۰۱۸ء ص ۲۰۷) [۶۵]
☆ صبیح رحمانی، ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعاتِ حمد و نعت، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، اکتوبر ۲۰۱۵ء
☆ سعید وارثی، ورثہ، بزمِ وارث، شاہر فیصل کالونی، کراچی، ۱۹۸۷ء
☆ شاہ احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ، حدائقِ بخشش، شرح کلام از الحافظ القاری مولانا غلام حسین قادری، مشتاق بک کارنر، اردو بازار، لاہور، س۔ن

منگل: ۱۶رذی الحج ۱۴۳۹ھ/ مطابق: ۲۸ر اگست ۲۰۱۸ء

☆☆☆

سلیم شہزاد، بھارت

نعتیہ شعری لفظیات کے تکنیکی زاویے

ABSTRACT: This text answers questions regarding poetic diction in general and poetic diction of Naat in particular. The text defines Urdu poetic diction with reference to poetic genres and proves that every genre has its own discourse; poetic diction of Naat has some peculiar qualities. On this basis this particular diction is divided into some kinds. Each has its own linguistic structure and has very broad spectacular of meaning. For the sake of ease and simplicity the types of poetic diction and the qualities of Naatiya diction, are set in diagram also. Effort has done in analyzing the phrases of the diction to show the multiplicity of meaning. It is to some extant technical level throws light on new angles of linguistic criticism.

زبان کے ہر استعمال میں ذیل کے چند عوامل کی شمولیت ناگزیر خیال کی جاتی ہے اور وہ عوامل ہیں :

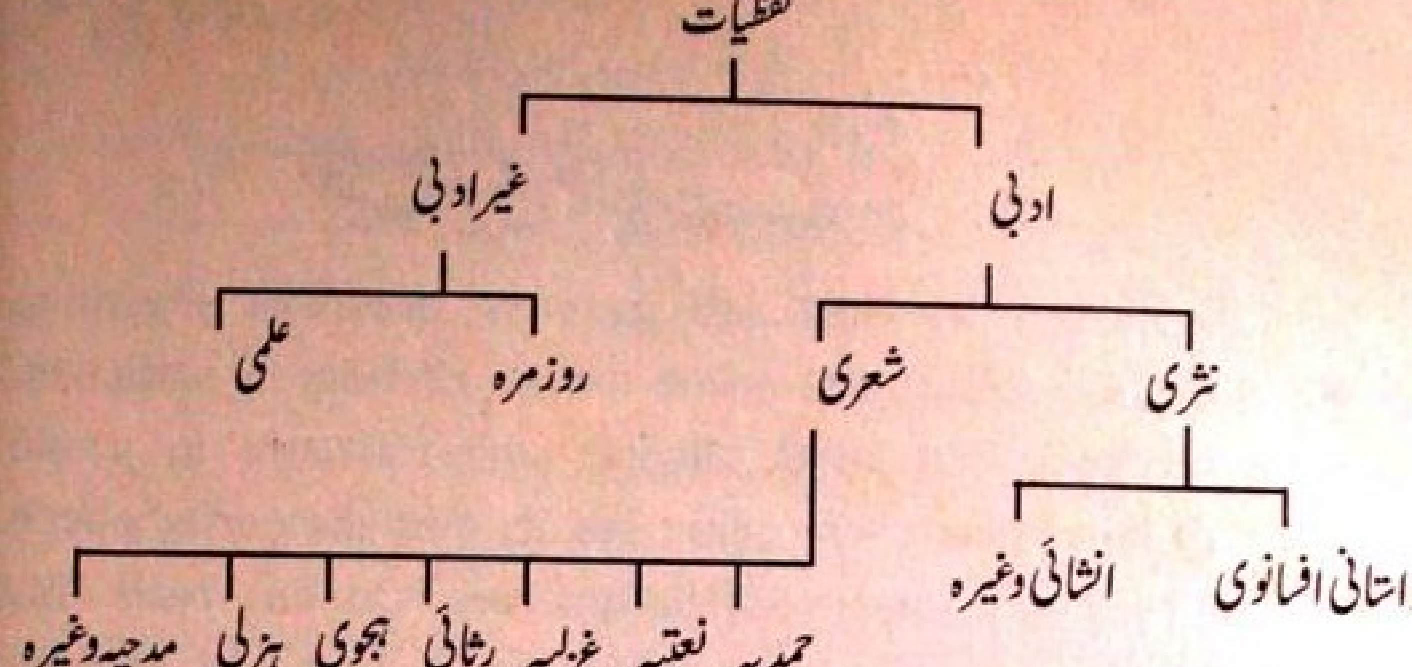
(۱) لسانی معاشرہ

(۲) لسانی ماحول

(۳) لسانی افراد کی ذہنی کیفیات

(۴) لسانی تعملات

ان عوامل کے تحت جس طرح زبان کا ہر استعمال لسانی مواد و متن بنتا ہے، اسی طرح ان عوامل کی آخری وحدت یعنی لسانی تعملات زبان کے مخصوص فنی اظہار میں (۱) لسانی ساخت (نظم/نثر) (۲) صنف (غزل/قصیدہ/ افسانہ/ انشائیہ وغیرہ) (۳) فنی اظہار کرنے والے فرد یعنی فن کار کی ذہنی وفکری کیفیات (۴) ادبی لفظیات (شعری/ نثری) کے متوازی عوامل کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ہر لسانی ساختیہ (حرف/ لفظ/ فقرہ) زبان کے استعمال میں لسانی تعمل/ تفاعل بنتا ہے۔ فنی اظہار کے لسانی تعملات یعنی مجموعی طور پر فن کی زبان سے لفظیات کی ساخت نمو پاتی ہے جس کی تقسیم کو ذیل کے شجری خاکے میں دیکھا جاسکتا ہے :



یہاں نعت کی صنف میں شعری لفظیات کا جائزہ مقصود ہے جس پر گفتگو سے پہلے مختلف شعری اصناف اور ان میں مستعمل لفظیات پر مختصر اظہارِ خیال ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جیسا کہ کہا گیا، زبان کے استعمال کا اصول ہے کہ اس کے لیے منتخب لسانی تعملات زبان کے معاشرے کے مخصوص ماحول سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی علمی درس گاہ کے ماحول میں بازار کے ماحول کی زبان استعمال نہیں جاتی، عدالت میں مستعمل زبان وعظ و بیان کی مجلس میں مستعمل زبان سے مختلف ہوتی ہے اور صحافیوں، طبیبوں اور معلموں کی زبان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ زبان کے ایسے ہر استعمال کو مخاطبہ/ کلامیہ کہتے ہیں۔ ادبی ماحول کی زبان کا بھی یہی عالم ہے جو ادبی اصناف کے مخاطبوں کے فرق تک پہنچتا ہے اور انھی مخاطبوں کی مجموعی صورت کو ادبی لفظیات کہتے ہیں، شعری لفظیات جس کی ایک شاخ ہے۔ شاعری کی ہر صنف کی زبان ایک دوسرے کے متغائر ہوتی ہے یعنی مواد و موضوع کی مطابقت سے ان کی شعری لفظیات بھی بدلتی ہے۔ قصیدے اور مرثیے کی لفظیات ان کے موضوعات کے پیش نظر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح غزل کی لفظیات میں مثنوی نہیں لکھی جاسکتی ذیل کی چند مثالوں سے مختلف اصناف کی شعری لفظیات کا فرق واضح ہوسکتا ہے۔

تیز آندھیوں میں اڑتے پر و بال کی طرح
ہر شے گزشتنی ہے مہ و سال کی طرح
کیوں کر کہوں کہ در پے آزار ہے وہی
جو آسماں ہے سر پہ مرے ڈھال کی طرح
میں بے سبب تو کوئی انھیں پوجتا نہیں
کچھ تو ہے پتھروں میں خدو خال کی طرح

اب تک مرا زمین سے رشتہ ہے استوار
رہنِ ستم ہوں سبزۂ پامال کی طرح
ہر موڑ پر ملیں گے کئی راہ زن، شکیبؔ
چلیے چھپا کے غم بھی، زر و مال کی طرح

اس غزل کی شعری لفظیات:

تیز آندھیاں/ پر و بال/ ہر شے گزشتی ہے/ مہ و سال/ آسماں در پے آزار/ کچھ تو ہے پتھروں میں/ خد و خال/ زمین سے رشتہ/ رہنِ ستم/ ہر موڑ پر راہ زن/غم/ زر و مال

میں سے بعض فقرے اور ترکیبیں (تیز آندھیاں/ پر و بال/ مہ و سال/ خد و خال/ راہزن وغیرہ) یقیناً غزل کے علاوہ اور صنف میں بھی مستعمل ہو سکتی ہیں مگر دی گئی غزل کے لسانی سیاق و سباق نے انھیں غزل کی لفظیات سے مخصوص کر دیا ہے۔

میرؔ کی مثنوی ''شکار نامہ'' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

چلا آصف الدولہ بہر شکار — نہادِ بیاں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ — لگے کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
ہوئے لشکری جب کہ سرگرم گزشت — مقید ہوئے مست پیلانِ دشت
گوزن اور ہرنوں کی، کیا دیجے شرح — گئے شیر مارے سو کتوں کی طرح
غرض، میرؔ، تا دورِ چرخِ بلند — رہے آصف الدولہ اقبال مند

ان شعروں میں:

نہادِ بیاباں/ شیر و پلنگ/لشکری سرگرم گزشت/ مست پیلان دشت/گوزن/ ہرن شیر مارے گئے، جیسی شعری لفظیات بیانیے سے ربط رکھنے کے سبب مثنوی سے متعلق ہوگئی ہے۔ ان لسانی تعملات کو غزل کی لفظیات کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

مدحیہ قصیدے کی شعری لفظیات غالبؔ کے ایک قصیدے کے چند اشعار میں دیکھیے۔

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر، زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن — نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ — مظہرِ ذوالجلال و الاکرام
شہسوارِ طریقتِ انصاف — نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیِ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم رزم میں اوستادِ رستم و سام

ان شعروں سے منتخب مدحیہ لسانی تعملات:

جس کے در پہ ناصیہ سا مہر ومہ/ شاہنشہ بلند مقام/ قبلۂ چشم و دل/ مظہر ذوالجلال/ شہسوارِ طریقت انصاف/ نوبہار حدیقۂ اسلام/ جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز/ ہر قول معنی الہام/ میزبانِ قیصر و جم/ اوستادِ رستم و سام/ بزم رزم، قصیدے کے لیے مختص ہیں۔

مرثیہ مخصوص موضوع اور ماجرا بیانی کے سبب کثیر ابعادی صنف بن چکا ہے جب کہ اس کا اصل موضوع ''رثا'' مردے پر رونے کے سوا کچھ نہیں۔ مرثیے میں غزل کی طرح مختلف النوع مضامین نظم کیے جانے کی روایت رہی ہے اگر چہ یہ مضامین غزل کے مضامین کی طرح غیر مربوط نہیں ہوتے۔ اس کی تکنیکی وصف سے قطع نظر مرثیے میں نوحے اور ماتم کے تحت جو لسانی متن و مواد ملتا ہے، وہی دراصل مرثیے کی شعری لفظیات متعین کرتا ہے جیسے ۔

شبیر نے یہ خیمے کی ڈیوڑھی سے پکارا ، مارے گئے اکبر
گھر لٹ گیا اے بانوے دلشاد ، تمھارا ، مارے گئے اکبر
ہم بیکس و تنہا ہوئے ، واحسرت و دردا ، واحسرت و دردا
جینے کا ہمارے نہ رہا کوئی سہارا ، مارے گئے اکبر
زینب سے یہ کہہ دو کہ کرے چاک گریباں ، پیٹے بصد افغاں
نیزے سے ترے لال کا دل چھد گیا سارا ، مارے گئے اکبر
غل ہوتا تھا خیمے میں انیسؔ ، آہ و بکا کا ، ساماں تھا عزا کا
جب کہتا تھا رو کر اسد اللہ کا پیارا ، مارے گئے اکبر

ان اشعار سے منتخب شعری لفظیات :

گھر لٹ گیا/ بیکس و تنہا ہوئے/ واحسرت و دردا/ نہ رہا کوئی سہارا/ چاک گریباں/ پیٹے بصد افغاں/ آہ و بکا، صرف مرثیے سے تعلق رکھتی ہے اور دیے گئے اشعار کے مطالعے سے جو لسانی ماحول سامنے آتا ہے، اس پر غم واندوہ کی کیفیت چھائی نظر آتی ہے۔

طنز و مزاح کے اسلوب کی شاعری اپنی لفظیات آپ وضع کرتی ہے لیکن اس کا انتخاب بھی چوں کہ زبان کی عام ساخت سے کیا جاتا ہے اس لیے مخاطبے کا ماحول اور استعمال کے سیاق و سباق ہی ہزلیہ اظہار کے لیے شعری لفظیات فراہم کرتے ہیں۔ دلاور فگارؔ کے چند اشعار دیکھیے ۔

وہ حسن شعلہ بداماں جو رونما ہوجائے
نظر کے چاروں طرف خطِ استوا ہوجائے
ابھی تو نسل ہے بندر کی، کل یہ ممکن ہے
ہمارا مورثِ اعلا کوئی گدھا ہوجائے
نہ جینے دیتے ہیں ہم کو، نہ مرنے دیتے ہیں
وہ چاہتے ہیں، یہ کمبخت ادھ مرا ہوجائے
سنا ہے یہ کہ جہنم میں جائیں گے شاعر
عجب نہیں جو وہاں بھی مشاعرہ ہوجائے
جسے شکایتِ کمیابیِ غذا ہو، فگار
اس آدمی کو یہ لازم ہے، اولیا ہوجائے

اس ہزل کی شعری لفظیات:

حسن شعلہ بداماں/ چاروں طرف خطِ استوا/نسل ہے بندر کی/مورثِ اعلا : گدھا/کمبخت ادھ مرا/ جہنم میں مشاعرہ/کمیابیِ غذا کی شکایت/کسی کا اولیا ہوجانا۔

زبان کے عام ذخیرے سے لی گئی ہے مگر شعری اظہار میں طنز ومزاح کی ملاوٹ نے ان لسانی تعملات کا مزاج ہی بدل دیا ہے۔شعری لفظیات کے اسلوبی تجزیے سے اس کے چند شناختی خواص بھی سامنے آتے ہیں مثلاً میرؔ،نظیرؔ، انیسؔ، غالبؔ،مومنؔ، حالیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ، سردارؔ، باقیؔ وغیرہ شعرا کی شعری لفظیات سے حزنیہ، طربیہ، فکریہ، طنزیہ، حرکیہ وغیرہ کے شناختی خواص منسلک کیے جاسکتے ہیں۔

ان باتوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ شعری اصناف میں مستعمل لفظیات صنف کے موضوع کی مناسبت سے منتخب کی جاتی ہے اور یہ اصول تقدیسی شاعری کی صنف نعت کی شعری لفظیات پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔البتہ اوپر بیان کیے گئے خواص میں سے حمد ونعت کی شاعری سوائے "فکریہ" کے کسی اور لفظی وصف کو قبول نہیں کرتی۔حمدیہ اور نعتیہ شاعری کا تعلق ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ذات سے ہے اس لیے اس قسم کے شعری اظہار میں حزن والم اور طنز ومزاح جیسے خواص کی نمود بے محل اور اللہ اور رسول ﷺ سے حزن کے توسط سے مایوسی کے اظہار اور مزاح کے توسط سے شوخی کرنے کے مترادف ہوگی۔ یہ صورت ظاہر ہے کہ شاعر کے لیے دنیاوآخرت دونوں میں شرم اور گناہ کا باعث بنے گی۔تقدیسی شاعری کا فن شیشہ گری کے فن سے کہیں بڑھ کر نازک ہے۔اس کے فنی تقاضے عام شعری اظہار کے فنی تقاضوں سے یقیناً بہت مختلف ہیں چناں چہ نعت کی شعری لفظیات کا جائزہ لیتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ شعرا نے اسلامی شعائر کا خیال کیے بغیر لسانی اظہار کے عام اصولوں کے تحت جو کہنا چاہا، کہہ دیا اور اسے اللہ اور رسول ﷺ سے اپنی عقیدت وارادت کا نام دے دیا ہے۔صرف ایک مثال نامی گرامی شاعر وناقد سلیم احمد کی نعت میں دیکھ لیں۔

وہ ابتداؤں کی ابتدا ہے، وہ انتہاؤں کی انتہا ہے
ثنا کرے کوئی اس کی کیوں کر، بشر ہے لیکن خدا نما ہے

وہی ہے اول، وہی ہے آخر، وہی ہے باطن، وہی ہے ظاہر
یہ سوچ ہے آگہی سے باہر، وہ اور کیا ہے جو رہ گیا ہے
وہ سرِ تخلیق ہے مجسم کہ خود ہی آدم ہے، خود ہی عالم
وجود کی ساری وسعتوں پر محیط ہے جو وہ دائرہ ہے
کوئی نہیں ہے مثیل اس کا، کوئی نہیں ہے نظیر اس کا
وہ شخص بھی ہے، وہ عکس بھی ہے اور آپ اپنا ہی آئینہ ہے
ہے خطِ واصل کہ حدِ فاصل کہ قوس کے قوس ہے مقابل
سلیمؔ، عاجز ہے فہم کامل، وہی بشر ہے، وہی خدا ہے

اس نعت کے ہر شعر پر بہت بہت کچھ خیال آرائی ممکن ہے مگر اس سے قطع نظر سورۂ شعرا کی ایک آیت کے حوالے سے یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ اللہ کے قول کے مطابق شعرا ہر وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں اور مندرجہ نعت کے ہر شعر میں شاعر کا ذہن بری طرح بھٹکا ہوا اور گمراہی کا مارا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ تکنیکی لحاظ سے اس میں صرف دو لفظ (اور وہ بھی ہم معنی) ''مثیل/ نظیر'' نعت کی لفظیات سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے علاوہ اس نام نہاد نعت میں نعت کی روایتی شعری لفظیات تک کا پتا نہیں ملتا۔ یہ لغو دانش ورانہ اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ اردو کی عام نعتیہ شاعری میں ایسی لغویت کے مارے بے شمار اشعار جا بجا بکھرے ہوئے ہیں لیکن سلیم احمد کی درج بالا تخلیق کو مجسم لغویت کی مثال کہنا قطعی بے جا نہ ہوگا۔ عام شعری لفظیات کے جن خواص کا ذکر آیا کہ ان میں سے صرف ایک ''فکریہ'' کی صفت نعت سے تعلق رکھتی ہے تو ان کا تفکر و تفلسف بھی کچھ معنویت اور اثباتیت نہیں رکھتا، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے۔ ''فکریہ'' کے علاوہ چند ایسی صفات نعت کی شعری لفظیات سے ہم رشتہ نظر آتی ہیں جو شاعر کے تفکر کے علاوہ اس کے زمان و مکان، عقیدت و ارادت، یقین و گماں، حقیقت و ماورائیت وغیرہ کے تصورات کا احاطہ کرتی ہیں، چند مثالوں سے اس بات کی تفہیم ہو سکے گی: مکان/ مقام/ عرصہ/ پہنائی/ وسعت وغیرہ لفظوں سے مظاہر کے ''کہیں'' پائے جانے کا طبعی اور حسی تصور وابستہ ہے مثلاً:

سبز گنبد/ درِ حضور/ گلستانِ محمد/ مدینے کی فضا/ ارضِ طیبہ/ روضۂ اطہر/ شہرِ نبوت/ میخانہ محمد کا/ رسولِ عربی/ میرِ عرب، وغیرہ وغیرہ فقروں اور شعری ترکیبوں پر مشتمل لفظیات مکانیت کا یہی طبعی حسی تصور خلق کرتی ہے۔ ان مثالوں کے الفاظ ''گنبد، در، مدینہ، ارض، روضہ، شہر، میخانہ، عرب'' پر غور کیجیے، سب کا تعلق ''مکان'' سے ہے اس لیے ایسی شعری لفظیات کو ''مکانی'' کا شناختی نام دیا جا سکتا ہے۔ مختلف نعتیہ تخلیقات سے ماخوذ ایسی لفظیات پیش ہے:

آرزوے کوچۂ سرکار/ آنگن محمد کا/ آقا کے در سے/ آویزۂ قندیل مدینہ/ ابرِ رحمت بطحا/ ان کا گنبد/ ان کی چوکھٹ پہ سجدہ/ بارگہِ صاحبِ لولاک/ ترے در کی گدائی/ ثور کی رفعت/ جادۂ طیبہ/ جلوۂ شہرِ مدینہ/ چمنستانِ رسولِ عربی/ حرا کے جلوے/ حرم/ خاکِ دہلیزِ مصطفیٰ/ خلدِ مدینہ/ خوشبوے فاراں/ درِ اقدس/ درِ حضور/ درِ نبی/ درِ مولا پہ جبیں/ درِ پرنور/ دربارِ محمد/ راہِ مدینہ/ روضۂ خیر البشر/ روضۂ اطہر/ روضۂ نبی کا طواف/ رسولِ عربی/ رہِ عشقِ محمد/ رحمت کا سائباں/ سبز گنبد/ سرکارِ محمد/ سوادِ شہرِ مدینہ/ شہرِ نبوت/ شمعِ بزمِ محشر/ شاہِ حجاز/ شہرِ رسول/ طیبہ/ طیبہ کی خاک/ طیبہ کا رستہ/ عرب کا مہر/ عجم کا ماہِ تمام/ کوچۂ محمد/ گنبدِ خضرا/ گلستانِ محمد/ مدینے کا رخ/ مدینے کی فضائیں، گلیاں/ مدینے کی رونقیں/ ماہِ بطحا/ میخانۂ محمد کا/ محمد کا در/ میرِ عرب/ ندیمِ اقصیٰ/ وادیِ طیبہ/ یثرب

ان مثالوں میں کسی مکانی محیط کے لیے مستعمل لسانی ساختیہ (لفظ) کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ تشبیہی، استعارتی وغیرہ دوسرے لسانی ساختیے سے انسلاک کے سبب نعتیہ شعری لفظیات کی ایک وحدت تشکیل پاتی ہے مثلاً ''دیارِ رحمت عالم'' کی لسانی وحدت مکانی محیط ''دیار'' اور استعارتی ساختیے ''رحمت عالم'' کے انسلاک سے تشکیل پاتی ہے۔ ''راہِ مدینہ'' میں ''راہ'' اور ''مدینہ'' دونوں لفظ مکانی محیط سے تعلق رکھتے ہیں۔ ترکیب ''رحمت کا سائباں'' میں ''رحمت'' (مضاف الیہ) استعارے/ مجازیے اور ''سائباں'' (مضاف) مکانی محیط کی نشاندہی کرتا ہے۔ مکانی محیط کی نمایندگی کرنے والے ساختیوں کے علاوہ جو دوسرے ساختیے شعری لفظیات سے منسلک ہوتے ہیں، وہ لفظیات کی دیگر یعنی زمانی / اعتقادی/ طبعی وغیرہ صفات سے متصف ہو سکتے ہیں۔

نعت میں زمانی شعری لفظیات صبح و شام، شب و روز، بہار و خزاں، اول و آخر اور ازل و ابد جیسے عام معلوم اور شعوری تصورات کے علاوہ معراج و اسریٰ کے اعتقادی حوالوں کے پس منظر میں شعور و ادراک کی گرفت میں نہ آنے والے زمانی تصور سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ ''وقت/ عصر/ عہد'' وغیرہ زماں یا زمانے کے مترادفات ہیں اور فلسفے، منطق، مذہب اور نفسیات میں اس اصطلاح کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بعض علما مادے اور مکاں کے انطباق کے بغیر زماں کے تصور کو لغو قرار دیتے ہیں لیکن کچھ علما ایسے بھی ہیں جو زماں کو ذہن و شعور کا ایک عمل خیال کرتے ہیں۔ زمانے کے گزرنے کے تصور پر بھی متعدد نظریات عام ہیں کہ یہ خطِ مستقیم میں گزرتا ہے، اس کی حرکت دائروی یا منحنی ہے یا یہ کسی مرکز سے منتشر لہروں کی طرح بیرون کی سمت بڑھتا ہے (یا مرکز کی طرف مراجع ہے) نعت چوں کہ شاعری کا فن ہے اور اوپر مذکورہ علوم کا اس فن سے گہرا تعلق ہے اس لیے اس کی زمانی لفظیات کو ان علمی اصطلاحی پس منظر

وں کے ساتھ ساتھ مذہب یعنی اسلام کے زمانی تصور کے تناظر میں بھی دیکھنا ہوگا۔

زمانے کے عام تصور کے تعلق سے قرآن کی بعض آیات میں "سات/ چالیس راتوں/ دو، چار، چھے دنوں/ بارہ مہینوں/ کچھ برسوں" اور کسی خاص واقعے کے حوالے سے اس کے واقع ہونے کے سال کا تذکرہ آیا ہے مثلاً اصحابِ فیل کا واقعہ "عام الفیل" میں واقع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ زماں کا ایک اور نظریہ جو قرآن میں پایا جاتا ہے، وہ انسانی ذہن و فکر سے ماورا ہے مثلاً حضرت عذیر علیہ السلام کا سو برس تک اور اصحابِ کہف کا ساڑھے تین سو برس تک سونا اور بیدار ہو کر اس طویل مدت کو ایک دن یا کچھ وقت تک محدود سمجھنا۔ اسی طرح "شبِ اسریٰ/ معراج" کا واقعہ جس کے واقع ہونے کے زمانے کی طوالت یا اختصار انسانی ذہن کی قوتِ فہم سے ماورا ہے۔ ایسے ناقابلِ فہم زمانی تصور پر ہمارے لیے آمنا و صدقنا کہے بغیر چارہ نہیں، اسے ایمان بالغیب کا حصہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اوپر کے مذکورہ علوم کے حوالوں سے زمانہ/ عصر/ وقت شاعری کا عام موضوع رہا ہے۔

فلسفہ و تاریخ کے زمانی تصورات مختلف شعری اصناف میں برتے گئے ملتے ہیں۔ نعت کی صنف بھی ان سے مبرا نہیں۔ اس میں زمانے/ وقت/ عصر کے عمومی فکری متعلقات کے علاوہ ماورائے فکری متعلقات بھی خوب نظم کیے گئے ملتے ہیں۔ اس لحاظ سے جو شعری لفظیات مطالعے میں آتی ہے، اس کی چند مثالیں پیش ہیں:

ابتداؤں کی ابتدا/ انتہاؤں کی انتہا/ اول و آخر/ ابد گیر ہے یہ رُت/ اولین کائنات/ آخرین بیتِ نبی/ ابتدا میں انتہا کا رتبہ/ باعث صبح و مسا/ بہارِ بے خزاں/ بدایت و نہایت ان کی/ بہارِ گلستانِ صبح وجود/ پانچوں وقت نقارہ محمد کا/ تاریک شب میں آپ کا قدم/ جلوۂ صبح ازل/ چراغِ بستانِ شامِ شہود/ چرچا انھی کا صبح و شام/ روزِ روشن تھی شبِ اسریٰ/ یہ رات میں سورج/ شب اسرا/ شب معراج/ شامِ ابد کا ستارا/ شامِ ابد کی شمع فروزاں/ شام و سحر پر چھائے محمد/ شبستانِ جہاں میں نورِ سحر/ صبحِ بہارِ امکاں/ صبحِ ازل/ صبحِ دیدار/ صبحِ جمالِ مصطفیٰ/ ضیا مہتابِ شب کی/ فیض ان کا بہر دور/ لیلۃ القدر کا ستارا/ مدارِ گردشِ دوراں/ مقصودِ گردشِ روز و شب/ معراج کی رات/ ماہِ شبِ دیجور/ مدینے کے شام و سحر/ نورِ ازل/ نورِ اولیں

اس انتخاب میں صبح و شام، روز و شب، بہار و خزاں وغیرہ کے عام لسانی ساختیوں کے ساتھ ازل ابد / ابتدا انتہا/ بدایت، نہایت جیسے فلسفیانہ اور مجرد تصورات کو جوڑ کر زمانے/ عصر/ وقت کو مبہم اور پیچیدہ کر دیا گیا ہے۔ یہاں "ابتداؤں کی ابتدا" اور "انتہاؤں کی انتہا" جیسے فقرے قطعی بے معنی ہیں (اگرچہ فلسفہ ان پر خوب بحث کرتا ہے) ابتدا اور انتہا کے تعلق سے ان کے محض "ایک" ہونے کی معنویت میں قطعیت ہے۔ کسی واقعے کی کئی ابتدائیں اور کئی انتہائیں لغو تصورات ہیں۔ "شب معراج/ شب اسریٰ" کا زمانی

تصورِ مکان یعنی زمین اور خلا یعنی زمین سے الگ وسیع کائنات کے زمانی علمی نظریات سے بھی ماورا/ الوہی/ قرآنی تصور ہے اور قرآن میں، جیسا کہ کہا گیا، زمان کا کوئی واحد تصور نہیں ملتا، اس میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ شبِ معراج کے واقعے میں رسولِ اکرم ﷺ کا بیت الحرام سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک سفر کے زمانے کی طوالت کے بارے میں کچھ سوچنے اور اسے سمجھنے سے انسانی ذہن قاصر ہے۔ مندرجہ بالا نعتیہ شعری لفظیات میں ''تاریک شب میں آپ کا قدم/ معراج کی رات/ پانچوں وقت اسمِ محمد کا اعلان'' وغیرہ فقرے زماں کے عام مفہوم کا اظہار کرتے ہیں جب کہ ''بہارِ بے خزاں/ شامِ ابد کا ستارہ/ مقصودِ گردشِ روز و شب'' جیسی تراکیب شعریت سے مملو ہیں۔ ان میں تشبیہ اور استعارے کا حسن پایا جاتا ہے۔

نعتیہ شعری لفظیات میں مکانی اور زمانی لفظیات مجسم اور مجرد کے فرق سے دراصل فکر کے طبعی زاویوں سے ہمرشتہ ہے جن پر یہاں گفتگو کی گئی۔ ان زاویوں سے قطع نظر طبعی خصوص کے تحت نعت میں ایسے شعری لسانی ساختیے بھی وافر استعمال کیے گئے اور کیے جاتے ہیں جو انسانی فکر و احساس اور کردار و عمل سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ زمان و مکاں کے تصورات طبعیات سے اور مؤخر الذکر تصورات نفسیات، ثقافت، اخلاقیات وغیرہ علوم سے اپنی معنویتیں حاصل کرتے ہیں۔ تجسیم اور تجرید ان کی بھی شناخت کے عوامل ہیں جن کی وجہ سے انھیں بالترتیب طبعی اور غیر طبعی لفظیات کے زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں طبعی یعنی محسوس و مدرک خواص کی حامل لفظیات پیش کی جاتی ہے:

آپ کا داماں/ آفتابِ کرم/ آئینہ پیکر/ آفتابِ ہاشمی ان کو سوچتے رہنا/ اسم نبی/ ابر لطف و کرم/ امام رہبراں/ انگشت نبی/ بدر الدجیٰ/ بہار جلوۂ احمد/ بادشہِ سلطنتِ ارض و سما/ بوے گلزارِ نبی/ بحر جود و سخا/ بادشاہِ کونین/ پاے حبیبِ خدا/ پیکر ختم رسالت/ پرتوِ انوارِ نبوت/ جالی سنہری/ جنونِ عشقِ محمد ﷺ/ جسم اطہر/ جنبش انگشت/ چراغ حبِ نبی/ چہرۂ مبیں/ چراغِ جمالِ مصطفیٰ/ چشم گریانِ شفیعِ مرتجیٰ/ حامی بے چارگاں/ حبیبِ خدا/ خمِ زلفِ نبی/ خیالِ احمدِ مرسل/ خورشیدِ رسالت/ خاکِ درِ مصطفیٰ/ خرام آپ کا/ خاکِ پاے محمد ﷺ/ خاکِ طیبہ/ داماں آپ کا/ دامانِ سالارِ انبیا/ دامن نسبت/ دولتِ عشقِ نبی/ دیوانہ محمد ﷺ/ دیوانگی عشقِ محمد ﷺ/ ذکرِ صلِ علیٰ/ ذکرِ احمدِ مختار/ ذکرِ سرکار/ رخِ عالم پناہ/ روے سرکار/ زیارتِ روے رسول/ زلفِ محمد ﷺ/ سایۂ دامن مصطفیٰ/ سایہ آپ کا/ شمعِ عشقِ حضور/ شادیِ دیدار/ حُسنِ مصطفیٰ/ شہِ دوسرا/ شافعِ محشر/ شہنشاہِ کون و مکاں/ شہِ ہدیٰ/ شمعِ نورِ ہدیٰ/ شمس الضحیٰ/ شہِ رسل/ شہِ کونین/ شعورِ عشقِ محمد ﷺ/ شہِ والا/ صداے صلِ علیٰ/ صاحبِ جود و سخا/ ضیاے سیدِ کونین/ عالمِ اسباب کی تقدیر/ غمِ حبیب/ غم خوارِ جانِ بے کساں/ فرش پہ آپ کا بستر/ قربِ نفسِ پاک/ قرارِ دلِ بے کساں/ کلام آپ کا/ گیسو: سایۂ

رحمت/ گدائے مصطفیٰ/ منبع نور/ موجۂ نسیمِ گلستاں/ امیرِ عرب/ مظہرِ کامل/ مہِ تمام نورِ ہدیٰ/ نیرِ برجِ ہدایت/ نقشِ کفِ پائے نبی/ نگاہِ محمد ﷺ/ نامِ محمد ﷺ/ نورِ مجسم/ نورِ دل وجاں/ نبی کی خاکِ پا/ نورِ ہدیٰ/ وردِ صلِ علیٰ/ یادِ شہِ کونین/ یادِ حضور

ان تراکیب اور فقروں میں "سوچنا، خیال، یاد، قرار، جنوں، عشق" وغیرہ الفاظ مجرد ادراک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور انسانی نفسیات میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ "آفتاب، مہتاب، ستارہ، نور، ضیا، نیر، شمع" جیسے الفاظ طبعیات کے شعبے سے ہیں اور ظاہر ہے کہ نعت میں ان کا استعمال علمی معنوں کی بجائے روحانی، اعتقادی اور فنی معنوں میں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح "جلوہ، جمال، چہرۂ مبیں، خمِ زلف، خرام، منبع نور، نگاہ، نقشِ کفِ پا" وغیرہ شعری ترکیبوں کا تعلق واضح طور پر جمالیات سے ہے۔ ان نفسی اور جمالی لسانی ساختیوں کو مجموعی طور پر طبعی شعری لفظیات کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اور اس کا بڑا حصہ حیاتی عوامل کا حامل ہونے کی وجہ سے پیکریت کی ذیل میں آتا ہے۔ مثال کے طور پر "ابرِ لطف وکرم، آفتابِ کرم، جالی سنہری، چراغِ حبِ نبی" وغیرہ وغیرہ لسانی تراکیب میں "ابر، آفتاب، جالی، چراغ" کے ساختیے بصری پیکر تخلیق کرنے والے ہیں۔ دوسری مثالیں:

"بوئے گلزارِ نبی، جسمِ اطہر، خمِ زلفِ نبی" ترکیبوں میں مشامی پیکر ملتے ہیں۔ "ذکرِ سرکار، ذکرِ صلِ علیٰ، صدائے صلِ علیٰ، کلام آپ کا، وردِ صلِ علیٰ" ترکیبیں سمعی پیکر بناتی ہیں۔ اسی طرح "فرش پر آپ کا بستر، موجۂ نسیمِ گلستاں" وغیرہ ترکیبوں سے لمسی پیکر تخلیق پاتے ہیں۔ زیرِ تذکرہ طبعی نعتیہ شعری لفظیات کو "طبعی" کی ذیل میں لینے کا اہم سبب یہی ہے کہ اس کی ہر ترکیب کو کسی علم سے رابطہ رکھنے والے عامل کی حیثیت سے ثابت کیا جاسکتا ہے جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں نفسیات، طبعیات اور جمالیات کے علوم کے حوالوں سے چند تراکیب پیش کی گئیں۔

طبعی شعری لفظیات کے مقابل غیر طبعی شعری لفظیات کو علمی اساس پر ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی معنویت کی جڑیں روحانی، عرفانی، الوہی وغیرہ تصورات سے پیوست ملتی ہیں، مثلاً

آیۂ رحمت/ آیۂ نور/ آپ کی چشمِ کرم/ ان کی رحمت/ اسوۂ خیر البشر/ اسریٰ میں تقریبِ ملاقات/ انوارِ رسالت/ بنائے لطفِ رسول/ پیکرِ حُسنِ عدالت/ پرتوِ انوارِ نبوت/ تیری ذات کے تصرفات/ جمالِ پاک کا جلوہ/ جانِ حُسنِ ازل/ جمالِ سورۂ رحمٰن/ جس کی طلب گار ہے رحمتِ یزداں/ جمالِ کون ومکاں/ جوہرِ آئینۂ لوحِ قضا/ حُسنِ دعا/ حُسنِ سخاوت/ حبِ نبی/ حُسنِ سرکار/ حکمت کا گلاب/ حضور کیا ہیں؟/ حُسنِ ذات کا رازداں/ حق ترجماں محمد ﷺ/ خلقِ مجسم/ خیر البشر/ خطاپوشِ جہاں/ خلعتِ لولاک/ دردِ معاصی کی دوا/ دو

نیم مہتاب/ دولتِ بیدارِ عشق/ رحمتِ کل/ رحمت للعالمین/ رسول کا جلوہ/ روحِ روانِ ہستی/ رحمتِ ایزد کا پیامی/ رحمتِ عالم/ رحمتِ باری/ رحمتِ کونین/ رحمتِ تمام/ راحتِ قلبِ عاصیاں/ زینت طرازِ عرش/ سرِ تخلیق کرم آثار/ شمعِ خلوتِ لاہوت،/ شمعِ خلقِ اطہر/ طے ہوئی لمحوں میں یہ راہِ سفر/ طلوعِ ماہِ رسالت/ ظلِ رب/ عرفانِ ذاتِ مصطفیٰ/ عکسِ جمال/ فخرِ بشر/ فروغِ عشقِ محمد ﷺ/ فروغِ شانِ رسالت/ کن سے پہلے کی صدا/ غلامی ختمِ رسل/ کمالِ حُسنِ حضور/ مےٗ عشقِ نبی/ مزرعِ امید بخش/ معنی آیاتِ بینات/ منبعِ جوے کرم/ مجسم شریعت/ مصطفیٰ کی حقیقت/ نبوت کا حُسن و جمال/ نازِ جانانہ محمد ﷺ کا/ نورِ ازل تاب/ نورِ عرش کا مدح خواں/ نقشِ مراد

ان تراکیب کے بعض کلیدی الفاظ ''رحمت، کرم، ازل، دعا، سخاوت، بخشش، مراد'' وغیرہ نعتیہ متن میں استعمال کیے جانے کی وجہ سے معانی و مفاہیم میں اپنے عام معنوں سے بہت مختلف رنگوں کے حامل ہیں۔ ''رحمت/ کرم'' جیسے غیر طبعی لفظوں کو التواے معنی کا مابعد جدید تصور بھی واضح نہیں کر سکتا۔ جس کی وجہ سے معنی اپنی تاویلات/ تفہیمات/ تشریحات وغیرہ کو تہ در تہ بدلتے چلے جاتے ہیں اور ان کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔ جب کہ تقدیسی شاعری کے متن کا حصہ ہونے کے حوالے سے مذکورہ الفاظ کی ساری تہ در تہ معنوی کیفیات حمد یا نعت لکھنے/ پڑھنے/ سننے والے پر عیاں ہوتی ہیں۔ اس ذیل میں ''رحمت'' کی مختلف معنوی پرتوں سے ہم رشتہ نعتیہ لفظیات کا تجزیہ پیش ہے:

آیۂ رحمت/ جس کی طلب گار ہے رحمتِ یزداں/ رحمتِ ایزد کا پیامی/ رحمتِ باری/ رحمتِ تمام/ رحمتِ عالم/ رحمتِ کل/ رحمتِ کونین/ رحمت للعالمین

آیۂ رحمت: (۱) مراد قرآنی متن کے آغاز کی آیت جو اللہ تعالیٰ کے رحمٰن و رحیم ہونے کا اعلان کرتی ہے (۲) نعتیہ متن میں استعمال کیے جانے کی وجہ سے اس سے مراد رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس۔ اللہ کی تخلیق کردہ بے شمار آیتوں (نشانیوں) کی طرح آپ بھی ایک عظیم آیت کا درجہ رکھتے ہیں (۳) قرآن میں متعدد مقامات پر دنیا جہان والوں کے لیے رسولِ اکرم ﷺ کے رحمت ہونے کے حوالے موجود ہیں۔

جس کی طلب گار ہے رحمتِ یزداں: اس فقرے کی ضمیر موصولہ (جس) رسولِ اکرم کی طرف راجع ہے۔ اضافی ترکیب ''رحمتِ یزداں'' کے

عام معنی ہیں ''اللہ کی رحمت'' جو خود رسول اکرم کی طلب گار ہے۔

رحمتِ ایزد کا پیامی: اللہ تعالیٰ کی رحمت کا پیام لانے والا یعنی رسولِ اکرم ﷺ

رحمتِ باری: اللہ تعالیٰ کی رحمت

رحمتِ تمام : سے مراد اللہ اور رسول اللہ دونوں ہو سکتے ہیں۔

رحمتِ عالم : دنیا جہان کے لیے رحمت مراد رسول اکرم

رحمتِ کل : (۱) مراد رسول اکرم (۲) اللہ کی ساری رحمت

رحمتِ کونین : دونوں جہان کے لیے رحمت (کا باعث) مراد رسول اکرم

رحمۃً للعالمین : عالمین کے لیے رحمت (کا باعث) مراد رسول اکرم

ان مثالوں سے ''رحمت'' کی معنوی وسعتیں ظاہر ہیں۔ غیر طبعی لفظیات میں ازل/ ابد، لاہوت/ ملکوت جیسے تصورات ''زمان و مکاں'' سے ہم رشتہ ہونے کے باوجود اپنی الوہی معنویتوں میں لامحدود لا مدرک ہوتے ہیں اور ان کی زمانیت اور مکانیت طبعی نہیں، غیر طبعی ہے۔ مثال کے طور پر تراکیب ''جانِ حسنِ ازل'' اور ''شمعِ خلوتِ لاہوت'' میں ''ازل/ لاہوت'' کو صرف ''حسن/ خلوت'' کے معنوی پس منظر کے ساتھ سمجھنا ممکن ہے، آزادانہ ان کا مفہوم ادراک سے پرے ہے (بھلے ہی کتابوں میں ان کے معانی کی تفصیل بیان کی گئی ہو) مکانی/ زمانی اور طبعی/ غیر طبعی شعری لفظیات کی یہ تقسیم ساختی معنیاتی درجہ بندیوں کی پابند نہیں۔ ان کے لسانی اجزا کبھی ایک سے دوسری ترکیب میں بھی سرایت کر جاتے ہیں مثلاً ترکیب ''بہارِ گلستانِ صبحِ وجود'' لفظ ''صبح'' کے کلیدی ہونے کی وجہ سے زمانی لفظیات میں شامل ہے لیکن اس میں لفظ ''گلستان'' مکانی خاصیت کا حامل ہے۔ اسی طرح ترکیب ''شمعِ نورِ ہدیٰ'' میں لفظ ''شمع''، طبعی، لفظ ''ہدیٰ'' غیر طبعی خصوصیت رکھتے ہیں۔

حمد میں بیشتر اور نعت میں اکثر ایسے تصورات شعری لفظیات میں ڈھل گئے ہیں جو بظاہر معنوی کثرت کے حامل ہیں مگر دراصل اپنی تجرید اور گہرائی و گیرائی کی وجہ سے ان کی تفہیم میں سرعت نہیں ہوتی (غیر طبعی شعری لفظیات ملحوظ رہے) صرف تعبیر و تاویل ہی کے ذریعے انھیں سمجھا جا سکتا ہے۔ نعت میں ایسی شعری تراکیب اگرچہ کم مستعمل ہیں لیکن شعری ترنگ شعرا کو ان کی طرف اکثر کشش کیے رہتی ہے۔ نعتیہ شعری لفظیات کی یہ شاخ ''الوہی'' کی صفت سے متصف کی جا سکتی ہے، چند مثالیں :

اسوۂ حسنہ/ اللہ سے ملاقات/ حاصل کلام/ خدا اور اس کے فرشتے دُرود بھیجتے ہیں/ دورِ تکوین/ دو بہ دو راز کی باتیں/ ذاتِ احد کا مظہر/ راز الا اللہ/ سر نکتہ معراج/ سرِ عرش مسند نشیں/ سجدہ گہِ شمس و قمر/ عرش کے مسند نشیں/ قاب قوسین/ محمد (ﷺ) ازل ہے، محمد (ﷺ) ابد/ مظہرِ ذاتِ خدا/ مظہرِ یزداں/ وہی خدا ہے

شاعری مبالغے سے خالی نہیں ہوتی۔ نعت بھی شاعری ہے اور اس کے اظہار میں شاعر کی رسول اکرم سے عقیدت و ارادت جب مبالغے کا رنگ اختیار کر لیتی ہے تو وہ آپ کی ذات میں خالق کل کی ذات

کے رنگ دکھانے لگتا ہے۔ نتیجے میں الوہی شعری لفظیات تشکیل پاتی ہے۔ دی گئی مثالوں کے شعری فقرے اور ترکیبیں تصوف، فلسفے، اسطوری فکر اور شعریت کی آمیزش کے سبب اللہ کو رسول اللہ کے اوتار (ذاتِ احد کا مظہر/ مظہرِ یزداں) میں دیکھتی اور دکھاتی ہیں۔ ان مثالوں میں ہر ایک تعبیر و تاویل کے ہر تفہیمی زاویے سے بے معنویت کے تاریک گڑھے میں گم ہو جاتی ہے۔ صرف ایک تصور ''محمد ازل ہے، محمد ابد'' پر چند باتیں :

یہ خیال ''زمانہ خدا ہے'' کے تصور سے متاثر ہے کہ ازل/ ابد عصر کے لامحدود آغاز و انجام کے اشاریے ہیں۔ ''زمانہ'' (ایک قول کے مطابق) اگر خدا ہے تو ازل/ ابد زمانے کی (نعوذ باللہ خدا کی) دو انتہائیں ہیں۔ انھی کو شاعر نے محمد کہہ دیا ہے اور ایسا کہنا قطعی لغو، بے معنی اور ایمان کے لیے خطرہ ہے۔ نعت کی ایسی ہی شعری لفظیات کو اسطوریات سے متاثر ہوتے دیر نہیں لگتی، مثلاً اوپر جو ''اوتار'' کا لفظ آیا ہے، ''مظہرِ ذاتِ خدا'' کے تصور کو اسطوری بنا دینے کے لیے کافی ہے۔

اللہ کی ذات اپنے وجود کے اثبات کے لیے کسی مظہر کی محتاج نہیں اور نہ کائنات کے مظاہر ہی میں اس نے خود کو ظاہر کیا ہے، سارے مظاہر اس کی مخلوقات ہیں۔ ان کے وجود سے اللہ کی تخلیقی قدرت کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ اللہ آپ مظاہر میں جلوہ گر ہو گیا ہے۔ وحدۃ الوجود، اَدْوَیت واد اور حلول کے اول جلول نظریات/ فلسفے وجودِ الٰہی کی فطری سادگی میں تصوف، تیاگ، بیراگ اور آواگون جیسی لغویتیں شامل کر دیتے ہیں۔ یہ اسطوری فکر کا تسلط ہے جو ذیل کی نعتیہ لفظیات میں دکھائی دیتا ہے :

آپ بگڑی بنائیں/ آپ کی دعا سے آتش نمرود کا بجھنا/ انگلی پہ جن کی شش جہت/ الفِ احمد و احد/ احمدِ بلا میم/ بہر امداد آئے محمد/ براقِ مؤدت/ بامیمِ احمد/ پردہ میم کا/ تری مشکل کشائی/ تیرے کرم نے سرد کی آتشِ سحرِ سامری/ خاکی پیکر میں مالکِ دو جہاں/ خورشید لوٹ کر آیا/ دو نیم آفتاب/ ذاتِ نبی خدا کا نشاں/ قدرت رسول اللہ کی/ لات و منات پاش پاش/ وہ عطائے عفو ہے/ وہی خدا ہے/ ہر شے محمد ہی محمد/ محمد نقشِ اول و آخر/ میم کا اَسرار

ان مثالوں سے ''آتش نمرود'' اور ''آتش سحرِ سامری'' کی اسطوریت پر چند معروضات پیش ہیں۔ جیسا کہ حوالہ آیا ہے کہ آپ کی یعنی رسول اکرم ﷺ کی دعا سے آتش نمرود بجھ گئی، اسے زمانی مغالطہ سمجھنا بے جا نہیں۔ رسولِ اکرم حضرت ابراہیم کے لیے دعا کر رہے ہیں۔ گویا دونوں حضرات کا زمانہ ایک ہے یا رسول اکرم جیسا کہ ایک خاص مدرسۂ فکر سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کا خیال ہے، ہر زمانے میں حاضر (اور ناظر) ہیں۔ جب نمرود نے حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا تو رسول اللہ کی دعا سے آگ بجھ گئی۔ یہ سارا

وقعہ گویا لغویت کا ڈراما ہے ۔ قرآن میں ہے کہ اللہ کے حکم سے آگ ابراہیم کے لیے سرد ہو کر سلامتی بن گئی تھی ۔ وہاں اس کے بجھنے کا ذکر نہیں پایا جاتا اس لیے شعری لفظیات کی اس مثال کو اسطور/ دیومالا / خرافات سمجھنا بیجا نہیں ۔ اسی طرح ''آتشِ سحر سامری'' شاعر کے اپنے تخیل کی اپج ہے کیوں کہ تلمیحی واقعات میں ''سحرِ سامری/ گوسالۂ سامری'' وغیرہ کے حوالے تو ملتے ہیں مگر ''آتش سامری'' کا تذکرہ نہیں ملتا ۔ اسطوریات کا یہ قاعدہ ہے کہ ایک ''حقیقی'' اسطور کے حاشیوں سے نئی اسطوری کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں ۔ ''آتش سامری'' کو اسی کی مثال سمجھنا چاہیے ۔ مزید یہ کہ ''خورشید لوٹ کر آیا'' کے واقعے میں حضرت علی کی نماز عصر فوت ہو جانے کا اشارہ ملتا ہے ، کیوں کہ سورج غروب میں آچکا تھا ۔ رسول اکرم کی دعا سے وہ دوبارہ خط زوال سے اوپر آ کر چمکنے لگا اور حضرت علی نے عصر کی نماز (گویا اس کے وقت پر) پڑھ لی ۔ سورج کے لوٹ کر آنے کا یہ واقعہ رومی اور یونانی اساطیر میں بھی پایا جاتا ہے اس کے علاوہ ہندو دیومالا بھی ایسے ہی ایک مشابہ واقعے کا تذکرہ کرتی ہے ۔ نعت میں ایسی خرافات کے نظم کرنے سے پرہیز کیا جانا چاہیے ۔ یہاں صرف ایک مثال ''لات و منات پاش پاش'' ایسی اسطوری ساخت ہے جو عربی صنمیات کے کرداروں کی شکست کا ذکر کرتی ہے ۔ (اگرچہ وہاں بھی ان کرداروں سے تعلق رکھنے والا کوئی واقعہ نہیں ملتا ، گویا یہ اسطوری بیانیے کے کردار نہیں ، محض علامات ہیں)

نعت رسول اکرم ﷺ کی صورت و سیرت کے مضامین کا شعری اظہار ہے ۔ روایات و اعتقادات ، ثقافتی و ماحولیاتی اثرات اور لسانی و فنی ضروریات وغیرہ عوامل منفی و مثبت زاویوں سے اس شعری اظہار پر ہر دور میں حاوی رہے ہیں ۔ دنیا بھر کے تہذیبی و ثقافتی رنگوں نے بھی نعت گوئی کو خاصا متاثر کیا ہے ۔ اس ذیل میں علاقائی فلسفیانہ تصورات ، تصوف اور رہبانیت کے رنگ یہاں تک کہ مختلف علاقائی اسطوری خرافات بھی نعت پر اثر انداز نظر آتی ہے ۔ (گذشتہ صفحات پر یہ بحث آچکی ہے) یہاں نعت پر فلسفے یا فلسفیانہ لفظیات کے اثرات کا جائزہ مقصود ہے ۔

آبِ حکیمانہ محمد کا / آوازۂ پرشوکتِ پیغامِ محمد / اقلیم لامکاں کے مکیں / امکانوں کا امکاں / جس قدر قرب اتنا ہی فاصلہ / حدوث و قدم / حضور و غیاب / شرحِ لفظ کن / ظاہر و باطن فکرِ رسول عربی / مکاں لامکاں ان کی رفعت / موجود و عدم فاصلہ / نہ یہاں زماں ، نہ یہاں مکاں

ان مثالوں میں ''آبِ حکیمانہ محمد کا / اقلیم لامکاں کے مکیں / امکانوں کا امکاں / زمان و مکاں لاموجود / قرب و فاصلہ بے تمیز'' جیسے تصورات بے معنی ہیں ۔ شاعرانہ غلو نے دراصل رسول اکرم کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر بنا دیا ہے اور یہیں شاعر کی اپنے رسول سے عقیدت و ارادت کا امتحان بھی ہے جو اسے غلو اور مبالغے کی

ہوا سے پھلا کر کسی بھی لمحے پھٹنے کے لیے فضا میں چھوڑ دیتا ہے۔ دیگر مثالیں ''قرب و فاصلہ/ حدوث و قدم/ حضور و غیاب/ ظاہر و باطن/ موجود و عدم/ زمان و مکاں محتمل الضدین/ قول محال/ اجتماع نقیضین کی مثالیں ہیں۔ یہ فلسفیانہ تصورات اسلام اور قرآن اور الوہیت و رسالت کے مفاہیم سے کچھ رشتہ نہیں رکھتے۔ (اسلام میں فلسفے کی گنجائش ہی نہیں) اس لیے نعتیہ شعری لفظیات کے طور پر یہ برائے شعر گفتن بھی مناسب نہیں۔

حمد، نعت، غزل، قصیدہ وغیرہ اصطلاحی لسانی تعملات کبھی اپنے اصطلاحی معنوں سے ہٹ کر مجازی رنگ بھی اختیار کر لیتے ہیں (شاعری سے قطع نظر) لفظ ''غزل'' کو رنگیں بیانی کے معنی میں بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ کسی نواب یا بادشاہ کی مبالغہ آمیز تعریف نہ رہ کر عام فہم فرد کی تعریفوں کے پل باندھنے کو بھی ''قصیدہ'' کہتے ہیں۔ اسی طرح لفظ ''نعت'' اپنے تکنیکی معنوں سے زیادہ شعری مجازیے کے طور پر بھی خوب مستعمل ملتا ہے۔ ''مدح/ مدحت/ ثنا/ قصیدہ'' وغیرہ اس کے مترادفات سمجھے جاتے ہیں۔ مختلف طریقوں سے ماخوذ ذیل کی شعری لفظیات ملاحظہ کیجیے:

آقا کی مدحت/ افسانہ محمد کا/ ارزانی نعتِ نبی/ ثنائے خواجہ/ ثناخوان محمد/ حمدِ باری/ دیباچہ گلستانِ وجود/ خدا ہے ان کا ثناخواں/ شعورِ مدحتِ سلطانِ بحر و بر/ شعرگوئی کی پاکیزگی/ کلام پاک قصیدہ ان کا/ گلدستہ نعتِ نبی/ مدحِ محبوبِ رب/ مدحتِ سرورِ کونین/ مدحتِ سرکار/ مدحتِ پیمبر/ مدحت سرائی رسول/ مدحت شاہِ بطحا/ مدح چمن آرائے مدینہ/ نعتِ نبی/ نعتِ محبوبِ الٰہی

اوپر واضح کیا گیا ہے کہ لفظ ''قصیدہ'' اپنے اصطلاحی معنوں کے علاوہ اور مجازی معنوں میں کس طرح استعمال ہوتا/ ہوسکتا ہے۔ یہاں مثالوں میں ایک فقرہ ''افسانہ محمد کا'' آیا ہے۔ شاعر نے ایک غیر شاعرانہ یا نثری اصطلاح کو مجازی معنی دے کر نعتیہ شعری لفظیات کا حصہ بنا دیا ہے۔ دوسری مثال ''دیباچہ گلستانِ وجود'' ترکیب کی ہے جو غیر شعری اصطلاح ''دیباچہ'' کو شعری معنویت کے ساتھ استعمال کر رہی ہے۔ اسی طرح ترکیب ''گلدستہ نعتِ نبی'' میں ''گلدستہ'' ایک شعری اصطلاح ہے بمعنی مختلف شعرا کی اعلیٰ معیاری غزلوں کا مجموعہ۔

صنفی لفظیات کا شعری لفظیات کے طور پر استعمال واضح کرتا ہے کہ اصطلاحی الفاظ صرف محدود معنوں کے حامل نہیں ہوتے۔ انھیں کثرتِ معنی کے پیشِ نظر زاویہ بدل کر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

شعر میں نعتیہ اظہار دراصل رسول اللہ ﷺ پر شاعر کے ایمان و یقین کا اظہار ہے۔ اس کی عقیدت و ارادت ہی اسے نعتیہ شعری اظہار کی طرف راغب کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر شاعر کا اعتقاد نعتیہ شعری

لفظیات کے تحت متعدد رنگوں میں سامنے آتا ہے۔ اب تک پندرہ سو برس کی مدت اس صنف کے شعری اظہار پر گزر چکی ہے اور اس مدت میں متعدد زبانوں، ملکوں، تہذیبوں اور فکروں کے رنگ رنگ زاویے نعت پر اثر انداز ہو چکے ہیں۔ ان رنگوں میں بہت سے رنگ اسلامی فکر کے ساتھ ساتھ علاقائی فکر اور تہذیب و ثقافت سے بھی ہم رشتہ ہوتے ہیں۔ لامحالہ یہ رشتہ نعتیہ شعری اظہار میں راہ پا جاتا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ نعتیہ شاعری صرف اور صرف شاعر کے اعتقاد کی شاعری ہے اس لیے اس پر شاعر کی انفرادی فکر کے ساتھ اجتماعی مذہبی تصورات بھی حاوی ہوتے ہیں۔ نعتیہ اعتقادی شعری لفظیات میں جن کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں :

نعت میں اعتقادی شعری لفظیات کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(ا) قابل قبول اعتقادی لفظیات :

آقا/ آمدِ سرکار/ آمدِ حضور/ افتخارِ نسلِ آدم/ امت کا سہارا/ اسمِ گرامی سرِ عرش/ اُمّی لقب/ اعجاز پارے احمدِ مرسل/ اسمِ احمد سے منور ہے زمانہ/ بخشش کا وسیلہ/ جانِ شش جہت/ جمالِ مصطفائی سے سارا جہاں روشن/ جودِ شاہِ کوثر/ جو ہیں نہایتِ جستجو/ حبیبِ خدا/ حضور تشریف لا رہے ہیں/ حضرتِ اقدس/ حرمتِ زنجیرِ حرف (بے معنی)/ حبِ نبی/ خدا کے بعد جلال و جمال کا مظہر/ خاتمِ دہر کے نگیں/ خیالِ نبی/ خدا کے حسن کا آئینہ/ خاتم الانبیا/ ختمِ نبوت/ دین کامل کی آخری تحریر/ راہِ پرنور/ روئے نور فشاں/ رہنمائے راہِ حقیقت/ سلطانِ سلاطین/ سلطانِ عادل/ سایۂ رحمت/ سرکار، رب کی آرزو/ سرکار میری آرزو/ ساقی سلسبیل/ سحابِ لطف پر و بال (بے معنی) سرکارِ دو عالم/ سرورِ دین و دنیا/ سفر معراج کا/ سایۂ طوبیٰ/ ساقی کوثر/ شہِ جن و بشر/ شانِ رسالت مآب/ شہِ ابرار/ شہِ دوراں/ شفیع المذنبیں/ شہرِ علم/ شاہِ امم/ شاہِ حجاز/ شمعِ بزمِ محشر/ صاحبِ فیض و لطف و عطا/ صاحبِ وحیِ مبیں/ صدرِ بزمِ امکاں/ صاحبِ شق القمر/ صاحب معراج/ طرزِ بیانِ محمدی/ عرش سے فرش تک ترے حُسن کی جلوہ پاشیاں/ عدل کی میزان/ علوئے مرتبت اس کا/ فخرِ موجودات/ فیضِ رسالت مآب/ قاسم/ کتابِ زندگی کا ضابطہ/ گنجِ قدرت کے امین/ لبِ جاں بخش نبی/ لباسِ شریعت/ محرمِ اسرارِ کریمانہ/ محشر میں آسرا محمد/ مصطفیٰ کے لہجے میں قرآن/ منبعِ علم و یقیں/ محسن اعظم/ مہمانِ حضرتِ معبود/ محسن انسانیت/ مولائے خاص و عام/ مخزنِ لطف/ مہرِ نبوت/ مرجع ذاتِ انبیا/ محسن دشمناں/ نازشِ رحمتِ کبریا/ نقشِ علم و آگہی/ نبی خاتم و ختم الرسل/ وسیلہ نجات کا/ ہادیِ اعظم

عقیدے کی صحت، فرداً فرداً شاعر کی رسولِ اکرم ﷺ سے سچی عقیدت اور اس کے فن کے خلوص نے درج بالا لفظیات کو قابل قبول بنایا ہے۔

(۲) ناقابلِ قبول اعتقادی لفظیات :

اسرارِ کائنات کا عقدہ کشا/ استمداد بالرسول/ آگاہِ رازِ پیدا و پنہاں/ امینِ کن فکاں/ ان کو سب خبر ہے/ اولِ مخلوق/ بشرِ خدانما/ پرتوِ انوارِ الٰہی/ تری مشکل کشائی/ تو ہے یزداں/ جس کی آنکھ نے نظارۂ حق کیا/ حُسنِ لم یزل/ خدا کا ہمنشیں/ حضور مجسم تھے روشنی/ حسن دائمی/ داورِ محشر/ دلِ یزداں کی دھڑکن/ دستِ خدا ہیں آپ/ دو عالم سے باخبر/ دانائے حرفِ کن/ ذاتِ احمد تھی یا خدا تھا/ رازِ ارض و سما/ رمزِ الف لام میم/ رئیس قدسیاں/ رمزِ تخلیقِ جہاں/ راز دارِ خدا/ راز دانِ وسعتِ کون و مکاں/ زبانِ خدا ہے، زبانِ محمد (بے معنی)/ سجدۂ آستانِ نبی/ شرحِ الف لام میم/ شہِ لوح و قلم/ شہِ لولاک (بے معنی)/ ظلِ الٰہی/ عارض پر نور پہ آیاتِ قرآنی/ عکسِ یزداں/ عکسِ نورِ کبریا/ عالمِ علمِ کن فکاں/ عالمِ علمِ دو عالم/ عکسِ نورِ خدا/ کن سے قبل کاشفِ سرِ لا / منشائے تخلیقِ دو عالم/ مقصدِ اعظمِ نورِ ازل/ مسند آرائے سریرِ کائنات/ مشکل کشا/ منبعِ نور/ مختارِ کارخانۂ قدرت/ معنی لولاک (بے معنی)/ مالکِ کل جہاں/ مشکل میں ان کو پکارا/ نورِ ازل ہیں آپ/ نائبِ ربِ قدیر/ نور کے سانچے میں ڈھلا/ نورِ صفا/ نورِ مجسم/ نورِ محبوبِ خدا/ نورِ بزمِ کون و مکاں/ نورِ دو عالم کی ابتدا/ نشانِ وجہُ اللہ/ نور کا منبع / نورِ عین الیقیں/ وجہِ بنائے دین و دنیا/ وجہِ تخلیق لوح و قلم/ واقفِ اسرارِ یزدانی/ ہمرازِ لوح و قلم

اعتقادی شعری لفظیات ہی حادی طور پر نعت کی عمومی شعری لفظیات ہے۔ نعت کے جتنے شاعر اتنے ہی ان کے اعتقادات : کچھ آپ کے لیے قابلِ قبول، کچھ راقم کے لیے ناقابلِ قبول کہ آپ کے اور راقم کے اپنے بھی تو کچھ اعتقادات ہیں (اس تقسیم کو ماننے نہ ماننے کا ہر قاری کو اختیار ہے)

نعت چوں کہ عرب سے آئی ہے اس لیے اس پر عربی یعنی قرآن و حدیث کی زبان کے اثرات بھی واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں ۔ ایسے لسانی تعملات کو شاعر کبھی راست عربی لسانی ساخت اور کبھی بالضرورت ترجمے کے طور پر استعمال کرتا ہے، چند مثالیں :

ع رحمت نے پکارا خود بڑھ کر انا اعطینا ک الکوثر

ع دعوا ہے من رانی محبوبِ سرمدی کا

ع رحمت للعالمیں یا رحمت للعالمیں

ع ہر نفس وردِ صلِ علیٰ چاہیے

ع وہ بارگہِ صاحبِ لولاک لما ہے

ع پڑھا کرتا ہوں اکثر یا نبی آہستہ آہستہ

ع منارہ ہیں خیر البشر روشنی کا

ع افضل الانبیا ہیں فخرِ بشر

ع یارسول اللہ آجاؤ مدد کے واسطے

ع راحتِ قلبِ عاصیاں صلِ علیٰ محمد

ع صلوا علیہ وآلہٖ یہی اک کلام ہے کو بہ کو

ع اقرا سے تا بہ آیتِ آخر، زبانِ علم

ع دربارِ نبی سبحان اللہ، دربارِ نبی سبحان اللہ

ع طاہر اطیبا عن الانجاس

ع ہر اک لب پر یہاں صلِ علیٰ، اللہ اکبر ہے

ع اے خاتم الرسل، شہِ دوراں تمھی تو ہو

ع لولاک لما خلقت الافلاک

ع من انفسنا، زکی، صفی، پاک

ع قال : خیر القرون قرنی

ع فرمایا : انا مدینۃ العلم

ع آتا ہے جب زباں پہ لقد جاءکم رسول

ع وما محمد الا رسول، سچ ہے مگر

ع ملا رفعنا لک ذکرک میں اس کو اثبات

ع یا نبی، روحی فداک، بابی

ع کوئی سبب تو ہو پھر انزل السکینہ کا

ع طلع البدر علینا من ثنیات الوداع

وغیرہ وغیرہ۔ ایک زبان کے شعر میں دوسری زبان/ زبانوں کے الفاظ اور فقروں کا استعمال صنائع لفظی میں صنعتِ تلمیع کہلاتا ہے۔ "تلمیع" کے معنی "چمک" ہیں۔ ایک زبان میں جب دوسری زبان کا کوئی مستعار لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو گویا یہ اجنبی لفظ شعر میں چمکتا ہوا نظر آتا ہے یعنی بہت واضح سنائی اور دکھائی دیتا ہے۔ تقدیسی شاعری میں، خصوصاً نعت میں، اس صنعت کا استعمال عام ہے اور زبانوں میں ایک قسم کا تہذیبی، فکری اور جمالیاتی امتزاج پیدا کرنے کی تکنیک ہے۔

شعری لفظیات کے اس جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ

(۱) زبان کا ہر استعمال اس کے معاشرے، ماحول اور متکلم کی ذہنی کیفیات پر انحصار کرتا ہے

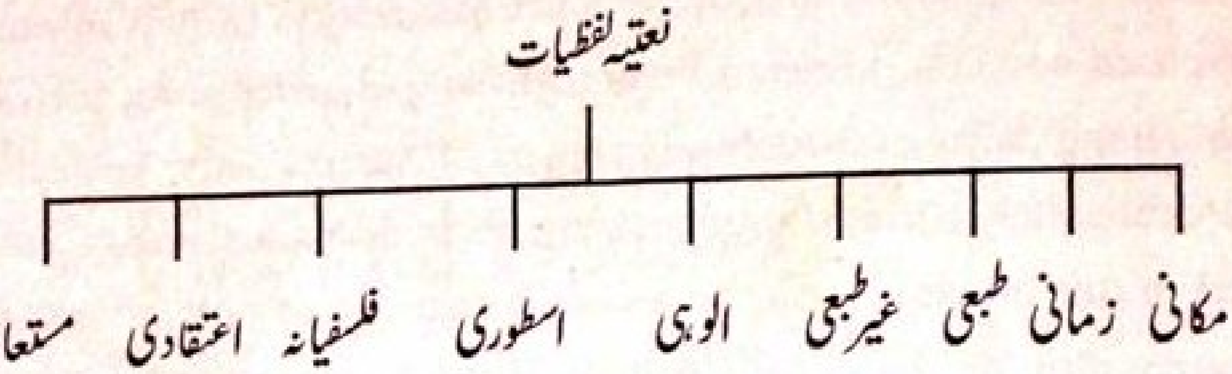
(۲) زبان کے عام استعمال کی طرح اس کے خاص استعمال میں بھی ماحول وغیرہ کو بڑا دخل حاصل ہے

(۳) زبان کے فنی/ادبی استعمال میں شعر کی زبان نثر کی زبان سے مختلف ہوتی ہے

(۴) شعر یعنی شاعری کی مخصوص زبان کا تعین شعری اصناف کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے

(۵) ہر شعری صنف کی زبان/مخاطبہ/کلامیہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے

(۶) لسانی ساخت کے اعتبار سے نعتیہ شعری لفظیات کو ذیل کے شجری خاکے میں نشان زد کیا جاسکتا ہے :



(۷) شعری لفظیات سے چوں کہ شعری صنف کا مخاطبہ تشکیل پاتا ہے اس لیے اس کا مطالعہ شاعر کے اسلوب کی شناخت میں معاونت کرتا ہے۔ چھٹے نکتے میں پیش کیے گئے خاکے کی طرح ممکن ہے کہ دیگر اصناف کی شعری لفظیات کے خواص بھی متعین کیے جاسکیں۔

□□□

ڈاکٹر اشفاق انجم، مالیگاؤں

نعت — غلطی ہائے مضامین!!

ABSTRACT: Ignorance of poets emerged towards faith, ideology of Islam and grandeur of Holy Prophet Muhammad (S.A.W) from their composed couplets, needs to be brought into knowledge for the sake of maintaining purity of thought and content of Naatia Poetry. Textual errors and deliberately narrated irrational content in devotional poetry, has been cited in this article in order to arouse conscience of poets to avoid such creative attitude. Practical Criticism is unavoidable to high light such erroneous Texts in the poetry done for the sake of showing love and affection towards Holy Prophet Muhammad (S.A.W) and therefore, the writer of this article has done his job.

نعت کے تقدس، اس کی لفظیات، لسانی نظافت و لطافت، پاکیزگی فکر اور خال خال اس کے مضامین اور اسلوب بیان کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور لکھا جارہا ہے، لیکن نعت گو شعراء کی ایک بہت بڑی تعداد آج بھی بد احتیاطی میں مبتلا اور بے راہ روی کا شکار ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ قرآن اور سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اغماض ہے۔ بیشتر شعراء تو ایسے ہیں جنھوں نے سیرت پر ایک بھی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ہے بس اس روایت یا وراثت کو سینے سے لگائے ہوئے وہی کچھ کہے جارہے ہیں جو ان کے پرکھوں نے کہہ دیا ہے ان میں اتنا بھی شعور نہیں ہے کہ جس روایت کی وہ پاسداری کررہے ہیں ان میں حقیقت کتنی ہے؟ مبالغہ و غلو کتنا ہے؟؟ من گھڑت واقعات کی آمیزش کتنی ہے!!؟ یہ شعراء اونٹ کے قافلے کی طرح ہیں کہ سب سے آگے والے اونٹ کے پیچھے چلنے والے تمام اونٹوں کی نکیل آگے والے کی دُم میں بندھی ہوئی ہے پہلا اونٹ جس طرف جائے گا آخری اونٹ کا رخ بھی اسی طرف ہوگا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اندھوں کا یہ قافلہ ایک دوسرے کی دُم کے سہارے بلا سوچے سمجھے، بلا تردّد آگے بڑھتا چلا جائے گا اور اگر کوئی گڑھے میں گرا تو سارا قصور آگے والے اونٹ کے سر جائے گا۔

جس طرح اردو غزل کی ہیئت اور مضامین فارسی غزل کا عکس ہیں۔ اسی طرح نعت پر بھی فارسی کے زبردست اثرات مرتب ہوئے جو آگے چل کر مقامی لسانی عناصر اور کم علم و جاہل شعراء کے ہاتھوں اپنا حسن گنوا بیٹھی اور ایسے ایسے مضامین ایسے اسلوب اور زبان میں نظم کیے جانے لگے کہ توبہ ہی بھلی۔ راقم کے پاس ایسے سینکڑوں اشعار محفوظ ہیں جنھیں دیکھ کر خون کھولنے لگتا ہے۔ ان میں سے بطور مشتے از خروارے مختلف عنوانات کے تحت صرف ایک سو ایک (۱۰۱) اشعار پیش خدمت ہیں۔

ا۔ کفر و شرک:

نعت میں سب سے بڑی خرابی ان شعراء کی پیدا کردہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طور نبی و رسول ماننے کو تیار نہیں ہیں بلکہ ان کا عقیدہ ''احد اور احمد'' کے میم پر اٹکا ہوا ہے اور بیشتر نے نہایت دیدہ دلیری سے ''میم'' کا یہ پردہ نوچ پھینکا اور پکار اٹھے کہ،

''ترسٹھ برس لباس بشر میں خدا رہا''

یہ خطرناک رجحان آج بھی پنپ رہا ہے اور افسوسناک بات تو یہ ہے کہ اکثر مدارس و مساجد کے جلسوں اور ختم بخاری وغیرہ کی تقاریب میں ''نعت گو شعراء'' کو بھی خصوصیت سے مدعو کیا جاتا ہے اور یہ حضرات اکثر اسی قسم کے اشعار پڑھتے ہیں اور ہمارے بیشتر سخن نا آشنا اور شعر فہمی سے پاک علماء اچھل اچھل کر داد دیتے ہیں۔ ایسے بے شمار اشعار میرے ذخیرے میں موجود ہیں چند ایک ملاحظہ فرمائیے۔

ذاتِ احمد تھی یا خدا تھا — سایہ کیا میم تک جدا تھا (محسن کاکوروی)

عینیت غیر رب کو رب سے ہے — غیریت عین کو عرب سے ہے (محسن کاکوروی)

''عرب'' کا ''عین'' نکال دیں تو ''رب'' بچتا ہے یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لباسِ بشری میں اس جہانِ آب و گل میں وارد ہوا تھا۔ یہی حال اس شعر کا ہے۔

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہوکر — اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہوکر
(آسی غازی پوری)

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے — جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمد سے
(نعت رنگ نمبر ۲۴، ص ۱۲)

یعنی اللہ صرف وحدہٗ لاشریک ہے اور بقیہ کائنات کی کسی شئے پر اسے کوئی اختیار نہیں ہے۔

وہ نغمہ کن جس سے مرتب ہوئے کونین — اللہ کے پردے میں محمد کی صدا ہے
(نعت رنگ نمبر ۲۴، ص ۱۲)

یعنی ''کن'' اللہ نے نہیں بلکہ اس کے پردے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

زبانِ شمع رسالت اگر نہ ضو دیتی قسم خدا کی خدا یوں خدا نہیں ہوتا

(نعت رنگ نمبر ۲۴، ص ۱۳)

مطلب یہ کہ خدا کا وجود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے مشروط ہے۔

بندے سے ہو ثنائے محمد مجال کیا ترسٹھ برس لباسِ بشر میں خدا رہا

(ماہنامہ قرطاس (ناگپور) نعت نمبر ۲۰۰۵ء، مارچ تا جون، ص ۱۵)

شاعر الجھن میں ہے کہ وہ محمد کی ثنا کس طرح کرے کیوں کہ وہ محمد تھوڑی ہیں وہ تو خود اللہ، محمد کی شکل میں زمین پر اتر آیا ہے۔

صورتِ انساں میں آ کے خود دکھانا تھا کمال رکھ لیا نامِ محمد تا کہ رسوائی نہ ہو

(قرطاس نعت نمبر ص ۱۰)

یعنی اللہ خود اپنے نام سے دنیا میں آتا تو رسوا ہو جاتا کہ اسے کوئی اللہ ماننے کو تیار ہی نہ ہوتا اس لئے اس نے اسم محمد کا سہارا لیا۔

محمد نے خدائی کی، خدا نے مصطفائی کی کوئی سمجھے تو کیا سمجھے کوئی جانے تو کیا جانے

(قرطاس نعت نمبر، ص ۱۰)

یہاں بھی وہی بات ہے کہ خدا اور محمد ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔

شمس منیر والضحیٰ بدرالدجی لقب ملا ثانی رہا ہے خود خدا سرورِ کائنات کا

(اسرار عالم سیفی آروی)

اب تک تو یہ تھا کہ اللہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں خود زمین پر اتر آیا تھا۔ اب اسرار عالم صاحب نے یہ سرّ عیاں کیا کہ اصل اللہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سرورِ کائنات ہیں جسے ہم اللہ کہتے ہیں وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ثانی ہے!!

نگاہِ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر

(اقبال لاہوری، قرطاس، ص ۳۱)

یہاں بھی وہی بات ہے کہ یثرب کا مکیں رسول نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہے۔

حاصل آئینہ خانہ ہے فقط اک آئینہ جس میں خود کو آئینہ گر دیکھتا ہے آج بھی

(حزیں صدیقی)

آئینے میں صورت دیکھی جاتی ہے!؟ حزیں صاحب کا یہ کہنا کہ آئینہ گر (اللہ) خود کو حاصل آئینہ

(رسول کریمؐ) میں آج بھی دیکھتا ہے یعنی اللہ باقاعدہ جسم وصورت رکھتا ہے اور خود کو آئینہ مصطفیٰ میں دیکھتا رہتا ہے؟؟

خدا عرش سے آ گیا ہے زمیں پر محمد محمد ہے کوئی پکارے (حسان الآمری)

شاید مطلب یہ کہ اللہ تلاش محبوب میں زمین پر اتر آیا ہے اور ہر سمت محمد محمد پکارے جا رہا کہ کہیں سے تو محمد جواب دیں گے۔ یعنی اللہ کو اتنا بھی علم نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں!؟

ہو سکا ہے کہیں محبوبِ خدا غیر خدا اک ذرا دیکھ سمجھ کر میری چشم احول

(محسن کاکوروی)

یہ ''چشم احول'' کا ہی کارنامہ ہے کہ ''محبوب خدا، خدا'' ہی نظر آ رہا ہے۔

رفع ہونے کا نہ تھا وحدت و کثرت کا خلاف میم احمد نے کیا آ کے یہ قصہ فیصل

(محسن کاکوروی)

وحدت و کثرت کے اختلاف کو ''میم احمد'' نے دور کر دیا یعنی ''احمد'' سے ''میم'' نکال دیں تو ''احد'' بچا یعنی اللہ و رسول ایک ذات!؟

ان کو یٰسین و طٰہٰ مزمل لکھا، واہ کیا خوب صل علیٰ لکھ دیا

اب لباسِ بشر میں بشر نہ رہا سایہ تن سے رہے گا جدا لکھ دیا (خاکی رضوی)

وہی بات یعنی اللہ، لباسِ بشر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وصورت میں زمیں پر اترا تھا۔

پردہ کہیں کہ پرتو انوار کبریا تفسیر کیا بیان ہو احمد کے میم کی

(جاوید ندیم ناگپوری)

یہاں بھی احمد سے میم ہٹا دیں تو احد بچتا ہے۔

اک میم کا پردہ سا یہاں بھی تو ہے حائل معلوم کرے کیا کوئی اسرارِ مدینہ

(عارج دھولیوی)

یہاں بھی ''میم'' دیوار کی صورت حائل ہے۔

اپنے ہونے کا کسی روز پتہ دے ہم کو آئنہ عشق محمد کا دکھا دے ہم کو

(شبیر حسن فراز فتح پوری)

یعنی شاعر بغیر نبی کے عشق کا آئنہ دیکھے اللہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرے گا۔

جانشینی پیمبر کے سزا تو ہی تو تھا قالب خاکی کے پردے میں خدا تو ہی تو تھا

(میر تقی میر)

میر صاحب کو کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے یعنی، انھوں نے حضرت علیؓ کو ''خدا'' کہدیا!!
ذیل کے شعراء نے تو اور بھی غضب ڈھایا ہے اللہ غنی!! ملاحظہ فرمائیں۔

صورت میں ایاز کی جلوہ جب دکھلا دیا کملی والے نے
محمود کو شیدا مثل احد بنوا دیا کملی والے نے (اظہر کرجانوی)

اس کی وضاحت وتشریح میں روح کانپ رہی ہے اس لئے اسے قارئین کے فہم وادراک کے حوالے کرتا ہوں اور یہ دوسرا شعر بھی اسی قبیل کا ہے

ہوا دیکھتے ہی جسے قیس مجنوں وہ لیلیٰ نہ تھی، تھا جمالِ محمد
(چمن بادشاہ پشاوری)

استغفر اللہ! استغفر اللہ!

۲۔ جنت کی تحقیر:

مدینہ منورہ کے عشق میں شعراء اپنے مخبوط الحواس ہو گئے ہیں کہ صحیح غلط کی تمیز تک کھو بیٹھے ہیں۔ اللہ جل شانہ نے قرآن حکیم میں جس جنت کو ''فوزِ عظیم وفوزِ کبیر'' کہا ہے جو ان نیک بختوں کے لئے عظیم ترین انعام ہوگا جو ''اطیعو اللہ واطیعو الرسول'' کی کسوٹی پر کھرے اتریں گے اور یہ جنت وہ مقام ہے جس کا تصور بھی انساں کے خواب وخیال میں نہیں آسکتا، اس کی نعمتیں کبھی نہ ختم ہونے والی ہیں جب کہ مدینہ منورہ اور یہ ساری کائنات ایک دن فنا ہونے والی ہے اس فانی کائنات کے عشق میں یہ مخبوط الحواس شعراء دائمی نعمتوں کی تحقیر وتضحیک کر رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جنت کے ٹھکرانے پر اللہ تعالیٰ انھیں جہنم رسید فرمادے گا تو ان کے عشق مدینہ کا کیا حال ہوگا۔ یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ بیشتر شعراء ''شہر مدینہ'' ہی کو جنت جانتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود پاک کے بغیر!! ملاحظہ ہو،

جنت نہیں ملتی ہے عبادات کے بدلے جنت کی طلب ہے تو مدینے کی قضا مانگ
(ڈاکٹر صابر سنبھلی)

بہت ڈھونڈا مگر جبرئیل نے بھی نہ پایا دو جہاں میں ایسا گلزار
(ڈاکٹر صابر سنبھلی)

رشک گلزارِ جناں طیبہ میں حاضر ہو گیا میری منزل ہے یہی میں کیوں کروں جنت کی آس
(ڈاکٹر صابر سنبھلی)

ہستی ہی کیا ہے اس کی مدینے کے سامنے میں مفت بھی نہ لوں ملے جنت اگر مجھے
(حاجی محمد شائق کوپادی)

نہ کر تعریف ہم سے باغِ جنت کی تو اے زاہد
ہے گلزارِ جناں کانٹا، بیابانِ محمد کا
(عبدالجبار گہر مالیگانوی)

وہاں وہ سکوں ہے کہ ہر گام دل کو
گماں ہو ارم ہے سرائے محمد
(ممتاز نادر دھولیہ)

باغ جنت سے میں گھبرا کے نکل جاؤں گا
یاد آئے گا جو دیوار کا سایہ تیر
(اطہر کامٹوی)

ان تمام اشعار سے صاف واضح ہے کہ شعراء کو جنت کی خواہش نہیں ہے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر صابر سنبھلی کا فتویٰ بھی غضب کا ہے کہ ''جنت عبادات کے بدلے نہیں ملتی بلکہ اگر کسی کو جنت کی طلب ہے تو وہ مدینے میں قضا کی دعا کرے''، پھر چاہے اس کے لئے خودکشی ہی کیوں نہ کرنی پڑے کیوں کہ مدینے میں اگر کافر و مشرک بھی مرے گا تو وہ سیدھا جنت میں جائے گا، پھر ایک مسلمان کو اگر برسوں گزارنے کے بعد بھی مدینے میں موت نہ آئے تو خودکشی کر لینا اولیٰ ہے کہ یہاں حلال و حرام موت کا سول ہی نہیں ہے۔ سوال مدینے میں قضا کا ہے جو سیدھی جنت میں لے جاتی ہے۔

ایک بات اور کہ اکثر شعراء شداد کی جنت یعنی ''ارم'' کو بھی اللہ کی جنت سمجھتے ہوئے مدینہ منورہ کو بھی ارم کہہ دیتے ہیں۔ ان نادانوں کو کون سمجھائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ اور ہے اور شداد جیسے کافر کی جنت ارم اور ہے۔

۳۔ قرآن کی بے حرمتی:

بعض شعراء کے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن پڑھا ہی نہیں اور اگر پڑھا ہے تو کم از کم انھیں نص قرآنی سے تو واقف ہونا چاہئے تھا اور ان میں اتنی غیرت تو ہونی چاہئے تھی کہ قرآن کی تضحیک اور بے حرمتی کی جرأت نہ کرتے۔ ملاحظہ ہو،

کیا مجھ کو ضرورت ہے کہ قرآن پڑھوں میں
ہے یاد مجھے مصحف رخسارِ محمد
(ڈاکٹر صابر سنبھلی)

صابر صاحب، اس قدر پہنچی ہوئی شخصیت ہیں کہ ''رخسار محمد'' ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے اور انھیں قرآن کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

اس قبیل کے اور بھی اشعار ہیں لیکن طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ انھیں نقل کیا جائے۔

۴۔ خدا اور رسول کی شان میں گستاخی:

ایک دن عرش پہ محبوب کو بلوا ہی لیا ہجر وہ غم کہ خدا سے بھی اٹھایا نہ گیا
(بزم آفندی)

اللہ کو ہجر و وصال کے جذبات سے مملو بتانا گستاخی کی انتہا ہے۔ شعر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بے بس و مجبور ہے وہ عرش اعظم پر براجمان ضرور ہے لیکن ساری کائنات اس کی نگاہوں سے اوجھل ہے یا پھر اس کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل مبارک صاف صاف نہیں دیکھ پا رہا ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے عرش پر بلوا لیا تا کہ قریب سے اچھی طرح دیکھ سکے!!؟

معراج میں وہ عرش پہ جانا رسول کا مقصود تھا خدا کو نظارہ رسول کا
(عبدالکریم درویش، باسم)

وصل احمد تھا شب معراج منظورِ نظر خاص تھی یہ مالک کون و مکاں کی آرزو
(رفیع اللہ رفیع شاہجہاں پوری)

آ گیا معراج کی شب عرش پر وہ مرحبا تھی خدائے پاک کو جس مہماں کی آرزو
(محمد فرقان علی سید)

ان اشعار سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اللہ پاک بھی جذبات رکھتا ہے اور یہی نہیں وہ ان جذبات سے مغلوب بھی ہو جاتا ہے جس کے زیر اثر مجبور ہو کر اس نے شب معرج اپنے محبوب کو عرش پر بلوا لیا۔

میں اسی روز سے منسوب تری ذات سے ہوں جبکہ جبرئیل امیں بھی ترا دربان نہ تھا
(حافظ مظہر الدین)

شاعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا رہا ہے کہ میں آپ کی ذات سے منسوب تھا اس وقت بھی جبکہ جبرئیل کو دربانی کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہاں کئی سوالات اٹھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلا رہا ہے، دوسرے یہ کس طرح حضورؐ سے منسوب تھے، تیسرے یہ کہ یہ "دربانی" کی روایت کہاں سے چلی ہے؟ شعراء کے کلام کے سوا میرے کہیں دیکھنے میں یہ روایت نہیں آئی ہے کوئی شاعر یا عالم و محدث اس کی سند پیش فرمائیں تو احسان ہوگا۔

ہر غنچہ و گل میں ہے نہاں یار کی خوشبو تاحشر رہے گی مرے سرکار کی خوشبو
(غنی اعجاز اکولوی)

ترا ہو بول بالا وردِ عشق یار عالم میں صدائے نام احمد آ رہی ہے قلب مضطر سے
(جوہر چاندوڑی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو "یار" کہنا انتہائی معیوب بات ہے۔

امتی پریشاں ہیں وہ خبر نہیں لیتے — آج شکل شفق شاید بدگماں محمد ہیں

(شفق آکوٹوی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو کفار و مشرکین مکہ سے بدگمان نہیں تھے۔ طائف کا واقعہ مشہور ہے کہ اہل طائف کی آئندہ نسلوں سے بھی آپ کو قبول اسلام کی امید تھی۔ اب بتائیں کہ آپؐ اپنی امت سے کس طرح بدگمان ہوں گے؟ شاعر نے اپنی پریشانی کے اسباب کا ذمہ دار حضور کو ٹھہرا دیا نعوذ باللہ!!

چاند پر پڑتی ہے آقا جب کبھی میری نظر — یاد آتا ہے مجھے انگلی اٹھانا آپؐ کا

(شکیل شرف دھولیوی)

شاعر "انگلی اٹھانا" محاورے کا مطلب نہیں جانتا اسے کسی کی عیب جوئی یا برائی وسقم کے اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

نہ پوچھ تجھ پر سلام کہنے میں کیا کشش تھی — کہیں خدائی کہیں خد ہم نوا ملا ہے

(محسن نقوی)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں جس طرح "تجھ" کہا ہے وہ گستاخی کے زمرے میں آتا ہے اور پھر "نہ پوچھ" اس پر مستزاد ہے۔ خدائی تو سمجھے یہاں "خدا" کس طرح شاعر کا ہمنوا ہو گیا؟ شاعر کی اوقات کیا ہے کہ خدا اس کے سُر میں سُر ملائے گا؟؟

۵۔ انبیا و ملائیکہ کی تضحیک و تذلیل:

اس خاک کو جس نے ترے قدموں کو چھوا ہے — جبرئیل امیں پائیں تو آنکھوں سے لگالیں

(شریف ناگپوری)

ہم عاشق ہیں محمد کے وہ قاصد ہیں محمد کے — فرشتو! مرتبے جبرئیل سے بڑھ کر ہمارے ہیں

(بختیار قیسی ناگپوری)

ترے امتی کی ہے شان کیا صل علیٰ ص علیٰ — پر جبرئیل ہے زیر پا صل علیٰ صل علیٰ

(حسن بھائی ناگپوری)

بلالؓ کہنے کو ادنیٰ غلام ہے کہ نہیں — مسیح و خضر سے افضل مقام ہے کہ نہیں

(ظہور شاہد کھنڈوی)

ملاحظہ فرمایئے، شاعر کا مرتبہ جبرئیل سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اتنا کہ پر جبرئیل اس کے زیر پا ہے اور بلالؓ کا مقام مسیح و خضر سے بھی افضل و اعلیٰ ہے۔ ان شعراء کو شاید اپنی عاقبت کی فکر نہیں ہے!! مقامِ افسوس ہے کہ

نعت کے ذریعے جنت کے حصول کی خواہش رکھنے والے دوزخ کی جانب بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

۶۔ عشق نبیؐ میں غلو اور حیرت انگیز مضامین:

ہمارے نعت گو شعراء بعض تلمیحات کو بڑی مضحکہ خیز شکل عطا کر دیتے ہیں۔

نبیؐ کی چاہ میں مثل اویس قرنی میں — گرا اپنے دانت گرالوں تو نعت لکھوں نا!!

(نعیم اللہ نقیب اکولوی)

میرے علم کے مطابق حضرت اویس قرنیؓ نے اپنے دانت گرانے (توڑ لینے) کے بعد نعت کا ایک بھی شعر نہیں کہا ہے تو پھر شاعر کے دانت گرانے کا نعت سے کیا تعلق!!

بہ محشر پڑھ کے میرا فرد عصیاں — فرشتہ خود بھی ششدر ہو گیا ہے

(قاضی سید صولت حسین ناگپوری)

ایسا بھیانک اور سیاہ تر نامہ اعمال!! ویسے قاضی صاحب کو علم نہیں ہے کہ ''بہ محشر'' کوئی فرشتہ فرد عصیاں پڑھ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کو نہیں سنائے گا بلکہ وہاں ''میزان'' پر ''نامہ اعمال'' تولے جائیں گے۔

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں — صرف مسلم کا محمدؐ پر اجارہ تو نہیں

(کنور مہندر سنگھ بیدی سحر)

اول تو مسلمانوں نے کبھی بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف مسلمانوں کے نبی ہیں۔ ارے آپؐ تو رحمۃ اللعالمین ہیں پھر مسلم کے اجارے کا سوال کہاں اٹھتا ہے اور یہ تو درست ہے کہ عشق کسی کو کسی سے بھی ہو سکتا ہے لیکن عاشق تو وہ ہوتا ہے جو معشوق کے اوصاف میں کود کو ڈھالنے کی کوشش کرے جبکہ سحر صاحب کا دعویٰ صرف زبانی اور شاعری تک محدود ہے یعنی حقیقت سے بعید ہے اور ہمارے مسلمان بھائی اس پر جھوم جھوم کر داد دیتے ہیں کہ یہ ایک غیر مسلم شاعر کی کاوش ہے۔

یوں سمجھئے اس کی تکمیل عبادت ہو گئی — مالک کونین سے جس کو عقیدت ہو گئی

(صابر دانش آکوٹوی)

ایک تو یہ نہیں کھلتا کہ مالک کونین کون ہے؟ اللہ یا رسولؐ!!؟ قرینہ تو یہ کہتا ہے کہ اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ اس صورت میں یہ فتویٰ قابل غور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت ہو جانا ہی تکمیل عبادت ہے یعنی اب نماز، روزے وغیرہ کی ضرورت نہیں۔

مصطفیٰ جو آئے ہیں آمنہ کے آنگن میں — قدسیوں کے سائے ہیں آمنہ کے آنگن میں

(مولانا اعجاز کامٹوی)

قدسی بھی تو نوری ہیں پھر ان کا سایہ؟

حلیمہ دائی کا چیلنج ہے یہ دنیا کو　　کسی یتیم کو ایسا کسی نے پالا ہے
(جہانگیر خاں جوہر پاتوری)

اول تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پالن پوشن مشیت الٰہی کے تحت حلیمہؓ کے یہاں ہوا اور اس یتیم سے حلیمہ دائی کو کیسی کیسی نعمتیں حاصل ہوئیں سیرت کے صفحات گواہ ہیں۔ دوم یہ کہ حضرت حلیمہؓ نے ایسا ''چیلنج'' کب اور کس طرح کیا؟

اتنا خوش نصیب تو میں ہوں زمانے میں نہیں　　میرا بھی ہو سامنا سرورِ کائنات سے
(اسرر عالم سیفی آروی)

شاعر کو ''سامنا ہونا'' کے معنی ہی معلوم نہیں۔ سامنا ہونا ''مقابلہ ہونے'' یا ٹکراؤ ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

کر دیا ہے عشق ابروئے پیمبر نے حلال　　پھیر دو مجھ پر چھری تکبیر کی حاجت نہیں
(اسعد پاتوروی)

عجب بے تکا مضمون ہے۔ جب ابروئے پیمبر سے حلال ہو گئے ہیں تو دوبارہ چھری سے حلال ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

جو آؤ خالی مکاں میں کرو نبی کو سلام　　حضور ہوتے ہیں موجود خالی ہر گھر میں
(عبدالکریم درویش باسم)

ایسی روایت تو کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہاں اتنا تو ضرور مشہور ہے کہ خالی گھر میں آسیب کا ڈیرہ ہوتا ہے؟

نہ آیا نہ آئے گا ایسا عرب　　جہاں سے نرالا ہے میرا عرب
عرب کا دوانہ ہوں میں اس لئے　　خدا کا دوانہ ہے میرا عرب
(نادر اسلوبی کھنڈوہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر نے ''عرب'' کہا ہے۔ بڑا نادر استعارہ ہے۔ اس کا مطلب بھی شاعر کے بطن ہی میں ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ صاحب ''عرب'' کے دوانے ہیں اس لئے ''میرا عرب'' خدا کا دیوانہ ہے یعنی ان کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی معرفت حاصل ہوئی! الا ماشاء اللہ!!

سرورِ دو جہاں ہو تم بے شک　　کھا رہا ہوں قسم مدینے کی (آرزو خورجوی)

جگ ظاہر بات کو شاعر قسم کھا کر بیان کر رہا ہے اور پھر قسم بھی کس کی! غیر اللہ یعنی مدینے کی!!

اعجاز نمائی دکھلائی بندے نے خدائی دکھلائی　　بوجہل کے ہاتھ میں پتھر کو بلوا دیا کملی والے نے
(صدیق مراد آبادی)

یہاں ''دکھلائی'' لسانی اعتبار سے غلط ہے۔ ''نمائی'' ہی کافی تھا پھر یہ کہ بندے نے خدائی دکھلائی، وہی ''لباسِ بشر'' والا معاملہ!!

تجسس میں ترے بانکے عرب ابرو کماں والے
کہاں ڈھونڈوں کہ تو ملتا نہیں اولا مکاں والے (مسلم برہانپوری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بڑی گھٹیا اور قابل اعتراض زبان استعمال کی گئی ہے اور پھر ''لا مکاں والے'' دونوں ہستیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!! دیگر ''اے'' اور ''او'' جیسے الفاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنا میری نظر میں بے ادبی کے مترادف ہے۔

رحمت کی بدلیاں ہیں تجلی کا نور ہے 		ہر ایک شئے میں شکل شہِ مصطفیٰ تو ہے
(نثار احمد کلیم بیدری)

ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے مقابل یہ ایک نیا نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ ''ہر شئے میں شکل مصطفیٰ'' ہے۔ یہ بھی ''لباسِ بشر'' والا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔

مختار دو عالم کے ہو تم ظلم الٰہ 		بس خوبیاں ہم سے ہوں بھلا کیا محسوب
(نیچون رنچوری بدایونی)

یہاں تو شاعر نے ''مختار دو عالم'' اور ''الٰہ'' کو دو الگ الگ شخصیتیں بنادی ہیں اسی لئے اس نے مختار دو عالم کے ''ظل'' کی بجائے ''ظل الٰہ'' کہا ہے۔

۷۔ گنہ گاروں کی شفاعت:

مسلمانوں خاص طور پر شعرائے کرام کے دماغوں میں نہ جانے کہاں سے یہ خناس گھس گیا ہے کہ چاہے جتنے چاہے جیسے گناہ کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ''شافع محشر'' ہیں وہ ہر حال میں ان کی شفاعت فرمائیں گے کیوں کہ انھوں نے اللہ اور رسول پر ایمان لاکر ان دونوں پر احسان کیا ہے اور یہ کہ حضور کا فرض ہے کہ اپنے گناہ گار امتیوں کی بخشش کے لئے ہر طرح کوشش کریں پھر چاہے انھیں اللہ سے مقابلہ آرائی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ ملاحظہ ہو،

اتنا بھی معاصی پہ پشیماں نہ ہو اے دل 		سرکار ہیں اپنے وہ نمٹ لیں گے خدا سے
(کیفی کامٹوی)

خدا کی مار ہو ایسے شاعر اور ایسی شاعری پر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ سے لڑا دے۔

دوزخ میں میں تو کیا مرا سایہ نہ جائے گا ، 		کیوں کہ رسولِ پاک سے دیکھا نہ جائے گا
(قرطاس، ص ۳۲)

اس خوش فہمی کا کوئی علاج ہے کہ گناہ پر گناہ کرتے جاؤ اور اپنی بخشش اور نجات کی ذمہ داری ''رسول پاک'' پر ڈال دو۔

کنارے حوضِ کوثر کے ہیں نیکوکار بھی لیکن
گنہ گاروں کی جانب التفاتِ ناز اللہ ہو

(محمد امجد رضا امجد ناگپوری)

یعنی نیکوکاروں کی کوئی اوقات نہیں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اغماض برتتے ہوئے گنہ گاروں کی جانب ملتفت ہیں کیوں کہ آپ کو گنہ گاروں سے محبت ہے!! نعوذ باللہ!!

آقا کا ہوں غلام مجھے کوئی ڈر نہیں
لاکھوں گناہ ہوں مری فردِ گناہ میں

(مجید کوثر مالیگانوی)

آقا کے یہ کیسے غلام ہیں جو بلا خوف گناہ پر گناہ کیے جا رہے ہیں اور شفاعت و جنت کے دعوے دار بھی ہیں؟

۸۔ خود کو انبیا، ملائکہ وصحابہ سے برتر بتانا:

غلو اور بد عقیدگی اور دعویٰ عشق نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شعراء اتنے مات گئے ہیں کہ انبیا و ملائکہ و صحابہ کو بھی خاطر میں نہیں لا رہے ہیں۔

قریب حضرت محبوب داور ہوتے جاتے ہیں
بقا اب آپ سلمان و ابوذر ہوتے جاتے ہیں

(نعت رنگ نمبر ۲۵، ص ۱۳۰)

خود کو سلمان و بوذر کہنا کس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے؟

ہم عاشق ہیں محمد کے وہ قاصد ہیں محمد کے
فرشتو! مرتبے جبرئیل سے بڑھ کر ہمارے ہیں

(بختیار قیسی ناگپوری)

شاعر صرف اس وجہ سے کہ وہ عاشق محمد ہے، جبرئیل امین سے مرتبے میں بڑھ گیا ہے جبکہ ان کا عشق صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ یہ تو حضرت اویسؓ اور حضرت منصور حلاجؒ کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچتے۔

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

(علامہ اقبال)

خود کو کسی پیغمبر کے مماثل بتانا بھی میرے نزدیک بہت نامناسب بات ہے۔

جو کوہِ طور پہ جاتے نہ اشرفی موسیٰ
وہ جلوہ میری نگاہوں میں آ گیا ہوتا

(عزیز اشرفی بھیونڈی)

اشرفی صاحب ذرا سا چوک گئے شاید اونگھ گئے ہوں گے اور اسی دوران حضرت موسیٰ کوہِ طور پر جا

پہنچے ورنہ وہ جلوہ اور صاحب جلوہ تو اشرفی صاحب کا منتظر تھا۔

۹۔ درِ رسول پہ سجدہ اور التجائے حاجت روائی:

شعراء کا ایک حلقہ ایسا بھی ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے در پر سجدہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی اسے شرک کا مرتکب ہونے کا ادراک و احساس ہوتا ہے۔ جس امر یعنی خود کو سجدہ کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے ممانعت فرمائی اور تاکید فرمائی کہ،

''سابق قوموں کی طرح تم بھی اپنے پیغمبر کو سجدہ نہ کرنے لگنا۔''

لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ اللہ اور رسولؐ نے جن باتوں کے لئے منع فرمایا ہے آج کل قوم انھیں کی طرف راغب نظر آ رہی ہے۔

درِ رسول پہ سجدہ کروں محبت کا   اجل مدینے میں اے میرے کردگار آئے

(قرطاس ۲۰۰۵ء، ص ۳۳)

درِ رسولؐ پر سجدہ کر کے شاعر کس جنت میں جائے گا؟

بس یہی ایک آرزو ہے مری   آپ کا در ہو اور سر میر

(صلاح الدین نیر حیدرآبادی)

اللہ کو سجدہ کرنے کی فرصت نہیں اور درِ رسول پہ ماتھا ٹیکنے کی آرزو کی جارہی ہے۔

عالم علم دو عالم ہیں حضورؐ   آپ سے کیا عرضِ حاجت کیجیے

(قرطاس نعت نمبر، ص ۳۳)

نہ مانگ اور کسی در پہ جا کے اے غازی   درِ رسول درِ شاہ انبیاء کے سوا

(غازی امان اورنگ آبادی)

بہت سے ہیں بگڑے ہوئے کام میرے   سوا کون تیرے بنائے محمد

(ناظم حسین ناظم سرون اسٹیٹ)

اس قسم کے اشعار سے اردو نعتیہ شاعری بھری پڑی ہے۔ شعراء درِ رسول پہ سجدہ کرتے ہوئے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں کرتے اور نہ انھیں شرک و کفر کی پرواہ ہے۔ وہ خدا کو بھول کر صرف اور صرف رسول سے اپنی حاجات کا سمادھان چاہتے ہیں کیوں کہ انھیں شیطان نے پوری طرح باور کرا دیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی حاجت روا ہیں، مشکل کشا ہیں، عالم الغیب ہیں، یہاں تک کہ مالک لوح و قلم ہیں۔ پھر اللہ سے کیا ڈرنا، کیوں کہ،

''سرکار ہیں اپنے وہ نمٹ لیں گے خدا سے''

اور اسی غلط فہمی میں شعرا اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ خدا بھی ان کی ہم نوائی کر رہا ہے۔

نہ پوچھ تجھ پر سلام کہنے میں کیا کشش تھی　　کہیں خدائی، کہیں خدا ہم نوا ملا ہے

(محسن نقوی)

تم سا داتا تم سا مولا تم سا آقا ہے کہاں　　بندہ پرور آپ کے ہم ہیں پجاری یا نبی

(حسان الآمری)

ایسا ہے بہروپیا حسان کا بھولا صنم
وہ عیاں بھی اور نہاں بھی دل کے کاشانے میں ہے (حسان الآمری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''بہروپیا'' اور ''صنم'' جیسے الفاظ کا استعمال میری دانست میں تو حرام ہے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ''پوجا'' بھی کی جا رہی ہے۔ پوجا ایک خاص طریق عبادت ہے جو ہندوؤں کے یہاں رائج ہے اور جس کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے نہ ہی اجازت!!

۱۰۔ صداقت کے متخالف بیانات:

ہے روایت کہ نبی ہو کے جو نکلا گھر سے　　ٹوٹ کر رہ گیا اس شخص کا رشتہ گھر سے

(سلیم شہزاد)

گھر سے نبی ہو کر مسیلمہ کذاب جیسے لوگ نکلتے ہیں۔ انبیاء تو منجانب اللہ مبعوث ہوئے ہیں۔

چاند دو ٹکڑے ہوا ہو کر فدائے مصطفیٰ　　معجزہ کہئے یا پھر کہئے ادائے مصطفیٰ

(اشتیاق کامل ناگپوری)

صداقت کے خلاف بیان ہے۔ چاند کے ٹکڑے ہونا یہ معجزۂ الٰہی تھا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ذات سے ظہور میں آیا جو کفار مشرکین مکہ کی ہدایت کے لئے تھا۔ اگر چاند ''فدائے مصطفیٰ'' ہوتا تو اپنی اصل روشنی سے کہیں زیادہ روشن ہو جاتا، ٹکڑے نہیں ہوتا۔ پھر اس میں شاعر کو شبہ بھی ہے کہ یہ واقعی معجزۂ الٰہی ہے یا ''ادائے مصطفیٰ''؟ یعنی حضورؐ کا خود ارادی عمل؟؟

کہسار پاش پاش ہیں ابرو کی ضرب سے　　دولخت چاند ہے ترے ناخن کی نوک پر

(محسن نقوی)

نعوذ باللہ ''ابرو'' نہ ہوئے ''میزائل'' ہو گئے اور چاند ناخن کی نوک پر دولخت ہے! کس طرح؟! ایسے مضامین نظم کرتے ہوئے شعراء کی عقل کہاں غائب ہو جاتی ہے؟

آیا تھا آفتاب قیامت جلال میں　　آئینہ جمال محمد دکھا دیا

(حزیں صدیقی)

آفتاب قیامت کب جلال میں آیا تھا؟ شاعر کو جمالِ محمد کا آئینہ کہاں سے مل گیا جسے دکھا کر اس نے آفتابِ قیامت کے جلال کو شانت کر دیا؟ شاعر یہ آئینہ کسی عوامی نمائش گاہ میں رکھ دے تو امت ان کی احسان مند ہوگی۔

وہ فرش نشیں عرش کے اوپر نظر آیا　　وہ مسجد اقصیٰ سے اڑا نور کا پیکر

(حزیں صدیقی)

حضورؐ خود نہیں اڑے تھے بلکہ حرم شریف سے مسجد اقصیٰ اور پھر افلاک تک جبرئیل اور براق و رف رف کے ذریعے پہنچے تھے۔

ابھی زمیں پر ابھی عرش پر قیامِ رسول　　تصرف آج بھی ہے وقت پر محمد کا

(حزیں صدیقی)

یعنی اللہ تعالیٰ بے کار بیٹھا ہوا ہے اور ساری کائنات محمدؐ سے تصرف میں ہے اور اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمین اور آسمان پر آنا جانا لگا رہتا ہے؟

تیرے عاشق سارے مسلماں میرے نبی کے روضہ انور

نور لے تجھ سے مہر درخشاں میرے نبی کے روضہ انور　(صابر سنبھلی)

روضہ انور کی تعمیر سے پہلے کیا مہر درخشاں سیاہ تھا؟ یا پھر نور سے محروم تھا؟؟

بھیک لینے روشنی کی چاند تارے چل پڑے　　گنبد خضریٰ سے پھوٹی جب صداقت کی کرن

(عزیز اشرفی بھیونڈی)

یہ صداقت کی کرن کب پھوٹی؟ کیا گنبد خضریٰ چاند تاروں کی تخلیق سے پہلے وجود میں آیا تھا؟

وہ حسن بے پناہ وہ صورت نبی کی ہے　　خود خالق جہاں بھی ہوا آپ پر فدا

(عزیز اشرفی بھیونڈی)

اللہ تعالیٰ سے حسین کائنات کی کوئی شئے نہیں ہے پھر وہ اپنی ہی کسی تخلیق پر کس طرح فدا ہوگا جب کہ وہ ہر قسم کے جذبات سے عاری ہے۔

جو دیکھ چکے گرمیِ بازارِ مدینہ　　کیا ان کو جلائے گی بھلا گرمیِ دوزخ

(کامل بہزاد، بھوپال)

مطلب یہ کہ مدینہ دوزخ سے بھی زیادہ گرم ہے؟ نعوذ باللہ!!

نوح کی کشتی کو کس انداز سے　　بحر طوفاں سے بچایا آپؐ نے

(سہیل سورتی)

لیجئے نیا انکشاف کہ نوح علیہ السلام کی کشتی کو اللہ تعالیٰ نے نہیں نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچایا تھا۔

یہاں بالیدگی ہوتی رہی موئے مبارک کی
زمانے بھر میں یکتا کشت قدرت ہے سر اقدس
(مولانا صلاح الدین مصلح)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر اقدس کو ''کھیتی'' کہا جا رہا ہے جس میں اللہ تعالیٰ موئے مبارک کی کاشت کر رہا ہے۔

جب رسالت کی تصدیق مانگی گئی
کام تھا آپؐ کا اک شجر کر گیا
(امان افسر ایولوی)

مطلب یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کارِ رسالت میں ناکام ہو گئے اور یہ کام اک شجر کر گیا؟؟

قبر نبی ذریعہ شفاعت کا خوب ہے
دیدار ہو رہا ہے محمد کے شہر میں
(نعیم قادری)

محمد کے شہر میں نہ جانے یہ کس نبی کی قبر ہے جس کا دیدار ذریعہ شفاعت ہے۔

ٹوٹا انگشت کے اشارے سے
ماہتابی غرور کا عالم
(عظیم وقار اکولوی)

ماہتاب کس بات پر مغرور تھا؟ اس کی دلیل وثبوت بھی تو چاہیے؟ پھر ماہتاب خود ٹوٹا (دو نیم ہوا) تھا یا اس کا غرور؟؟

۱۱۔ نعت گو اور ان کی خوش فہمیاں:

ہمارے بیشتر شعراء نعت کو نہ صرف عبادت جانتے ہیں بلکہ اسے نماز روزوں سے بھی افضل جانتے ہیں اور اسی کو نجات کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔

جنت کا راستہ ہے یہی نعت مصطفیٰ
سنّی نے شان سے ہے پڑھی نعت مصطفیٰ
(نعیم قادری)

کیا ایسی نعتیں شاعر کو جنت میں لے جائیں گی؟

یہ آرزو نہیں کہ دعائیں ہزار دو
پڑھ کر نبی کی نعت لحد میں اتار دو
(محمد علی ظہوری قصوری)

جس وقت دعا کی شدید ضرورت ہے شاعر وہاں نعت پڑھوا رہا ہے۔

کب سوال اٹھے کہاں اعمال کی پرسش ہوئی
مجھ سے تو مرقد میں بھی نعتوں کی فرمائش ہوئی
(حزیں صدیقی)

قبر کے سوال و جواب جو لازمی و ناگزیر ہیں شاعر ان سے انکار کر رہا ہے اور قبر میں مشاعرہ برپا کر رکھا ہے۔ منکر نکیر اچھل اچھل کر داد دے رہے ہیں واہ! واہ!! سبحان اللہ! سبحان اللہ!! اور اطراف کی قبروں کے مردے مضطرب و پریشان ہیں کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ کہیں قیامت تو برپا نہیں ہوگئی!؟

۱۲۔ سگ درِ رسول:

نہیں قابل حضوری کے تو باہر ہی گزاروں گا　　سگ در ہی بنالیں آپ دربارِ رسالت کا

(سالم ناگپوری)

سگانِ کوچہ احمد بنے نصیب سے ہم　　درِ حبیب پہ سجدے کئے قریب سے ہم

(حسان الآمری)

اس قسم کے اشعار سے اردو فارسی شاعری بھری پڑی ہے۔ راقم کے ذہن میں بارہا یہ سوال اٹھا ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ،

''جس گھر میں کتا پلا ہو فرشتے وہاں داخل نہیں ہوتے۔''

اب اس حدیث مبارکہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو درِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اگر کتا بیٹھ جائے تو کیا ہر لمحہ جو وہاں ہزاروں فرشتوں کا نزول ہوتا ہے، وہ سلسلہ قائم رہے گا؟

دیگر یہ کہ کہیں یہ غزل کے محبوب کا ''سگ در'' تو نہیں تھا جسے اندھے عقیدت مندوں نے ''سگ در'' بنادیا؟؟

ایک مجلس میں ناچیز نے ان خیالات کا اظہار کیا تو کافی لوگ برہم ہوگئے۔ کچھ نے حمایت بھی کی۔ ایک صاحب نے ایک اخبار کے کالم کے کالم سیاہ کردیئے۔ میرے ایک کرم فرمانے وہ اخبار مجھے دکھایا تو میں نے ان سے کہا کہ ان کالم نویس سے اتنا پوچھ کر آیئے کہ،

''آپ خود کو ''سگ درِ غوث الاعظم'' کہتے ہیں۔ اگر میں آپ کو فارسی کے ''سگ'' کی بجائے اردو میں غوث الاعظم کا ''کتا'' کہوں تو برا تو نہ مانیں گے؟ ان صاحب نے جاکر ایسے ہی کہا اور پچاسوں گالیاں کھائیں۔ اب قارئین ہی بتائیں کہ ''کلب اور سگ'' شعراء کے نزدیک پاک اور معزز ہستی ہے تو ''کتا'' ناپاک کیسے ہے؟

۱۳۔ مسلکی تعصب و تشدد پسندی

بریلوی مسلک کے شعراء کے نعتیہ کلام سے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:

اتراتے پھر رہے ہیں جو نجدی　　کب ہوگا انھیں زوال آقا

(مشاہد رضوی مالیگانوی)

نعت رنگ ۲۸

ندائے یا رسول اللہ لگاتے ہی رہیں گے ہم
جلانا تجھ کو نجدی ہے وطیرہ اہل سنت کا

(مشاہد رضوی مالیگانوی)

مسلک احمد رضا اپنا لے جو
نار سے وہ نور ہی ہو جائے گا

(مشاہد رضوی مالیگانوی)

اس لئے پڑھتے ہیں ہم سنی کھڑے ہوکر سلام
ہے یہی سرکار طیبہ سے محبت کی سند

(حسان الآمری)

درج بالا اشعار کسی صورت نعت کے اشعار نہیں کہے جاسکتے۔ مجھے مسلکی مباحث میں نہیں پڑنا ہے۔ ''سنی'' حضرات نجدیوں، دیوبندیوں، اہل حدیثوں کو مغلظات سے نوازیں، گالیاں دیں مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں ہے بس میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس کے لئے نعت کو اپنا آلہ کار بنا کر اس کی حرمت و پاکیزگی کو داغدار نہ کریں۔ اس قسم کے مضامین کی ادائیگی کے لئے اردو مین ایک صنف سخن ''ہجو'' موجود ہے جس میں ایسے جذبات بآسانی بیان کئے جاسکتے ہیں اور اگر شاعروں کو کہیں زبان و بیان میں دشواری محسوس ہو تو سودا، مصحفی، انشاء وغیرہ کی ہجویات کا مطالعہ کریں بہت فائدہ ہوگا۔ لیکن نعت کو ایسے مضامین سے آلودہ نہ کریں۔

لاکھوں میں ایک فخر امم حافظ ملت
ملت کا محافظ ہے نگہبان وہی ہے

(نعیم قادری)

دین حق کی راہ لاکھوں کو دکھائی ہند میں
حضرت خواجہ معیں کے خلق کی تلوار نے

(نعیم قادری)

یہ بھی نعت کے شعر نہیں ہیں۔ ملت کا نگہبان اللہ ہے یا ''حافظ ملت''؟ اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ''خلق کی تلوار'' بھی عجیب چیز ہے۔

جب زبانیں سوکھ جائیں پیاس سے
جامِ کوثر کا پلا احمد رضا

(قرطاس نعت نمبر ۲۰۰۵ء، ص ۶۲)

نعوذ باللہ شاعر نے مالک و قاسم کوثر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی ملکیت سے بے دخل کر کے امام احمد رضا کو مالک حوض کوثر بنا دیا۔ اللہ غنی!! اس عقیدت کو کیا نام دیں؟

☆☆☆

ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی، فیصل آباد

اُردو حمد و نعت اور برصغیر کی فلمی صنعت

ABSTRACT: Art itself bears religious sensibility; hence most of poetic works in the world contains sacred elements of expression. This is why; films produced in Sub-continent mostly contained Hamd and Naatiya poetic version. Since Film is a valuable and forceful cultural expression, Devotional Lyrics sung in various films by different singers gained popularity. Various songs of sacred content i.e Hamd and Naat have been referred in this article to emphasize upon religiosity of Artists and Film producers, besides public appeal.

اُردو حمد و نعت کے فروغ کا جائزہ لیتے ہوئے یہ سوال بہت کم اٹھایا گیا کہ برصغیر کی فلمی صنعت اور اس سے وابستہ اہلِ فن نے ان کے فروغ میں کیا کردار ادا کیا؟ حمد و نعت کا یہ سرمایہ اپنے اندر موضوعاتی لحاظ سے کتنا تنوع رکھتا ہے؟ حمد و نعت کی ان تخلیقات میں مشرقی زندگی اور اس سے وابستہ اقدار کن اطوار سے ظاہر ہوئیں اور ان کے متن کو دیکھ کر مشرقی سماج میں سیرتِ رسول کا کیا تصور ابھرتا ہے؟

تاریخ انسانی میں مذہب اور فنون لطیفہ کے مابین ایک مستحکم تعلق رہا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو مختلف فنون مذہب کے جامع نظام کا حصہ رہے ہیں اور مذہبی اخلاقی قدروں کے فروغ میں ان کا مثبت کردار رہا ہے۔ اگرچہ مشرق میں مذہبی دانش کے بعض گوشوں سے تمام یا چند ایک فنون کو ناپسندیدگی سے بھی دیکھا گیا اور ان سے گریز کی تعلیمات بھی دی گئیں۔ تاہم اہل فن نے معاشرے میں خیر کے تسلسل کے لیے اپنا کردار ایک خاص متوازن اسلوب میں جاری رکھا۔

مذہب اور فنونِ لطیفہ کا رشتہ کسی تضاد پر مبنی کبھی نہیں رہا بلکہ ہمیشہ سے عظیم آدرش کی جستجو اور اُسے عملی جامہ پہنانے کے مشترکہ نصب العین کے تناظر میں بہت مستحکم اور اہم رہا ہے۔ دونوں ہی اپنے باطن میں جمالیاتی اقدار کے فروغ کے عظیم خواب کو شرمندۂ تعبیر دیکھنا چاہتے ہیں۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ فنونِ لطیفہ میں ابلاغی قوت کسی بھی عظیم خیال یا فلسفیانہ تصور کی براہِ راست ترسیل سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بات اس اعتبار سے بھی درست ہے کہ آرٹ محض رسالتِ فکر کا فریضہ انجام نہیں دیتا بلکہ اُس کے اندر احساسات اور جذبات پر ضبط نیز تربیت نفس کا جمالیاتی شعور بھی

ہوتا ہے۔ ایک فن کار کو دیگر شعبہ ہائے زندگی کے اہلِ دانش پر اس لحاظ سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ وہ افکار و تصورات کو ایک مسرت آمیز اسلوب میں دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

آرٹ کی اس توانائی اور تاثیر کے باعث مذہب کا صحت مند تصور رکھنے والے اہلِ نظر نے فنونِ لطیفہ کی مخالفت کے بجائے ان کی نہ صرف حمایت و سرپرستی کی بلکہ ان کی ترویج کے ذرائع بھی پیدا کیے۔

مذہب کے مذکورہ صحت مند تصورات کی بنیاد پر فنون کے ارتقا کے باعث ''فنِ دینی'' (Religion Art) یا (Sacred Art) کی اصطلاح رائج ہوئی جس سے مراد ایسی فن کارانہ تصویر کاری ہے جس میں اذہان کو روحانیت کی طرف مائل کرنے کے لیے مذہبی تصورات سے استفادہ کیا جاتا ہے:

> "Sacred Art involves the ritual and cultic practices and practical and operative aspects of the path of the spiritual realization within the artist's religious tradition."(1)

مختلف مذاہب خصوصاً بدھ مت، ہندو مت، مسیحیت اور اسلام کی تاریخ کو دیکھیں تو فنون کے ذریعے مذہبی تصورات کی پیشکش کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے۔

فنونِ لطیفہ میں فنِ اداکاری کا شمار Performing Arts میں ہوتا ہے۔ زندگی کی جامع عکس بندی کے لیے اداکاری کا فن اپنے اندر کئی ایک منفرد جمالیاتی پہلو رکھتا ہے اور اس کے ذریعے سماج اور اُس کے افراد کی تصویر کسی کہانی کی عملی پیشکش کی صورت میں کھینچی جاتی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ فن بہت سے افراد کی متنوع فنی مہارتوں کا بھی محتاج ہوتا ہے اور جدید عہد میں ان فنی مہارتوں کی ایک حیران کن کثرت سامنے آئی ہے۔

معروف ماہرِ سماجیات اینڈریو ایم گریلے (Andrew M. Greeley)[۲] کی "Images of God in popular Movies" کے موضوع پر ایک تقریر سے متاثر ہو کر ریاست اوماہا کی یونیورسٹی آف نیبراسکا (University of Nebraska) سے ۱۹۹۷ء میں ولیم ایل بلزک (William L. Blizck) اور رونلڈ برک (Ronald Burke) نے ایک شش ماہی تحقیقی مجلّہ "Journal of Religion and Film"[۳] جاری کیا جس میں فلم کے ذریعے مذہبی تصورات کی ترسیل، اس کے مختلف پیرایوں، قرینوں اور تکنیکی امور نیز مذہبی فلموں کے تجزیات پر مبنی نہایت قابلِ توجہ تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ برصغیر میں فلمی صنعت، دنیا کی قدیم ترین صنعتوں میں شمار ہوتی ہے۔ ۷ جولائی ۱۸۹۶ء بمبئی میں فرانس کی ایک کمپنی نے اپنی ۶ مختصر فلموں کی تعارفی نمائش کی اور ۱۸ جولائی ۱۸۹۶ء کو ناولٹی تھیٹر میں ان کی باقاعدہ نمائش ہوئی، جس کے لیے ۴ آنے سے ایک روپے تک کا ٹکٹ مقرر کیا گیا۔

۱۹۱۳ء میں ''راجہ ہری چندر'' نامی پہلی خاموش فلم بنائی گئی اور ۱۹۳۰ء تک ہر سال کم و بیش ۲ سو فلمیں ریلیز کی جاتی رہیں۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک جبکہ دنیا بھر کے افراد ایک عجیب ذہنی تناؤ کا شکار تھے اور برصغیر کے باشندے تحریک آزادی کے باعث ایک بے سکونی کے عالم میں تھے۔ فلم سازوں نے زندگی کے متنوع موضوعات پر فلمیں تیار کیں اور ایسی فلمیں بھی بنائیں جن میں تحریک آزادی کو بہ طور خاص موضوع بنایا گیا۔

۱۹۲۹ء میں برصغیر کی فلمی صنعت میں لاہور بھی ایک مرکز کے طور پر مستحکم ہونا شروع ہوا۔ عبدالرشید کاردار نے یونائٹیڈ پلیئر کارپوریشن کے نام سے ایک کمپنی بنائی۔ تقسیم ہند کے بعد برصغیر کی فلمی صنعت میں کراچی اور لاہور دو بڑے مراکز کے طور پر مستحکم ہوئے اور پاکستانی تہذیب و ثقافت کی تشکیل و ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد پہلی فلم ''تیری یاد'' کے نام سے ریلیز ہوئی۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۷ء تک زمانہ پاکستان فلمی صنعت کا عہد زریں تھا۔

برصغیر کی فلمی صنعت نے اس خطے کی تہذیب و ثقافت کے فروغ میں جہاں اور کئی حوالوں سے نمایاں کردار ادا کیا وہاں مذہبی اقدار اور رسوم و روایات کی عکس بندی کا بھی ذریعہ بنی۔ اس تناظر میں جب ہم اردو نعت کا ارتقائی جائزہ لیتے ہیں تو برصغیر کی فلمی صنعت کا کردار نہ صرف اہم اور نمایاں نظر آتا ہے بلکہ اپنے اندر گوناگوں دلچسپیاں بھی سمیٹے ہوئے ہے۔

اردو حمد و نعت کے فروغ کے سلسلے میں برصغیر کی فلمی صنعت کے حوالے اوّلیں قابلِ ذکر نام کملا جھریا کا ہے، جن کی گائی ہوئی نعتیں کسی فلم کا حصہ تو نہیں لیکن یہ گلوکارہ فلمی صنعت کے ساتھ نہ صرف گلوکارہ بلکہ بطور اداکارہ بھی وابستہ رہیں اور ان کی گائی ہوئی نعتوں میں سازینوں کا سنگم بھی شامل ہے۔ کملا جھریا کی گائی ہوئی نعتیں ریکارڈ کے اعتبار سے چار ہیں، جن کے بول یہ ہیں:

(i) تورے درشن کے کارن بھئی جوگن

(ii) یا شاہِ عرب، سیّد ابرار تمھی ہو

(iii) تمرے دیا کی ہے آس محمد

(iv) مجھے روئے زیبا دکھا کملی والے

کملا جھریا اپنے وقت کی ایک مقبول اور معتبر گلوکارہ تھیں۔ ۱۹۰۶ء میں جھریا میں پیدا ہوئیں اور ۷۱ برس کی عمر میں کلکتہ میں وفات پائی۔ اردو کے علاوہ ہندی، بنگالی اور پنجابی میں بھی اپنے فن کا جادو جگایا۔ پروفیسر محمد سلیم نے کملا جھریا کی گائی ہوئی نعتوں کے سلسلے میں اپنے دو ذاتی تجربات اور جذبات نہایت والہانہ انداز میں بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''ایک روز کملا جھریا کی گائی ایک خوبصورت نعت کا یہ ریکارڈ ملا تھا۔

مجھے روئے زیبا دکھا کملی والے

تو وفورِ جذبات میں مَیں نے اس ریکارڈ کو چوم لیا تھا۔ سر آنکھوں سے لگایا تھا اور ریکارڈ عنایت کرنے والے کے لیے مٹھائی منگوائی انہیں کھلائی، خود بھی کھائی، چائے پلائی، مگر موصوف کو کچھ علم نہ ہوا کہ بیٹھے بیٹھے یہ جشن کیوں ہو گیا ان صاحب نے میری Excitment کا نوٹس لیا مگر اس کا ادراک نہیں ہوسکا۔ انہوں نے اتنا دو ایک مرتبہ پُر مسرت انداز میں ضرور کہا ''پروفیسر صاحب کیا مل گیا آج آپ کو'' میں نے کہا بہت کچھ مل گیا ہے آج! بس آپ جیتے رہیں خوش رہیں آباد رہیں۔''

''ان کی گائی ہوئی کئی نعتیں بھی بڑی خوب ہیں مگر بخدا اس نعت کی بات ہی اور ہے:

تمرے دیا کی ہے آس محمدؐ
پاپی ہوں کچھ نہیں پاس محمدؐ

''صاحبانِ قلب و نظر کہتے ہیں کہ یہ نعت مغنیہ کی بخشش کا سامان ہے۔ پروفیسر اسرار احمد مرحوم (استاد طبیعات، میوزک ڈائریکٹر) میرے غریب خانے پر Twins کمپنی کا یہ ریکارڈ سن رہے تھے، بے اختیار ذرا بلند آواز میں کہہ اٹھے۔

''بھئی سلیم صاحب! کملا جھریا بخشی گئی۔۔۔۔!''

اسرار صاحب مرحوم سے جب بھی کملا جھریا کا ذکر ہوا تو انھوں نے اس نعت کا حوالہ بڑی محویت سے دیا اور پھر چند منٹ تک موصوفہ کی گائیکی اور اسلوب کی انفرادیت پر بڑی ہی پُر مغز گفتگو کی!۔۔۔!

ع خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں''(۴)

کملا جھریا کی گائی ہوئی نعتیں اپنے اندر روایتی مضامین کا رچاؤ رکھتی ہیں اور اُن جذبات و احساسات کی پُر گداز عکاسی ہے، جو اوصافِ نبیؐ کے سلسلے میں اردو شعرا کے لیے بہت مرغوب و مقبول رہے ہیں۔

کملا جھریا کی معاصر امیر بائی کرناٹکی بھی برصغیر کی فلمی صنعت میں اپنے وقت کی ہر دلعزیز گلوکارہ اور اداکارہ تھیں۔ فلم ''قسمت''، ''زینت''، ''شہنائی''، ''سمادھی''، ''کلد یپ''، ''زمانہ'' اور ''اعلان'' جیسی فلموں کے لیے گائے ہوئے ان کے گیتوں کو جہاں بہت مقبولیت ملی وہاں ان کی گائی ہوئی یہ نعت بھی یادگار ہے، جس کے بول ہیں:

دربارِ محمد پر اے شوقِ جبیں لے چل
دل بھی یہ مرا چاہے لے چل تو وہیں لے چل

۱۹۳۸ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''زمانہ'' کے لیے امیر بائی کرناٹکی نے ایک نغمہ گایا تھا، جس کے بول ہیں: ''اس پاپ کی دنیا سے اب اور کہیں لے چل''

مذکورہ نعت کی دھن وہی ہے جو اس نغمے کے لیے تشکیل دی گئی جبکہ بحر، ردیف اور قوافی کا نظام بھی مشترک ہے۔

برصغیر کی فلمی صنعت میں جس گلوکار نے سب سے زیادہ حمد و نعت پیش کی ہیں، وہ محمد رفیع ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندوستان کی بہت سی مقامی زبانوں کے علاوہ بعض عالمی زبانوں میں بھی کم و بیش ساڑھے سات ہزار نغمے ریکارڈ کرانے والے محمد رفیع نے متنوع اسالیب میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

محمد رفیع کی گائی ہوئی حمد، نعت اور مناقب کی تعداد ۳۰ سے زائد ہے۔ آپ نے مقدس مقامات کے علاوہ بعض مذہبی شعائر پر بھی بہت عمدہ نغمے گائے جن میں سے بعض میں کسی کہانی کی پیش کش کا انداز بھی شامل ہے۔ مذکورہ حمد و نعت و مناقب میں بعض فلموں کا حصہ ہیں جبکہ بعض غیر فلمی ہیں۔ محمد رفیع نے جو غیر فلمی حمد و نعت و مناقب گائی ہیں، اُن کے بول یہ ہیں:

۱۔ یا محمد! غم کے مارے آئے ہیں دربار میں
۲۔ سرکارِ دو جہاں کا یہ اعجاز دیکھیے
۳۔ دربارِ مدینہ دیکھیں
۴۔ دیکھیے سوئے حرم مولا کے دیوانے چلے
۵۔ حج ادا کرنے چلے ہیں کعبۂ اقدس کو ہم
۶۔ لبیک یا حرم
۷۔ مبارک ہے یہ دن، پیشِ نظر اللہ کا گھر ہے
۸۔ چلو مدینے، محمد کا نام لے کے چلیں
۹۔ فضل رب ہوگیا، حج ادا ہوگیا

۱۰۔ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۱۔ سن لو مری فریاد خدارا عبدالقادر جیلانی

۱۲۔ سنو میں داستانِ حضرتِ آدم سناتا ہوں

۱۳۔ یا خدا ایک دن جذبۂ عاشقی

۱۴۔ اے مومنو! سنو یہ کرامت نماز کی

۱۵۔ یا نبی سلام علیک

۱۶۔ کرم ہو یا علی

۱۷۔ ہجرتِ رسول

۱۸۔ اگر مل گئی مجھ کو راہِ مدینہ

۱۹۔ اللہ تو دکھا دے یہ کرشمہ قرآن کا

۲۰۔ فرشتوں سے بڑھ کر وہ انساں بنے گا

۲۱۔ آج ختم انبیا پیدا ہوئے

۲۲۔ اگر کملی والے کی رحمت نہ ہوتی

اسی طرح جو حمد و نعت فلموں کے لیے گائیں، اُن کے بول یہ ہیں:

۱۔ کالی کملی والے تم پہ لاکھوں سلام (حاتم طائی کی بیٹی ۱۹۵۵ء)(۵)

۲۔ پروردگارِ عالم تیرا ہی سہارا ہے (حاتم طائی ۱۹۵۶ء)(۶)

۳۔ میرے مالک، میرے داتا، اے میرے پروردگار (حاتم طائی ۱۹۵۶ء)

۴۔ مری جھولی کو بھر دے اے خدا صدقے محمد کے (ماں کے آنسو ۱۹۵۹ء)(۷)

۵۔ تیرے در پے جھکے میرا سر، ہے یہی آرزو، اللہ ہو اللہ ہو (نیاز اور نماز ۱۹۷۷ء)(۸)

۶۔ اگر مل گئی مجھ کو راہِ مدینہ (دین اور ایمان ۱۹۷۸ء)(۹)

۷۔ تم پہ نازل ہوا قرآن رسولِ عربی (دین اور ایمان ۱۹۷۸ء)

۸۔ کملی والے کا روضہ نگاہوں میں ہے (دین اور ایمان ۱۹۷۸ء)

۹۔ اللہ کا نام پاک ہے وہ پاک رہے گا (مان گئے استاد، ۱۹۸۱ء)(۱۰)

۱۰۔ میرے محبوب تجھے سلام (بغاوت ۱۹۸۲ء)(۱۱)

۱۹۵۹ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''ماں کے آنسو'' کے لیے گائی گئی نعت ''مری جھولی کو بھر دے اے خدا'' میں محمد رفیع کا ساتھ شمشاد بیگم نے دیا۔ شمشاد بیگم بلاشبہ ایک عظیم مغنیہ تھیں۔ ۱۹۳۰ میں برصغیر

کی فلمی صنعت میں بولتی فلموں کے آغاز کے ساتھ ہی اُن کی گائیکی کی ابتدا ہوئی اور انھی دنوں میں شمشاد بیگم نے سجاد نیازی کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں ایک غیر فلمی نعت گائی جو فی زمانہ بھی بہت مقبول ہے اور متعدد نعت خواں بھی پیش کر چکے ہیں۔ اس نعت کے بول ہیں:

پیغام صبا لائی ہے گلزارِ نبی سے
آیا ہے بلاوا مجھے دربارِ نبی سے

فلم ''ماں کے آنسو'' کے لیے گائی گئی اُن کی ایک اور نعت بھی بہت دل آویز و خوش آہنگ ہے۔ جس کے بول ہیں:

میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے
کھلے آنکھ صلِ علی کہتے کہتے

فلم ''حاتم طائی کی بیٹی'' کے لیے گائی گئی نعت ''کالی کملی والے تم پہ لاکھوں سلام'' میں ممتاز بھارتی گلوکارہ آشا بھوسلے نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ اس کے علاوہ فلم ''دین اور ایمان'' کے لیے گائی گئی نعت ''تم پہ نازل ہوا قرآن رسولِ عربی'' میں آشا بھوسلے نے اُن کے ساتھ مل کر بھی پڑھی، جبکہ یہی نعت فلم کی ابتدا میں اُن کی آواز میں الگ طور سے بھی شامل ہے۔

فلم ''مغل اعظم'' کے بیشتر نغمے شکیل بدایونی نے لکھے اور اُن میں ایک نعت ''بے کس پہ کرم کیجیے سرکارِ مدینہ'' بھی شامل ہے، جسے لتا منگیشکر نے گایا۔ انار کلی کا کردار ادا کرنے والی مدھوبالا پہ فلمائی گئی اس نعت کی موسیقی نوشاد نے ترتیب دی۔ عمدہ دھن اور پُر اثر کلام کے باعث یہ نعت بعد ازاں دیگر بہت سے نعت خوانوں نے بھی پڑھی اور اس کی مقبولیت کا تسلسل آج بھی جاری ہے۔ لتا منگیشکر کی گائی ہوئی مذکورہ نعت کے علاوہ بعض دیگر حمد و نعت بھی قابلِ ذکر ہیں۔ جن کے بول ہیں:

۱۔ سہارا ہے مجھ کو حبیب خدا کا (نیاز اور نماز ۱۹۷۷ء)
۲۔ ظالم تری طاقت کا نشہ جھوٹا نشہ ہے (نیاز اور نماز ۱۹۷۷ء)
۳۔ للہ کرم کرنا (صنم بے وفا ۱۹۷۹ء)[۱۲]
۴۔ پروردگارِ عالم (اللہ رکھا ۱۹۸۶ء)[۱۳]

لتا منگیشکر کی آواز سے مماثل آواز رکھنے والی بنگالی گلوکارہ سمن کلیان پور نے فلم ''دادا''[۱۴] کے لیے ایک حمدیہ کلام ''اللہ تو کرم کرنا، مولا تو کرم کرنا'' ریکارڈ کروایا جو مغنیہ کی آواز کی دلپذیری کے باعث بے حد تاثیر رکھتا ہے۔

۱۹۸۳ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''قلی''[۱۵] کے لیے شابر کمار کا گایا ہوا گیت ''مبارک ہو تم

سب کو حج کا مہینہ'' ایتا بھ بچن پہ فلمایا گیا۔ یہ گیت فلم کے سیاق و سباق میں بھی ایک دردمندی کا عنصر رکھتا ہے اور متن اور دھن کے لحاظ سے بھی۔

برصغیر کی فلمی صنعت میں لاہور اور کراچی کی شناخت ۳۰ کی دہائی میں تشکیل پائی اور قیامِ پاکستان کے بعد یہ شہر پاکستانی فلمی صنعت کا بنیادی مرکز بن گئے۔ تشکیل پاکستان کے سال میں بننے والی فلم ''درد'' کے لیے گلوکارہ ثریا نے قدرے دھیمے سروں میں ایک نہایت پُر درد نعت گائی، جس کے بول یہ ہیں:

بیچ بھنور میں آن پھنسا ہے، دل کا سفینہ، شاہِ مدینہ (۱۶)

''درد'' سے ایک سال قبل فلم ''نیک پروین'' ریلیز ہوئی جس میں زینت بیگم کی گائی ہوئی حمد ''اے دو جہان والے'' (۱۷) اور حمیدہ بانو کی آواز میں حمد ''تری ذات پاک ہے اے خدا تری شان جل جلالہ'' (۱۸) شامل تھی۔ یہ دونوں حمدیں ایک عرصہ تک مذکورہ گلوکاراؤں کی پہچان رہیں۔

ساغر صدیقی نے فلم ''دربارِ حبیب'' (۱۹) کے لیے جو نغمے لکھے اُن میں دو نعتیں اور ایک منقبت بھی شامل تھی۔ دونوں نعتیں قوالی کے اسلوب میں پیش کی گئیں۔ ایک نعتیہ قوالی ''خدا اور نبی کے وفادار بندے'' حافظ عطا محمد قوال اور دوسری ''ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا تمھی تو ہو'' امداد حسین اور سنتو خاں کی آواز میں ریکارڈ ہوئی۔

اس فلم کے لیے جو منقبت ریکارڈ ہوئی وہ بقول پروفیسر محمد سلیم، حضرت داتا گنج بخش کی تحسین میں ہے اور اس کے بول ہیں، ''سلام اے گنج بخشِ فیضِ عالم نورِ سبحانی'' ان کی اطلاع کے مطابق یہ خود ساغر صدیقی کی آواز میں ریکارڈ کی گئی۔ جب کہ آن لائن میگزین Pakmag.net کے ریکارڈ میں اس منقبت کے بجائے عنایت حسین بھٹی کی آواز میں ایک اور منقبت ''جنابِ غوث الاعظم یا محی الدین جیلانی'' پیش کی گئی۔ اس فلم کے لیے عنایت حسین بھٹی نے چند اور حمد و نعت بھی گائیں جن کے بول ہیں:

۱۔ خدا کی عظمتوں کا اک نشاں ہے خانہ کعبہ
۲۔ سلام اے تاجدارِ انبیا! اے فضلِ ربانی! سلام
۳۔ سن بات کسی دیوانے کی، ہو خیر تیرے مے خانے کی
۴۔ ہمیں تقلید ابراہیم کی توفیق دے مولا

فلم ''حاتم'' کے لیے زبیدہ خانم کی آواز میں گائی گئی نعت ''گردش میں اپنا ستارہ ہے سرکار مدینے والے'' (۲۰) اور ''زہرِ عشق'' کے لیے گائی گئی نعت ''سنو عرض مری کملی والے'' (۲۱) اپنے باطن میں استغاثے کا عنصر رکھتی ہیں۔

اردو میں فلمی نعتوں کے سلسلے میں ''نور اسلام'' کے لیے سلیم رضا، آئرن پروین اور ساتھیوں کی

گائی ہوئی نعت ''شاہِ مدینہ،،(۲۲) غنائیت سے بھرپور ہے اور اپنے سامع کے لیے تاثیر کے بے پناہ اسباب رکھتی ہے۔ ایسی ہی ایک اور مقبول فلمی نعت ''جو نہ ہوتا تیرا جمالہ تو جہاں تھا خواب و خیالہ،،(۲۳) فلم ''ایاز'' کے لیے زبیدہ خانم، اقبال بانو اور ناہید نیازی کی آواز میں ایک کورس کی شکل میں ریکارڈ کی گئی۔ ''صلوعلیہ وآلہٖ'' کے ساتھ قافیہ ملانے کے لیے اس نعت میں بے معنی نوعیت کی ترکیب سازی کی گئی ہے لیکن عوامی مقبولیت کا بھی کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔

فلم ''فرنگی'' کے لیے نور جہاں کی آواز میں گائی گئی نعت ''تری ذات ہے مظہرِ نورِ خدا،،(۲۴) اپنے اندر بھرپور رزمیہ عنصر رکھتی ہے۔ نعت کی ابتدا میں مولانا الطاف حسین حالی کا یہ شعر بھی ایک کورس کی شکل میں پڑھا جاتا ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت ِدعا ہے

امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

فلم ''سرتاج'' کے لیے اُن کی آواز میں نعت ''دے صدقہ کملی والے کا،،(۲۵) دھیمے سروں میں دردمندی اور گداز کا عنصر رکھتی ہے۔

نور جہاں کی نعت گوئی کے سلسلے میں پروفیسر سلیم الرحمٰن نے یہ دلچسپ اور حیران کن معلومات دی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اقبال بانو نے بتایا تھا کہ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے کیریئر کے باقاعدہ آغاز سے قبل ملکہ ترنم نور جہاں کی ادا کی ہوئی نعت ع ''ہنستے ہیں ستارے یا شاہ مدینہ'' سنائی تھی۔

یہ قصہ بھی سنتے جایئے گا مذکورہ نعت نور جہاں کی سوانح حیات میں ایک اہم ترین حوالہ ہے، ایک سنگ میل ہے۔ بے بی نور جہاں نے یہ نعت صرف چھ برس کی عمر میں لاہور کے بھاٹی دروازے کے تھیٹر میں مع اداکاری کے بارہا گائی تھی۔ شنید یہ ہے کہ اس کی طرز بابا چشتی نے موزوں کی تھی اور بابا جی نے کم سن بے بی کو سہارا دے کر اسٹیج پر چڑھایا تھا۔ یہ نعت بے بی نور جہاں کی آواز میں تو خوبصورت ریکارڈ اس وقت محفوظ نہیں ہو سکی تھی مگر اس کی طرز بڑی ہی مقبول ہوئی تھی اور یہ نعت بے بی نور جہاں کی عہد کم سنی میں شناخت بھی بن رہی تھی اور طرز کو کئی دوسرے فنکاروں نے بھی اپنا لیا تھا۔ اسی طرح بے بی نور جہاں کی سٹیج پر بارہا پرفارم ہونے والی ایک اور نعت بڑی مقبول رہی تھی جس کے بول تھے:

ع سن رے شتر سوار

یہ دور مقبولیت دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے پہلا دور ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔ دوسرا ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۱ء ہے۔ اس دور میں بے بی نور جہاں نے تھیٹر کے سٹیج پر بطور چائلڈ سٹار، گلوکارہ

اور رقاصہ کے طور پر کام کیا اور اس دور میں دونوں مذکورہ نعتیں بالخصوص اوّل الذکر نعت گھر گھر پہنچی تھی اور دلچسپ بات ہے کہ ریکارڈنگ کی بجائے صرف سماعت کے آسرے پر اس کی طرز حافظے میں محفوظ ہوتی چلی گئی۔ بعد کو چند ایک مغنیاؤں نے یہ نعت ریکارڈ کروائی تھی۔ "Regal" ریکارڈنگ کمپنی نے بھی ایک ریکارڈ تیار کیا تھا جس کے ایک طرف یہ نعت بھری گئی تھی:

ع ہنستے ہیں ستارے یا شاہ مدینہ

جسے مس ببو جان "Miss Baibbo Jan" نے اپنی آواز کا جمال و گداز دیا۔ ممکن ہے یہ "Miss Bibbo Jan" ماضی کی اداکارہ عشرت جہاں ببو ہی ہوں۔ ریکارڈ سن کر عشرت جہاں ببو کی آواز کا شائبہ بھی گزرتا ہے۔ اس ریکارڈ کے دوسری طرف یہ نعت ہے:

ع سن رے شتر سوار

اور یہ نعت ذکریا بائی دلی والی کی آواز میں ہے۔ کولمبیا گراموفون کمپنی کے ذیلی ادارے Regal کے زیرِ اہتمام ریلیز ہونے والے اس نعتیہ ریکارڈ کا نمبر RL 367 ہے چھوٹا نمبر CEL 20812 اور CEL 20814 ہے (مس ببو جان + ذکریا بائی دلی والی) یہ بات ہنوز تشنۂ تحقیق ہے کہ آیا مذکورہ ریکارڈ والی طرز بے بی نور جہاں سٹیج پر گایا کرتی تھیں یا مذکورہ ریکارڈ والی طرزوں میں کچھ ردو بدل کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

لیکن یہ بات قرین قیاس ہے کہ مس ببو جان اور ذکریا بائی دلی والی کی آوازوں میں جو مذکورہ ریکارڈ تیار ہوا ہوگا وہ بالیقین بے بی نور جہاں کی سٹیج والی طرز کی مقبولیت کی بنا پر ہوگا یہ الگ بات ہے کہ دونوں مغنیائیں یعنی ببو جان اور ذکریا بائی دلی والی سن سال کے حوالے سے نور جہاں سے خاصی بڑی تھیں۔،، (۲۶)

۱۹۶۵ء میں دو فلمیں ''عظمتِ اسلام،،(۲۷) اور ''عشقِ حبیب،، ریلیز ہوئیں۔ ''عظمت اسلام،، میں چار نعتیں شامل کی گئیں، جن کے بول یہ ہیں:

۱۔ محمد محمد پکارے چلا جا (سلیم رضا اور ساتھی)

۲۔ حرم کی عظمت کا پاسبانو (مسعود رانا)

۳۔ کر فکر خدا پھر دیکھ ذرا (سلیم رضا اور ساتھی)

۴۔ میرے آقا میرے سلطان (آئرن پروین، سلیم رضا اور ساتھی)

فلم ''عشقِ حبیب،، کے لیے، غلام فرید صابری قوال کی معروف نعتیہ قوالی ''میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا،، ریکارڈ کی گئی۔ یہ امر تحقیق طلب ہے مذکورہ نعت فلم ہی کے لیے گائی گئی یا گائی ہوئی قوالی کو فلم

میں شامل کیا گیا۔

فلم ''ہمراہی''(۲۸) کے لیے مسعود رانا کی گائی ہوئی آواز میں نعت، ''کرم کی اک نظر ہم پر خدارا یا رسول اللہ'' او نچے سُروں میں گائی گئی نعت ہے اور رسول کریم کے حضور استغاثہ کی بابت بہت پُر درد اور پُر تاثیر ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فلم ''ہمراہی'' ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت معرکہ آرائی کے تناظر میں بنائی گئی فلم ہے جس میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی ۶ ستمبر کی صبح کی گئی معروف تقریر کا کچھ حصہ بھی شامل ہے اور اس فلم میں جنگ کے بعض مناظر بھی دکھائے گئے۔ اس کے علاوہ بعض عالمی راہنماؤں اور مقامی سیاستدانوں کی تصاویر بھی پس منظر میں دکھائی گئیں۔ جنگِ ستمبر ہی کے پس منظر میں مسعود رانا کی آواز میں گایا ہوا جنگی ترانہ، ''جاگ اٹھا ہے سارا وطن'' بھی بہت مقبول ہوا جو فلم ''مجاہد'' کے لیے گایا گیا۔

فلم ''انسانیت'' کے لیے مالا کی آواز میں گائی ہوئی نعت ''ساری دنیا کے مختار محمد کملی والے''(۲۹) اپنے اندر دعا اور استغاثہ کے عناصر رکھتی ہے۔ دھیمے سروں میں پیش کی گئی اس نعت میں رجائیت کا پہلو تاثر انگیز ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں بھارتی گلوکار، ''سونو نگم'' کی آواز میں چند نعتیں منظرِ عام پر آئی ہیں جن کے بول ہیں:

۱۔ کشتی عمر لگے پار رسولِ عربی

۲۔ سلام آپ پر تاجدارِ مدینہ

۳۔ محمد کے در پر چلا جا سوالی

سونو نگم نے حال ہی میں غلام فرید صابری قوال کی گائی ہوئی نعتیہ قوالی، ''تاجدارِ حرم ہو نگاہِ کرم'' سکھ وندر سنگھ کی ہمنوائی میں گائی ہے اور یہی قوالی پاکستانی گلوکار عاطف اسلم نے بھی پیش کی ہے۔

برصغیر کی فلمی صنعت میں حمد و نعت کی روایت جو ابتدا ہی سے بڑی مستحکم رہی ہے۔ ۸۰ کی دہائی کے بعد بوجوہ کمزور ہوگئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو ماضی میں فلم کے ساتھ وابستہ مقصدیت کا تصور ہے۔ فلم ساز فلم بناتے ہوئے کچھ سماجی مقاصد کو پیش نظر رکھتے تھے۔ تفریحی اسلوب میں معاشرتی شعور کی بیداری کا کام لینے کے تصور کو باعث جہاں کہانی کے پلاٹ میں افادی مقاصد کا آمیزہ شامل کیا جاتا تھا وہاں اس عنصر کو نغموں میں بھی بطورِ خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ اسی اہمیت کے پیش نظر فلم ساز حمد و نعت کا بھی اہتمام کرتے تھے۔

پاکستانی فلموں میں حمد و نعت کی روایت کے کمزور ہونے کی ایک بڑی وجہ تو ۷۰ کی دہائی کے بعد خود فلمی صنعت کا زوال ہے جب کہ دوسری بڑی وجہ مذہبی تصورات اور فلم کی جمالیاتی اقدار کے مابین ہم

آہنگی کے خاتمے کی شعوری کوشش بھی ہے۔ پاکستانی سماج میں بعض مقتدر طبقات نے جہاں فلمی صنعت پر کڑی پابندیاں لگائیں وہاں آرٹ کے ذریعے مذہبی اقدار کے فروغ کو ناپسندیدہ بھی قرار دیا۔

اردو فلموں میں حمد و نعت کی پیش کش ہندوستان کی ہند اسلامی ثقافت یا جدید سیاسی اصطلاح سیکولرازم کے تناظر میں بہت اہم ہے۔ ہندوستان ایک کثیر المذہبی اور کثیر الثقافتی خطہ ہے۔ کئی ایک مذاہب کے افراد صدیوں سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں اور ان کے مذہبی تصورات نیز ثقافتی روایات میں اختلاف کے باوجود کئی ایک امتزاجات پیدا ہو چکے ہیں۔ انھی امتزاجات کا ایک عکس یہ فلمیں بھی ہیں کہ جن میں پڑھی جانے والی حمدیں یا نعتیں مسلم تصورات سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان فلموں کے ہدایت کاروں، اداکاروں، موسیقاروں اور گلوکاروں کے علاوہ مصنّفین کی کثرت دیگر مذاہب خصوصاً ہندومت سے ہے۔

فلم میں حمد و نعت کے ذریعے مذہب اور فنونِ لطیفہ کے مابین ربط مظاہر ہوتا ہے۔ مذہب ہو یا دنیا کا کوئی بھی عظیم فکری نظام، اس نے اپنی ترویج و اشاعت یا اذہان و قلوب کی تسخیر کے لیے فنون کا سہارا لیا ہے۔ خود فن کاروں نے بھی اپنے اپنے آدرش کو عملی رنگ میں دیکھنے کے لیے اپنے فن کو وقف کیا ہے۔

سماج میں مذہبی تعلیمات کے فروغ کی خاطر برصغیر میں بہت سی ایسی فلمیں بنائی گئیں جن میں کہانی کے متن یا کسی مثالی کردار کو مذہبی بیانیے کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا۔ یہ الگ بات کہ بعض فلموں میں ابلاغ اتنا واضح بلکہ شدید ہے کہ آرٹ کی جمالیات پر کئی ایک سوال پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سوالات اس لیے بھی جنم لیتے ہیں کہ برصغیر میں ایک عرصے تک فن کا صحت مند تصور تشکیل نہیں پا سکا، جس کی کئی ایک عمرانی وجوہ ہیں۔

ان فلموں کو دیکھ کر یہ واضح محسوس ہوتا ہے کہ فلم ساز ایک عمرانی منصوبے کے تحت نہ صرف کہانی کا پلاٹ اور مکالمے تیار کرتے ہیں بلکہ اس کے لیے حمد و نعت بھی ایسی شامل کرتے ہیں جو اُس عمرانی مقصد کی تکمیل کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس کی نسبت یورپ میں تیار کردہ فلموں کو دیکھیں تو ان میں فن کی جمالیات مسخ نہ ہونے پہ بہت توجہ صرف کی جاتی ہے اور فلم کے پس منظر میں موجود عمرانی بیانیے کے اظہار کے لیے مختلف تکنیکی وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔

عمرانی مقاصد کی تکمیل کے تناظر میں دیکھیں تو فلموں میں حمد و نعت کی ریاستی بیانیے کے فروغ یا جذبۂ حب الوطنی کو تقویت دینے کے لیے بھی شامل کی گئیں بلکہ بعض فلمیں تو کلی طور پر اسی مقصد کے لیے تیار کی گئیں۔ اس سلسلے میں وہ فلمیں قابلِ ذکر ہیں جو ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر بنائی گئیں۔ ''عظمت اسلام''، ''عشق حبیب'' اور ''ہمراہی'' ایسی فلموں کی تیاری اور ان میں حمد، نعت اور قوالیوں کی

شمولیت کے ذریعے حربی حالات میں اہلِ وطن کے دلوں میں اپنی سرزمین سے محبت اور دشمن کے خلاف غصہ و عناد کے جذبات کو ابھارنا تھا۔

اُردو فلموں کے لیے گائی گئی حمد یا نعت کے سلسلے میں سماجی تصورات کا سوال اٹھایا جائے تو ان کی پیشکش مشرقی معاشرت کے بعض ایسے تصورات کی بھی عکاسی ہے جن کی بنیاد مذہب سے وابستہ وہ مقبول عقائد ہیں جو اب ماضی کی طرح مستحکم نہیں رہے اور اُن عقائد کی شکستگی کے ساتھ وہ تصورات بھی بہت حد تک کمزور ہو چکے ہیں۔ ان عقائد میں سب سے غالب تصور خیر و برکت کا ہے۔ بعض نعتیں تو محض مذہبی بزم آرائی کے لیے فلم کا حصہ بنائی گئیں جبکہ بعض کسی بیمار کی صحت یابی یا حالات کی تنگدستی میں کشادگی کی دعا کے طور پر شامل کی گئیں۔ ان نعتوں میں استغاثہ کا تصور فعالیت پر کم اور انفعالیت پر زیادہ ہے۔

ان فلموں کے بعض واقعات ایسے تصورات کی بھی عکاسی کرتے ہیں جن کا تعلق قدیم داستانوں اور معاصر معروضی سے اُن کی جرأت پر کئی سوال اٹھتے ہیں۔ مثلاً فلم ''دین اور ایمان'' میں فلم کی ہیروئن پر جب انتہائی مشکل وقت آتا ہے تو عین اُسی وقت اُسے حج پر گئے ہوئے اپنے والد کا خط ملتا ہے۔ جس میں وہ بیٹی کو بہت سی دعائیں دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ اب وہ باقی زندگی ادھر ہی گزارے گا اور واپس نہیں آئے گا۔ یہ عدم مراجعت ایک بیٹی کے امتحان کے لمحوں میں ایک اور بڑی آزمائش ثابت ہوتا ہے اور وہ باپ کے ہوتے ہوئے ایک بڑے سہارے سے محروم ہو کر خودکشی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ خیر و برکت کے تصور کے تسلسل ہی میں بعض معجزاتی واقعات بھی ان فلموں کا حصہ ہیں، جن کے ذریعے مشرقی معاشرے کی مابعد الطبیعاتی افتادِ طبع کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ جیسا کہ فلم ''حاتم طائی'' میں نعت سن کر ایک کردار کی بینائی لوٹ آتی ہے۔

بعض فلموں میں حمد و نعت کے ذریعے رسول کریمؐ کے حضور استغاثہ کا صحت مند عنصر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے اور ان میں بلاشبہ جوش و جذبہ اور احساس کے ترفع کا پہلو بھی موجود ہے۔ اس نوع کی نعتوں میں ایک رزمیہ آہنگ بھی موجود ہے اور یہ کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے بطور روحانی سہارے کا احساس بھی دلاتی ہیں۔ ان فلموں میں وقت کی جابر قوتوں کے سامنے بے کسی اور لاچار طبقات کی مزاحمت دکھائی گئی ہے۔ سماج کے لیے یہ پسے ہوئے افراد مقتدر اور استبدادی قوتوں کے مظالم کے خلاف جب بغاوت پر آمادہ ہوتے ہیں تو اُن کے قلوب تصورِ توحید اور پیغام رسالت کے انقلابی تصور سے معمور دکھائی دیتے ہیں۔ فلم ''دادا''، ''نماز اور نیاز''، ''اللہ رکھا'' اور ''فرنگی'' میں غریب طبقے کے افراد جابر و ظالم قوتوں اور اُن کے وسائل طاقت کو ہیچ خیال کرتے ہوئے خدائے واحد اور اُس کے رسول ﷺ کی عظمت کے تصور سے تقویت آشنا ہوئے ہیں۔ استغاثہ کا یہ تصور نہ صرف مثبت بلکہ عوامی

شعور کی بیداری کے سلسلے میں فکری آگاہی کا وسیلہ ہے اور ان فلموں میں شامل حمد و نعت انقلابی احساسات کو مہمیز عطا کرتے ہیں۔

اردو نعت کی تاریخ میں فلم کے لیے گائی گئی نعتوں کے ذکر نہ ہونے کا سوال بھی موجود ہے۔ ان نعتوں کے تذکرے سے گریز کی ایک بڑی وجہ آرٹ اور اہلِ فن سے متعلق ہمارا سماجی رویہ بھی ہے۔ خصوصاً مذہبی لحاظ سے اس فن اور اس سے وابستہ افراد کے بارے میں کوئی ایسے تصورات راہ نہیں بنا پائے جس سے یہ معاشرے کے لیے کسی تکریم کے ساتھ قبولیت کا مقام حاصل کر پائیں۔ چنانچہ جہاں آرٹ اور فن کار کو اپنی حدود میں رکھا گیا وہاں نعت کے تذکرے میں بھی اُن کی گائی ہوئی نعتوں پر مثبت اسلوب میں توجہ نہیں کی گئی۔ یہ الگ بات کہ اُن کی پیش کی ہوئی نعتیں، بعدازاں کسی اور قرینے سے نہ صرف قبول بلکہ مقبول بھی ہوگئیں۔

فلمی صنعت سے وابستہ حمد و نعت کے مزاج، معیار یا ان کے فنی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تو مذکورہ حمد نعت کا سرمایا اپنے اندر ایک عوامی لحن بھی رکھتا ہے اور اپنے مافیہ میں ایک سماجی آہنگ بھی۔ فلم کے لیے گائی گئی حمد و نعت کے کم و بیش ویسے ہی تقاضے ہوتے ہیں جو کسی دوسرے فلمی نغمے کے۔ یعنی اُس کی پیشکش فلم کی مجموعی فضا سے جڑی ہوتی ہے اور اُس کی تیاری کہانی کی ضرورت کے مطابق کی جاتی ہے۔ ان نعتوں کے تخلیق کار بھی زیادہ تر وہی شعرا ہیں جو فلمی صنعت سے جڑے ہوئے تھے اور وہ کسی نعت کی تخلیق یا پیشکش میں اُن تقاضوں کو لازماً پیش نظر رکھتے تھے جو فلم کی مجموعی کہانی یا نعت کی پیشکش کے منظر اور سیاق و سباق کے حوالے سے لائق لحاظ ہوتے تھے۔

فلمی حمد و نعت کے متون کے شعری معیار کا سوال اٹھایا جائے تو بعض نعتیں کم و بیش اتنا ہی اہمیت رکھتی ہیں جیسی کہ ہماری مجموعی شاعری میں فلمی نغموں کی ہے۔ یعنی وہ آواز، آہنگ اور لے کے لحاظ سے تو قابلِ سماعت ہوتی ہیں لیکن اُن کا فکری و فنی معیار ترفع کا حامل نہیں ہوتا لیکن بعض نعتیں اپنے اندر ایک ادبی رفعت کے اسباب بھی رکھتی ہیں اور انھیں آہنگ نغمہ سے ہٹ کر بھی دیکھیں تو اُن کا شعری اسلوب پائیدار محسوس ہوتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

1. http://en.wikipedia.org/wiki/religious.art

۲۔ اینڈریو ایم گریلے (۵ فروری ۱۹۳۸ء۔ ۲۹ مئی ۲۰۱۳ء) ایک امریکی رومن کیتھولک پادری، ماہر سماجیات، صحافی اور مقبول ناول نگار تھے۔ آپ یونیورسٹی آف شکاگو اور یونیورسٹی آف ایریزونا میں سوشیالوجی کے پروفیسر اور ''نیشنل اوپینین ریسرچ سنٹر'' (NORC) سے ریسرچ ایسوسی ایٹ کے طور پر وابستہ رہے۔ اس کے علاوہ آپ نے شکاگو

سن ٹائمز کے لیے کالم بھی تحریر کیے اور ''نیویارک ٹائمز''، ''نیشنل کیتھولک رپورٹر'' اور ''کامن ویل'' کے لیے متفرق خدمات انجام دیں۔

۳۔ اس تحقیقی مجلّے کے مدیر John C. Lyden ہیں۔ اب تک ۲۲ شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں جو درج ذیل لنک پر آن لائن مطالعہ کیے جا سکتے ہیں: https://digitalcommons.unomaha.edu/jrf/

۴۔ پروفیسر محمد سلیم، ''صدا آتی ہے''، سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۴۳۔۴۴

۵۔ یہ فلم ۱۹۵۵ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے پیش کار اور ہدایت کار ننو بھائی تھے۔ پیش کی گئی نعت میں محمد رفیع کا ساتھ آشا بھوسلے نے دیا اور یہ فلم کے مرکزی کرداروں سلیم اور جہاں آرا پر فلمائی گئی۔ یہ کردار بالترتیب اداکار ماہی پال اور چترا نے ادا کیے۔ اس نعت کی موسیقی اے آر قریشی (اللہ رکھا قریشی) نے ترتیب دی۔

۶۔ فلم ''حاتم طائی'' ۱۹۵۶ء میں ریلیز ہوئی۔ فلم میں گائی گئی نعت کی موسیقی سری ناتھ ترپاٹھی نے ترتیب دی اور اداکار پیڈی جیراج پہ یس نعت کو فلمایا گیا۔

۷۔ فلم ''ماں کے آنسو'' ۱۹۵۹ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے ہدایت کار سردار ملک تھے۔ راجہ مہدی علی خاں کی لکھی ہوئی اس نعت کو گانے کے لیے محمد رفیع کا ساتھ شمشاد بیگم نے دیا۔ اس کی موسیقی سردار ملک نے ترتیب دی۔

۸۔ فلم ''نیاز اور نماز'' ۱۹۷۷ء میں ریلیز ہوئی۔ اُس کے موسیقار شام جی گھن شام جی تھے۔ اس فلم کی بعض نعتیں لتا منگیشکر نے بھی گائیں۔

۹۔ فلم ''دین اور ایمان'' ۱۹۷۹ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے ہدایت کار و مکالمہ نگار اے شمشیر تھے۔ فلم میں شامل بعض نعتوں میں محمد رفیع کا ساتھ آشا بھوسلے نے دیا اور موسیقی شیام جی گھن شام جی نے ترتیب دی جبکہ شاعر انجم جے پوری تھے۔ یہ نعتیں فلم کے کرداروں ناظمہ اور مقصود احمد پر فلمائی گئیں اور یہ کردار بالترتیب اداکارہ وینا اور امجد خان نے ادا کیے۔

۱۰۔ فلم ''مان گئے استاد'' ۱۹۸۱ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے ہدایت کار شیو مترا جبکہ موسیقار اوم پرکاش شرما تھے۔ فلم میں شامل کی گئی نعت اداکار اوم پرکاش پر فلمائی گئی۔

۱۱۔ ۱۹۸۲ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''بغاوت'' کے ہدایت کار رامانند ساغر تھے۔ فلم میں شامل نعت میں محمد رفیع کا ساتھ آشا بھوسلے نے دیا جبکہ موسیقی لکشمی کانت پیارے لال نے ترتیب دی۔ اور اسے اداکار دھرمندر اور اداکارہ رینا رائے پر فلمایا گیا۔

۱۲۔ فلم ''صنم بے وفا'' ۱۹۹۱ء میں ریلیز ہوئی۔ جس کے ہدایت کار مہیش کشور تھے۔ فلم میں شامل حمدیہ کلام اداکارہ چاندنی (نوودتا شرما) پہ فلمائی گئی۔

۱۳۔ یہ فلم ۱۹۸۸ء میں ریلیز ہوئی۔ فلم میں گائی گئی نعت کی موسیقی انو ملک نے ترتیب دی ہے اور اسے اداکارہ ڈمپل کمباڈیا پر فلمایا گیا۔ یہ نعت اس فلم میں محمد عزیز کی آواز میں بھی شامل ہے جسے شمی کپور پر فلمایا گیا۔

۱۴۔ فلم ''دادا'' ۱۹۷۹ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے ہدایت کار جگل کشور تھے۔ فلم میں شامل نعت کے شاعر گوہر کانپوری ہیں جبکہ موسیقار اوشا کھنا ہیں۔ فلم میں شامل بندیا گوسوامی پر فلمائی گئی۔

۱۵۔ فلم ''قلی'' کے ہدایت کار من موہن ڈیسی اور پریاگ راج تھے۔ فلم میں شامل نعت کے گلوکار شابر کمار کا تعلق بھارت کے علاقہ وڈورا سے تھا۔ ''قلی'' کے علاوہ جن فلموں کے لیے مقبول گیت گائے۔ اُن میں ''آج کا ارجن''، ''طوفان''، ''آن''، ''گرفتار'' اور ''وہ 7 دن'' قابلِ ذکر ہیں۔

۱۶۔ فلم ''درد'' کے ہدایت کار عبدالرشید کاردار تھے۔ جو ۱۹۰۴ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیا مگر بوجوہ جلد ہی بھارت چلے گئے اور ۱۹۸۹ء کو بمبئی میں انتقال ہوا۔ ''درد'' ایک تعلیمی موضوع پر بننے والی یادگار فلم تھی۔ اس کی ابتدا میں شمشاد بیگم کی آواز میں یتیم بچوں کے لیے ایک بہت ہی عمدہ گیت شامل ہے جس میں بعض بند نعتیہ عنصر بھی رکھتے ہیں:

ہم درد کا افسانہ دنیا کو سنا دیں گے
ہر دل میں محبت کی اک آگ لگا دیں گے
سرکارِ دو عالم کی امت پہ ستم کیوں ہو
اللہ کے بندوں کو منجھدار کا غم کیوں ہو
اسلام کی کشتی کو ہم پار لگا دیں گے

۱۷۔ ''نیک پروین'' کے لیے گائی گئی حمد کی گلوکارہ زینت بیگم قیامِ پاکستان سے قبل فلمی صنعت کا ایک اہم نام تھیں۔ تاہم بعد ازاں زیادہ پذیرائی نہ ملی اور ریڈیو پاکستان کے لیے گاتی رہیں۔ ۱۹۶۶ء میں وفات پائی۔

۱۸۔ حمیدہ بانو ۱۹۲۸ء میں لاہور میں پیدا ہوئیں۔ کم عمری میں گلوکاری کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۲ء تک بمبئی کی فلمی صنعت سے وابستہ رہیں اور پھر پاکستان آگئیں۔ فلم ''نیک پروین'' کے لیے گائی گئی حمد کے بارے میں وہ بتاتی ہیں:
''(یہ حمد) پہلے راج کماری کی آواز میں ریکارڈ ہوئی تھی مگر معلوم نہیں کیوں یہ ڈراپ کر دی گئی اور پھر میری آواز میں ریکارڈ کی گئی تھی۔'' (سلیم الرحمٰن سے گفتگو، مشمولہ: ''صدا آتی ہے''، ص ۴۴۰)

۱۹۔ یہ فلم ۱۹۵۶ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار شیخ محمد لطیف اور ریاض احمد تھے۔ فلم میں شامل مذہبی کلام ساغر صدیقی اور ناظم پانی پتی کا ہے۔ جبکہ موسیقی رحمٰن ورما اور حسن لطیف نے ترتیب دی۔

۲۰۔ فلم ''حاتم'' ۱۹۵۶ء میں ریلیز ہوئی۔ فلم میں شامل نعت قتیل شفائی کی لکھی ہوئی اور موسیقی صفدر حسین نے ترتیب دی ہے۔ یہ نعت اداکارہ صبیحہ خانم اور سدھیر پر فلمائی گئی۔

۲۱۔ فلم ''زہرِ عشق'' ۱۹۵۷ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے لیے گائی گئی اس نعت کے خالق قتیل شفائی ہیں۔ خواجہ خورشید انور کی موسیقی میں یہ نعت اداکارہ یاسمین پہ فلمائی گئی۔ اس سے قبل اس نام سے ۱۹۳۳ء میں بھی فلم بنائی گئی تھی۔

۲۲۔ فلم ''نورِ اسلام'' ۱۹۵۷ء میں ریلیز ہوئی جس میں شامل نعت اداکار درپن پہ فلمائی گئی۔ اس کے شاعر نعیم ہاشمی تھے جبکہ موسیقی حسن لطیف نے ترتیب دی۔ ''نورِ اسلام'' کے نام سے اس سے قبل ۱۹۳۴ء میں بھی فلم بن چکی تھی جبکہ ''نورِ ایمان'' (۱۹۳۳ء)، ''نورِ وحدت'' (۱۹۳۶ء) اور ''نورِ عرب'' (۱۹۴۶ء) کے نام سے بھی فلمیں ریلیز کی جا چکی تھیں۔

۲۳۔ فلم ''ایاز'' ایک سوانحی فلم تھی جو ۱۹۶۰ء میں ریلیز ہوئی۔ فلم میں شامل نعت کے خالق تنویر نقوی تھے جبکہ موسیقی خواجہ خورشید انور، یہ نعت اداکارہ صبیحہ، نیلو، نیئر سلطانہ، نسرین اور ریکھا پر فلمائی گئی۔

۲۴۔ برطانوی نو آبادیاتی نظام کے خلاف بنائی گئی فلم ''فرنگی'' ۱۹۶۴ء میں کے کے پروڈکشنز نے ریلیز کی جس میں اداکار طالش نے بنیادی کردار ادا کیا۔فلم میں شامل تنویر نقوی کی لکھی ہوئی اس نعت کی موسیقی رشید عطرے نے ترتیب دی اور اسے اداکارہ شمیم آرا پر فلمایا گیا۔

۲۵۔ فلم ''سرتاج'' ۱۹۶۵ء میں ریلیز ہوئی جس میں بنیادی کردار اسلم پرویز نے ادا کیا فلم میں گائی گئی نعت اوارہ دیبا پہ فلمائی گئی۔

۲۶۔ پروفیسر سلیم الرحمٰن، ''صدا آتی ہے''، ص ۳۸۷۔۳۸۹

۲۷۔ فلم ''عظمت اسلام'' کے مصنف ظہیر احمد نقش تھے۔فلم میں شامل کی گئی نعتیں تنویر نقوی اور نعیم ہاشمی نے تخلیق کیں اور انھیں مختلف اداکاروں پر فلمایا گیا۔

۲۸۔ فلم ''گمراہی'' ۱۹۶۶ء میں جی ایس اینڈ کمپنی نے تیار کی۔فلم میں پیش کی گئی نعت مظفر وارثی نے تخلیق کی تصدق حسین کی موسیقی میں یہ نعت اداکار خالد پر فلمائی گئی۔

۲۹۔ فلم ''انسانیت'' ۱۹۵۷ء میں ریلیز ہوئی۔فلم میں شامل نعت ادکارہ زیبا پر فلمائی گئی اور اس کی دھن منظور اشرف نے بنائی۔

☆☆☆

خان حسنین عاقبؔ، مہاراشٹرا، بھارت

گوئٹے کی نظم 'نغمۂ محمدی' کا تنقیدی جائزہ

ABSTRACT: Johann Wolfgang, Goethe was a renowned German poet who composed devotional poem in praise of Holy Prophet Muhammad (S.A.W). Allamah Iqbal translated the same in Persian and presented some gist of theme of the poem by using symbolic word "River" as title. Critical analysis of Goethe's poem has been carried out in this article besides bringing some historical facts in lime light to ascertain meanings of symbolic words used by the poet.

لسانی اعتبار سے اردو زبان کا جرمن زبان سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں بنتا کیونکہ دونوں زبانیں دو مختلف لسانی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ ہی اردو ادب پر جرمن زبان و ادب کے راست اثرات مرتب ہونے کی دلیل کہیں سے دستیاب ہوتی ہے کیوں کہ جرمنی ایک مغربی ملک ہے جس کی لسانی، تہذیبی، ثقافتی اور ادبی تاریخ اردو ادب کی تاریخ سے بالکل مختلف ہے اور نہ ہی اردو زبان و ادب کے جرمن زبان و ادب کو متاثر کرنے کے شواہد ملتے ہیں۔ اگر ہم چند جرمن مستشرقین کی ادبی خدمات کو سامنے رکھ کر اس ضمن میں کوئی مثبت بات کریں تو اس سے پہلے ہمیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اردو زبان و ادب سے ان مستشرقین کی واقفیت کی نوعیت ذاتی مطالعہ اور ذوق پر مبنی تھی۔

البتہ جرمنی کی دو ایسی شخصیات کا تعلق اردو ادب سے براہِ راست اور بالراست رہا ہے جن کے ذکر کے بغیر شائد اردو ادب کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ ایک نے اقبالؔ کو متاثر کیا اور دوسری کو اقبالؔ نے اس حد تک متاثر کیا کہ آج اسے ماہرِ اقبالیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یعنی گوئٹے اور این میری شمیل۔

ایمانداری کی بات تو یہی ہے کہ گوئٹے سے ہم اردو والوں کے تعارف کا وسیلہ سوائے اقبال کے اور کوئی نہیں ہے۔ لیکن گوئٹے کا تعارف مشرقی ادبیات سے عموماً اور فارسی ادبیات سے خصوصاً اس کی طبعِ سلیم اور روحانیت کی طرف اس کے فطری رجحان کا مرہونِ منت ہے۔ مشرقی ادبیات کے ذیل میں حافظ اور رومی کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ انہوں نے گوئٹے کو متاثر کیا۔

جان وولف گانگ گوئٹے GOETHE, JOHANN WOLFGANG عیسوی سنہ 1749 میں جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں پیدا ہوا اس نے اہل علم کے خاندان میں آنکھیں کھولیں وہ یوں کہ اس کا باپ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھا اور اس کی ماں حاکم شہر کی بیٹی تھی۔ گوئٹے جرمن ادب کا سب سے عظیم شاعر مانا جاتا ہے۔ ابتداء ہی سے، بلکہ اپنی نوجوانی ہی سے گوئٹے کو اسلام اور مشرق سے بے حد دلچسپی تھی۔ اسی لئے اس نے عربی زبان بھی سیکھی تھی۔ گوئٹے کے خیال میں نئی ثقافتوں کی دریافت کے لئے ادب اور مذہب سے زیادہ کارآمد کوئی اور ذرائع نہیں ہو سکتے اس لئے اس نے مشرقی ادب میں رومیؔ اور حافظؔ کی شاعری کا اور ساتھ ہی ساتھ مذاہب کے ذیل میں زرتشت کی تعلیمات اور دینِ اسلام کا مطالعہ کیا۔ مشرق اور اسلام سے گوئٹے کی دل چسپی اور مطالعہ کا دورانیہ ۱۸۱۴ سے ۱۸۲۷ عیسوی تک محیط ہے۔ گوئٹے کی معرکۃ الآراء کتاب 'دیوانِ مغرب' جس کا جرمن نام Divan West-östlicher ہے، اسے جرمن۔ فارسی عہد کا ایک آغاز ہی کہا جا سکے گا جس کی ابتداء ۱۸۱۴ میں ہوئی جب اسے جرمن زبان میں آسٹریائی مستشرق جوزف وون ہیمار پرگستال کی ترجمہ کردہ 'دیوانِ حافظؔ' کی دو جلدیں موصول ہوئیں۔ جوزف کے تراجم اور تبصروں نے جرمن عوام کی دلچسپی مشرق کے مطالعہ میں بڑھانے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ دیوانِ حافظ کے مطالعے نے جہاں ایک جانب گوئٹے کے جوش میں اضافہ کیا وہیں اس نے مشرق کے ساتھ فکری transaction and dialogues کی راہیں بھی ہموار کیں۔ گوئٹے نے اپنی اس کتاب کے کئی عنوانات بدلے لیکن ہر عنوان میں اس نے لفظ 'دیوان' برقرار رکھا، یہ اس کی علمیت اور شخصیت پر حافظؔ کے اثرات کا عکاس ہے۔ اس دیوان میں سو نظمیں ہیں جو جرمن زبان میں لکھی گئی ہیں کہ یہی گوئٹے کی مادری اور تخلیقی زبان تھی۔ گوئٹے کے اس دیوان کو مشرق و مغرب کے ادب کا حسین امتزاج کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں کئی ابواب شامل ہیں اور ہر باب کے لئے فارسی اور جرمن، دونوں زبانوں میں متبادلات دئے گئے ہیں۔ زیرِ مطالعہ نظم 'نغمۂ محمدیؐ' گوئٹے کی شہرۂ آفاق نظم ہے۔ جس نے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ چونکہ گوئٹے کو جرمنی کے قومی شاعر جیسی اہمیت حاصل تھی اور اسے سارے عالم میں بڑی قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لئے اس کی اس نظم نے ایک بڑے طبقے کو اپنے دامِ اثر میں لے لیا۔ اس نظم کے کئی زبانوں میں تراجم ہوئے۔ یہ نظم گوئٹے نے غالباً ۱۷۷۲ یا ۱۷۷۳ میں لکھی تھی جو سب سے پہلے Göttinger Musenalmanach میں ۱۷۷۴ میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں ایک نابغۂ روزگار شخصیت، حضرت محمدؐ کے لئے ایک 'جوئے آب' کی علامت اور استعارہ استعمال کیا گیا ہے جسے دھیرے دھیرے ایک عظیم دریا کی شکل اختیار کرتے دکھایا گیا ہے۔ یہ نظم دراصل آپؐ کی سیرت پر گوئٹے کے ایک غیر

مطبوعہ ڈرامے کا حصہ تھی جسے پلے کرنے کا اس کا ارادہ تھا۔ لیکن وہ ڈرامہ اسٹیج ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، نظم نے ضرور گوئٹے کے اخلاص کو شرفِ قبولیت بخش دیا۔ اور اسے نہ صرف یہ کہ عالمگیر شہرت عطا کر دی بلکہ اگلے وقت میں اسے عموماً مشرق اور خصوصاً اقبالؔ سے نزدیک کر دیا۔

اس معرکہ الآراء نظم کا تنقیدی مطالعہ اہلِ علم کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

نظم کا عنوان Mohamet's Gesang ہے۔ جرمن زبان میں گیسانگ کے معنی ہوتے ہیں نغمہ۔ یعنی نغمۂ محمدی۔

مکمل نظم علامتی شاعری کی بہترین تمثیل ہے۔ اس نظم میں گوئٹے نے نہ صرف رسولِ خُدا کے لئے ایک پہاڑی چشمے کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے بلکہ اس طویل نظم میں جہاں جہاں افراد، گروہوں، جماعتوں اور جدو جہد و کشمکش کے لازمی عوامل کا ذکر آیا ہے، گوئٹے نے علامتوں کے سہارے اپنی بات کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نظم کا پہلا ہی لفظ Felsenquell ہے جس کے معنی ہیں پہاڑی چشمہ۔ دراصل یہ کارنامہ شاعرانہ تخیل پردازی کی اعلیٰ ترین مثال ہے جس کے بارے میں اقبالؔ خود کہتے ہیں۔

> It is not until I had realised the infinitude of Goethe's imagination that I discovered the narrow breadth of my own.
>
> (یہ گوئٹے کے تخیل کی آفاقیت ہی تھی جس کے پیشِ نظر میں اپنے یہاں تھوڑی بہت وسعت دریافت کر پایا۔)

اس نظم میں گوئٹے کے تخیل کی افسوں کاری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ علامتوں کی تجرید کاری کے تجربے سے گزرتا ہے تو ایک ذات (رسولِ اکرم ﷺ کی ذات) کے لئے پہاڑی چشمے کی علامت کا تعین کرتا ہے اور پھر پوری نظم اپنی تمام تر آب وتاب کے ساتھ اس پہاڑی چشمے کی صفات و فیوض، روانی وخروش اور تابندگی و پائندگی کی سراپا تفسیر نظر آتی ہے۔ چونکہ اس نظم کا subject matter ایک آفاقی اور مقدس ہستی ہے اس لئے گوئٹے کی یہ نظم تقدیسی ادب کے زمرے میں شمار کئے جانے کی اہل قرار پاتی ہے۔ یوں بھی جب ہم گوئٹے کے تخلیقی رجحان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم صاف طور پر محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ گوئٹے ہر قسم کے مذہبی اور قومی تعصبات سے نفرت کرتا ہے۔ ان تعصبات کے بجائے ہمیں گوئٹے خالص وجدان اور منطق کی تبلیغ کرنے والا شاعر نظر آتا ہے۔ نغمۂ محمدی ﷺ جب اپنی آب وتاب کے ساتھ آگے بڑھتی ہے تو لفظ و بیان کے جلوے بکھیرتی چلی جاتی ہے۔

گوئٹے اس پہاڑی چشمے سے متعلق اپنے ایقان کا اظہار کرتا ہے اور قاری کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''دیکھو، اس پہاڑی چشمے کی جانب نظر ڈالو، تمہیں نظر آئے گا کہ یہ مسرت سے لبریز ہے، ویسے ہی جیسے بادلوں کے اوپر ستاروں کی روشنی جگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ چشمہ ہے جس کو فرشتوں محافظت اور معاونت حاصل ہے۔ بادلوں سے نیچے یہ چشمہ آسماں سے زمین کی جانب چلا آتا ہے۔ اقبال گوئٹے کے اس خیال کی نمائندگی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

زی بحرِ بے کرانہ ، چہ مستانہ می رَوَد
درِ خود یگانہ، از ہمہ بے گانہ می رَوَد

نظم مزید آگے بڑھتی ہے تو اپنے ممدوح کی مدح سرائی میں یوں گویا ہوتی ہے۔

''یہ چشمہ خوش خرامی کے ساتھ
بادلوں کے اوپر ستاروں کی جگمگاہٹ کی طرح
مقدس روحوں کے زیرِ سایہ
اپنی قوت کے ساتھ
زمین کی جانب اترتا چلا جارہا ہے
پھر یہ چشمہ پہاڑوں کی چوٹیوں کے درمیان سے گزرتا
دوبارہ سوئے آسمان چلا جاتا ہے
اور اپنے ہم جنس وہم نَفَس دیگر چشموں کی
قیادت کرتے ہوئے انہیں آگے
لئے چلا جارہا ہے
وادیوں میں اس کے چلنے سے پھول کِھل اُٹھتے ہیں
اس کی سانسوں کی مہک سے سرسبز زمینوں میں جان آجاتی ہے
کوئی وادیٔ ظلمات اسے روک نہیں سکتی
اور نہ ہی پھولوں سے اس کے استقلال میں خلل واقع ہوتا ہے
بلکہ وہ اس چشمے کا استحسان کرتے ہیں
چھوٹے چھوٹے دیگر چشمے
اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں
اور وہ بے نیازانہ اپنی روشنی اور تابانی سے

زمانے کو روشن کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہتا ہے
کہ ایسے میں پہاڑی نالے اسے آواز لگاتے ہیں
'اے بھائی، اے ہمارے بھائی! ہمیں اپنے ساتھ
اپنے باپ (کے راستے، صراطِ مستقیم کی جانب)
اور بقاء کے بحرِ ذخار (اسلام) کی طرف لے چلو
وہ بحرِ ذخار جو اپنی آغوش وا کئے ہمارا انتظار کر رہا ہے
کیونکہ گرم تپتے ہوئے صحرا میں

سورج کی تپش اور تمازت ہمیں کھائے جا رہی ہے
یہ ہمارا خون چوس لے گی
بھائی! اپنے ہم نفس بھائیوں کو
ان پہاڑوں سے نکال کر اپنے باپ (کے راستے) کی جانب
اپنے ساتھ لے چلو!
(یہ فیض رساں چشمہ) کمالِ وقار کے ساتھ
ان سے کہتا ہے
'آؤ، آؤ تم سب میرے ساتھ، چلو'
اور پھر وہ ان سب کو لئے ہوئے چل پڑتا ہے
شہر ہی نہیں بلکہ ممالک اس کے قدموں میں آ کر جی اٹھتے ہیں
یہ چشمہ مسلسل ومتواتر، بلا تکان، خوش خرامی کے ساتھ
چلا جا رہا ہے
اپنے پیچھے نقوشِ قدم چھوڑتے ہوئے
یہ چشمہ، اٹلاس کی طرح عظیم جہازوں کو
اپنے شانوں پر اُٹھائے ہوئے
چلا جا رہا ہے
ہزاروں کشتیاں اس کی قوت و شوکت، جاہ و حشمت
کی شہادت دیتی ہیں
وہ اپنے بھائیوں، اپنے بچوں اور اپنے اعزاء واقرباء

کو ساتھ لئے
مسرت و شادمانی کی پُر شور لہروں کے درمیان
منتظر دل (آباء و اجداد کے بتائے صراطِ مستقیم)
کی جانب چلا جارہا ہے۔

یہ ہے اس نظم کا لفظی نیز معنوی ترجمہ۔ اگر ہم اصل نظم ابتدا سے پڑھیں تو بہت سی باتیں ڈھیرے ڈھیرے اس نظم کے فنی محاسن کی عقدہ کشائی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ گوئٹے نے اللہ کے رسول ﷺ کو ایک ایسے چشمۂ آب سے تشبیہ دی ہے جو اپنی آب و تاب کے ساتھ جانبِ منزل رواں دواں ہے لیکن محض اتنا کافی نہیں ہے بلکہ یہ چشمہ اپنے ساتھ آنے والے، خود کو ساتھ لینے کی خواہش کرنے والے دیگر چھوٹے چھوٹے چشموں، ندی، نالوں کو بھی ساتھ لئے ہوئے ایک عظیم کارواں کی شکل میں بڑھتا چلا جارہا ہے۔

گوئٹے کی اس نظم کی تخلیق سے تقریباً دو سو برس یعنی دو صدی سے زیادہ عرصے بعد بیسویں صدی کے نصف آخر کے آس پاس ایک غیر مسلم مراٹھی شاعر سریش بھٹ نے نعت کہی جس کا مطلع یوں ہے۔

اُجاڑ، وِیران، واڑ وٹی، کھراڑ نارا جھرا محمد
جگات لیا دین دُکھتانچا، اکھیر چا آسرا محمد

یعنی محمد ﷺ، اُجاڑ اور ویران ریگستان (صحرائے عرب یا اگر وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو کفر اور باطل کو صحرا کہا گیا ہے) میں جھر جھر کرتے (کھراڑ نارا) بہنے والے ایک چشمے (جھرا) کی طرح ہیں۔ دنیا بھر کے (جگات لیا) غریبوں اور ناداروں کے لئے (دین دُکھتانچا) آپ ﷺ آخری سہارا (اکھیر چا آسرا) ہیں۔

یہ سریش بھٹ کی اس مراٹھی نعت کا مطلع ہے جو نہ صرف شعری محاکات میں بلکہ معنوی اعتبار سے بھی گوئٹے کے 'چشمۂ آب' والے استعارے کا تتبع نظر آتا ہے۔ اس بات کے امکانات کم ہیں کہ سریش بھٹ نے گوئٹے کا مطالعہ کیا ہو۔ اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ دنیا کی بیشتر زبانوں کے ادب میں جن جن تخلیق کاروں نے اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے، ان میں سے اکثر کے ذہن میں آپ کے لئے اور آپ کی ذاتِ مقدسہ کی فیض رسانی کے لئے چشمۂ آب ہی کا بلیغ استعارہ آیا ہو اور انہوں نے اپنی تخلیقات میں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کو اسی استعارے سے معنون کیا ہو جیسے ہمیں گوئٹے اور سریش بھٹ کے یہاں نظر آتا ہے۔

گوئٹے کی نظم جب استعارے سے آگے بڑھتی ہے تو ذاتِ محمدی ﷺ کے بیان کی وسعتوں میں

اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

'مقدس روحوں کے زیرِ سایہ' سے مراد براہِ راست 'روح القدس' حضرت جبریلؑ اور ان کے ساتھ ساتھ دیگر تمام فرشتے ہیں جن کی معاونت اللہ کے حکم سے، اللہ کے رسول ﷺ کو حاصل تھی۔ 'اپنے ہم جنس اور ہم نفس دیگر چشمہ ہائے آب کی قیادت کرتے ہوئے انہیں آگے لئے چلا جارہا ہے'۔ یہ چشمۂ آب یعنی ذاتِ محمدی ﷺ کی شان گوئٹے نے بھی بیان کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اپنے ہم نفسوں یعنی اپنی طرح کے نیک طینت انسانوں، جو طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے اسلام کو مطلوب و محبوب تھے اور جنہیں اسلام اور اسلام کے داعی ﷺ سے محبت تھی، ایسے ساتھیوں کی قیادت کرتے ہوئے انہیں آگے، صراطِ مستقیم کی طرف لئے جارہے ہیں۔

'وادیوں میں اس کے چلنے سے پھول کِھل اُٹھتے ہیں'، یعنی اللہ کے رسول ﷺ جہاں کہیں گئے، وہاں اسلام اور ایمان، تقدس اور پاکیزگی کی ضیاپاشیاں ہونے لگیں، پھر چاہے مکہ سے مدینے کی جانب اللہ کے رسول ﷺ کی ہجرت ہو یا پھر اللہ کے رسول ﷺ کی دعوت ہو، نیک نفس لوگوں نے اس عظیم دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اس جگہ ایمان واعتقاد کے پھول کِھلا دئے اور یہ صرف ذاتِ محمدی ﷺ کی برکتوں سے ہی ممکن ہو پایا۔

'ایسے میں پہاڑی نالے اسے آواز لگاتے ہیں
اے بھائی! اے ہمارے بھائی!
ہمیں اپنے ساتھ، اپنے باپ (کے راستے، صراطِ مستقیم کی جانب)
اور بقاء کے بحرِ ذخار (اسلام) کی طرف لے چلو'

یہ اس نظم کا ایک ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ نظم کا یہ حصہ، یہ بیانیہ اللہ کے رسول ﷺ کی بشریت ماورائے بشریت کا مظہر ہے۔ یہاں پہاڑی نالوں کا استعارہ اغلب طور پر ان لوگوں کیلئے استعمال کیا گیا ہے جو بہ نفسہٖ اللہ کے رسول ﷺ کی دعوت سے متاثر ہوکر اس خدشے سے کہ کہیں ہم پیچھے نہ رہ جائیں، آواز لگاتے ہیں کہ اے ہمارے شریف بھائی، ہمارے شریف بھائی کی شریف اولاد، اے محمدِ عربی ﷺ، ہمیں اکیلا نہ چھوڑ دینا۔

بلکہ اپنے اس عظیم سفر میں ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ ہمیں بھی اپنے ساتھ صراطِ مستقیم کی جانب لے چلو ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا کی کثافتیں ہمیں نابود کردیں۔

پھر اس چشمۂ آب کے 'بھائی بند' اپنے اس خدشے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ

'کیونکہ گرم تپتے ہوئے صحرا میں
سورج کی تپش وتمازت ہمیں کھائے جا رہی ہے
یہ ہمارا خون چوس لے گی'

یعنی ہمیں گرم تپتے ہوئے صحرا (یہ صحرا کفر اور باطل کی علامت بھی ہوسکتا ہے اور صحرائے عرب بھی لیکن اس بلیغ استعارے کا اطلاق کفر اور باطل طاقتوں کی بالادستی پر ہی ہوتا ہے) کی تکالیف وزحمتیں ضرر پہنچا رہی ہیں اور کہیں یہ ہمارے ایمان اور عقیدے کے اخلاص کو چوس نہ لے۔

اس وجہ کے بیان کرنے کے بعد دوبارہ یہ گروہ اپنے بھائی سے بصد اصرار درخواست کرتا ہے کہ

'بھائی، اپنے ہم نفس بھائیوں کو
ان پہاڑوں سے نکال کر اپنے باپ (کے راستے) کی جانب
اپنے ساتھ لے چلو!'

اس نظم میں اہلِ عرب کا اپنے بھائی 'محمد ﷺ' سے یہ اصرار کرنا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ صراطِ مستقیم کی جانب لے چلے، دبازتِ معنوی کا حامل ہے۔ اس درخواست کے نتیجے میں، بقول گوئٹے،

'(یہ فیض رساں چشمہ) کمالِ وقار کے ساتھ
ان سے کہتا ہے
آؤ، آؤ، تم سب میرے ساتھ چلو
اور پھر وہ ان سب کو لئے ہوئے چل پڑتا ہے
یہ چشمہ مسلسل ومتواتر، بلاتکان، خوش خرامی کے ساتھ
چلا جارہا ہے'

یہ کیفیت محتاجِ تشریح نہیں ہے اس لئے اس پر کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ لیکن اس نظم کا اختتام نہایت خوبصورت ہوتا ہے۔

'ہزاروں کشتیاں اس کی قوت وشوکت، جاہ وحشمت
کی شہادت دیتی ہیں
وہ اپنے بھائیوں، اپنے بچوں اور اپنے اعزاء واقرباء کو ساتھ لئے
مسرت وشادمانی کی پُرشور لہروں کے درمیان
منتظر دِل (آباء واجداد کے بتائے صراطِ مستقیم)
کی جانب چلا جارہا ہے۔'

اس چشمے کے بھائی، بیٹے، بچے، اعزاء واقرباء دراصل رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے لے کر تا قیامت پیدا ہونے والے اور اسلام کے راستے پر چلنے والے اہلِ ایمان ہیں جن کے اعمالِ صالحہ کی بدولت یہ چشمہ انہیں اپنے ساتھ 'منزلِ شفاعت' تک لے جارہا ہے۔

اگر ہم اس لفظ کو نظم کے عنوان 'نغمۂ محمدی' کے تناظر میں دیکھیں تو سیدھے سبھاؤ یہ بات گوشۂ ادراک میں جانشین ہوجاتی ہے کہ چونکہ یہ نظم گوئٹے نے اللہ کے رسول ﷺ کی شان میں کہی ہے لہٰذا Felsenquell, یعنی پہاڑی چشمہ کی علامت بھی رسول اللہ کے لئے ہی استعمال کی ہے لیکن ہمارے مشہور شارحِ اقبال محترم یوسف سلیم چشتی صاحب 'پیامِ مشرق' کے مقدمے میں فرماتے ہیں، ''اس نظم میں وہ (گوئٹے) اسلام کو ایک اُبلتے ہوئے چشمے سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے: 'اس چشمے کو دیکھو جو ستاروں کی کرنوں کی طرح ہنستا ہوا صاف و شفاف چٹانوں سے نکلا ہے۔' لیکن جب موصوف جب گوئٹے کی اس نظم 'نغمۂ محمدی ﷺ' کے علامہ اقبال کے ذریعے کئے گئے فارسی ترجمے موسوم بہ 'جوئے آب' جو پیامِ مشرق میں شامل ہے، کی تشریح فرماتے ہیں تو کہتے ہیں، 'جوئے آب کنایہ ہے زندگی سے، اور چونکہ اسلام منبعِ حیات ہے اس لئے جوئے آب کنایہ ہے اسلام سے، اور چونکہ اسلام کا وجود موقوف ہے ذاتِ محمدی ﷺ پر، اس لئے جوئے آب کنایہ ہے ذاتِ محمدی ﷺ سے، یعنی یہ تینوں معنی مراد ہوسکتے ہیں۔' جب کہ شارحِ اقبال، موصوف پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب پیامِ مشرق کی اسی شرح کے حاشیے میں لکھتے ہیں کہ

''گوئٹے نے اس ڈرامے کی تمہید میں لکھا ہے کہ 'میں نے یہ نظم اس لئے لکھی تھی کہ آنحضرت ﷺ کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے جب کہ وہ کامیابی کے لحاظ سے مرتبۂ کمال پر تھے، ان کے رفیقِ کار حضرت علیؓ ان کی شان میں پڑھ کر سنائیں۔' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گوئٹے آنحضرت ﷺ کی پیغمبرانہ شان سے اور اس کامیابی سے جو آپ ﷺ کو اپنے مقصد میں حاصل ہوئی، بہت متاثر تھا۔''

اگر ایک مستند شارحِ اقبال کسی نظم کے نفسِ مضمون کے عنوان میں جلوہ افروز subject کا تعین نہ کرپائے تو ایک عام قاری یا ادب سے عام دلچسپی رکھنے والا طالبِ علم کس طرح اس کی اصل تک پہنچ پائے گا؟ اگر بالفرضِ محال، نظم کے بیانیہ اسلوب کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جائے تو کیا محض اسی اسلوب کو اس امر کی دلالت کے لئے کافی سمجھ لیا جائے کہ Felsenquell کا جو استعارہ گوئٹے نے استعمال کیا ہے، اس کا اطلاق اسلام، زندگی اور ذاتِ محمدی ﷺ، تینوں پر ہوسکتا ہے؟ حالانکہ موصوف اس سے قبل ہی حتمی طور پر فرما چکے ہیں کہ: اس نظم میں وہ (گوئٹے) اسلام کو ایک اُبلتے ہوئے چشمے سے تعبیر کرتے ہوئے کہتا ہے: 'اس چشمے کو دیکھو جو ستاروں کی کرنوں کی طرح ہنستا ہوا صاف و شفاف چٹانوں سے نکلا

ہے۔' تو پھر نظم کی تشریح کے دوران 'جوئے آب' کے تین مرادی معنی اخذ کر کے ایک نیا ابہام پیدا کرنا چہ معنی دارد؟ اب اسی کتاب یعنی پیامِ مشرق کی شرح میں اس نظم کے ابتدائی بند کی تشریح چشتی صاحب مرحوم نے بعینہٖ ویسی ہی کی ہے جیسا انہوں نے موضوعِ نظم کے تعین کے وقت کیا تھا۔ یعنی انہوں نے اسلام کو ہی اس نظم کا موضوع مانا ہے اور اس نظم کی تشریح اسی لحاظ سے کی ہے۔ نظم کے لفظی ترجمے کے تحت لکھتے ہیں۔

''ذرا اس آبجو پر نظر کرو، جو ستارے کی طرح درخشاں ہے۔ فضائے آسمانی کی مہربان روحوں نے، اس کے عہدِ طفولیت میں، کوہستان میں اس کی پرورش کی۔ بادلوں سے تروتازہ حالت میں آتی ہے اور سفید چٹانوں پر رقص کرتی ہے۔ اور خوشی کے عالم میں آسمان کی طرف جست کرتی ہے۔''

یہاں صاف دکھائی دیتا ہے کہ شارحِ موصوف نے دانستہ کوشش کی ہے کہ اپنی فہم کے مطابق گوئٹے کی متعین کردہ موضوعِ نظم کو magnify کر کے اسے 'اسلام' سے معنون کیا جائے۔ حالانکہ موصوف کی یہ کوشش مبنی بر اخلاص ہے لیکن ہم ادبی لحاظ سے اس درجہ تصرف سے کام نہیں لے سکتے کہ ترجمہ یا تشریح کرتے ہوئے کسی نظم کا موضوع یا تو تبدیل کر دیں یا اس سے متعلق ابہام پیدا کر دیں۔

بہرحال، اگر ہم اس بات سے پہلوتہی بھی کر جائیں تو واضح طور پر دو باتیں ہماری توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی ہیں۔ اولاً یہ کہ گوئٹے کی اصل نظم کا عنوان 'نغمۂ محمدی ﷺ' ہے جس سے ہمیں فی الوقت بحث مطلوب ہے۔ اگر اس نظم کا عنوان گوئٹے نے 'Mohamet's Gesang' رکھا تھا تو ہمارے ذہن میں ایک بنیادی تاثر تو یہی اُبھرتا ہے کہ پوری نظم حضرت محمد ﷺ کی ذات کا احاطہ کرتی ہوگی۔ اگر گوئٹے کے دماغ میں 'اسلام' سے متعلق یہ تمام باتیں ہوتیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس نظم کا عنوان 'نغمۂ اسلام' یعنی Islam's Gesang رکھتا نہ کہ نغمۂ محمدی ﷺ۔

ثانیاً یہ کہ جب اقبالؒ نے اس نظم کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس کا عنوان 'نغمۂ محمدی ﷺ' نہ رکھتے ہوئے 'جوئے آب' رکھا تو اچانک اس کے مرادی معنی کیسے تبدیل ہو سکتے ہیں؟ لہٰذا یہ ماننا کہ نظم کی تخلیق کے دوران گوئٹے کے ذہن میں بھی یہی تینوں مرادی مفاہیم روشن ہوں گے، کسی طور مناسب نہیں لگتا۔ البتہ یہاں ایک گنجائش ضرور پیدا ہو سکتی ہے۔ چونکہ گوئٹے کی یہ نظم مکمل طور پر تشبیہ و استعارہ، رمز و کنایہ اور علاماتی شاعری کی بہترین تمثیل ہے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نظم کی معنوی وسعت کے پیشِ نظر ہو سکتا ہے ان تینوں مرادی مفاہیم کو قبول کرنے کی سبیل نکل آئے۔ لیکن اگر ہم ان تینوں مرادی مفاہیم کو قبول کر لیتے ہیں تب کیا زندگی، اسلام اور ذاتِ محمدی ﷺ، ایک ہی زمرے میں لئے جا سکتے ہیں؟ زندگی، کائنات کا ایک لازمی عنصر ہے جب کہ اسلام معاشرتی طرزِ عمل کا ضابطہ اور حضرت محمد ﷺ ایک ذات

اور ایک شخصیت ہیں۔ دراصل گوئٹے کی فکر آفاقی فکر تھی، اس لئے اس نے جب یہ نظم تحریر کی، تو اپنی تمام تر شاعرانہ صلاحیت حضرت محمد ﷺ کی ذات کو آفاقی تمثیلات و استعارات و کنایات سے مرصع کرنے میں نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کی۔ Felsenquell یعنی پہاڑی چشمے کا بلیغ استعارہ خود گوئٹے کی اس شعری صلاحیت کی عمدگی کی غمازی کرتا ہے۔ اس امر کی دلیل میں خود اقبال کہتے ہیں۔ ' In contrast to Shakespeare who as a "realist Englishman," rethinks the individual, Goethe as "the idealist German" rethinks the universal. (یعنی شیکسپئر ایک حقیقت پسند انگریز ہونے کے ناطے انفرادیت کے بارے میں سوچتا ہے جب کہ گوئٹے ایک نظریہ پسند جرمن ہونے کے ناطے آفاقیت پر فکر و تدبر کرتا ہے۔)

جب نظم اپنے عنوان سے آگے بڑھتی ہے تو گوئٹے کہتا ہے Freudehell جس کے معنی ہیں joyfully اس کا ترجمہ لیسلی نورس نے یوں کیا ہے۔ sparkle with joy، اسی کا ترجمہ علامہ اقبال نے فارسی میں یوں کیا ہے چہ مستانہ می رَوَد' لیکن شان الحق حقی نے اس کا کوئی ترجمہ نہیں کیا ہے۔ چونکہ ہم اصل نظم کو پیشِ نظر رکھے ہوئے ہیں اس لئے ہمیں اسی سے بحث ہے، اس کے تراجم سے نہیں۔ تراجم کا ذکر تو ہم بطورِ خصوصی حوالہ کررہے ہیں۔ لہٰذا اگر گوئٹے نے لفظ Freudehell استعمال کیا ہے تو پھر یہ اسلام کے لئے نہیں ہوسکتا کیوں کہ اسلام کا joyful ہونا یا پھر sparkle with joy کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اگر ہم تجسیم کاری personification کی بات کریں تو کسی نظریۂ حیات یا ضابطۂ حیات کو کسی طور بھی personify کرنے کی مثال معروف نہیں ہے۔ ہاں، بے جان اشیاء کی تجسیم کاری معروف و معلوم ہے لیکن کسی خیال، کسی نظریے کو یوں انسانی اوصاف سے متصف کر کے اسے مجسم کرنا ہمارے نزدیک نہایت غیر معروف ہے۔

چونکہ علامات، تشبیہات و استعارات اور رمز و کنایوں سے شاعری میں ابہام پیدا ہونا فطری امر ہے نیز چونکہ گوئٹے کی یہ نظم تشبیہات و استعارات، تمثیلات، علامات اور رزم و کنایوں سے بھرپور ہے لہٰذا اس میں فطری طور پر subject matter کے لئے ابہام کا پیدا ہونا کوئی نئی بات نہیں۔

مثلاً جب گوئٹے کہتا ہے

Wie ein sterne en blick
Uber wolken

تو اس میں ایسے استعارات استعمال ہوتے دکھائی دیتے ہیں جن سے یہ تاثر زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے کہ گوئٹے دراصل اسلام کی بات کررہا ہے۔

Wie ein sterne en blick

یعنی ستاروں کی روشنی کی طرح، اقبال نے اسے اپنے فارسی ترجمہ میں 'مانندِ کہکشاں' باندھا ہے اور لیسلی نورس نے بھی اسے Like the light of stars Uber wolken باندھا ہے۔

یعنی بادلوں کے اوپر۔

لیکن اس کے اگلے ہی مصرعے ہمارے اس خیال کی نفی کر دیتے ہیں۔

Gute Giester

Zwischen klippen im Gebusch

پہلے مصرعے میں لفظ Giester کے معنی ہیں روحیں، پاکیزہ روحیں، جس سے مراد ہے ملائکہ۔ اور اگلے مصرعے کے معنی ہیں 'اس کی راہوں کو تازگی بخشی'۔ اس کا نہایت خوبصورت ترجمہ شمّی صاحب نے کیا ہے:

پُر افشاں ملائک کی چشمِ نگہدار کے سائے سائے

یہی دراصل اہم نکتہ ہے کہ کیا اسلام ایسا دین ہے جو فرشتوں کی نگہداشت کا مکلف و مرہون ہو؟ فرشتے تو پیامِ الٰہی کی ترسیل و ابلاغ کے محض agents ہیں۔ ہاں، البتہ اللہ نے اپنے رسول کی محافظت و معاونت کے لئے فرشتوں کو متعین کر رکھا تھا۔ لہٰذا اگر 'ملائک کی چشمِ نگہدار کے سائے سائے' کوئی ذات پروان چڑھی ہو سکتی ہے تو وہ ہے ذاتِ محمدی ﷺ۔ اللہ کے رسول ﷺ کو بچپن ہی میں فرشتوں کا پہاڑی پر لے جا کر آپ کے دل سے دنیاوی آلائشوں کو صاف کرنا اور پھر وقتاً فوقتاً اللہ کے نبی کی محافظت کے لئے معجزات کی شکل میں فرشتوں کا آتے رہنا یہاں تک کہ آفتابِ رسالت کے طلوع اور اسلام کے اعلان کا لمحۂ بابرکت آن پہنچا۔ یہ واقعات تاریخ کا روشن ترین باب ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نظم میں ہمیں جا بجا ایسے شواہد دستیاب ہوتے ہیں جو واضح طور پر اس امر پر دال ہیں کہ نغمۂ محمدی ﷺ کا موضوع ذاتِ محمد ﷺ ہے۔

ہم پھر کہہ رہے ہیں کہ ہم تراجم کی بات نہیں کرتے بلکہ براہِ راست اصل نظم سے حوالے حاصل کرتے ہیں تاکہ موضوعِ نظم 'نغمۂ محمدی ﷺ' میں قطعیت آ جائے۔

اس نظم میں گوئٹے ایک جگہ کہتا ہے

Und die Bache von den Bergen
Jauchzen ihm und rufen: Bruder!
Bruder, mimm die Bruder mit
Mit zu deinem alten Vater
Zu dem ewgen Ozean
Der mit ausgespannten Armen
Unser wartet

ترجمہ: پہاڑی ندی نالے پُرشور طریقے سے اس چشمے کو پکارتے ہوئے کہتے ہیں، 'بھائی، بھائی، ہمیں اپنے ساتھ لے چلئے۔ ہمیں اپنے قدیم باپ (یہاں مراد حضرتِ آدم یا حضرت ابراہیم بھی ہو سکتے ہیں) کی طرف لے چلئے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والے سمندر کی طرف۔'

اس جگہ جرمن زبان میں لفظ 'بروڈر' کے معنی بھائی ہیں۔ اور اسی جگہ یہ لفظ دو جگہ آیا ہے۔ مزید یہ کہ چوتھے مصرعے میں لفظ 'واٹیر' یا 'واٹر' آیا ہے جس کے معنی ہیں باپ۔ واضح طور پر بھائی کے تخاطب کا اختصاص بنی نوع انسان کے لئے ہے نہ کہ اسلام کے لئے، اور یہی امر انتہائی قریب القیاس بھی ہے۔ یوں بھی اہلِ عرب اور اہلِ قریش اللہ کے رسول ﷺ کو 'شریف بھائی' کہتے تھے۔ لہٰذا اہلِ قریش (یعنی نظم میں بیان کردہ ندی اور نالے) اللہ کے رسول ﷺ (یعنی پہاڑی چشمہ) کو بھائی کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں اور منت سماجت کر رہے ہیں کہ ہمیں جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر اپنے 'باپ' کے مذہب کی طرف لے چلئے۔ باپ سے واضح طور پر مراد ہے حضرت آدم یا پھر حضرت ابراہیم۔ اور دونوں حضرات کے ناموں کے حوالوں کو درست مان لیا جائے تب بھی لفظ 'باپ' کی معنویت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پانچویں مصرعے میں جو لفظ Ozean استعمال کیا گیا ہے تو اس کے معنی ہیں سمندر، بحر، اور یہ بحر اسلام ہے۔ اور بقیہ دو مصرعوں میں اس بحر کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ یہ بحر، یہ سمندر اپنی وا آغوش کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اردو والوں نے بنیادی طور پر گوئٹے کی اس اصل نظم کو ملحوظ نہیں رکھا اور تمام تر تراجم کے لئے اقبال کے ذریعے کئے گئے اس نظم کے آزاد ترجمہ کو مرجع العام بنا دیا۔ 'بھائی یا برادر' کے تخاطب والی بات سے اہلِ علم و زبان کی عدم واقفیت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ اقبال نے 'جوئے آب' کے عنوان سے اس نظم کا آزاد ترجمہ کیا ہے اور چونکہ یہ ترجمہ لفظی ترجمہ نہیں ہے اس لئے اقبال نے یا تو کسی مصلحت کے تحت یا پھر معنوی وسعت کو دھیان میں رکھتے ہوئے 'بھائی یا برادر' کے تخاطب کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اور پھر گوئٹے کی اس نظم پر جن معدودے چند لوگوں نے قلم اٹھایا، انہوں نے بھی اقبال کے ترجمہ کو ہی پیشِ نظر رکھا جس کی وجہ سے یہ اہم پہلو پسِ پشت چلا گیا۔ یوسف سلیم چشتی صاحب نے بھی غالباً یہی کیا۔ انہوں نے بھی اقبال کی نظم 'جوئے آب' کی شرح تحریر کی، گوئٹے کی اصل نظم کی نہیں، اسی لئے انہوں نے 'جوئے آب' کے مطالعے سے جو تاثر حاصل کیا، اسی کی شرح تحریر کر دی۔ اس معنوی ابہام کا اصل سبب یہی معلوم ہوتا ہے۔

نظم کی اگلے چند مصرعے ہمارے اس خیال کی بھرپور معاونت اور تائید کرتے ہیں۔

Gierger Sand: die Sonne droben
Saugt an unserm Blut; ein Hugel
Hemmet uns zum Teiche! Bruder,

Nimm die Bruder von der Ebne,
Nimm die Bruder von den Bergen
Mit, zu deinem Vater mit

ترجمہ: ہمارے سروں پر چلچلاتا سورج ہمارا خون چوس لے گا۔ یہی پہاڑی ہمیں ایک چشمے کی طرف لے جاتی ہے، ہمارے بھائی! تم اپنے بھائیوں کو اپنے ساتھ لے چلو۔ ان پہاڑوں سے اپنے بھائیوں کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے چلو، اپنے 'باپ' کی جانب۔

'باپ کی جانب' سے مراد اپنے آباء واجداد کے بتائے ہوئے سراطِ مستقیم کی جانب بھی ہوسکتے ہیں۔ اور یہی مرادی مفہوم درست ترین معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پھر وہی تجسیم کاری والے الفاظ دوہرائے گئے ہیں۔ Bruder یعنی بھائی اور Vater یعنی باپ۔ کیا اب بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ بھائی سے مراد اسلام ہے؟ یا پھر 'بھائی' سے مُرادحیاتِ انسانی ہے جیسا کہ فاضل شارح جناب چشتی صاحب مرحوم نے کہا ہے؟

گوئٹے نے اپنے اسلوب کو اس نظم میں از ابتداء تا انتہا برقرار رکھا ہے۔ جب نظم اختتام پذیر ہوتی ہے تو اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں گوئٹے یوں کہتا ہے۔

Zedern häuser trägt der Atlas
Auf den Riesen schultern; sausend
Wehen über seinem Haupte
Tausend Flaggen durch die Lüfte,
Zeugen seiner Herrlichkeit.
Und so trägt er seine Brüder,
Seine Schätze, seine Kinder
Dem erwartenden Erzeuger
Freude brausend an das Herz.

پہلے مصرعے میں گوئٹے، اللہ کے رسول ﷺ کو یونانی دیومالائی داستان کے کردار اٹلاس سے تشبیہ دیتا ہے۔ یونانی دیومالا میں بیان کیا جاتا ہے کہ اٹلاس نے دنیا کو اپنے شانوں پر اٹھا رکھا ہے۔ گوئٹے کہتا ہے کہ اٹلاس کی طرح محمد ﷺ نے بھی بڑے بڑے جہازوں کو اپنے شانوں (Riesen shultern) پر اُٹھالیا۔ ہزاروں سیٹیاں بجاتی ہوئی کشتیاں محمد ﷺ کی شان وشوکت اور جاہ وحشمت (Herrlichkeit) کی شہادت (Zeugen) کے لئے آواز لگاتی ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے خوشی، مسرت اور شادمانی کی پُرشور لہروں کے درمیان اپنے بھائیوں (Bruder)، اپنے بچوں (KInder) اور اپنے زیرِ سرپرستی اعزاء واقرباء (schatze) کو اپنے ساتھ لے لیا اور (اپنے باپ کے) منتظر دل

(brausend an das Herz) کی طرف چل پڑے۔ بالکل یہی محاکاتی بیانیہ اسلوب گوئٹے کی دوسری نظم 'خلد نامہ' میں بھی ملتا ہے۔ اس نظم میں 'حوری' کے عنوان کے تحت گوئٹے دوسرے بند میں کہتا ہے

Denn, siehst du, wie die Glaubigen kamen,
Von dem Propheten so wohl empfohlen,
Besitz vom Paradiese nahmen,
Da waren wir, wie er befohlen,
So liebens wurdig, so scharmant,
Wie uns die Engel selbst nicht gekannt.

(یعنی تم دیکھتے ہو (siehst) کہ سفارش کردہ (empfohlen) مومنین (Glaubigen) جوق در جوق اپنے پیغمبر (propheten) محمد ﷺ کے قریں آن موجود (kamen) ہوئے۔ پھر وہ تمام جنت (paradiese) پر قابض (besitz) ہوگئے۔ پھر ان ہی سفارش کردہ لوگوں میں ہم بھی شامل تھے جو اس وقت نہایت لائقِ محبت (liebens) باوقار (wurdig) اور دلکش (scharmant) تھے۔ کسی فرشتے (Engel) نے بھی ہمیں اس سے قبل اتنا خوش تصور نہیں (nicht gekannt) کیا ہوگا۔)

یعنی اس نظم میں بھی گوئٹے نے وہی منظر بیان کیا ہے جو اس نے 'نغمۂ محمدی ﷺ' کے بند میں دکھایا ہے۔ یہاں اپنے پیمبر ﷺ کے سفارش کردہ مومنین کے جوق در جوق اپنے نبی ﷺ کے قریں آن موجود ہونے کی بات کہی گئی ہے، اس میں جو محاکاتی عناصر ہیں، وہ ہو بہو وہی ہیں جن کی بازیافت ہمیں 'نغمۂ محمدی ﷺ' میں ہوتی ہے، جہاں دیگر تمام چشمے 'چشمۂ آب' کو 'بھائی' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور اپنے اس 'بھائی' سے اصرار کرتے ہیں کہ وہ انہیں اپنے ساتھ صراطِ مستقیم کی جانب لے چلے۔ جب 'نغمۂ محمدی ﷺ' اپنے اختتام تک پہنچتی ہے تو آخر میں یہ 'برادر' اپنے دیگر ہم نفس بھائیوں کو اپنے ساتھ سراطِ مستقیم کی جانب بحفاظت لے جاتا ہے۔ گوئٹے کی نظم 'خلد نامہ' اسی خیال کی توسیع sequel یا اگلی کڑی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی 'خلد نامہ' کا یہ بند، نغمۂ محمدی ﷺ کا تکملہ معلوم ہوتا ہے۔ منطقی طور پر جب کوئی انسان نیک صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جاتا ہے تو انجامِ کار، اسے 'شفاعت' نصیب ہوتی ہے اور وہ 'جنت' کا اور اپنے پیغمبر ﷺ کی مصاحبت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ 'خلد نامہ' کا مذکورہ بالا بند 'نغمۂ محمدی ﷺ' میں بیان کردہ 'دیگر چھوٹے ندی نالوں اور پہاڑی چشموں کے درخواست اور 'چشمۂ آب' کے ذریعے اس درخواست کی قبولیت کا منظر نامہ واضح کرتا ہے اور 'خلد نامہ' کے بند اس صراطِ مستقیم پر چلنے والے مومنین کو اس چشمۂ آب یعنی رسول اللہ ﷺ کی 'سفارش' اور 'حصولِ جنت' کا پیش منظر بتاتا ہے۔ 'خلد نامہ' کے اس بند کو یہاں بطور حوالہ نقل کرنے کے پسِ پُشت یہی مقصد ہے کہ 'نغمۂ محمدی ﷺ' کا عنوان 'چشمۂ

آب' کا استعارہ دراصل نہ اسلام ہے اور نہ ہی حیاتِ انسانی، بلکہ اس عظیم تخلیق کا استعارہ 'ذاتِ محمدی ﷺ' کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

اب تک ترجمہ در ترجمہ کا عمل تو قابلِ فہم ہے لیکن ترجمہ در ترجمہ کی شرح کے دوران اصل تخلیق کے متن کو یکسر نظرانداز کر دینے سے اصل تخلیق کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ گوئٹے کی اس نظم کے بارے میں اردو میں جتنا بھی کام ہوا ہے، اس کے ضمن میں یہی کچھ ہوا ہے یعنی اس کی اصل روح مضروب ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ چاہے اقبال کا ترجمہ 'جوئے آب' ہو، چاہے شان الحق حقی کا ترجمہ ہو یا کسی اور کا، اکثر نے اصل تخلیق سے زیادہ اپنے فنِ ترجمہ نگاری کو چمکانے اور اپنے اس فن کی صیقل گری میں سارا زورِ بیان صرف کر دیا۔ ان حضرات نے گوئٹے کی نظم کے آخری بند کے اہم عناصر سے صرفِ نظر کرنا کیوں مناسب سمجھا، یہ بات بعید از فہم ہے۔ پھر ان حضرات نے 'برادر' اور 'باپ' جیسے نظم کے لازمی محاکاتی عناصر کے ترجمے اور ذکر سے کیوں اجتناب برتا، یہ بات بھی سمجھ سے پَرے ہے۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے الفاظ سے زیادہ معنی کو اہمیت دی جاتی ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ اخذ کیا جانا چاہیے کہ اصل نظم میں موجود الفاظ کو یکسر حذف کر دیا جائے؟ اگر ایسا ہو تو پھر اصل نظم کی وقعت ہی کیا رہ جائے گی؟

منابع:

۱۔ پیامِ مشرق: علامہ اقبال۔ اقبال اکیڈمی۔ پاکستان۔

۲۔ قندِ پارسی۔ رایزنی فرہنگی جمہوری اسلامی ایران۔ نئی دہلی۔ شمارہ۔ ۹۱۔ ستمبر۔ دسمبر ۲۰۰۲۔

۳۔ John Wolfgong von Goethe, Samtliche Werke, Bd.3, Zurich, Munchen 1977

۴۔ Oxford Companion to German literature.

۵۔ Wikisource.

۶۔ A Leslie Norris Translation of Selected Poems by Johann Wolfgang von Goethe : Leslie Norris and Alan F. Keele

۷۔ Yearbook of the Goethe Society of India, 1999-2000, S. 184-201.

۸۔ <http://www.goethezeitportal.de/db/wiss/goethe/bhatti_iqbal.pdf>

۹۔ Annemarie Schimmel, Gabriel's Wing. A Study into the Religious Ideas of Sir Mohammad Iqbal.

۱۰۔ Anil Bhatti: Iqbal and Goethe. J.N.U. New Delhi.

۱۱۔ Stry Reflections : Allama Iqbal's notebook , Iqbal Academy, Lahore. 1992

۱۲۔ Essays In The Social History Of Modern India; Ravinder Kumar, Delhi. 1983

☆☆☆

شاہ اجمل فاروق ندوی، نئی دہلی

نعت اور روحِ عصر

ABSTRACT: Zeitgeist reflects in devotional poetry has been discussed in this article. It is felt that either Zeitgeist is ignored in most of creative experiences in devotional poetry or expressed without forming part of actual Natiya voice. Some examples of appropriate couplets have also been cited to denote requisites of poetry containing contemporary sensibility under Zeitgeist's influence.

نعت کا محور و مرکز اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔اس بات میں نہ کسی کو کوئی اختلاف ہوا اور نہ ہوسکتا ہے۔البتہ نعت سے متعلق کئی موضوعات ایسے ہیں، جن کے سلسلے میں یا تو سیر حاصل گفتگو ہی نہیں ہوئی اور اگر ہوئی تو اب تک کوئی نتیجہ خیز چیز سامنے نہیں آ سکی۔ان میں سے ایک اہم موضوع نعت اور روحِ عصر کا ہے۔کیا نعت میں روحِ عصر کی گنجائش پائی جاتی ہے؟ کیا نعت کے کینوس کو اتنی وسعت دی جانی چاہیے کہ اس میں روح عصر کی گنجائش پیدا ہو جائے؟ اس سلسلے میں ایک رویہ نفی کا ہے اور ایک اثبات کا۔جو لوگ نعت کو صرف رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی اور اس سے وابستہ چیزوں سے اظہارِ محبت کا ذریعہ سمجھتے ہیں، وہ نعت میں روح عصر کی آمیزش کو قطعاً نامناسب اور غلط سمجھتے ہیں۔اُن کا ماننا ہے کہ نعت میں صرف محبت اور اظہارِ محبت ہونا چاہیے۔عصری مسائل کا عنصر شامل ہوا، تو نعت کا تقدس مجروح ہوگا اور نعت نعت نہ رہے گی۔اردو نعت کے موجود ذخیرے کا اکثر حصہ اسی اساس پر قائم ہے۔دوسرے رویے کے حامل افراد کا کہنا ہے کہ نعت میں روح عصر کی گنجائش ضرور رکھنی چاہیے۔عشق و محبت کے ساتھ عصری مسائل اور ان کے حل کا عنصر بھی شامل کرنا چاہیے۔اس نظریے کی بنیاد پر وجود میں آنے والا نعتیہ ذخیرہ بہت محدود ہے۔اتنا طے ہے کہ اِن دونوں نظریات کے حامل نعت گو اپنے رویوں میں نہایت مخلص اور اپنی آرا میں نعت کے لیے انتہائی وفادار نظر آتے ہیں۔دونوں نعت کے بقا و ارتقا کے لیے سچے جذبات اور سنجیدہ طرزِ عمل کے حامل ہیں۔اس لیے دونوں نظریوں کے حامل نعت گو شعراء اور ان کے شعری ذخیرے کو پلکوں پہ سجانا ضروری ہے۔البتہ کسی ایک سے اختلاف کی گنجائش بہ ہر حال باقی رہتی ہے۔

جب ہم نعت میں روحِ عصر کے مسئلے پر غور کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں ہم سے دو کوتاہیاں ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس پر سنجیدگی سے غور وخوض نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ اس مسئلے کے متعلق پائے جانے والے دونوں نظریات کے حامل شعراء نے عام طور پر افراط یا تفریط کا مظاہرہ کیا ہے۔ اعتدال و سنجیدگی کے ساتھ مسئلے کی حساسیت کا ادراک کر کے ایک درمیانی رویہ اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جو لوگ نعت کو صرف ذات رسالت مآب علیہ الصلاۃ والسلام سے محبت اور اظہار محبت کے لیے خاص کرتے ہیں، انھوں نے عام طور پر یہ کوشش ہی نہیں کی کہ زمانے کی ضرورت کے مطابق انسانیت کو تعلیمات نبوی سے واقف کرایا جائے۔ ان کے پیش نظر صرف آقائے نام دار کی ذات بابرکات، آقا کا مبارک حلیہ، آپ کا پاک شہر اور زیادہ سے زیادہ آپ کی سیرت کے کچھ واقعات رہے۔ تعلیمات کا پہلو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا۔ دوسری روش اس کے بالکل برعکس پائی جاتی ہے۔ یہاں سرور کائنات کے اخلاق حسنہ، اسوۂ مبارکہ اور پاک تعلیمات کو پیش کرنے پر پوری توجہ دی گئی۔ ذات رسالت مآب سے عشق ومحبت کے اظہار کا پہلو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ ان دونوں رویوں پر اصرار کرنے اور ایک درمیانی رویے کو اختیار نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا پورا نعتیہ ذخیرہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک حصہ ذات کا اور دوسرا تعلیمات کا۔ دونوں کو جمع کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ دونوں رویوں کے حامل شعراء اپنے اپنے نظریے پر حد سے زیادہ اصرار کرنے لگے اور دوسرے نظریے کے حامل شعراء کو غیر حقیقی نعت گو سمجھنے لگے۔ یہ خلیج اتنی بڑھی کہ ایسی نعتیہ شاعری وجود میں آنے لگی، جس سے نہ تو ذات نبوی سے اظہار محبت ہوتا ہے اور نہ تعلیمات نبوی کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیے:

سنبل پیچاں گیسوئے پر خم صلی اللہ علیہ وسلم　　عاشق رب معشوق دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
حمید و احمد و محمود تم ہو یا رسول اللہ　　سعید و اسعد و مسعود تم ہو یا رسول اللہ

مدینہ　مدینہ　مدینہ　مدینہ
دکھا دے دکھا دے دکھا دے خدایا

ان تینوں اشعار میں نہ تو حضور سے عشق وفدائیت کا تذکرہ ہے اور نہ آقا کی شخصیت کے متعلق کوئی ایسی بات کہی گئی ہے جس کو پڑھ کر قاری جھوم جائے اور حضورؐ کی ذات گرامی سے محبت کرنے لگے۔ تینوں شعروں میں ایسی باتیں ہیں جو ایک کم عمر مسلمان بچہ بھی بیان کر سکتا ہے۔ اگر ذرا سا فطری شعری ذوق ہو تو اس طرح کے اشعار بہت معمولی تعلیم یافتہ مسلمان بھی نظم کر سکتا ہے۔ ہماری اردو نعتیہ شاعری میں اس طرح کے اشعار لاتعداد پائے جاتے ہیں۔ بہت عام سی بات اور بغیر کسی اہم اور پر کیف

مضمون کے بروزن مصرعے۔ ہم اس طرح کی شاعری کو ذخیرۂ نعت سے خارج تو نہیں کر سکتے، لیکن انھیں اردو نعت کے مؤثر نمونوں کے طور پر پیش بھی نہیں کر سکتے۔

اس کے برعکس دوسرے نظریے کے حامل شعراء ہیں۔ ان کے ہاں تعلیم نبوی اس قدر حاوی ہو جاتی ہے کہ ذات نبوی کا پتہ ہی نہیں چلتا، بل کہ بسا اوقات تو نعت نعت ہی نہیں رہتی۔ مثال کے طور پر چند اشعار دیکھیے:

دل میرا خوف مرگ سے مطلق ہے بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنت رسول کی

اس شعر میں واحد متکلم غالب ہے۔ اس نے اپنا کمال بتایا ہے۔ دوسرے مصرعے میں موت کو سنتِ رسول کہہ کر بات بنانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن یہ بھی محل نظر ہے۔

ایک فاضل نعت گو کی نعت کا مطلع اور پہلا شعر دیکھیے:

حق ساگر میں جب بھی انکی   پھوٹ گئی باطل کی مٹکی
اونچا ہوا، جب دین کا پرچم   اہلِ زمانہ نے کھٹ پٹ کی

ایک مشہور شاعر کی نعت کا مطلع ہے:

میسر ہو اگر ایمان کامل
کہاں کی الجھنیں کیسے مسائل

ان اشعار میں یہ بات مشترک ہے کہ شاعر نے تعلیمات نبوی کو پیش کرنے کے چکر میں ذات نبوی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ بل کہ ان اشعار کو اگر نعتوں سے الگ کر کے پڑھا جائے تو ان کے نعت ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ہیں نعت کے ہی اشعار۔

سوال یہ ہے کہ کیا اردو نعت کے مقدر میں افراط و تفریط کے یہ دو رویے ہی رہ گئے ہیں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر کے ایک درمیانی راستہ نکال لیا جائے؟ کیا نعت میں ذات اور تعلیمات کو جمع نہیں کیا جا سکتا؟ ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہم نعت کو ایک دل آویز رنگ و آہنگ سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایسا نہ کر کے ہم نعت کے مخالفین کو یہ کہنے کا موقع فراہم کر دیتے ہیں کہ نعت انسانیت کے لیے غیر مفید اور غیر نافع چیز ہے۔ اس کی افادیت صرف ان لوگوں تک محدود ہے، جو رسول کریم ﷺ سے محبت رکھتے ہیں۔ گویا نعت ایک بہت محدود شعری موضوع سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

جب ہم اس مسئلے پر اصولی انداز سے غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک حقیقی نعت گو

کو اپنے مرکزی موضوع کی وجہ سے ان دونوں رویوں کے درمیان کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ جب اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ نعت کا مرکزی موضوع اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں اور حضور کی ذات اور تعلیمات دو لازم وملزوم چیزیں ہیں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اس مرکزی موضوع کے متعلق شعر کہنے بیٹھیں تو دو لازم وملزوم چیزوں میں سے ایک کو ہی پکڑ کر رہ جائیں؟ ایک کو اختیار کرلیں اور دوسری کو یکسر نظر انداز کردیں؟ کوئی سمجھ دار مسلمان اس رویے کو درست نہیں کہہ سکتا۔ رسول کریم ﷺ کی احادیث مبارک سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے آپ کی ذات سے محبت بھی فرض ہے اور آپ کی تعلیمات کا اتباع بھی لازمی ہے۔ کسی ایک کو پکڑنے اور دوسرے کو نظر انداز کردینے سے کام نہیں چل سکتا۔ شعراءِ رسول کی نعتیں ملاحظہ کیجیے تو دونوں گوشے بہت ابھرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بھی پیارے نبی کا ذکر دونوں طرح سے کیا ہے۔ آقا کی ذات گرامی کا دل کش بیان بھی ہے اور آپ کی تعلیمات کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم بھی۔ برا ہو مسلکی اور فکری گروہ بندیوں کا، جن کی وجہ سے ہمارے ہاں زندگی کے دوسرے گوشوں کے ساتھ ادبی گوشہ بھی متاثر ہوگیا اور ہم نے نعت کو بھی دو خانوں میں بانٹ کر رکھ دیا۔

قرآن حکیم، احادیث نبوی اور شعرائے رسول کے مبارک رویوں کی روشنی میں جب یہ بات واضح ہوگئی کہ نعت کے موضوع کے لحاظ سے اردو نعت میں پایا جانے والا افراط وتفریط کا رویہ قطعاً نامناسب ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان دونوں کو جمع کرنے کی کیا شکل ہوسکتی ہے؟ ایک نعت گو کس طرح ذات وصفات کو ساتھ لے کر چل سکتا ہے؟ کن باتوں کا خیال کرکے کام یابی کے ساتھ بہ یک وقت دونوں عناصر کو اختیار کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں چند باتیں بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلے یہ بات سامنے رکھنے ہوگی کہ کلام سامنے آتے ہی قاری کو پہلی فرصت میں یہ محسوس ہونا چاہیے کہ وہ نعت پڑھ رہا ہے۔ کیوں کہ اس کا الگ نفسیاتی اثر ہوتا ہے۔ اگر ابتداء میں ہی یہ معلوم ہوجائے کہ وہ نعت نبوی پڑھنے جارہا ہے تو شروع سے آخر تک اس کے وجدان کے اردگرد تقدس کا ہالہ قائم ہوجاتا ہے۔ جس سے شعر کو سمجھنے، اس کے اندرون تک اترنے اور اس سے نئے نئے موتی برآمد کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر شروع میں یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے سامنے موجود منظوم کلام نعت ہے تو قاری دوسرے ماحول میں گھومتا رہتا ہے اور اسے وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو نعت کی قرأت سے ہونا چاہیے۔ مختصر لفظوں میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بے خبری سے شعور تک کا سفر طے نہیں ہوپاتا۔ جیسا کہ افسر امروہوی نے کہا ہے:

چل کر غزل سے آؤ جو نعت حضور تک
اک سلسلہ ہے بے خبری سے شعور تک

اس لیے سب سے پہلے ایسی تکنیک استعمال کرنی ہوگی کہ قاری نعت کو نعت سمجھ کر ہی پڑھنا شروع کرے۔ اگر غزل کے فارم میں نعت کہی جارہی ہے تو مطلع میں کم سے کم ایک لفظ ایسا استعمال کرنا ضروری ہوگا، جس سے کلام کے نعت ہونے کا یقین ہوجائے۔ اگر نظم کے فارم میں نعت کہی جارہی ہو تو نعتیہ انداز کا عنوان اختیار کر کے یہ کام بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔ اگر عنوان نعتیہ انداز کا نہ ہو، بل کہ علامتی یا اشاراتی ہو تو یہاں بھی ابتدائی مصرعوں میں کم سے کم ایک لفظ ایسا استعمال کرنا ضروری ہوگا، جس سے کلام کے نعت ہونے کا یقین ہوجائے۔ جیسے عامر عثمانی نے نظم کے فارم میں ایک طویل نعت کہی ہے۔ پوری نعت میں رسول کریم کا اسم گرامی ایک جگہ بھی استعمال نہیں ہوا۔ لیکن اس نعت کو سن کر نہ جانے کتنے لوگوں کو زار و قطار روتے دیکھا گیا ہے۔ اس نعت کا پہلا، آخری اور ایک درمیانی بند ملاحظہ کیجیے:

تمھاری نعت کے قربان جان و دل لیکن
تمھاری نعت کے قابل کہاں زبان و قلم
قلم کی نوک پہ الفاظ تو بہت ہیں مگر
ثبوت صدقِ معانی کریں کہاں سے بہم
چڑھی ہوئی ہیں زباں پر کثافتوں کی تہیں
پھر اس زبان سے کیسے تمھاری نعت کہیں

بُتانِ قوم و وطن جن کو تم نے توڑا تھا
نئے سرے سے انھیں ہم نے پھر تراش لیا
کیا تھا تم نے اخوت کا جو محل تعمیر
اسے نفاق کی ضربت سے ہم نے توڑ دیا
ہماری ظلمت شب میں کہیں بھی نور نہیں
طلوع صبح کے آثار دور دور نہیں

حضور! پھر بھی یہ اشعار پیشِ خدمت ہیں
اگرچہ ہدیۂ ناچیز، کم عیار سہی
برائے نام سی نسبت تو تم سے باقی ہے
ہزار دامنِ ایمان تار تار سہی
تمھارا نام ہے تسکینِ روح و جاں اب بھی
تمھاری یاد سے ہوتا ہے دل جواں اب بھی

(یہ قدم قدم بلائیں، ص: ۱۶،۱۵)

یہ پوری نعت اسی رنگ کی ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ شاعر نے اگرچہ پوری نعت میں کہیں آقا کا اسم ذاتی یا صفاتی استعمال نہیں کیا، لیکن نعت کے پہلے مصرعے میں لفظ ''نعت'' استعمال کرلیا، جس سے قاری پہلی فرصت میں یہ جان لیتا ہے کہ وہ کیا سننے جارہا ہے اور اس کلام میں کس ذات گرامی سے وابستگی کی بات ہورہی ہے۔ اس طرح نعت کے ماحول میں امت کے زوال و انحطاط کا پورا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ اگر ''نعت'' کی جگہ ذکر یا مدح استعمال کرلیا جاتا، تو یہ نعت کسی طرح نہیں کہی جاسکتی تھی۔ اقبال کی نظم ''اے روحِ محمدؐ!'' بھی اسی ضمن میں آتی ہے:

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تُو ہی بتا، تیرا مسلمان کدھر جائے
وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں، وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد
اس کوہ و بیاباں سے حُدی خوان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

(ضربِ کلیم، ص: ۴۷)

اس نظم میں چار اشعار ہیں، جن میں سے آخری شعر میں ''اے روحِ محمدؐ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ باقی تین اشعار میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ یہ نعت ہے۔ اس کے باوجود قاری پہلی نظر میں ہی یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نظم کا مرکز و محور سرکارِ مدینہ کی ذاتِ گرامی ہے۔ نعت کا تصور آتے ہی اس کے سامنے ملت کا انتشار و زوال اور شاعر کا اضطراب گردش کرجاتا ہے۔ کیوں کہ نظم کا عنوان بہت واضح ہے۔ اس کو دیکھتے ہی ذہن نعت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ اگر عنوان واضح نہ ہوتا تو قاری کو آخری شعر میں معلوم ہوتا کہ اب تک اس نے جو تین شعر پڑھے، وہ نعت تھے۔ ایسا بالکل نامناسب ہوتا۔

(۲) دوسری اہم چیز یہ ہے کہ جس عصری واقعے یا مسئلے کو نعتیہ شاعری میں نظم کیا جارہا ہو، اس کا سیرت نبوی سے راست تعلق ہو۔ یا کم از کم اتنا تو ضرور ہو کہ شاعر نے اس پیش کردہ واقعے یا مسئلے کو نبوی سیرت و تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہو۔ مثال کے طور خدانہ خواستہ پر کسی مسلم ملک پر ایٹمی حملہ ہو اور لاکھوں مسلمان موت کی آغوش میں چلے جائیں۔ شاعر اس المیے سے متاثر ہوکر اسے اپنی نعت میں پیش کرنا چاہے۔ ایسی صورت میں وہ پہلے مصرعے میں کہے کہ فلاں ملک پر ایٹمی حملہ ہوگیا، لاکھوں مسلمان مارے گئے۔ پھر دوسرے مصرعے میں کہے کہ ہم اپنے رسولؐ سے محبت کرتے ہیں اور ان پر جان چھڑکتے ہیں، تو ظاہری بات ہے کہ نعت میں اس طرح کے کسی واقعے کا ذکر برائے ذکر ہی کہلائے گا۔ نعت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر وہ نعت گو ان ایٹمی حملوں میں مرنے والوں کا تذکرہ رسول کریم ﷺ کے امتی کی حیثیت سے کرے اور خونِ امت کی ارزانی کا ذکر کرکے

اظہارِ رنج والم، یا سیرت کی روشنی میں اس طرح کے حادثات کے اسباب دریافت کرے، تو یہ ایک معنیٰ خیز بات ہوگی۔ نعت میں روحِ عصر کے جواز کے قائل بہت سے شعراء اس کا خیال نہیں رکھ پاتے اور بسا اوقات بے جوڑ باتیں کہہ جاتے ہیں۔

(۳) ایک بہت اہم چیز یہ ہے کہ روح عصر کے چکر میں نعت کا ماحول اور کیفیت متاثر نہ ہو۔ شاعر اس مہارت کے ساتھ نعت میں روح عصر کو پیش کرے کہ نعت نعت ہی رہے، نری انقلابی نظم نہ بننے پائے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ ہم نعت میں روح عصر کی آمیزش کر رہے ہیں، روح عصر کی حامل کسی نظم میں نعت کا مضمون پیش نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے اساسی مضمون کو اساسی رہنا چاہیے اور ثانوی کو ثانوی۔ بعض شعراء ایسے جذباتی ہو جاتے ہیں کہ ان کی نعتوں میں نعت بہت پیچھے رہ جاتی ہے اور عصری مسائل غالب آ جاتے ہیں۔ یہ ایک نادرست رویہ ہے۔ اس طرح کے کچھ اشعار بہ طور مثال پیچھے پیش کیے گئے ہیں۔ البتہ ایسے شعراء بھی پائے جاتے ہیں، جنھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس سنگ میل کو عبور کیا ہے اور کامل مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نعت میں روح عصر کی آمیزش کی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی ۔۔۔ اب سے تا حشر جو فردا ہے، وہ تنہا تیرا
ایک بار اور مدینے سے فلسطین میں آ ۔۔۔ راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصیٰ تیرا
(احمد ندیم قاسمی)

آپ کے نام میں ہر لفظ کا مفہوم ملے ۔۔۔ میرے سرکار ہیں ہر دور کی زندہ فرہنگ
(ابوالخیر کشفی)

اپنے ہاتھوں ہی پریشان ہے امت تیری ۔۔۔ اس کے الجھے ہوئے حالات کو شانہ دے دے
(مظفر وارثی)

گھبرا کے مسلمان یہ کیا ڈھونڈ رہا ہے ۔۔۔ کیا چھوٹ گیا ہاتھ سے دامانِ محمد
(حفیظ میرٹھی)

زخم کھائے ہوئے سر تا بہ قدم آئے ہیں ۔۔۔ ہانپتے کانپتے یا شاہِ امم آئے ہیں
(کلیم عاجز)

بلا کی تشنگی میں اب وہ لمحے آنے والے ہیں ۔۔۔ نگاہیں جب پڑیں گی آپ پر سارے زمانے کی
(رباب رشیدی)

ہاتھ میں اب آ گیا ہے میرے دامانِ نبی ۔۔۔ اب ذرا یہ گردشِ ایام آئے سامنے
(ساجد امروہوی)

چھیڑا کبھی جو سیلِ غمِ کائنات نے گھبرا کے مصطفیٰ کو پکارا حیات نے

(قاسم حبیبی برکاتی)

ان اشعار میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کس خوبی کے ساتھ نعت میں روح عصر کا رنگ ملایا گیا ہے۔ ان تمام اشعار میں بہت بڑے بڑے معاصر مسائل کو دو تین لفظوں میں اس انداز سے پیش کر دیا گیا ہے کہ کہیں بھی نعت کی کیفیت متاثر ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ نعت نعت ہی رہتی ہے اور اس کا کینوس بھی وسیع تر ہو جاتا ہے۔

(۴) نعت میں جب بھی روحِ عصر کی آمیزش کی جائے تو اس بات کا خاص اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ واقعہ ایسا ہو جو نعت اور صاحب نعت علیہ السلام کے مقام و مرتبے کے مطابق ہو۔ مثال کے طور پر کسی شخص کی طبیعت خراب ہو گئی یا اس کے گھر میں چوری ہو گئی۔ بلاشبہ اس کے لیے یہ ایک بڑا واقعہ ہوگا۔ لیکن یہ افسوس ناک واقعہ ایسا نہیں ہے کہ اسے ذکر سرور کائنات کے ساتھ ملا کر پیش کیا جائے۔ یہ واقعہ رسول کے ایک امتی پر ہونے والا ظلم تو ضرور ہے، لیکن اسے نعت میں ضم کرنے سے نعت کا وقار کچھ گرتا ہوا محسوس ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی شمشیر براں سے گوریا مارنے کا کام لے۔ گوریا مر تو جائے گی، لیکن مارنے والے پر تلوار کی ناقدری کا بے جا الزام بھی آئے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ نعت میں پیش کیے گئے معاصر مسائل نعت کے مقام کے بھی ہوں۔ رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی پوری انسانیت کے لیے تھی اور آپ کی تعلیمات بھی تا قیامت ساری انسانیت کے لیے مینارۂ نور کا کام کریں گی۔ اس لیے ہمیں نعت کی روشنی میں بڑے اور اہم مصائب و آلام کو ہی پیش کرنا چاہیے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی آجاتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ پر کسی خاص مسلم فرقے، مسلک، مشرب یا تنظیم و ادارے کی اجارہ داری نہیں ہے۔ آقا سب کے تھے اور سب کے رہیں گے۔ سب اپنے اپنے لحاظ سے آپ پر جان نچھاور کرتے ہیں اور آپ کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ہمارے مسلم معاشرے میں پائے جانے والے فکری و ذہنی اختلافات ہمارے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ آقا نے مسلمانوں کے آپسی اختلاف کو ہمیشہ قابل نفرت بتایا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ نعت میں ایسے عصری مسائل پیش نہ کیے جائیں، جن کا تعلق کسی خاص فرقے، مسلک، مشرب، تنظیم یا ادارے سے ہو۔ مثال کے طور پر:

کیوں یا رسول کہنے پہ کرتے ہو شور و غل کیوں حنفیوں سے مرتے ہو لڑ کر وہابیو

نمازوں میں جو پڑھنے کے لیے حکمِ سلام آیا کہاں سے کود کر غافل یہ میلادی قیام آیا

فکری اختلافات کا یہ انداز انتہائی سطحی اور بے بختانہ ہے۔ یہ انداز عام حالات میں بھی جائز قرار

نہیں دیا جاسکتا، چہ جائے کہ اسے نعت میں نظم کیا جائے۔ اس سے دوسرے مسلمان بھائیوں کی دل آزاری بھی ہوتی ہے، انسان اپنی ذہنی سطحیت کا بھی مظاہرہ کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے نعت کا تقدس پامال ہوتا ہے۔

(۵) نعت میں جن لوگوں نے روحِ عصر کی آمیزش کی ہے، ان میں بھی اس بات کا رجحان عام طور پر نہیں پایا جاتا کہ انسانیت کو درپیش عالمی مسائل کو نعت میں پیش کیا جائے۔ ساتھ ہی اشارے کنایے میں ان مسائل کا نبوی حل بھی بیان کر دیا جائے۔ آج دنیا کو ماحولیات، اخلاقیات، اقتصادیات اور سیاسیات کے نہ جانے کتنے بڑے بڑے مسائل درپیش ہیں۔ دنیا ان مسائل کا حل ڈھونڈنے میں کروڑوں اربوں روپے صرف کر رہی ہے، پھر بھی ناکام ہے۔ سرورِ کائنات علیہ السلام کے پاس ان کے مسائل کا حل موجود ہے، لیکن دنیا اس سے ناواقف ہے۔ ایک ذمے دار نعت گو کا فرض ہے کہ وہ پہلے ان مسائل کی نوعیت کو سمجھے، تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں ان کا حل دریافت کرے اور پھر ان مسائل کو مذکورِ بالا شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے نعت میں نظم کرے۔ ہماری ناقص معلومات کی حد تک اردو نعت میں اب تک اس طرح کے مضامین پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ الحمدللہ بہت سے شعراء نے نعت میں روحِ عصر کی آمیزش کی کامیاب کوششیں کی ہیں، لیکن اس طرح کی Universal اور Update کوششیں اب تک نہیں ہوسکی ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ نعت کو روحِ عصر کی آمیزش دینا ایک اہم ادبی ذمے داری بھی ہے اور ایک وقیع انسانی خدمت بھی۔ جب رسول کی ذات، صفات اور تعلیمات سب کچھ عالمی ہے، تو آپ کی نعت کو کس طرح مدح و توصیف میں محدود کیا جاسکتا ہے؟ البتہ اس کے کچھ شرائط بھی ہیں، جنھیں اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اگر وہ شعراء جو نعت میں روحِ عصر کے قائل ہیں، مذکورہ شرائط کے ساتھ آگے بڑھیں گے تو ان شاء اللہ وہ نعت گویانِ مصطفیٰ بھی اس جانب توجہ کرنے لگیں گے، جو اپنی بعض غلط فہمیوں اور مصلحتوں کی بنا پر اس رنگ کو اختیار کرنے سے بچ رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں مذکور بالا پانچ نکات کے ساتھ نعت میں روحِ عصر کو پیش کرنا ایک عظیم ادبی و انسانی خدمت ہوگی، جس کی بنا پر ان شاء اللہ ہم قیامت کے دن رضائے مصطفیٰ کے حق دار ہوں گے۔

☆☆☆

ضیاء الدین دہشیری / ڈاکٹر نوید احمد گل

اُردو ترجمہ "مقدمہ" "نعت رسول اکرم در شعر فارسی"

ABSTRACT:
'NAAT-E-HAZRAT RASOOL-E-KARAM'(S.A.W) is a complied work of Zia-ud-deen Dehshaeeri. This book is the first anthology of Persian Naat. This Selection is consisting of works of 29 Persian poets, along with brief biographical notes for the poets. Thought it is an anthology yet its preface and explanatory foot notes received world wide acclamations. Urdu translation of Preface of the treatise along with introductory remarks for the book, are presented hereunder in this article.

ہجری تقویم کے اعتبار سے آج سے تقریباً نصف صدی پہلے فارسی نعت سرائی کا پہلا انتخاب بعنوان "نعت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در شعر فارسی" ایران سے شائع ہوا۔ اس انتخاب کو سید ضیاء الدین دہشیری نے اپنے ذوق، ظرف اور شرف سے تالیف کیا اس نعتیہ انتخاب میں انہوں نے ۲۹ (انتیس) فارسی شعراء کرام اور ان کے کلام کو الفبائی ترتیب سے جمع کیا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) ادیب فراہانی (۲) اوحدی مراغی (۳) بہار خراسانی (۴) جامی (۵) جمال الدین محمد اصفہانی (۶) خاقانی شروانی (۷) خسرو دہلوی (۸) خواجوی کرمانی (۹) سروش اصفہانی (۱۰) سعدی شیرازی (۱۱) سلمان ساوجی (۱۲) ثنائی غزنوی (۱۳) صائب (۱۴) صبا فتح علی خان (۱۵) صفی علی شاہ (۱۶) عاشق اصفہانی (۱۷) عراقی (۱۸) عطار نیشاپوری (۱۹) عرفی شیرازی (۲۰) فخرالدین گرگانی (۲۱) کمال الدین اسمعیل اصفہانی (۲۲) محتشم کاشانی (۲۳) مشتاق اصفہانی (۲۴) ناصر خسرو بلخی (۲۵) نظامی گنجوی (۲۶) وحشی بافقی یزدی (۲۷) وصال شیرازی (۲۸) ہلالی چغتائی (۲۹) یغمائے جندقی۔

ان کے کلام سے نعتیہ اشعار کو الگ کر کے اس میں سے کچھ نعتیہ انتخاب کو اپنی اس تالیف میں شامل کیا ہے۔ ادبیات کی دنیا میں کوئی شخص یا کتاب یا انتخاب کامل، کافی اور حرفِ آخر نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا یہ انتخاب بھی شعراء اور کلام دونوں کے لحاظ سے انتخاب کا انتخاب ہے۔

مگر اولیت بجائے خود بہت بڑا اعزاز ہے یہ انتخاب ایک قصر خیرہ نگاہ کی خشتِ اول ہے۔

اس نے تحقیق کے در بند نہیں وا کیے ہیں۔ ہر آغاز تشویق مزید کا باعث اور تحریک تحقیق کا پرچم بردار ہوتا ہے۔ یہ انتخاب سید ضیاء الدین دہشیری کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس انتخاب کو انہوں نے شعراء کے تخلص کی الفبائی ترتیب سے تالیف کیا ہے۔ ہر شاعر کا مختصر ترین سوانحی تذکرہ اور اس کے آثار کا ذکر کیا ہے۔ شاعر کے نعتیہ اشعار کا نمونہ تالیف میں شامل کیا ہے۔ اور ساتھ ہر ایک شاعر کے نعتیہ انتخاب کی تعلیقات مرتب کی ہیں۔ اس کتاب کی تعلیقات ہی دراصل دہشیری کا اصل اور سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ تعلیقات بہت ساری کتب سابقہ کی جامع اور کتب آئندہ کا منبع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کتاب کے آخر میں چار ضمائم بعنوان (۱) فہرست آیات قرآنیہ (۲) فہرست احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۳) فہرست اقوال مشائخ اور (۴) فہرست مصطلحاتِ عرفاء کو شامل کیا ہے۔ جو آئندہ کے طلباء کے لیے بڑے خاصے کی چیز ہیں۔

دہشیری کی یہ کتاب اپنے مختصر مقدمے کے لیے بھی بڑی اہم اور ہر دل عزیز سمجھی جاتی ہے۔ یہاں مجلہ "نعت رنگ" کے مدیر ابر مطیر، مصباحِ سُبُل جناب سید صبیح رحمانی کے حکم کی تعمیل میں دہشیری کی اس تالیف کے اس فارسی مقدمے کا سادہ با محاورہ اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

(= اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ بے کس پناہ میں صلوٰۃ درود کے بعد، ہجرت سے پہلے کا تیرہواں سال اور رجب کی ۲۷ ویں کو محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس رب جلیل کی طرف سے جبرئیل امین علیہ السلام آئے اور کہا: "اقرا باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق (= پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا آدمی کو خون کی پھٹک سے (کنزالایمان))۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کہ جس ذاتِ پاک پر کمال وعروج کے تمام مرتبے اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیے) نے نبوت کا اعلان فرمایا اور لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کا باضابطہ آغاز فرمایا۔ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث شریفہ (بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (= اچھے اچھے رؤیوں کی عملی اکملیت سکھانے کے لیے بھیجا گیا)) کا سکہ پوری کائنات میں عملی طور پر جاری ہو گیا۔

یہ وہ دور تھا جب صرف جزیرہ نما عرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا عام طور پر جبکہ اس وقت کی اصطلاح کے مطابق روم اور ایران جیسی ترقی یافتہ قومیں بھی انتہائی بری طرح سے فساد، شرک، ظلمت اور جہالت میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ قومیں اپنی ہی انتہائی نجی ان گنت، جان لیوا برائیوں کے شکنجوں کے پنجوں میں پھنسی ہوئی تھیں اور یہ برائیاں ان قوموں کو بڑی تیزی کے ساتھ محکومی، زوال اور موت کی طرف لے جا رہی تھیں اور اس پر یہ کہ خود انہیں پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔

اس وقت کے عالمی عمرانی مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اس زمین پر کس کس زبردست نے کس کس زیر دست کو کیسے کیسے اپنے مفاد اور ہوس کا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ لیکن اسی دوران میں جب شریعتِ محمدی صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہلال طلوع ہوا تو نہ صرف عرب قوم کو نجات ملی بلکہ مسلمان ہمیشہ سے آخر تک انسانیت کے کام آنے والے آزادی، عدل، مساوات اور اخوت جیسے اصول لے کر جو جو علاقے فتح کرتے چلے گئے اور ان کا نعمتیں بانٹنے والا اور کامیابیاں سمیٹنے والا جھنڈا جہاں جہاں لہراتا چلا گیا وہاں کے لوگ اپنے آپ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت شریف اور دین حنیف کو اپنے اقرار المن اللسان اور تصدیق من القلب کے ساتھ قبول کرتے چلے گئے۔

یہ ایک ایسا وقت تھا جب حکومت اور دین کے نام پر ہر قوم کو اس کے سیاسی اور مذہبی دیوتاؤں نے اپنی سیاہ کاریوں کے ناسور کی تباہ کاریوں کو چھپانے کے لیے اپنی اپنی قوم کو انتہائی شرم ناک خود ساختہ رسموں کی سولی پر اس بے دردی سے لٹکایا ہوا تھا کہ انسانیت بس اپنی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت کا اعلان فرمایا اور تبلیغ کا آغاز کیا تو اس وقت کے ہر ایک دین کے ماننے والے عام طور پر جب کہ عیسائی اپنے پادریوں اور آتش پرست اپنے موبدوں کے ہاتھوں خاص طور پر کھلونا بنے ہوئے تھے۔ اور ان پادریوں اور موبدوں کے لیے ان کے ساتھ مل کر اپنے ہی جیسے لوگوں کے اندر ظلم، حسد اور ذلت کو پھیلا کر ان پادریوں اور موبدوں کے لیے مال اکٹھا کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی راہ باقی نہیں تھی۔

رسول فطرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین فطرت لے کر آئے تو ایسا لگا کہ اس خوشخبری کے لیے پہلے سے ہی ہر کان گوش بر آواز اور ہر آنکھ چشم براہ تھی لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام فوراً لوگوں کے ذہنوں اور جسموں کے اندر گھر کر گیا تو اس وقت کے ظالم چودھریوں اور وڈیروں کو اپنی چودھراہٹ کے پہاڑ کی لڑکھڑاہٹ کی سرسراہٹ جب صاف صاف سنائی اور دکھائی دینے لگی تو انہوں نے بڑی پھرتی سے مسلمانوں کو اندر کی طرف سے نقب لگانے کے لیے بھیس بدلہ اور خود پر اسلام کا چولا چڑھا لیا اور اپنے آپ کو بغداد کے فاسق اور فاجر خلفاء اور خود ساختہ امیر المؤمنین کا نمائندہ کہلوانا شروع کر دیا۔ خدا لگتی کہی جائے تو اللہ پاک کو سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴، انہی کے لیے نازل کرنا پڑی "**واذالقوا الذین امنوا قالوآ امنّاوا واذا خلوا الی شیاطینھم قالوآ انامعکم، انما نحن مستھزؤن** (=اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں (کنزالایمان))۔

پھر اسی دوران میں ایسے اول درجے کے بہروپیے مسلمان چودھریوں، وڈیروں اور بادشاہوں کو اپنا سفرا اپنے خرچے پر نہ کرنے کے عادی عالموں، ان کی جوٹھی حسیناؤں سے بستر گرم کرنے

والے ہوس ران منقبوں، سونے کے برتنوں میں سے پس خوردہ چاٹنے والے رال بے قابو ادیبوں اور ہر وقت جیب پر نظر رکھنے والے شاعروں کی ایک پوری جماعت ایسی ہم نوا ملی کہ جس نے ان کے تعریفوں کے پانیوں پر پل باندھ دیے۔ یہ سلسلہ یونہی دو سو سال تک جاری رہا۔

پھر جب ان فنکاروں کے اپنے ملک ہڑپ، ابلیس کرتوت ممدوحوں کے اصل مکروہ چہروں سے پردہ اٹھا تو وہ سبھی ان کے دربار سے اٹھ آئے اور اپنے اپنے ظالم ممدوح سے بہت دور کسی کونے میں اکیلے صبر کر کے جا بیٹھے اور ہولے ہولے فقر و درویشی کی راہ پر چل پڑے۔

صوفیانہ زندگی کے باقاعدہ رواج پا لینے اور تنہائی کے نتیجے میں بہت سارے ادیبوں اور شاعروں نے حکمرانوں کی مدح سرائی کو تج کر اور درباری شان و شوکت پر لات مارتے ہوئے دینی اور عرفانی یعنی حمد، نعت اور منقبت لکھنے میں اپنی عافیت اور نجات کی راہ کو تلاش کیا اور ان حالات کو عنصری، فرخی، اور عسجدی جیسے دنیا دار شعراء جنہوں نے اپنے وقت کے چودھریوں اور وڈیروں کی دہلیز چاٹ چاٹ کر صرف اپنے لیے نرم نرم بستر، اچھے کھانے، ہوس رانی اور عہدے ہی کو زندگی قرار دے لیا تھا اور جن کے پورے کلام میں حمد، نعت یا منقبت کا ایک شعر بھی نہیں، انہوں نے بھی زمانے کے چلن کو بھانپ لیا اور خود میں سنائی، عطار اور جامی کی طرح آزاد منش، عظیم اور درویش صفت شعراء کی طرح کی جوت جگا لی اور یوں ایک وقت آیا کہ فارسی ادب بادشاہوں کی تعریف کے کانٹوں اور امراء کی چاپلوسی کے گھاس پھونس سے تقریباً پاک ہو گیا۔ اور اس کی جگہ حمد، نعت اور منقبت نے لے لی۔ حتیٰ کہ ایسے شعراء جنہوں نے ابھی دربار سے پوری طرح منہ نہیں موڑا تھا انہوں نے بھی صوفیانہ مضامین نظم کرنے شروع کر دیے۔ ساتویں صدی ہجری اور پھر اس کے بعد کو خصوصی طور پر جہاں سوز چنگیزیوں کے حملوں نے (منفی طور پر) اور صفویوں کے رویے نے (مثبت طور پر) خصوصی طور پر شعراء کی توجہ حمد، نعت اور منقبت نگاری کی طرف تقریباً وقف کرا دی اور بعد میں ہر شاعر کے یہاں باقاعدہ اس کا رواج ہو گیا۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ ہر شاعر اپنے اپنے ذوق، واردات، ماحول، مسلک اور مذہب کے مطابق اپنے روحانی جذبات کو اولیاء اللہ کے مناقب میں نظم کرتا ہے۔ اور یوں ہر شاعر کا کلام اپنا ایک خاص اسلوب بھی رکھتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ جب سب کا ممدوح ایک ہی ہو تو ممدوح کی یکسانی کرامت اور معجزہ کے بیان میں عام طور پر اسلوب کی یکسانی بھی لے آتی ہے۔ ایسے میں ایسے شعروں کو سمجھنے کے لیے شاعر، ان بزرگوں کی زندگی کے حالات اور پھر اس دور کی تاریخ سے پوری آگاہی بڑی ضروری ہو جاتی ہے۔

موجودہ دور جو تمام مذہبی اور روحانی اصولوں کے زوال اور ہوس اور عیش پرستی کی ترقی کا

دور ہے اس میں ایسی سچائیوں کی طرف توجہ کرنا اور کروانا نہ صرف ضروری بلکہ فرض عین ہوگیا ہے۔ اس لیے اس بندہ ناچیز (سید ضیاء دبشری) نے سب پر سب احسان کرنے والے (خدائے منان) کی خاص مہربانی سے فارسی زبان کے باایمان اکابرین کے کلام کا نعتیہ انتخاب پیش کر کے اسے اپنی موجودہ نسل کی راہنمائی کے لیے اپنے تئیں ایک چراغ روشن کر کے راہ میں رکھ دیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ میں اپنی اس کتاب کے وسیلے سے شاید موجودہ نسل میں سے چند لوگوں کو ان کی اپنی روحانی میراث کی طرف موڑ لانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ میں نے ابتدائی طور پر مندرجہ ذیل تین کتابیں مرتب کرنے کی ٹھانی ہے:

(۱) توحید حضرت باری در شعر فارسی

(۲) نعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در شعر فارسی

(۳) نعت امیر المومنین علی علیہ السلام در شعر فارسی

خوش قسمتی سے میری یہ دوسری تالیف اہل دل اور معنیٰ شناس آنکھوں کے سامنے ہے لیکن ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی ہے کہ مجھ ایسے کم علم کے کام میں کئی خامیاں اور بہت ساری کوتاہیاں باقی رہ گئی ہیں مگر میں نے اپنے پڑھنے والوں کے بڑے پن کی وجہ سے اپنی سب خامیاں بھی ان کے سامنے رکھ دی ہیں۔

آخر میں اپنے تمام عظیم استادوں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں خاص طور پر میں ڈاکٹر ذبیح اللہ کی صفا کا ممنون ہوں کہ جن کا مجلہ "گنج سخن" میرے لیے فیض کا مصدر ثابت ہوا۔ میں ڈاکٹر سید صادق گوہرین کا بھی شکرگزار ہوں کہ جن کی فریدالدین عطار کے "اسرار نامہ" کی لکھی ہوئی تعلیقات میرے لیے بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ ایسے میں میں اپنے محقق دوست ڈاکٹر باستانی پاریزی کو کیسے بھول سکتا ہوں کہ جس کی مسلسل تشویق، مسلسل میرے ساتھ رہی میں ان تمام ادیبوں، شاعروں اور ناشران کتب کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے بڑے خلوص اور ہمت کے ساتھ اپنی اپنی کتابیں مجھے باہم پہنچائی جو اس کتاب کی تیاری میں مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔ میں اللہ کے حضور ان کے لیے دعا گو ہوں۔ استاد سعید نفیسی جنھوں نے اپنے پر سوز شیریں قلم سے میرے اس کام کی تصحیح فرمائی میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام نیاز۔

(دبشیری ضیاء الدین سید، مقدمہ "نعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در شعر فارسی ۸۹ ۱۳ ھ ق ص ص ۳۔۶)۔

ooo

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، کراچی

اُردو کی نعتیہ شاعری میں خواتین کا حصہ

ABSTRACT: Urdu devotional poetry composed by women has been highlighted in this article. Though Urdu poetry have had been done from ages of emergence of the new language, yet poetry of poetesses never received required heed from literary historians. Attempts to include women in certain anthologies have been traced in this article to show ground breaking trends against negligence towards poetesses. Examples of couplets have also been placed to show poetic diction of some poetesses for composing Naatia Poetry.

عصرِ حاضر میں اردو نعت کی ترویج واشاعت ونقدِ نعت، نعت کے روشن مستقبل کا آغاز ہے۔ آج اردو نعت کے معیار اور فکری وفنی عظمت اور مضامین وموضوعات کی وسعت دیکھ کر یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اردو زبان میں نعت رسول مقبول ﷺ کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں۔ اردو زبان میں چھوٹے بڑے نعتیہ مجموعوں، انتخابوں، گلدستوں اور میلاد ناموں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اردو زبان میں نعت کی وسعت وتنوع، ندرت وجدت اور مقدار ومعیار میں نعت گوشعراء کے ساتھ ساتھ نعت گوشاعرات کا بھی اہم حصہ ہے۔

خواتین شاعرات کی ایک کثیر تعداد نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور گلہائے عقیدت کے نذرانے پیش کیے ہیں اور ان کے نعتیہ مجموعے بھی اردو ادب کی زینت بنتے رہے ہیں۔ اردو نعتیہ شاعری نے اپنے ارتقاء کی جو منزلیں طے کی ہیں اور جن نعت گوشاعرات نے اس صنف کی تزئین و آرائش میں مقدور بھر حصہ لیا ہے۔ پیش نظر مقالے میں ان کے مختصر ادبی تعارف اور فکری تاثر وشعری صلاحیتوں، نعتیہ شاعری کے ارتقاء اور فروغ کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں کو سمیٹتے ہوئے نمایاں نعت گوشاعرات کے منفرد میلانات ورجحانات کی نشاندہی، خواتین کی نعتیہ شاعری کے موضوعات، نعت گوئی کے نسوانی اسالیب، نیز نعتیہ شاعری میں راہ پانے والے جدید رجحانات کی نشاندہی بالخصوص صاحبِ کتاب اور نمایاں نعت گوشاعرات کے فنی اور تخلیقی سرمایے کا جداگانہ مطالعہ مقصود ہے۔

نعت گوئی ایک مستقل صنف سخن ہے اور شعرائے قدیم سے لے کر دورِ حاضر تک تقریباً بھی شعراء نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔نعت کہنا پلِ صراط پر چلنے کے مترادف ہے کہ یہاں صرف فنی پختگی اور جذبے کے وفور ہی سے بات نہیں بنتی بلکہ فکر ونظر کی راستی اور اظہار واسلوب کی تہذیب بھی اس صنفِ سخن کے بنیادی تقاضوں میں ہے۔(۱)

نعتیہ شاعری کی ابتدا عربی زبان سے ہوئی۔آنحضرت ﷺ کی مدح میں اشعار جو کا ذخیرہ ہمیں ملتا ہے، اس کے عناصر میں جود وسخا اور جمال ظاہری کے علاوہ آپ کے معنوی احسانات (ہدایت بخشی، قرآن کریم کا عطیہ، مکمل دین کی طرف رہنمائی وغیرہ) کا عنصر بھی داخل ہے۔ بعد کے شعراء نے ان مضامین میں مزید اضافہ کیا کہ اپنے جذبہ فدویت اور ذاتِ گرامی سے نسب رکھنے والی ہر شے سے اپنا دلی تعلق ظاہر کیا جس سے کلام میں نرمی، گداز اور سوز کا عنصر بڑھ گیا۔(۲)

صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے ساتھ ساتھ صحابیات رضی اللہ عنہن نے بھی گلستان نعت میں اپنے جذبات سے عنبر افشانی کی۔خواتین میں یہ شرف سب سے پہلے وجہِ تخلیقِ کائنات رسول اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ کو حاصل ہوا۔(۳) علاوہ ازیں حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت حفصہؓ اور دیگر صحابیات کے نعتیہ اشعار بھی تاریخ وسیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے منسوب خوبصورت ترین اشعار:

و احسن منک لم ترقط عینی
واجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرا من کل عیب
کانک قد خلقت کما تشاء

بھی محققین نعت کے نزدیک ایک خاتون کے ہیں جو بنی زہار سے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئی تھیں اور انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! اگر اجازت ہو تو میں اپنے جذبات عقیدت شعر کی صورت میں عرض کروں، اجازت پاکر انھوں نے مذکورہ دو اشعار پڑھے۔(۴)

''المواہب الدنیہ'' میں حضرت زید بن ارقمؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ حضرت عمرؓ حسب معمول ایک رات مدینہ منورہ کی گلیوں میں گشت لگا رہے تھے تو ان کو ایک جھونپڑے میں روشنی نظر آئی، قریب آگئے تو دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت روئی دھنک رہی ہے اور یہ گاتی جاتی ہے:

علی محمد صلاۃ الابرار
صلی علیه الطیبون الاخیار

قد کنت قوام بکی بالاسحار
یا لیت شعری والمنایا اطوار
ھل تجمعنی و حبی الدّار

(محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پاکیزہ نفوس کا درود ہو، پسندیدہ منتخب حضرات کا ان پر سلام ہو۔ میں راتوں کو جاگتی سحر تک آنسو بہاتی رہوں، اے کاش موت کی بھی تو شکلیں ہیں۔ کیا ہمارے حبیب سے ہم کو دارِ آخرت ملائے گا)(۵)

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، اردو شاعری میں نعت کے نمونے اردوئے قدیم کی شاعری ہی سے ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اردو کی نعتیہ شاعری کا ایک طویل پس منظر ہے جو کئی صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ بہ قول ناوکؔ حمزہ پوری:

''اردو کا غالباً ایک بھی شاعر خواہ مسلمان ہو، ہندو ہو، سکھ ہو، عیسائی یا کسی اور عقیدے کا ایسا نہ ملے جس نے نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں۔ یہ اردو کے اپنے مزاج اور تہذیب کی دین ہے۔''(۶)

اردو میں حمد و نعت گوئی ابتداً جزوی طور پر متعارف ہوئی۔ اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کے ساتھ ہی نعت گوئی کا بھی آغاز ہو گیا تھا۔ پہلے قصائد و مثنویوں کی تمہید میں حمدیہ اور نعتیہ اشعار درج کیے گئے لیکن جلد ہی انھیں علیحدہ علیحدہ صنفِ سخن کے طور پر فروغ حاصل ہوا۔(۷)

اردو شاعری میں خواتین شاعرات کا ہمیشہ سے حصہ رہا ہے۔ صنفِ نعت کی آبیاری میں شاعروں کے ساتھ ساتھ شاعرات کی عقیدت بھری کوششیں بھی لائق مطالعہ ہیں۔ اگرچہ نعتیہ مجموعہ نگار خواتین کی تعداد نعتیہ مجموعہ نگار شعراء کی نسبت کم ہے۔ تاہم وہ شعرا اور شاعرات جنھوں نے کثرت کے ساتھ نعتیں لکھیں اور مجموعے بھی مرتب کیے ان کی تعداد بھی کم نہیں۔

نعت گو شاعرات کے مجموعے ہماری تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ اس حوالے سے زینت بی بی محجوب کے نعتیہ مجموعے ''گلبنِ نعت'' کو اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ یہ اردو زبان میں کسی نعت گو شاعرہ کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے۔ مفید عام پریس لاہور سے شائع ہونے والے اس مجموعے کا سن اشاعت ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء ہے۔(۸)

بیسویں صدی کے آخری ربع میں صنفِ نعت کو جو فروغ اور ترقی ملی ہے بالخصوص پاکستان میں، وہ اردو نعت کی تاریخ میں مقدار اور معیار دونوں حوالوں سے قابل ذکر ہی نہیں لائق تحسین بھی ہے۔ ان برسوں میں تخلیق نعت کے ساتھ ساتھ ترتیب و تدوین نعت کا بھی بہت سا کام ہوا۔ مختلف رسائل نے صنف نعت کے جداگانہ نمبر نکالے جب کہ مرتبین اور اہل ذوق نے نعت کے گلدستے اور انتخاب شائع

کیے۔ جامعات میں بھی نعت پر تنقیدی اور تحقیقی کام ہوا ہے۔ نعت کے باب میں الگ رسالے بھی شائع ہونا شروع ہوئے۔ شاعرات نے بھی اس ربع صدی میں نعت گوئی کی طرف زیادہ توجہ کی اور اردو نعت کے اثاثے میں اضافہ کیا۔ (۹)

نعت گو شاعرات کے تذکرے

نعت گو شعراء کے ایک دو تذکروں میں چند ایک شاعرات کی نعتیہ شاعری پر بھی لکھا گیا۔ مگر اس سلسلے میں باقاعدہ کام کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اوّل تو اردو شاعرات کے جتنے بھی تذکرے اب تک مرتب ہوئے ہیں، ان میں اکثر شاعرات کے حالات اور ان کے عہد کا علم نہیں ہوتا اور چند اشعار کے سوا ان کا کلام بھی فراہم نہیں ہوتا، جس کے باعث ان کے شعری مزاج اور فکری صلاحیتوں کا پتا نہیں چلتا۔ ثانیاً ان کے نعتیہ کلام کا نمونہ بھی ان تذکروں میں نہیں دیا گیا، باوجود اس کے کہ تذکروں میں ان کی نعت گوئی سے دلچسپی کا اظہار بھی موجود ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ شعرائے اردو کے مقابل شاعرات کو اس قابل ہی نہیں سمجھا گیا کہ ان کے حالات اور کلام کی جمع و ترتیب کا کام کیا جائے۔ (۱۰)

بقول شفیق بریلوی: ''میر نے شعراء کا تذکرہ لکھا، لیکن اس میں کسی شاعرہ کا ذکر نہیں کیا حالانکہ خود ان کی صاحبزادی بہت اچھی شاعرہ تھیں۔ آزاد نے بھی ''آبِ حیات'' میں کسی شاعرہ کو شامل کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اسی طرح دوسرے تذکرہ نویسوں نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ جس کے باعث نہ جانے کتنی شاعرات کا نام اور کلام منظر عام پر نہ آسکا۔ لیکن پھر کچھ زمانہ بدلا، مردوں کے لیے شاعر خواتین کی اہمیت اور عظمت سے انحراف مشکل ہو گیا اور اب شعراء کے تذکروں میں شاعرات کا ذکر بھی خال خال کیا جانے لگا۔ چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے ''گلشن بے خار'' میں بعض شاعرات کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر یہ تذکرہ بہت مختصر ہے۔ اس کے بعد عبدالغفور نساخ نے ''سخنِ شعراء''، میں، منشی کریم الدین نے ''طبقات شعرائے ہند'' میں چند شاعرات کا تذکرہ شامل کیا۔ البتہ رائے درگا پرشاد نے ''تذکرۃ النساء نادری''، مولانا آسی الدنی نے ''تذکرۃ الخواتین'' اور شمیم سخن نے ''گلشن ناز''، ''چمن انداز'' کے نام سے مختصر تذکرے صرف خواتین پر مشتمل مرتب کیے، لیکن یہ بہت سرسری ہیں، ان تذکروں سے یہ حقیقت ضرور سامنے آتی ہے کہ ہماری بہت سی خواتین، مردوں سے بھی بہتر شعر کہتی ہیں اور یہ صورت آج بھی قائم ہے۔'' (۱۱)

امر واقعہ بھی یہی ہے کہ شعر و ادب کے میدان میں مرد و زن کی ایسی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ فارسی اور اردو کی ان گنت شاعرات کے ہاں جو پختگی کلام اور ندرت مضامین ہے، وہ شاید ان بہت سے شعراء

کے ہاں یکسر مفقود ہے، جن کا ذکر شعراء کے بے شمار تذکروں میں محفوظ ہے۔ مثال کے طور پر ز۔خ۔ش (زاہد خاتون شیروانیہ) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ زاہدہ خاتون کے ہاں جذبے کی شدت کے ساتھ ساتھ کلام میں بے حد پختگی اور علمی بصیرت موجود ہے۔ زاہدہ خاتون کا نہ صرف نعتیہ کلام بلکہ ان کی دیگر مذہبی، سیاسی اور معاشرتی نظموں میں جو حسن ابلاغ، شستہ بیانی، خیال آفرینی اور کیف و تاثیر ہے، اس سے ان کا ادبی مقام کسی طور بھی کسی اعلیٰ درجے کے شاعر سے کم نہیں ثابت ہوتا۔ (۱۲) چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چمکی ترے وجود سے وحدت الٰہ کی آئی ترے ورود سے آنکھوں میں روشنی
زاہد کے ڈر میں شان ترے انتباہ کی عاصی کی آس میں تری دل جوئی کی جھلک
درکار ہے زمین ایک خواب گاہ کی (۱۳) سرکار مجھ کو گنبد خضرا کے متصل

اسی طرح اداؔ جعفری (م: ۱۲ مارچ ۲۰۱۵ء) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ عصرِ حاضر میں اداؔ جعفری نے شاعرات کے لیے ایسی راہ ہموار کی کہ متعدد شاعرات کو منظرِ عام پر آنے کا حوصلہ ملا۔ جدید اور قدیم الفاظ اور تراکیب کا استعمال ان کے ہاں بڑی عمدگی اور شائستگی سے پایا جاتا ہے۔ اداؔ جعفری کو بجا طور پر ایک قادرالکلام شاعرہ کہا جاسکتا ہے۔ (۱۴) جن کا کلام روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہے۔ ان کی شاعری میں اگر اقبال، جگر، اختر شیرانی اور اثر لکھنوی کا اسلوب بیان اور طرز فکر نمایاں ہے تو موجودہ دور کے شعری رویوں سے بھی انھوں نے انحراف نہیں کیا۔ (۱۵)

جب نگاہوں میں ہونکہتوں کی سی خو تب انھیں سوچنا
دردِ محرابِ جاں، آنکھ ہو باوضو تب انھیں سوچنا
روشنی کے حوالوں سے لکھنا وہ اسمِ جمالِ بشر
بارشِ رنگ ہو پھول ہوں چار سو تب انھیں سوچنا
جن کا مداح ہے خالقِ دوجہاں، مالکِ ہر مکاں
حرف سے ماورا ہو سکے گفتگو تب انھیں سوچنا

پھلواری شریف کے مجیبی خاندان کی شاعرات کے بارے میں ڈاکٹر طلحہ رضوی برق لکھتے ہیں:

''پھلواری شریف کے خاندان مجیبی میں اکثر ایسی شاعرات گزری ہیں، جن کی خاموش شاعری آج بھی تحسین و ستائش کی مستحق ہے۔'' (۱۶) بعض شاعرات نے تو باقاعدہ نعتیہ دیوان مرتب کیے۔ لیکن تذکرہ نگاروں کو ان تک رسائی نہ ہو سکی۔

نعت گو شاعرات کے تذکرہ کے سلسلے میں اوّلیت ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری کے مرتبہ ۱۱۳

صفحات پر محیط ایک مختصر تذکرہ ''نعت گو شاعرات'' کو حاصل ہے۔اس میں پچاس نعت گو شاعرات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری لکھتے ہیں: ''قدیم رسائل و گلدستوں میں خواتین شعرا کا نام ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔اردو کے شعرا کے پچاسوں تذکرے موجود ہیں لیکن خواتین کے تذکروں کی روایت کا پتہ ۷۰،۸۰ برس سے آگے نہیں چلتا۔'' (۱۷)

دوسری اہم کوشش خالد علیم کی کتاب ''اردو شاعرات کی نعتیہ شاعری'' ہے۔جس میں ۵۲ نعت گو شاعرات کا تذکرہ موجود ہے۔اس کتاب میں صرف ان شاعرات اردو کی نعتیہ شاعری پر لکھا گیا ہے جن کے متعلق یہ ثبوت ملتا ہے کہ وہ باقاعدہ نعت گوئی کی طرف مائل تھیں، یا ایسی شاعرات جو اسلامی رنگ میں شعر کہتی تھیں اور ان کا میلان طبع نعت کی طرف بھی رہا ہے۔ (۱۸)

تیموری خاندان سے تعلق رکھنے والی کئی خواتین کی نعتیہ شاعری کا تذکرہ بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ مثلاً نواب اختر محل، شرف النساء بیگم ضرورت، کیفی۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں درج ذیل نعتیہ مجموعوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔صحیفہ درخشاں (سردار بیگم اختر حیدرآبادی)، موج تسنیم (امۃ اللہ تسنیم)، ذکر و فکر، صبر و شکر (تہنیت النساء بیگم)، نوائے حرم (حمیدہ بیگم)، ہدیہ طاہر (طاہرہ بانو طاہر سعید)، گلستان سخن محمودہ (محمودہ پھلواری)، نغمات حرم (مریم قادری) نذرانہ (معینہ انور معین حیدرآبادی)، موج نسیم (وحیدہ نسیم)۔

نعت گو شاعرات کے حوالے سے ایک اہم کام ماہنامہ ''نعت'' لاہور کا خصوصی شمارہ ''خواتین کی نعت گوئی'' ہے۔جس میں راجا رشید محمود نے خواتین کی نعت گوئی کا جائزہ لیا ہے اور نعتیہ تذکروں اور نعتیہ انتخاب میں نعت گو شاعرات کے نظر انداز کیے جانے پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ (۱۹)

یہ حقیقت ہے کہ خواتین کے تذکرے، عام تذکروں سے نسبتاً بہت کم تعداد میں مرتب اور شائع ہوئے اور ان میں بھی نعت گو شاعرات کا یا نعت کے حوالے سے کسی شاعرہ کا ذکر کم ہے۔مضامین و مقالات میں بھی ان کا کم سے کم ذکر کیا گیا ہے۔نعت کے موضوع پر کیے گئے تحقیقی کام میں بھی اور نعتیہ انتخاب میں بھی خواتین کو کم نمائندگی دی گئی ہے۔جس کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے راجا رشید محمود رقم طراز ہیں:

''ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خواتین کو شاعری کے مواقع بھی نسبتاً کم ملے ہیں، نعتیہ مشاعروں میں بھی ان کی شرکت محدود رہی ہے۔ ماضی قریب میں جو نعتیہ مشاعرے ہوئے ہیں، ان میں بھی پبلک مشاعروں میں تو خواتین کی شرکت مشکل ہوتی رہی ہے، مخصوص مشاعروں میں بھی ان کی شرکت محدود رہتی ہے۔انہیں مشورہ سخن کا موقع بھی کم ہی ملتا ہے، اس لیے زیادہ تر شاعرات کے کلام میں فنی اسقام

بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے مجموعہ ہائے نعت بھی کم چھپے ہیں۔ جو چھپے ہیں وہ بھی عام طور پر کسی اچھے اشاعتی ادارے نے نہیں بلکہ شاعرات نے یا تو خود شائع کیے ہیں یا کسی شاعرہ کے کسی عزیز یا کسی عقیدت مند نے چھپوادیے ہیں۔ کسی اخبار، رسالے میں کسی خاتون کی کوئی چیز چھپتی ہے تو نعت کے ساتھ ان کے حالاتِ زندگی نہیں چھپتے۔ ہمارے معاشرے میں مستورات بہر حال کسی نہ کسی حد تک ''مستور'' رہنا پسند کرتی ہیں۔'' (۲۰)

بہر طور ان تمام اسباب اور وجوہات کے باوجود اردو کی نعتیہ شاعری میں خواتین کا حصہ کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ خود راجا رشید محمود نے اپنے مضمون ''خواتین کی نعت گوئی'' میں ۱۲۹ نعت گو شاعرات، جن کی نعتیں انھیں دستیاب ہوسکیں، ان کا تذکرہ کیا ہے۔ اردو زبان کو یہ تخصص حاصل ہے کہ اس میں خواتین کے جداگانہ نعتیہ مجموعوں کی تعداد عربی اور فارسی سے کہیں زیادہ ہے۔

محرکات، رجحانات ومیلانات

نعت کی تخلیق میں عشقِ رسول ﷺ، اطاعتِ رسول ﷺ، سنتِ خداوندی کا تصور، اظہارِ عقیدت، تبلیغ دین کا فریضہ، ذکرِ رسول ﷺ کو عام کرنے کی خواہش، وسیلۂ ثواب اور ذریعۂ نجات، وسیلۂ برکت اور مدینہ منورہ کی حاضری کا شوق، دنیا میں دست گیری اور آخرت میں شفاعت کی آرزو، ایسے جذبے ہیں جو نعت کی ترقی اور مقبولیت کا سبب بنے۔

نعت گوئی کا محرک اوّل وہ غیر معمولی جذبۂ عشقِ رسول ﷺ ہے جو ہر مسلمان کے قلب میں فروزاں ہے۔ یہی جذبہ عشق مختلف جذبات اور احساسات کو جنم دیتا ہے۔ یہی عشقِ رسول کبھی دل میں سوز و گداز کی علامت، کبھی شمع یقیں کی صورت، کبھی پلکوں پر چمکتے ہوئے موتیوں کی مانند نمودار ہوتا رہا ہے اور یہی دلوں کو اسوۂ حسنہ ﷺ سے آشنا کرنے کا باعث ہے۔ اس کے تاثر سے بوجھل احساسات کو تازگی اور بے جان الفاظ کو تابندگی ملتی ہے۔ (۲۱) یہی جذبہ عشقِ رسول شاعرات کی نعت گوئی کا بھی محرک اوّل ہے۔

علمی روایات اور خاندانی پس منظر نے بھی خواتین کی نعت گوئی کو تحرک عطا کیا ہے۔ ذیل میں ہم جن نعت گو شاعرات کا مختصر تعارف و نمونہ کلام پیش کر رہے ہیں، اس حوالے سے ان میں سے بالخصوص پروین جاوید، صغریٰ نصیر، مخفی امروہوی اور مسرت جہاں کا نام لیا جاسکتا ہے۔

حرمین شریفین کی زیارت ایک بڑی سعادت ہے۔ جن خوش نصیب شاعرات کو یہ سعادت حاصل ہوئی ہے، ان کے جذبہ حبِّ نبی میں اضافے اور ان کی شعر و سخن کی صلاحیتوں کا رخ نعت گوئی کی جانب موڑ دینے میں اس مبارک سفر نے مہمیز کا کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں درجِ ذیل شاعرات میں

سے راحت آراء سہیل، ریحانہ تبسم فاضلی، رضیہ ناصر سکیس، ناصرہ رفیق اور نورین طلعت عروبہ قابل ذکر ہیں۔

اہلِ خانہ کی ہمت افزائی کے نتیجے میں جن شاعرات نے اردو کی نعتیہ شاعری کی ترویج وفروغ میں اپنا کردار ادا کیا، ان میں حنفی امروہوی اور ام عبدِ منیب کا نام بالخصوص لیا جاسکتا ہے۔

خواتین کے یہاں بعض نعتیں ''نعتِ مسلسل'' کی تعریف میں بھی آتی ہیں۔ مثلاً حضور کی دنیا میں تشریف آوری، یا واقعۂ معراج یا میلاد شریف کی محفل کا بیان۔ تاکہ یہ نعتیں خواتین کی محافل میں اجتماعی انداز میں پڑھی جائیں۔

بعض شاعرات کے نعتیہ مجموعوں میں یہ انفرادیت بھی ملتی ہے کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے حوالے سے ۶۳ نعتوں اور ۶۳ قطعات پر مشتمل مجموعہ نعت ترتیب دیا۔ مثلاً پروین جاوید کا مجموعہ نعت ''حضوری چاہتی ہوں''۔ (۲۲) اسی طرح پروین جاوید ہی کا دوسرا نعتیہ مجموعہ 'اسمِ طیبہ'' (۲۴) حضورِ اکرم ﷺ کے اسمائے مبارکہ کی نسبت سے ۹۹ نعتوں پر مشتمل ہے۔

طاق کا عدد اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے۔ ام عبدِ منیب نے اسی مناسبت سے اپنے مجموعۂ نعت ''مدحِ مزمّل'' (۲۳) میں ہر نعت کے اشعار پابند طاق تعداد میں رکھے ہیں۔

فوزیہ انجم نے حضورِ اکرم ﷺ کے صفاتی ناموں کی مناسبت سے ذاتِ رسالت مآب ﷺ کو اپنی نعتیہ شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ آپ کی ذات سے صفات اور صفات سے تلازمات پیدا کیے ہیں اور یوں اپنے نعتیہ مضامین کو لفظ و بیان کا پیرایہ عطا کیا ہے۔ (۲۴)

ہر سمت میں ہیں اسم محمدؐ کی برکتیں
سارا جہان آپ کے نام انتساب ہے

وجود ایسا کہ طاہر ہے اور مطہّر ہے
فضا مدینے کی جس ذات سے منور ہے (۲۵)

عہد حاضر کی نعت گو شاعرات تعلیمات قرآنی اور فرمودات نبوی ﷺ کو اظہار کا ذریعہ بنارہی ہیں۔ اس حوالے سے بطورِ مثال ریحانہ تبسم فاضلی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ کسی مقام پر صورت مصطفیٰ ﷺ کی عکاسی اور کسی مقام پر سیرت کے اظہار پر زور، کہیں ہجرِ مدینہ کی تڑپ اور حاضری کی آرزو اور کہیں قلب گداز و سوزِ دروں نمایاں ہے۔

جدید رجحانات کے حوالے سے دیکھا جائے تو نعتیہ شاعری میں اکثر و بیشتر ملت اسلامیہ کی زبوں

حالی کا استغاثہ حضور اکرم ﷺ کے دربارِ اقدس میں پیش کرنے کا انداز بھی ملتا ہے۔ آشوبِ ملت کے حوالے سے اپنی بے بسی اور لاچاری کا بیاں بھی نعت میں ملتا ہے۔ شاعرات کی نعت گوئی میں یہ رجحان زیادہ نمایاں ہے۔ جس کی مثالیں ہم آگے چل کر اپنے مقام پر پیش کریں گے۔

ذیل میں ہم عصرِ حاضر کی چند نعت گو خواتین اور ان کے نعتیہ مجموعوں کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔ جن سے اردو کی نعتیہ شاعری میں ان کے کردار اور رجحانات و میلانات کا کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بیشتر نعت گو شاعرات وہ ہیں جن کا ذکر ماقبل کے تذکروں کی زینت نہیں بنا ہے۔

انجم، فوزیہ

حضور اکرم ﷺ کے اسمائے حسنہ کا ذکر اردو نعت کا اہم موضوع ہے۔ آپ ﷺ کے بے شمار صفاتی نام ہیں، ان میں سے کچھ قرآن کریم میں ہیں، کچھ احادیث رسول ﷺ کے مجموعوں میں۔ فوزیہ انجم نے ان ناموں کی مناسبت سے حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ سلام و درود بھی فوزیہ انجم کی نعت گوئی کا ایک موضوع ہے جو مختلف نعتوں میں مختلف طرح سے اظہار پذیر ہوا ہے۔ اس ضمن میں ایک نعت خصوصیت سے ذکر کے قابل ہے:

سلام اس کی ریاضت پر امیں ہے دشمنوں کا بھی　　جسے کافر کہے صادق، سلام اس کی صداقت پر
تھے جس کے منتظر سارے نبی اقصیٰ کی مسجد میں　　رُسل بھی مقتدی جس کے، سلام اس کی امانت پر
(۲۶)

سادگی، فوزیہ انجم کی نعت گوئی کا نمایاں وصف ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

انوار کی کثرت ہوجائے　　سرکار عنایت ہوجائے
ہر سانس درود و سلام پڑھوں　　پختہ یہی عادت ہوجائے　　(۲۷)

اُم عبدِ منیب

اُم عبدِ منیب کو اللہ تعالیٰ نے ابتدائے شعور سے ہی ذوقِ نعت گوئی عطا کیا تھا۔ اہلِ خانہ کی حوصلہ افزائی نے اس ذوق کو مزید پروان چڑھایا۔ (۲۸) نعت گوئی نعت کہنے والے سے اپنے ممدوح کے منصب اور احترام کی پاسداری کا تقاضا کرتا ہے اس سلسلے میں ام عبد منیب نے کچھ اصول اپنے پیشِ نظر رکھے۔ (۲۹) چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آپ کی سیرت اعظم اعظم　　قولاً فعلاً اکرم اکرم
آپ کی شفقت لمحہ لمحہ　　آپ کی رحمت پیہم پیہم　　(۳۰)

خود کو بڑا محسوس کریں ان کے دَر پر چھوٹے بھی
کندن آپ کی نظروں سے سکّے کھوٹے کھوٹے بھی (۳۱)

اُمِ بلال

ام بلال کے کئی نعتیہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''اسرارِ نور''، ''حصارِ نور''، ''بہارِ نور''، ''اذکارِ نور''، اور'' انہارِ نور''۔ ام بلال کے نعتیہ کلام میں ایک خاص قسم کا جذب و کیف ہے۔ محبوب دو جہاں کی محبت اور سرزمین حجاز کا ذکر ایسے دل نشین اور سحر انگیز انداز میں اس خوبصورتی سے کیا ہے۔

نہ موسموں کی قید میں میری بہار ہو
آنگن میں ان کے ذکر کے کھلتے رہیں گلاب (۳۲)

ہر زمانہ میرے حضور کا ہے دل ٹھکانہ میرے حضور کا ہے
جینا مرنا نہیں الگ اس کو جو دیوانہ میرے حضور کا ہے (۳۳)

بشریٰ فرخ

معاصر نعت گوشاعرات میں بشریٰ فرخ کا نام نمایاں ہے۔ ''ورفعنا لک ذکرک''، بشریٰ فرخ کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ نعت سے قبل نظم اور غزل میں کامیاب شاعری کی اور اپنی فنی ریاضت سے نئی شاعرات میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ انھوں نے نعت کو محض ایک موضوع کے طور پر نہیں برتا بلکہ اس میں فنی پختگی کے کامیاب نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ یہ مشقِ سخن ہی ان کی کل کائنات ہے:

میں حمد و نعت و منقبت کے پھول لے کے آئی ہوں
کہ میرے واسطے یہ میری ساری کائنات ہے (۳۴)

خدا کے بعد ہے تو بس مرے نبی کی ذات ہے
انھی کے واسطے ہے سب، درود ہے کہ نعت ہے (۳۵)

اک نگاہِ کرم وہ اثر کرگئی ہر نظر میں مجھے معتبر کرگئی
بے شبہ دو جہاں کی محبت فقط دل کے ویراں مکاں کو جو گھر کرگئی (۳۶)

مرے دل کو بھی آقا شاد کردیں
مکیں بن کر مکاں آباد کردیں (۳۷)

پروین جاوید

شاعرات میں پروین جاوید (پ: ۱۹۵۲ء) ایک معتبر نام ہے۔ پروین جاوید ایک مذہبی و علمی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ کے والد سید محمد ایوب وارث پاک کے سلسلے کے مرید تھے جب کہ والدہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے خانوادے سے تعلق رکھتی تھیں۔ (۳۸) پہلی نعت ۱۹۷۲ء میں ایک نعتیہ مشاعرے میں پڑھی۔ نعت گوئی کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔

''حضوری چاہتی ہوں'' پروین جاوید کا نعتوں کا اوّلین مجموعہ ہے جو غزلیہ ہیئت کی نعتوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں خاصی تعداد نعتیہ قطعات کی ہے۔ ڈاکٹر عاصیؔ کرنالی اظہار خیال کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ تمام نعتیں مختلف بحور میں ہیں۔ بحروں کے چناؤ میں انھوں نے روانی، شگفتگی اور ترنم کا خیال رکھا ہے۔ بوجھل، ادق اور نامانوس وغریب بحروں سے اجتناب برتا ہے۔ ان کی یہ بھی کوشش رہی ہے کہ معروف شعرا کی زمینوں پر شعر کہنے سے گریز کریں۔ سو ان کے یہاں اپنی زمینیں اور بالعموم اپنی ہی ردیفیں یا نظامِ قوافی ملتا ہے۔ اس شعری عمل سے قاری یا سامع کو نئی فضاؤں کا احساس ہوتا ہے اور وہ کسی بھی کہنگی کے خدشات کے بغیر ایسی شاعری کو خوشگواری کے ساتھ پڑھتا یا سنتا ہے۔'' (۳۹)

ڈاکٹر عاصیؔ مزید لکھتے ہیں:

''مجھے بعض نعتوں پروین جاوید کا نسائی لہجہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی یہ بے حد ضروری ہے کہ خواتین کی شاعری میں نسائی لہجہ موجود ہو اور انسانی جذبوں کا اظہار ہوتا ہو اس سے شاعری حقیقت کی آئینہ دار ہوتی ہے اور اس کی معنویت جو صداقت و اصلیت کی بنیاد پر ابھرتی ہے، سچے اثرات پیدا کرتی ہے۔ (۴۰)

ان کے نام کی مالا جپتی رہتی ہوں   بس ان سے ہی دھیان لگائی رہتی ہوں
بن دیکھے وہ جانیں ہیں سب حال مرا   بس یہ سوچ کے میں خوش ہوتی رہتی ہوں (۴۱)

پروین جاوید کے یہاں جذبات، خیالات، افکار اور مضامین کی کثرت اور رنگا رنگی ہے۔ چند متفرق اشعار ملاحظہ ہوں:

تصور میں شہِ بطحا کا گھر ہے
یہ آنسو چشمِ نم میں کم نہ ہوں گے (۴۲)

میرے آقاؐ کی عظمتوں کا سفر
ختم معراج پر نہیں ہوتا (۴۳)

زد میں آجاؤں ہواؤں کی تو پھر اس کا خیال — میری بجھتی ہوئی شمعوں کو ضیا دیتا ہے
راہِ ہستی میں اگر موجِ حوادث ہو بلند — وہ بلندی میرے قامت کی بڑھا دیتا ہے (۴۴)

غالباً تم نہ پہنچ پائے کبھی ان کے حضور — ہاتھ خالی کوئی اس در سے تو آتا ہی نہیں
دل کی دھڑکن سے مِلا ہے شہِ طیبہ کا پتہ — ہم نے رستہ تو کسی سے کبھی پوچھا ہی نہیں (۴۵)

سید محمد ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

''حضوری چاہتی ہوں، نعتیہ مجموعہ کا نام بھی ہے، شاعرہ کی تمنا بھی اور شخصیت کا اظہار بھی... اور عجیب پہلو یہ ہے کہ حضوری کے حصول کے باوصف حضوری کی تمنا ہے... پروین جاوید کے اس مجموعہ میں چشمِ نم کے ساتھ قربت کی آرزو میں دھڑکتا دل اور اور اسوۂ حسنہ پر چلنے کی تمنا ہر صفحہ پر موجود ہے۔ انھی سب باتوں کے مجموعہ کا نام نعت ہے۔ اس مجموعہ میں نئی ترکیبیں، نئے اظہار جیسے خود بخود وجود میں آتے چلے گئے مثلاً اپنی حیات کو سفینہ کہنا جس کا رخ اب سوئے طیبہ ہے۔'' (۴۶)

'سرِ طیبہ' پروین جاوید کا محاسنِ لفظی و معنوی سے مالا مال، ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے والہانہ عقیدت و فریفتگی کا اظہار کرتا دوسرا نعتیہ مجموعہ ہے۔ غزلیہ ہیئت کی نعتوں پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں خاصی تعداد نعتیہ قطعات کی ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کے اسمائے مبارکہ کی نسبت سے ۹۹ نعتیں اس مجموعے میں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں تمام نعتیں مختلف بحور میں ہیں۔ پروین جاوید کی نعتوں کا غالب مضمون ہجرِ مدینہ کی تڑپ اور حاضری کی آرزو اور مدینہ طیبہ میں رہ جانے کی تمنا ہے۔ جسے وہ نئے نئے رنگ اور ڈھنگ سے پیش کرتی ہیں:

لوگ جو سایۂ رحمت کا اثر جانتے ہیں
ساری دنیا کو تری راہ گزر جانتے ہیں (۴۷)

گنبدِ سبز آنکھوں کا مسکن ہوا
آج پرویں پہ لطف و کرم دیکھیے (۴۸)

غمِ دنیا سے دوری چاہتی ہوں
سرِ طیبہ حضوری چاہتی ہوں (۴۹)

نبی کے عشق میں خود سے بھی بے خبر ہو جاؤں
سنا یہ ہے، کہ وہ ہر بے خبر کو دیکھتے ہیں (۵۰)

تبسم، ریحانہ تبسم فاضلی

ریحانہ تبسم فاضلی کا شمار ان خوش نصیب شاعرات میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو حمدِ ربِّ جلیل اور ثنائے رسول ﷺ کے لیے وقف کردیا ہے۔ ایک مذہبی وعلمی گھرانے سے آپ کا تعلق ہے۔(۵۱) ''مہکتے حروف''، ریحانہ تبسم فاضلی (پ:۱۹۴۶ء) کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے۔ ''ریحانہ تبسم نے حمد ونعت میں جو خلوص وعقیدت کے چراغ روشن کیے ہیں وہ صرف اپنے باطن کو روشن رکھنے کے لیے نہیں کیے ہیں بلکہ وہ اس روشنی کو عام کرنے کی بے لوث تمنا رکھتی ہیں۔''(۵۲)

عزیز احسن لکھتے ہیں:

''مہکتے حروف کی حمدیہ شاعری میں عجز عبودیت، نعت میں احترام شریعت اور حب رسالت کا والہانہ اظہار، مناقب میں اعتدال پسندی اور موضوعاتی نظموں میں انتخاب و واقعات کی خوبی لفظ لفظ سے جھلک رہی ہے۔(۵۳)

چند اشعار جو اپنی سادگی اور خلوص واظہار کا آئینہ ہیں ملاحظہ کیجیے:

مری آنکھوں میں ہیں طیبہ کے جلوے
دیا یادوں کا دل میں جل رہا ہے(۵۴)

نعت کے روپ میں اظہارِ وفا کرتی ہوں
مجھ پہ جو قرضِ محبت ہے ادا کرتی ہوں(۵۵)

''خطیب الامم'' ریحانہ تبسم فاضلی کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ہے۔ ریحانہ تبسم فاضلی کے حمد ونعت کے اس مجموعے میں اپنی بندگی کا اظہار اور رسولِ خدا ﷺ سے اپنے وجود کی تمام توانائیوں کے ساتھ محبت کا بیاں جذبات کی پاکیزگی اور روح کی بالیدگی کا نمایاں عنصر ہے، بندگی اور مودّت کی زبان نہایت سادہ مگر دل نشیں ہے، نہ بوجھل تشبیہیں نہ بعید از قیاس استعارے، محبت کی زبان میں محبت کا اظہار اور بس! ریحانہ تبسم فاضلی کا خود یہ کہنا ہے کہ میں نے اپنی نعتیہ شاعری میں سرسید کے اصول کو اپنایا ہے کہ جہاں تک ہوسکے مرصع سازی سے بچوں۔ کام کی باتیں سادہ اور عام فہم زبان میں ہوں۔(۵۶) وہ وجد و سرشاری کے عالم میں بھی شریعت کا دامن مضبوطی سے تھامے رہتی ہیں۔

ریحانہ تبسم فاضلی نے اپنے نعتیہ کلام کے ذریعے مدحتِ رسول اور ثنائے پیغمبر کو اپنا فرض سمجھا اور اپنی اس صلاحیت اور شاعرانہ ذوق کو اللہ اور رسول کی عنایت وکرم ہی جانا:

یہ نوازش ہے میرے آقا کی
ان کی مدحت میں شعر ڈھلتے ہیں(۵۷)

وہ چونکہ تاریخ کی استاد بھی رہی ہیں اس لیے ان کے اشعار میں تازگیٔ فکر کے ساتھ تاریخی واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مثلاً:

غارِ حرا سے نکلا وہ کچھ ایسی شان سے
رشتہ زمیں کا جوڑ دیا آسمان سے (۵۸)

طائف کی سرزمین خود اس کی گواہ ہے
ہاتھ اپنے بد دعا کو اٹھائے نہیں کبھی (۵۹)

طیبہ کی خاک تبسم مرے آنسو چومے
عشق کا اتنا بھرم چشمِ ندامت رکھنا (۶۰)

ریحانہ تبسم کی حمدیہ و نعتیہ شاعری بھی اسی حجازِ مقدس کی محبت کا انمول تحفہ ہے جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے:

میری نعت میں آج جو نغمگی ہے انھی کے وسیلے سے مجھ کو ملی ہے
لبوں پر مرے نامِ نامی ہے جس کا جہاں میں اسی نام کی روشنی ہے (۶۱)

''خیر الوریٰ'' ریحانہ تبسم کا چوتھا نعتیہ مجموعہ ہے۔ ریحانہ ان خوش نصیب شعراء میں شامل ہیں جنھوں نے اپنی فکر کو حمد و نعت کے حوالے سے مخصوص کر دیا ہے۔ خواجہ رضی حیدر لکھتے ہیں:

''پروفیسر ریحانہ تبسم فاضلی نے اردو کے تمام قدیم و جدید نعت گو شعراء کا مطالعہ بھی کیا ہے بلکہ علمِ دین کے حصول پر بھی توجہ دی ہے، اس لیے وہ حمد و نعت کی مقتضیات سے بہ تمام و کمال واقف ہیں بلکہ ان کے موضوعات بھی دین کے دائرے سے شعر کے قالب تک پہنچتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی تفہیم پر انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد اٹھائی ہے کیونکہ وہ حمد و نعت گوئی کو تبلیغ دینِ متین کا ایک موثر ذریعہ بھی تصور کرتی ہیں۔ حق گوئی کی جرأت نعت گوئی میں اظہار کی سعادت کا روپ دھار لیتی ہے اور اظہار کی یہ سعادت پروفیسر ریحانہ فاضلی کے ایک ایک لفظ سے عیاں ہے۔

یوں مرے حرف حرف میں نکہت و حسن و نور ہے جیسے مرے خیال کے چلتا ہے ساتھ ساتھ تو
کوئی پوچھے جو اگر معنیٔ قرآں مجھ سے میں اسے سیرتِ سرور کا خلاصہ لکھوں (۶۲)

اسی در سے ملی ہے روشنی اذہانِ عالم کو اسی در سے ملا ہے راستہ اللہ کے گھر کا
زمین و آسماں روشن ہیں جسؐ کے نامِ نامی سے یہ سب عکسِ کرم ہے انؐ کے ہی روئے منور کا (۶۳)

جبیںؔ، بشارت

''اسیرِ مصطفیٰ بن کر'' یہ مجموعہ نعت ایک ایسی شاعرہ کی اوّلین کوشش ہے جو ادبی حلقوں میں غیر معروف ہے۔ اس نے نہ اس سے پہلے شاعری کی ہے اور نہ کسی رسالے میں اس کا کلام متعارف ہوا ہے۔ بشارت جبیں نے اپنے حقیقی جذبات اور قلبی واردات کی ترجمانی کے لیے اس میدان کا رخ کیا۔ چنانچہ انتہائی سادگی اور شائستگی سے آنحضرت کے حضور عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں۔ الفاظ کی بندش اور انداز کے والہانہ پن سے کسی غیر مرئی جذبے کی عکاسی ہوتی ہے۔ بشارت جبیںؔ کو چترال کی پہلی اردو شاعرہ اور نعت گو ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ (۶۴)

بشارت جبیں کی نعتیہ شاعری میں راہِ حجاز، حرمین شریفین، طواف بیت اور زیارت گنبد خضرا کے مناظر روشن نظر آتے ہیں۔ بشارت جبیں اپنی نعتیہ شاعری میں قاری کو دعوتِ نظارہ کے ساتھ ساتھ دعوت فکر بھی دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ ہوگا سرخرو دونوں جہاں میں رب کا وعدہ ہے
کرے گا عشق کوئی دل سے گر آقا کی سنت سے (۶۵)

جن کے قدموں پہ ہے واری روئے زمیں
چومنے ہم بھی نقشِ کفِ پا چلیں
آؤ طیبہ چلیں
آؤ طیبہ چلیں (۶۶)

تیرے بیاں سے دل میں ہل چل سی مچ گئی ہے
کاغذ مہک گیا ہے لکھتے ہی نام تیرا (۶۷)

حمیرا راحت

حمیرا راحت درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ ان کے غزل کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ کلام ''میرے آقا ﷺ'' نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ حمیرا راحت کی نعتیہ شاعری کا محور ذاتِ رسالت مآب ﷺ ہے۔ گنبدِ خضرا، سنہری جالیاں، خاکِ طیبہ اور حضوری کی تمنا شدّت کے ساتھ ملتی ہے۔

سورج تھا میرے ساتھ نہ ہمراہ ستارے
میں آگے بڑھی اسمِ محمدؐ کے سہارے

آپ کے ذکرِ مبیں نے مجھ پہ احساں کردیا		ذہن کو مثلِ حرا اور دل کو قرآں کردیا
میری ہستی بے نشاں تھی آپ نے پہچان دی		میرے ہر اِک درد کو آقا نے درماں کردیا
(۶۸)

رخشاں، اے۔ بی۔

''ثمن زارِ عقیدت'' اے۔ بی۔ رخشاں کی شاعری کا تیسرا اور نعت کا پہلا مجموعہ ہے۔ عقیدتوں، محبتوں سے بھرپور حضور ﷺ کے اوصافِ حمیدہ و انوار کی تجلیات سے معمور نعتیہ کلام کی صورت میں موجود ہے۔ فکر و فن اور اسلوب و بیان و زبان میں بھی منفرد ہیں۔ محبت رسول ﷺ ہی ان کا اثاثہ ہے:

کاش پھر سوئے حرم اذنِ مدینہ ہو مجھے
پھر میری آنکھ کو دیدار نصیب ہوجائے (۶۹)

سہیل، راحت آراء

''دیدارِ کعبہ'' راحت آراء سہیل کے ان جذبات واحساسات کی عکاسی ہے جو خانۂ خدا اور مسجدِ نبوی کی زیارت سے پہلے ان کے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ ان مشاہدات اور تجربات کا بیان ہے جو دیدارِ کعبہ کے دوران انھوں نے محسوس کیے اور ان قیمتی لمحوں کی یاد ہے جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں گزرے۔ (۷۰)

دیدارِ کعبہ کا کلام اس لحاظ سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہی میں لکھا گیا بلکہ اس کی ''آمد'' خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی کے احاطہ ہی میں ہوتی رہی۔ ایسا لگتا ہے کہ شاعرہ کے دل میں دیارِ مصطفیٰ ﷺ میں حاضر ہوتے ہی ان تمام محسوسات کا دریا موجزن ہوگیا جو حاضری اور حضوری کے لیے ان کی تڑپ اور شیفتگی نے عرصے سے ان کے باطن میں رواں دواں رکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بے ساختگی اور سلاست کے پیرائے میں دیارِ طیبہ و بطحا میں ان کی درجہ بہ درجہ حاضری مرحلہ وار حضوری میں بدلتی اور ڈھلتی نظر آتی ہے۔ (۷۱)

وہ کیفیت دل بیاں ہو تو کیسے،		نہ اظہار ممکن نہ الفاظ کافی
ہوا سبز گنبد کا پہلا نظارہ، میرا دل بھی		جھوما میری روح بھی جھومی (۷۲)

صغریٰ فاطمہ نصیر

''صدائے روح'' صغریٰ فاطمہ نصیر کا مجموعہ کلام ہے۔ جس کا ایک حصہ نعتوں پر اور ایک حصہ ان کے پیر طریقت کی منقبت پر مشتمل ہے۔ صغریٰ فاطمہ کوئی سکہ بند شاعرہ نہیں تھیں۔ بس یہ تھا کہ قدرت نے

انھیں قلب گداز بھی دیا تھا اور موزونیِ طبع بھی۔ شعر گوئی شعر فہمی کی صلاحیت انھیں گھر ہی سے ملی۔ (۷۳)

وہ شاہِ انبیا مہر رسالت سرور عالمؐ
انھیں کی یاد سے سینہ منور رہتا ہے ہر دم
وہ جن کے نامِ نامی نے سرورِ جانفزا بخشا
وہ ہیں امی لقب محبوبِ رب اور محسنِ اعظمؐ
نظر کے سامنے رہتا ہے ان کا روضۂ اطہر
ہوئی ہے جب سے میری آنکھ ان کی یاد میں پُرنم
(۷۴)

طلعت اشارت

طلعت اشارت دیارِ غیر میں مقیم ہیں اور طویل عرصے سے شعر کہہ رہی ہیں، نعتیہ مجموعے ''سرمایہ'' سے قبل ان کی غزلوں اور نظموں کا ایک مجموعہ ''اشارت'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ انھیں شعر گوئی کا سلیقہ بھی ہے اور وہ اپنے جذبے، احساس اور فکر کو شعر میں ڈھالنے کا ہنر بھی جانتی ہیں۔ انھوں نے ایک طرف عقیدت و احترام کے احساسات کے وفور سے کام لیا ہے تو دوسری طرف اظہار و بیاں کے سلیقے کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور دونوں کے امتزاج سے ایسا کلام تخلیق کیا ہے جو پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتا ہے۔ زیارت حرمین شریفین کی دل نواز مسافرت کی یادوں نے اسے حسن معنوی بھی عطا کر دیا ہے۔

حضورؐ دل کو مرے آگہی عطا کیجے
میں ایک ذرّہ ہوں، تابندگی عطا کیجے (۷۵)

بس ان کا ذکر ہو لب پر، بس ان کی یاد ہو دل میں
یہی دیوانگی طلعتؔ ترا شہکار ہو جائے (۷۶)

دل عشق مصطفیٰؐ سے سرافراز ہو اگر
یہ زندگی ہے جیسے ... اثر ہو دعا کے بعد (۷۷)

تخفی امروہوی

تخفیؔ بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہیں۔ زیارت حرمین شریفین کی برکت سے نعتیں بھی کہی ہیں جن کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن معیاری ہیں۔

وہ اور ہیں جنھیں حسرت ہے غم گساروں کی
غمِ حبیب مرا غم گسار کافی ہے (۷۸)

زندگانی اس قدر آساں نہ تھی
میرے آقا کی بدولت ہوگیا(۷۹)

کرم مجھ پہ آقا کا مخفی ہوا
جو مانگا، وہ مجھ کو عطا ہوا(۸۰)

میں جن کی نام لیوا ہوں وہ میری لاج رکھیں گے
مجھے کیا فکر کیوں الجھی رہوں جیب و گریباں میں(۸۱)

مسعودہ خانم

مسعودہ خانم ان شاعرات میں سے ہیں جو گزشتہ نصف صدی سے حمد و نعت کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ مسعودہ خانم کا پہلا مجموعہ حمد و نعت ''ابرِ رحمت'' ۱۹۹۱ء میں، دوسرا ''رحمتِ بے کراں'' ۱۹۹۳ء میں اور تیسرا ''منبعِ رحمت'' ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ (۸۲) اپنی زندگی کی پہلی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

ایک ان کے کرم کی نظر چاہیے
مجھ کو آقا کی نگری میں گھر چاہیے(۸۳)

مسکیں، رضیہ ناصر

رضیہ ناصر مسکیں مشرقی پنجاب شہر ہوشیار پور (انڈیا) میں پیدا ہوئیں۔ قیام پاکستان کے وقت اپنے والدین کے ہمراہ ہجرت کر کے فیصل آباد (پاکستان) میں مقیم ہوئیں۔ گورنمنٹ کالج فار ویمن فیصل آباد سے تعلیم مکمل کی۔ کالج کے زمانے میں کالج کے رسالے ''سیماب'' سے منسلک رہیں۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی۔اے میں اوّل پوزیشن حاصل کی اور عربی میں دو گولڈ میڈل حاصل کیے۔(۸۴)

۱۹۹۳ء میں فریضہ حج کے بعد حرمین شریفین سے واپسی پر اپنے سفرِ حمد و نعت کا آغاز کیا۔(۸۵) ۲۰۰۵ء میں اپنی فیملی کے ہمراہ کینیڈا منتقل ہوگئیں۔ کینیڈا کے شہر واٹرلو میں انجمن غلامانِ رسول کے نام سے تنظیم بنا کر حمد و نعت گوئی اور دینی محافل کا سلسلہ شروع کیا۔ ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو کینیڈا ہی میں انتقال ہوا۔(۸۶) رضیہ ناصر مسکیں کا مجموعہ حمد و نعت ''عقیدتوں کی مہک'' کے عنوان سے ان کے انتقال کے بعد ان کے شوہر ناصر الدین ناصر نے شائع کیا۔

رضیہ ناصر سکیں نے عربی، اردو اور پنجابی زبان میں نعتیں کہیں ہیں۔

شاہِ بطحا کی گدائی مل گئی
ہم کو تو جیسے خدائی مل گئی(۸۷)

جہاں رہوں وہ مدینہ مری نظر میں رہے — یہ قلب و جاں میرے مولا اسی اثر میں رہے
ضیائے نعتِ نبیؐ ساتھ لے کے جاؤں میں — کوئی اندھیرا نہ ہرگز مری قبر میں رہے(۸۸)

نازؔ، ریحانہ شفاعت

''نورِ محبت'' ریحانہ شفاعت نازؔ کا بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں نذرانہ عقیدت و محبت ہے۔ مسجدِ نبوی ﷺ میں بھی نعتیں لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ کلام میں سادگی و روانی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیکھ لوں حرم، ہو تیرا کرم — رکھ لے میرا بھرم، ہو تیرا کرم
ہاتھ ہوں پھیلے تیری سرکار میں — جھولی پھیلے تیرے دربار میں(۸۹)

ناصرہؔ رفیق

ناصرہؔ رفیق ایک علمی و ادبی ماحول کی پروردہ ہیں۔ گھر میں اکثر ادبی محفلیں سجتی تھیں۔ بڑے بڑے ادیب شاعر اور سیاست دان ان محفلوں میں شامل ہوتے تھے جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، فیض احمد فیض، احمد فراز، استاد قمر جلالوی، کلیم جلیسری، اظہر من الشمس، عبدالحمید عدم، شوکت واسطی، محسن احسان، انور سدید جیسے بلند پایہ علماء اور ادیب نمایاں تھے۔ ''تسبیحِ نور'' ان کا نعتوں اور منقبتوں کا خوبصورت مجموعہ اردو اور پنجابی زبان میں ہے۔

ناصرہؔ رفیق ان خوش بخت شاعرات میں ہیں جنھوں نے حمد و نعت گوئی کے لیے خود کو وقف کر دیا ہے۔ اس سے قبل ایک نعتیہ مجموعہ ''پھوٹی کرن حجاز سے'' منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ ان کی شاعری میں دیارِ رسول کی تڑپ، جستجو اور چاہت نمایاں ہے۔

آپ کے وجود نے بھر دیے رنگ کائنات
توڑ کے ساری ظلمتیں صبح قرار آگئی(۹۰)

حضور سایہ اطہر میں ایک شام ملے
میری ریاضت بے چین کو قیام ملے(۹۱)

ذوقِ نظر حضور کی محفل میں جا بسوں
رنگِ مدینہ تیری رُتوں میں سما سکوں (۹۲)

ناظرہ عالَم

منور جہاں ادبی نام ناظرہ عالَم ۱۷ ستمبر ۱۹۱۷ء کو بدایوں (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ فروری ۲۰۰۴ء میں کراچی میں انتقال ہوا۔ آپ کا گھرانے کا شمار بدایوں کے مشہور ادبی گھرانوں میں ہوتا تھا۔ آپ اردو زبان و ادب کی معروف شاعرہ ہیں۔ ''کلامِ ناظرہ'' آپ کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔

محمدؐ آگئے دنیا میں شاہِ مرسلیں ہو کر
حبیبِ کبریا ہو کر رسالت کے امیں ہو کر (۹۳)

نور جہاں بنتِ احمد عرب

نور جہاں بنتِ احمد عرب ۲۷ جون ۱۹۵۵ء کو بھارت کے شہر احمد آباد میں پیدا ہوئیں۔ علمی و ادبی گھرانے سے آپ کا تعلق تھا۔ شعبۂ عربی، جامعہ کراچی میں آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں۔ آپ کا نعتیہ کلام ''تحفۂ نور'' کے عنوان سے کراچی سے شائع ہوا۔ آپ کے کلام میں عمل کی خوشبو اور عقیدت و محبت کے رنگ نمایاں ہیں۔

میری مجال کیا کروں تعریف مصطفیٰؐ
اُن کا کرم ہے آج یہ عزت ملی مجھے (۹۴)

نورین طلعت عروبہ

''حاضری'' (صدارتی ایوارڈ یافتہ مجموعہ ۲۰۰۲ء) نورین طلعت عروبہ کی نعتوں کا اوّلین مجموعہ ہے۔ محسن بھوپالی لکھتے ہیں:

''ان کی نعتوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اس صنفِ سخن کو روشِ عام کے طور پر نہیں اپنایا ہے۔ انھوں نے حتی الامکان اپنی زمینیں تراشنے کی کوشش کی ہے اور اپنے لہجے اور اپنی لفظیات میں خیالات اور جذبات کو شعری جامہ پہنایا ہے۔ اور ایسا کرنے میں وہ کہیں بھی آورد کا شکار نہیں ہوئی ہیں۔ ان کی نعتوں کو پڑھ کر ذہن تازگی اور سرشاری محسوس کرتا ہے۔'' (۹۵)

پھول سے کھلنے لگے ہیں اس کے گرد و پیش میں
جو خیالِ مصطفیٰؐ کو دشتِ جاں تک لے گیا (۹۶)

ظلمتِ شب میں کسی ڈوبتی کشتی سے کوئی — آپ کا نام پکارے تو کنارا چمکے
دفعتاً آنکھ نے یوں گنبدِ خضرا دیکھا — شدتِ پیاس میں جیسے کوئی دریا چمکے (۹۷)

یہ سامنے روضے کے کھڑی سوچ رہی ہوں
ہاتھ اٹھے دعاؤں کو تو مانگوں گی میں کیا اور (۹۸)

نعت در نعت عجب سلسلۂ خوشبو ہے
جیسے پھولوں کا کھلے جانا، گلستاں ہونا (۹۹)

عروبہ نے بعض اشعار میں مسلمانوں اور قبلۂ اوّل کی بے بسی اور حالِ زار کا ذکر بھی نہایت دردمندی سے کیا ہے:

شبِ معراج بہاروں کی پذیرائی میں تھا
آج کانٹوں میں گھرا مسجدِ اقصٰی کا گلاب

ان کی شاعری میں مدینہ طیبہ کی محبت، گنبدِ خضرا کا تصور حرزِ جاں ہے:

جو مدینے کی مسافت میں تھکے اور نہ رکے
وہی پُر شوق قدم لے کے چلے آئے ہیں (۱۰۰)

دیکھا جو مدینہ تو کھلی ایک حقیقت
کچھ بھی نہیں رکھا تمنائے دگر میں (۱۰۱)

مانگتا ہے گنبدِ خضرا سے اس کی روشنی
کس قدر اعلیٰ ہے ذوقِ آفتابی دیکھیے (۱۰۲)

تمھیں دنیا کے سارے رنگ ہی پھیکے نظر آئیں
اگر وہ سبز گنبد آنکھ میں تصویر ہو جائے (۱۰۳)

''زہے مقدر'' نورین طلعت عروبہ کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ہے۔ جس کے بارے میں بشیر حسین ناظم لکھتے ہیں: اس مجموعے میں نورین نے نئی ردیفوں اور نئی قوافی کو استعمال کر کے اپنے مشاہدے اور مجاہدے کا ثبوت دیا ہے۔ اب نورین کی لکھی ہوئی نعتوں میں مضامین دلکش کا تنوع ہے، موضوعات کا تلاطم ہے، لفظوں کے انتخاب اور صنائع بدائع کی روشنی ہے۔ (۱۰۴)

مدینہ آکے کھلا ہے کہ رحمتیں کیا ہیں
یہیں پہ آ کے نظر آئی انتہائے کرم(۱۰۵)

مشکل میں جب لیا کبھی صلِ علیٰ کا نام
سنورے تمام کام، میں لکھتی چلی گئی(۱۰۶)

وہ برگِ زرد کو پھر سے نہال کرتا ہے
نبیؐ کے شہر کا موسم کمال کرتا ہے(۱۰۷)

نوریؔ، مسرت جہاں (بیگم شفیق بریلوی)

مسرت جہاں نوری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۶ء میں افسانہ نگاری سے کیا۔ دہلی کے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ایک ہفت روزہ کی اعزازی مدیر بھی رہیں۔ قیامِ پاکستان کے زمانے میں قائداعظم کو اپنے خون سے لکھ کر ایک خط بھیجا تھا جس میں اپنی خدمات مسلم لیگ کو پیش کی تھیں۔(۱۰۸) نعت گوئی کا آغاز ۱۹۷۵ء سے کیا۔(۱۰۹)

''ندائے نوری'' مسرت جہاں نوری بیگم شفیق بریلوی کا مجموعہ حمد، نعت و منقبت ہے۔ بیگم شفیق بریلوی کو احساس ہے کہ نعت گوئی ایک جرأت بیکراں ہے لیکن سرکارِ ختم المرتبت ﷺ کی اس کنیز کے دامنِ خالی میں یہی دولت ہے۔ وہ لفظ جن میں دل کی دھڑکن اور آنسوؤں کی چمک ہے۔ سو وہ یہی کچھ نذرانے کے طور پر لے کر حاضر ہوئی ہیں۔ مجموعہ کا انتساب اور سرنامہ یہی ہے:

میں شاعر ہوں سرمایہ ہے شعر میرا وہ نذرِ شہِ مرسلاں کر رہی ہوں
تہی دست ہوں، میرا دامن ہے خالی مگر جرأتِ بے کراں کر رہی ہوں

درج ذیل شعر ان کے جذبۂ حبِّ رسول ﷺ اور نعت گوئی دونوں کی ترجمانی بطریقِ احسن کر رہا ہے:

بے خودی ایسی کہ ہے خواب میں بھی لب پہ درود
جذب ایسا کہ مدینہ نظر آجاتا ہے(۱۱۰)

سید ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

''ندائے نوری میں بڑا تنوع ہے۔ کہیں غزل کے پیکر میں نعتیں ہیں، کہیں مسدس کے ذریعے اظہار ہے اور کہیں مخمس کے وسیلے سے ثنائے خواجہ پیش کی گئی ہیں۔ کہیں چاند سے خطاب ہے تو کہیں ساری کائنات میں عشقِ محمدی کے جلوہ کو دیکھا اور دکھایا گیا ہے۔''(۱۱۱)

یا رحمت للعالمیں انت شفیع المذنبیں
اے سبز گنبد کے مکیں ادرک لنا یوم الحزیں (۱۱۲)

خلاصہ کلام

نعت گوئی عصر حاضر کی ایک بڑی ضرورت ہے۔ نعت گوئی کے روایتی موضوعات کے ساتھ وہ روحانی، تمدنی اور اور اخلاقی آشوب بھی بہ طورِ خاص نعت کا موضوع بنا ہے جس سے امتِ مسلمہ اور عہدِ حاضر کا انسان دوچار ہے۔ دورِ حاضر کو نعت کا دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ نعت نے اس دور میں جو وسعت اختیار کی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ اردو کی نعتیہ شاعری میں خواتین کا بحیثیت مجموعی ایک موثر اور قابلِ ذکر حصہ موجود ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نعت گو شاعرات کا ایک پورا کارواں وجود میں آچکا ہے۔

نعت کے موجودہ منظر نامے کو دیکھتے ہوئے اس بات کی قوی امید ہے کہ اس کارواں میں صنفِ نازک پہلے سے زیادہ تخلیقی تب و تاب کو بروئے کار لا کر نعت گوئی کی نئی نئی جہتیں دریافت کریں گی۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، عربی میں نعتیہ کلام، ۱۹۷۸ء، کراچی: میزانِ ادب، ص ۳۱

۲۔ ارشاد شاکر اعوان، ''محامد ماقبل بعثت''، مشمولہ: فکر و نظر (ماہنامہ)، فروری ۱۹۷۹ء، اسلام آباد: ص ۱۸۔۱۹

۳۔ عبداللہ عباس ندوی، ص ۴۲، بحوالہ: عماد الدین ابی بکر العامری، بغیۃ الاماثل و بہجۃ المحافل، س ن، ص ۷۶۔۷۷

۴۔ عبداللہ ندوی، عربی میں نعتیہ کلام، ص ۱۱۹۔۱۲۰

۵۔ ظہیر غازی پوری، ''نعتیہ شاعری کے لوازمات''، مشمولہ: اردو نعت کی شعری روایت، مرتب: سید صبیح رحمانی، ۲۰۱۶ء، کراچی: اکادمی بازیافت، ص ۱۰۷

۶۔ خواجہ رضی حیدر (پیش لفظ)، مشمولہ: اردو میں نعت گوئی از پروفیسر شفقت رضوی، ۲۰۰۲ء، کراچی: جہانِ حمد پبلی کیشنز، ص ۹

۷۔ ڈاکٹر ریاض مجید (پیش لفظ)، مشمولہ: ورفعنا لک ذکرک، بشریٰ فرخ، ۲۰۱۶ء، پشاور، ص ۱۶

۸۔ ڈاکٹر ریاض مجید (پیش لفظ) مشمولہ: فیض یاب از فوزیہ انجم، ۲۰۰۷ء، فیصل آباد: ٹو فرینڈ پرنٹرز، ص ۸

۹۔ خالد علیم، اردو شاعرات کی نعتیہ شاعری، ۱۹۹۵ء، لاہور: مکتبۂ فانوس، ص ۱۳

۱۰۔ شفیق بریلوی، تذکرہ شاعرات پاکستان، ۱۹۶۱ء، کراچی: مشہور پریس، ص ۶

۱۱۔ خالد علیم، اردو شاعرات کی نعتیہ شاعری، ص ۱۰۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۱۳۔ نعیم الحق صبا ضیائی، دبستان کراچی کے ممتاز شعراء، ۱۹۹۰ء، کراچی: بزمِ شعور و دانش، ص ۹۵

۱۴۔ خالد علیم، اردو شاعرات کی نعتیہ شاعری، ص ۵۳

۱۵۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، اردو کی نعتیہ شاعری، ۱۹۷۴ء، ص ۹۰

۱۶۔ ابو سلمان شاہجہان پوری، ڈاکٹر، تذکرہ نعت گو شاعرات، ۱۹۸۴ء، کراچی: ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، ص ۸

۱۷۔ خالد علیم، اردو شاعرات کی نعتیہ شاعری، ص ۱۴

۱۸۔ دیکھیے: راجا رشید محمود، ''خواتین کی نعت گوئی'' مشمولہ: نعت (ماہنامہ)، جولائی ۱۹۹۵ء، لاہور، ص ۲۴۔۳۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۲

۲۰۔ زریں چغتائی، ڈاکٹر شوکت، اردو نعت کے جدید رجحانات، ۲۰۱۱ء، کراچی: بزم تحقیق ادب پاکستان، ص ۱۷

۲۱۔ دیکھیے: پروین جاوید، حضوری چاہتی ہوں، س ن، کراچی: ارباب ادب

۲۲۔ پروین جاوید، سر طیبہ، کراچی: ۲۰۰۵ء، ارباب ادب پاکستان

۲۳۔ اُم عبد منیب، مدح مزمل، ۱۴۲۶ھ، لاہور: مشربہ علم وحکمت

۲۴۔ ڈاکٹر ریاض مجید، انجم، فوزیہ، فیض یاب، ۲۰۰۷ء، فیصل آباد: ٹو فرینڈز پرنٹرز، ص ۹

۲۵۔ فوزیہ، فیض یاب، ص ۲۹

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۹۔۴۰

۲۸۔ اُم عبد منیب، مدح مزمل، ص ۸

۲۹۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ایضاً، ص ۱۰۔۱۱

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۸

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۳۲۔ ام بلال، انہار نور، ۲۰۱۵ء، اٹک: حنفیٰ اسلامک سینٹر، ص ۲۵

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۱

۳۴۔ بشریٰ فرخ، ورفعنا لک ذکرک، ۲۰۱۶ء، پشاور، ص ۴۹

۳۵۔ ایضاً، ص ۴۸

۳۶۔ ایضاً، ص ۵۵

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۳۸۔ طاہر سلطانی، نعت کی بہاریں، ۲۰۱۲ء، کراچی: جہانِ حمد پبلی کیشنز، ص ۱۵۳

۳۹۔ پروین جاوید، حضوری چاہتی ہوں، ص ۲۳

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۸

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۹

۴۳۔ ایضاً، ص ۶۲

۴۴۔ ایضاً، ص ۶۹۔۷۰

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۴۶۔ کشفی، سید محمد ابوالخیر (فلیپ)، مشمولہ: پروین جاوید، حضوری چاہتی ہوں، محولا بالا

۴۷۔ پروین جاوید، سر طیبہ، ص ۶۹

۴۸۔ ایضاً، ص ۶۷

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۷

۵۰۔ ایضاً، ۳۶

۵۱۔طاہر سلطانی، نعت کی بہاریں، ص ۴۹۳
۵۲۔حنیف اسعدی، مشمولہ: مہکتے حروف از ریحانہ تبسم فاضلی، ۱۹۹۹ء، کراچی: فاضلی پبلی کیشنز، ص ۱۰
۵۳۔ریحانہ تبسم فاضلی، مہکتے حروف، ص ۱۷
۵۴۔ایضاً، ص ۴۲
۵۵۔ایضاً، ص ۵۶
۵۶۔ریحانہ تبسم فاضلی، خطیب الامم، ستمبر ۱۹۹۴ء، کراچی: فاضلی پبلی کیشنز، ص ۱۶۔۱۷
۵۷۔ایضاً، ص ۹۵
۵۸۔ایضاً، ص ۶۹
۵۹۔ایضاً، ص ۸۸
۶۰۔ایضاً، ص ۷۷
۶۱۔ایضاً، ص ۸۰
۶۲۔خواجہ رضی حیدر، ''پرتاثیر نعتیہ شاعری''، مشمولہ: خیر الوریٰ از ریحانہ تبسم فاضلی، فروری ۲۰۰۶ء، کراچی: فاضلی پبلی کیشنز، ص د
۶۳۔ریحانہ تبسم فاضلی، خیر الوریٰ، ص ۱۸
۶۴۔رازی، محمد نقیب اللہ، ''چترال کی پہلی نعت گو شاعرہ''، مشمولہ: اسیرِ مصطفیٰ بن کر از بشارت جبیںؔ، ۲۰۱۱ء، لاہور: ادارہ نوائے چترال، ص ۱۷
۶۵۔جبیںؔ، بشارت، اسیرِ مصطفیٰ بن کر، ص ۳۰
۶۶۔ایضاً، ص ۹۴
۶۷۔ایضاً، ص ۶۴
۶۸۔طاہر سلطانی، نعت کی بہاریں، ص ۵۷۰۔۵۷۱
۶۹۔رخشاں، اے بی، ثمن زارِ عقیدت، ۲۰۱۴ء، پشاور: اعوان پرنٹرز، ص ۳۶
۷۰۔راحت آراء سہیل، دیدارِ کعبہ، ۲۰۱۰ء، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ص ۹
۷۱۔ڈاکٹر رفیع الدین احمد (پیش لفظ)، مشمولہ: دیدارِ کعبہ، ص ۱۴
۷۲۔راحت آراء سہیل، دیدارِ کعبہ، ص ۱۷
۷۳۔صغریٰ فاطمہ نصیر، س ن، صدائے روح، راولپنڈی: انجم پبلشرز، ص ۱۴
۷۴۔ایضاً، ص ۲۳
۷۵۔طلعت اشارت، سرمایہ، ۲۰۰۲ء، کراچی: اشارات پبلی کیشنز، ص ۸۴
۷۶۔ایضاً، ص ۸۳
۷۷۔ایضاً، ص ۸۵
۷۸۔مخفی امروہوی، متاعِ مخفی، مرتب: حامد امروہوی، ۲۰۰۵ء، نئی دہلی: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ص ۵
۷۹۔ایضاً، ص ۲۱
۸۰۔ایضاً، ص ۲۱
۸۱۔ایضاً، ص ۳۶

۸۲۔طاہر سلطانی، نعت کی بہاریں، ص ۵۲۶

۸۳۔ایضاً، ص ۵۳۰

۸۴۔سکینہ، رضیہ ناصر، عقیدتوں کی مہک، ۲۰۱۶ء، لاہور: حاجی حنیف اینڈ سنز، ص vii

۸۵۔ایضاً، ص ۷

۸۶۔ایضاً، ص viii

۸۷۔ایضاً، ص ۳۳۵

۸۸۔ایضاً، ص ۳۱۷۔۳۱۸

۸۹۔ناز، ریحانہ شفاعت، ۲۰۰۹ء، مکلی (سندھ): شفاعت پبلی کیشنز، ص ۳۴

۹۰۔ناصرہ رفیق، تسبیح نور، ۲۰۱۵ء، لاہور: ساحل پرنٹرز اینڈ پبلشرز لندن، ص ۷۹

۹۱۔ایضاً، ص ۱۷۷

۹۲۔ایضاً، ص ۲۲۸

۹۳۔ناظرہ عالم، کلام ناظرہ، ۲۰۱۵ء، کراچی: مکتب عالمین پاکستان، ص ۲۷

۹۴۔طاہر سلطانی، نعت کی بہاریں، ص ۵۳۲

۹۵۔محسن بھوپالی (پیش لفظ)، مشمولہ: حاضری از نورین طلعت عروبہ، ۲۰۰۲ء، لاہور: ماورا پبلشرز، ص ۱۶

۹۶۔ایضاً، ص ۲۶

۹۷۔ایضاً، ص ۳۰

۹۸۔ایضاً، ص ۱۱۹

۹۹۔ایضاً، ص ۴۳

۱۰۰۔ایضاً، ص ۵۴

۱۰۱۔ایضاً، ص ۵۹

۱۰۲۔ایضاً، ص ۸۹

۱۰۳۔ایضاً، ص ۹۳

۱۰۴۔بشیر حسین ناظم، مشمولہ: زہے مقدر، ص ۱۲

۱۰۵۔نورین طلعت عروبہ، زہے مقدر، ص ۴۶

۱۰۶۔ایضاً، ص ۱۳۵

۱۰۷۔ایضاً، ص ۴۹

۱۰۸۔نوری، مسرت جہاں، ندائے نوری، س ن، ص ۲۵

۱۰۹۔ایضاً، ص ۲۸

۱۱۰۔ایضاً، ص ۴۳

۱۱۱۔سید ابوالخیر کشفی (پیش لفظ)، مشمولہ: ندائے نوری، ص ۱۹

۱۱۲۔نوری، مسرت جہاں، ندائے نوری، ص ۴۴

☆☆☆

ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی، بھارت

مالیگاؤں میں اُردو نعتیہ شاعری کی روایت

ABSTRACT: A brief history of development and progress of Urdu devotional poetry in Maligawoon has been presented in this article. Three stages, besides contemporary scenario of Naat Goee in Maligawoon have been highlighted for the sake of showing different poetic trends. It has also been brought into lime light that Muslim poets migrated from different parts of India to Maligawoon, Maharashtra, during freedom fighting in 1857 had explored avenues in this atmosphere to enrich Urdu language with sacred poetry. Examples of couplets have also been placed to denote craftsmanship of poets to express sentiments, feelings and topic's related matter in their religious poetry.

نعت عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی وصف وخوبی اور تعریف وتوصیف کے ہیں۔لیکن عُرفِ عام میں نعت؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناوستائش اور تعریف وتوصیف بیان کرنے والی منظومات کو کہا جاتا ہے۔یوں تو نعت کا لفظ مستقل ایک موضوع یا مضمون کا احاطہ کرتا ہے اور جب یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو وہ تمام خزائن اور ذخائر مراد ہوتے ہیں جن میں حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہو، مدح ہو، ثنا ہو، تعریف وتوصیف ہو، سراپا کا بیان ہو، شبیہ وشمائل اقدس کی لفظی تصویر کشی ہو، عادات واخلاق کا بیان ہو، فضائل ومحاسن جمیلہ کا اظہار ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہو، آپ سے استغاثہ وفریاد ہو، عقیدت ومحبت کے جذبات کی ترجمانی ہو، مقصد وبعثتِ نبوت کا تذکرۂ خیر ہو یا ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل ہو۔الغرض ہر وہ ادبی کاوش جو اپنے قاری یا سامع کو مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کرے اور قرب کا احساس پیدا کرے چاہے وہ نثر ہو یا نظم بلاشبہ ''نعت'' ہے۔

مالیگاؤں کا تاریخی وادبی پس منظر : اجمالی جائزہ:

مالیگاؤں مہاراشٹر کا وہ مشہور ومعروف گہوارۂ علم وادب شہر ہے جہاں اردو بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے قدیم زمانے سے ہی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔مالیگاؤں کی علمی وادبی اور مذہبی وسماجی

حیثیت کو اک جہان نے تسلیم کیا ہے۔ یہاں بڑے بڑے علما، فقہا، حفاظ، قرا، ادبا اور شعرا نے جنم لیا اور مختلف میدانوں میں اپنی مخلصانہ خدمات کے ذریعہ شہر عزیز کے نام کو وقار بخشا۔ آج اسے مسجدوں میناروں کے شہر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہاں بنکر برادری کی اکثریت ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد شمالی ہندوستان اور خاندیس کے مختلف علاقوں سے آنے والے مہاجرین نے مالیگاؤں کو اپنا وطن بنالیا۔ شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین نے اپنی آبائی صنعتِ پارچہ بافی کے لیے اس شہر کو ساز گار پایا تو یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی اور ہینڈلوم پر رنگیں ساڑی بننے کا کام شروع کردیا۔ محنت و مشقت کرتے ہوئے اس مٹی میں رچ بس گئے اور فرصت کے لمحات میں وہ شعر و ادب کی طرف بھی متوجہ ہونے لگے۔

مالیگاؤں کی تاریخ کے محققین اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ مالیگاؤں کی شعری و ادبی روایت کم و بیش دو صدیوں کو محیط ہے۔ یہاں آنے والے مہاجرین اپنی تہذیب، زبان اور بول چال کا لہجہ ساتھ لائے تھے یہی وجہ ہے کہ یہاں کی قدیم اردو میں مراٹھی، قدیم دکنی اور خصوصاً خاندیسی زبان کے الفاظ کی آمیزش زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً : نکو (نہیں)، پرمانے (مطابق) کنے (پاس)، کدی (کبھی)، جدی (تبھی)، تیکو میکو (تجھے مجھے) وغیرہ۔ بہ قول استاذ محترم ڈاکٹر اشفاق انجم (پ: 1948ء) :

"مالیگاؤں کی شعری و ادبی روایت کم و بیش دو صدیوں پر محیط ہے۔ قدیم دکنی اور خصوصاً خاندیسی زبان کے ادبی نقوش کی دستیابی اس کی واضح دلیل ہے۔ مولوی عبدالکریم عرف دادا میاں عطا کا قلمی نسخہ میرے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے۔ علاوہ ازیں ان کا ایک دیوان 'چراغِ بقا عرف دیوانِ عطا' مطبوعہ 1885ء بھی موجود ہے جس کے مشمولات میں فارسی اور خاندیسی کے اثرات نہایت واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔" (مسلم فن اور شخصیت، ص 9)

مالیگاؤں کی ابتدائی شاعری کا بہترین اور عمدہ نمونہ وہی ہے جس میں خاندیسی اور فارسی زبان میں کہے گئے مرثیے اور مراٹھی آمیز نعت اور غزلیں ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ مومن انصار مہاجرین کی آمد 1860ء کے بعد سے یہاں خالص اردو ادب کی شروعات ہوتی ہے۔ تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ ادب کی نشو و نما پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ مولوی عبداللہ بیدلؔ، مولوی عبدالکریم خادمؔ (1830ء/ 1910ء)، منشی محمد شعبانؔ (1870ء/ 1929ء)، امیر خاں امیر قریشی (1895ء/ 1930ء)، عبدالکریم عرف دادا میاں عطاؔ (1864ء/ 1964ء)، مولانا اسحٰق مقصدؔ (1266ھ/ 1346ھ)، منشی عظیم اللہ مداحؔ (1870ء/ 1930ء)، حافظ محمد مرادؔ (1860ء/ 1928ء)، ماسٹر محمد امیر میرؔ (1881ء/ 1929ء)، ماسٹر محمد ابراہیم خلیلؔ (1870ء/ 1928ء)، حکیم عبدالمجید احسانؔ (1879ء/ 1844ء)، منشی

عبدالغفور خنداںؔ (1865ء/ 1962ء)، منشی الٰہی بخش تسلیمؔ (1860ء/ 1929ء)، منشی عباد اللہ صفدرؔ (1875ء/ 1936ء)، عبدالرحیم کوثرؔ (1892ء/ 1939ء)، حکیم عبدالحمید فاروقؔ (1876ء/ 1946ء) وغیرہم جیسے بزرگوں نے اس ادبی پودے کی آبیاری کی اور اس روایت کو فروغ دیا جو وہ اور ان کے اجداد شمالی ہندوستان سے لے کر آئے تھے۔ ان حضرات کی سعی پیہم سے اب مالیگاؤں کی شاعری اور زبان سے خاندیسی اور فارسی اثرات ختم ہوتے گئے اور شعرا نے لکھنوی اور دہلوی دبستان کی اتباع میں ٹکسالی اردو میں شعر کہنا شروع کر دیا حتیٰ کہ قنوج، میرٹھ اور الٰہ آباد سے شائع ہونے والے رسالوں اور گلدستوں میں یہاں کے شعرا شائع ہونے لگے، چناں چہ ڈاکٹر اشفاق انجم اپنے تحقیقی مقالے ''شعرائے مالیگاؤں'' میں یوں لکھتے ہیں:

''اب تک جو سب سے قدیم گلدستہ دستیاب ہوا ہے وہ 'پیامِ عاشق' ہے جس کے 1892ء کے دو شمارے راقم کے پاس ہیں۔ ان میں مالیگاؤں کے شعرا کا کلام بھی شائع ہوا ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنے والے مہاجرین میں شعرا اور ذی علم حضرات یقیناً شامل تھے جن کے ہاتھوں یہاں اردو نے آنکھیں کھولیں اور ادب کی شمعیں روشن ہوئیں۔'' (نعت رنگ، کراچی: شمارہ 26، دسمبر 2016ء، ص 292)

شعر و ادب کی بڑھتی ہوئی اس روش کے اثرات بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں نمایاں ہونے لگے اور مالیگاؤں سے ''افتخارِ سخن''، ''معیارِ سخن'' اور ''بہار'' نامی رسائل شائع ہونے لگے۔ جن میں مقامی شعرا کے علاوہ برصغیر کے ممتاز شعرا کی طرحی غزلیں اور نعتیں شائع ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ میرٹھ، الٰہ آباد، دہلی، لکھنؤ، امرتسر، بدایوں وغیرہ سے نکلنے والے رسائل میں بھی مالیگاؤں کے شعرا کے کلام شائع ہوتے رہے۔

مالیگاؤں میں اردو شعر و ادب کی آبیاری کرنے والے جن شعرا نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ان میں کچھ نمایاں نام اس طرح ہیں:

منشی دین محمد اعجازؔ، شیخ چاند قمرؔ (1894ء/ 1964ء)، منشی عبدالوہاب طالبؔ (1872ء/ 1932ء)، منشی سراج الدین سراجؔ (1873ء/ 1978ء)، منشی ولی اللہ ثاقبؔ (1890ء/ 1939ء)، منشی مدار اللہ مدعاؔ (1862ء/ 1927ء)، محمد صدیق ناطقؔ، محمد اسماعیل شررؔ، عبدالرحمٰن اثرؔ (1883ء/ 1917ء)، محمد یوسف عزیزؔ (1891ء/ 1957ء)، حضرت عارجؔ (1890ء/ 1953ء)، صدیق حسن شوقؔ (1898ء/ 1971ء)، محمد حسن احسنؔ (1897ء/ 1988ء)، محمد نذیر اوجؔ (1896ء/ 1971ء)، قمر الدین قمرؔ (1898ء/ 1964ء)، عبدالرزاق کوکبؔ (1896ء/ 1984ء)، عبدالحمید نعمانی، عبدالخالق خلیقؔ (1880ء/ 1858ء)، محمد نجیب اللہ ہنرؔ (1897ء/ 1967ء)، منشی صفی اللہ صفیؔ، محمد صدیق مسلمؔ (1901ء/ 1975ء)، جناب خلیلؔ (1903ء/

1962ء)، عبدالغفور سہیلؔ (1911ء/ 1985ء)، حیدر علی وقارؔ حیدری (1911ء/ 1990ء)، محمد بشیر اخترؔ مالیگانوی (1912ء/ 1985ء) ، منشی عبدالمجید نصیرؔ (1909ء/ 1989ء)، محمد بشیر ادیبؔ مالیگانوی (1909ء/ 1987ء)، محمد اسحٰق آزادؔ انصاری (1913ء/ 1958ء)، عبدالعزیز عابدؔ انصاری، نشاطؔ شاہدوی (1921ء/ 1948ء)، محمد حنیف حنیفؔ مالیگانوی (1920ء/ 1982ء)، محمد عمر قدسیؔ (1908ء/ 1973ء)، کاملؔ صدیقی (1920ء/ 1980ء)، احمد نسیم میناؔ نگری (1935ء/ 1991ء) وغیرہم۔

مالیگاؤں میں نعت گوئی کی روایت:

مالیگاؤں کی تاریخ پر لکھی گئی مختلف کتب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اردو شعر وادب کی روایت کے ساتھ ہی مالیگاؤں میں نعت گوئی کی روایت کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ میلاد کی محفل، محرم کی مجلس اور طرحی وغیر طرحی مشاعروں کے لیے زیادہ تر روایتی موضوعات و مضامین پر مبنی نعتیہ کلام لکھے جاتے رہے۔ آغاز میں امیر خاں امیرؔ قریشی، منشی محمد شعبانؔ اور ان کے شاگردوں نے میلاد کی محفلوں اور محرم کی مجلسوں کے لیے تقدیسی شاعری حمد، نعت، سلام، منقبت اور مرثیے کو خوب فروغ دیا۔ نعت گوئی کی روایت کو مستحکم بنانے میں عبدالکریم عرف دادا میاں عطاؔ (1864ء/ 1964ء) کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ موصوف مالیگاؤں کے اولین صاحب دیوان شاعر ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر الیاس صدیقی (پ 1945ء) اپنے مقالے ''مالیگاؤں میں اردو نثر نگاری'' میں لکھتے ہیں کہ 1885ء میں مالیگاؤں کے ایک شاعر عبدالکریم عطاؔ کا نعتیہ دیوان شائع ہوا۔ جو اردو لائبریری مالیگاؤں میں موجود ہے۔

دادا میاں عطاؔ کے ذریعے مالیگاؤں میں نعتیہ دیوان اور مجموعے کی ترتیب و تہذیب کی اس پاکیزہ روش کا کیا آغاز ہوا گویا دبستاں کھل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مختلف ادوار میں یہاں نعتیہ دواوین اور مجموعوں کی اشاعت ہوتی رہی اور تادم تحریر نعتیہ مجموعوں کی اشاعت کا یہ سلسلہ خیر جاری و ساری ہے۔ اب تک راقم کو جن نعتیہ کتب و رسائل کا سراغ ملا ہے اس کی ایک نامکمل فہرست پیش ہے، ممکن ہے ان کے علاوہ بھی مالیگاؤں سے نعتیہ مجموعے شائع ہوئے ہوں جن سے ناچیز ناواقف ہو :

مطبوعہ نعتیہ دواوین اور مجموعے:

(1) منشی سراج الدین سراجؔ : فی شان حبیبہٖ/ (2) محمد نذیر اوجؔ : حرفِ شیریں (نعتیہ و غزلیہ مشترک)/ (3) مولانا محمد یونسؔ مالیگ : جناں بکف/ (4) دین محمد عقیلؔ رحمانی : نغمۂ رحمت، شاہنامہ، حرمین، جلوۂ فاراں، گل بانگ حجاز اور گل زار حرم/ (5) قاری نذیر تابشؔ : متاعِ تابش/ (6) عبدالرزاق

الطاف انصاری سلطان پوری :رُودِ بخشش/(7) کلیم شاہدوی :عرفانِ کلیم/(8) حاجی بلڈانوی :محورِ حق /(9) امین صدیقی :تنزیل/(10) ڈاکٹر اشفاق انجم :صلوا علیہ وآلہٖ/(11) سلیم شہزاد :وہ لیلۃ القدر کا ستارا (لاہور یونی ورسٹی)، کشفیہ/(12) ارشد مینا نگری :رحمۃ للعالمین/(13) عبداللطیف لطیفؔ :حیاتِ مقدسہ (منظوم سیرت 1411/اشعار)/(14) محمد ہارون اکسیرؔ :شبستانِ مدینہ، ضیاے ایماں اور رحمتوں کا گھیرا/(15) ظہیر ابن قدسی :فیضانِ حرم/(16) اشرفی انیس نیرؔ :شافع محشر/(17) شیداؔ قادری میرٹھی :ماہِ طیبہ/(18) ماسٹر حسین احمد حامد النوری :ہیں منکر عجب کھانے غرانے والے (طرحی مصرع پر طویل نعت)/(19) ادریس وارثی :رب کے متوا/(20) حافظ اسماعیل یارعلوی :خورشیدِ جہاں اور مخزنِ ایماں/(21) وقار جعفری :عقیدت کے گوہر/(22) خالدؔ انور :یہ نبی ہمارا ہے/(23) مشاہدؔ رضوی :لمعاتِ بخشش، مشکوٰۃِ بخشش اور تشطیراتِ بخشش/(24) محمد نعیم رضا برکاتی مصباحی :کلامِ نعیم-تاریخی نام: در مدحتِ نبی حکیم و کریم (25) عطا ابن یارعلوی :سرکار کا جلوہ۔

غیر مطبوعہ نعتیہ دواوین اور مجموعے :

(26) مقیم اثرؔ بیاولی: رکے بل/(27) عبدالحق تنویر :ورفعنا لک ذکرک (زیرِ طبع)۔ یہاں ذکر کیے گئے مجموعوں میں 10 سے زائد شعری مجموعے ایسے ہیں جن کے فکر وفن پر ناچیز نے علاحدہ سے مضامین قلم بند کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

درج بالا 27/شعرا میں دین محمد عقیلؔ رحمانی کے 5، محمد ہارون اکسیرؔ کے 3، سلیم شہزاد کے 2، حافظ اسماعیل یارعلویؔ کے 2 اور مشاہدؔ رضوی کے 3 مجموعے ہیں، اس طرح مالیگاؤں کے سراغ شدہ مطبوعہ وغیر مطبوعہ نعتیہ دواوین اور مجموعوں کی تعداد 37 تک پہنچتی ہے۔ الحمدللہ! ماشآء اللہ! سبحان اللہ! یہ تعداد کوئی معمولی نہیں۔ ان کے علاوہ اکثر صاحب کتاب شعرا نے اپنے اپنے مجموعہ کلام میں حمد باری تعالیٰ کے ساتھ ساتھ نعتِ پاک بھی شامل کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

شہر مالیگاؤں میں نعتیہ روایت کا جائزہ ایک مبسوط مقالے کا متقاضی ہے۔ لہٰذا اس مختصر مضمون میں ممکن ہے کہ عنوان سے مکمل طور پر ناچیز عہدہ برآنہ ہو سکے۔ ذیل میں تین ادوار اور عصری منظر نامہ کے تحت مالیگاؤں میں اردو نعت گوئی کا اجمالی جائزہ پیش خدمت ہے :

پہلا دور :

اردو شعر وادب کے ساتھ ساتھ مالیگاؤں میں نعت گوئی کی روایت کے سراغ بھی ملتے ہیں۔ اس زمانے میں یہاں منعقد ہونے والی میلاد کی محفلوں، محرم کے دنگلوں اور بزرگوں کے اعراس میں تقدیسی

شاعری (حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مناقب وغیرہ) پر مشتمل کلام بڑے ذوق وشوق سے لکھے اور پڑھے جاتے تھے۔ اُس دور میں امیر خاں امیرؔ قریشی صاحب اور منشی محمد شعبانؔ صاحب کے دو گروپ بہت مشہور تھے، جن کے درمیان ایسی محفلوں میں بھی شعری و ادبی چشمک ہوجایا کرتی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ محفلِ میلاد کا سلسلہ ان بزرگوں کی بدولت برسوں قائم رہا۔ جب منشی محمد شعبان کا انتقال ہوگیا تو ان کے شاگرد دادا میاں عطا نے امیرؔ صاحب کے مدمقابل کی جگہ لے لی۔ لوگ بتاتے ہیں کہ محفلِ میلاد میں بھی فی البدیہہ نعتیں دونوں طرف سے کہی جاتی تھیں اور رات دیر گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ آدابِ محفل کا بڑا لحاظ رکھا جاتا تھا سب مؤدب بیٹھتے اور مجلس کے اختتام پر کھڑے ہوکر ہاتھ باندھ کر سلام پڑھتے۔ اس زمانے میں دادا میاں عطا کا یہ سلام زبان زدِ خاص وعام تھا۔

یانبی سلام علیکم یارسول سلام علیکم
یا حبیب سلام علیکم صلوٰۃ اللہ علیکم
کاشفِ اسرارِ حق ہو واقفِ اسرارِ حق ہو
عارفِ اسرارِ حق ہو صلوٰۃ اللہ علیکم

اس دور میں امیرؔ صاحب نے اردو کے ساتھ ساتھ پوربی میں بھی نعتیں لکھیں ساتھ ہی انھوں نے قدسیؔ کی مشہورِ زمانہ نعت "مرحبا سید مکی مدنی العربی" پر خوب صورت اور دل آویز تضمین بھی لکھی، امیرؔ صاحب کے چند اشعار نشانِ خاطر کریں۔

الٰہی دم نکل جائے مرا وصفِ پیمبر میں میں مداحِ نبی کہہ کر پکارا جاؤں محشر میں

تمھی ہو میرے مولا تما ہی ہو سرور توہرے در کے سوا نہیں ہے کوؤ در
تم نہ لیہو جو خبریا موری گو لیہے خبر چشمِ رحمت بکشا سوے من اندازِ نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی

امیرؔ صاحب کے یہاں جذب وکیف، رنگینی اور رعنائی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام میں تشبیہ، استعارہ رمز و کنایہ، حسنِ تعلیل اور قافیہ بندی جیسے شعری محاسن کا گھراؤ رچاؤ ملتا ہے۔ امیرؔ صاحب کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں منشی محمد شعبان کی تقدیسی شاعری کا کافی چرچا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ منشی محمد شعبانؔ زیادہ تر نعت وسلام اور مرثیے ہی لکھا کرتے تھے اور میلاد خواں حضرات کو سونپ دیتے تھے۔ اس دور میں آپ کی جس نعت کو مقبولیت حاصل ہوئی اس کے دو شعر یہ ہیں۔

اے مومنو! وصفِ نبی کرتے ہیں ارشاد ہے محفلِ میلاد

جو لوگ یہاں پر ہیں رہیں خرم و دل شاد ہے محفلِ میلاد
ہو کیوں نہ بیاں وصفِ رسولِ عربی کا مکی مدنی کا
اخلاقِ محمد (ﷺ) کا بیاں کیوں نہ ہو ارشاد ہے محفلِ میلاد

اس دور کے اکثر شعرا کے یہاں نعت کے روایتی مضامین ہی پائے جاتے ہیں لیکن مشکل ردیف و قوافی اور شعری محاسن کی رنگارنگی بڑی حُسن و خوبی کے ساتھ برتی ہوئی ملتی ہے۔ منشی محمد شعبانؔ صاحب کے چند شعر مزید دیکھیے۔

دمِ نزع آئیں گے جب تک نہ حضرت مرا دم لبوں پر ہی اٹکا رہے گا
نہیں جس کو سودائے زلفِ محمد (ﷺ) وہ ہر دم بلاؤں میں اٹکا رہے گا
ارادہ ہے جوائے رضواں نبی کی مدح خوانی کا وضو کے واسطے سائل ہوں میں کوثر کے پانی کا
لکھا مشکوٰۃ مصباحِ ازل روئے منور کو اڑایا میں نے کیا مضموں کتابِ آسمانی کا

مالیگاؤں میں نعت گوئی کی پاکیزہ روایت کو آگے بڑھانے اور اس روش کو مستحکم اور توانا بنانے میں جہاں امیر خاں امیر اور منشی محمد شعبانؔ کے شاگردوں نے نمایاں کردار ادا کیا وہیں عبدالکریم عرف دادا میاں عطا صاحب کی خدماتِ جلیلہ کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے مالیگاؤں میں اردو نعتیہ روایت کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا اور اولین نعتیہ دیوان کے مالک بھی قرار پائے۔

زیرِ نظر مضمون کی ذیلی سرخی ''مالیگاؤں میں نعت گوئی کی روایت'' کے تحت دورِ اول کی تمہید میں آپ نے دادا میاں عطا کا اس زمانے میں مشہور سلام خاطر نشین کیا۔ دادا میاں عطا نے اپنی نعت گوئی میں شعری و فنی محاسن کا بڑا گہرا رچاؤ کیا، صنائع کے نجوم درخشاں کیے اور بدائع کے مہر و ماہ جگمگائے۔ مشکل ردیفوں اور ادق بحروں کا استعمال بھی کیا۔ عطا صاحب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دلا ہم کو محمد (ﷺ) کی حمایت ہے تو کیا غم ہے اگر چہ کل کے دن بھی جو قیامت ہے تو کیا غم ہے
عطا خاطر پریشاں ہو نہ محشر کے عذابوں سے تجھے نعتِ نبی لکھنے کی عادت ہے تو کیا غم ہے

یا اُمتی یا اُمتی اوس دن وہ کہے گا دم نفسی نفسی نکلے گا عالم تمام کا
شاہی ضرور مجھ کو نہ درکار سلطنت شیدا ہوں دل سے یارو میں احمد کے نام کا
ذکرِ مولودِ مکرم ہے رسول اللہ کا تذکرہ اِس جا سراسر ہے خلق کے ماہ کا

عطا کی نعتوں میں لفظی و معنوی صنعتوں کی خوب جلوہ گری ملتی ہے۔ ایہام، تلمیح، مراعاۃ النظیر، تشبیہ، استعارہ تضاد، تجنیس تام، تجنیس ناقص، تجنیس مرکب، تحتانیہ، حسنِ تعلیل، مہملہ وغیرہ صنعتوں کا استعمال دادا میاں عطا کے کلام میں جا بجا دکھائی دیتا ہے۔

اس دور میں ان اعاظم شعرائے نعت کے علاوہ بھی بہت سے شعرا نعت کے میدان میں جوہر بکھیر رہے تھے ۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کی جانے والی نعتیہ شاعری کے موضوعات بڑے محدود رہے ۔ ''شفاعت کی طلب، دیدار کی حسرت، آقائے کائنات ﷺ کے در پہ مرنے کی آرزو اور مدینۂ طیبہ کے سفر کی خواہش'' جیسے خیالات اور جذبات کی عکاسی ابتدائی دور کی نعتیہ شاعری کی خصوصیت رہی ۔ دراصل یہ نعت گوئی اکثر مشاعروں، میلاد کی محفلوں اور محرم کی مجلسوں یا طرحی مشاعروں کے لیے کی جاتی تھی ۔ اس لیے جذبات کی شدت اس وقت کے شعرا کے کلام میں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں ۔ ہاں شعریت کے حسن، فکری و فنی در و بست اور خارجی محسوسات کے اعتبار سے اس دور کی نعتیہ شاعری کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے ۔ مگر دلی جذبات، عشقِ رسول ﷺ کی شدت اور داخلی محسوسات خال خال دکھائی دیتے ہیں ۔

1900ء سے پہلے کی نعتیہ شاعری نعت کے روایتی مضامین اور موضوعات تک ہی محدود رہی، زیادہ تر شعرا نے آقائے کائنات ﷺ اور مدینۂ منورہ سے متعلق وہی باتیں رقم کیں جو انھوں نے واعظین اور زائرین سے سنی یا کتابوں میں پڑھی تھیں ۔ اس وقت غربت اور افلاس کا دور دورہ تھا، محض چند ہی صاحبانِ استطاعت حج و زیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہوتے تھے ۔ لہٰذا یہی وجہ ہے کہ زیارتِ روضۂ رسول ﷺ کی تڑپ اور کسک کے مضامین اس دور کی نعتیہ شاعری کا خاص موضوع بن گئے تھے ۔

دوسرا دور :

اردو شعر و ادب کی مشہور ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل ہی مالیگاؤں کی شاعری (نعتیہ و غزلیہ) دوسرے دور میں داخل ہوگئی تھی ۔ اس دور میں دین و مذہب، شعر و ادب، فکر و فن، تعلیم و تعلم اور سماجی و سیاسی اعتبار سے کافی انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ۔ اس دور میں مالیگاؤں ڈاک کے نظام سے جڑ گیا تو ملک کے دیگر علاقوں کی ادبی سرگرمیوں سے یہاں کے شعرا ادبا واقف ہونے لگے ۔ دہلی، لکھنؤ، کان پور، قنوج، میرٹھ اور امرتسر جیسے دور دراز علاقوں سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں کے مطالعے اور ان میں مالیگاؤں کے شعرا کے کلام کی اشاعت کے سبب شاعری کے بدلتے رجحانات اور نئے تنقیدی رویوں کو جلا ملنے لگی ۔ اب نعتیہ شاعری میں بھی نئی تشبیہات اور نرالے استعارات بیان کیے جانے لگے ۔ تعلیم کی روشنی میں نئے خیالات اور فکری و فنی روش میں تبدیلی آنے لگی ۔ اس لیے اس دور کی نعتیہ شاعری میں شعرا نے روایتی موضوعات میں چار چاند لگاتے ہوئے نئے جذبات و احساسات کو سمونا شروع کیا ۔ اب نعت گوئی حسرتِ مدینہ، قیامِ مدینہ کی گفتگو اور خارجی محسوسات سے آگے بڑھ کر دلی جذبات اور داخلی محسوسات کی آئینہ دار بن گئی ۔ اسی کے ساتھ ساتھ دینی مدارس و جامعات کے قیام نے بھی نعت گوئی کی روایت کو نیا انداز بخشا ۔ دینی تعلیم کے فروغ نے شعرا کے خیالات اور فکر و فن کو وسعت دی ۔ سیرتِ طیبہ

کے مطالعے کے سبب شعرا اپنی نعت گوئی میں آقائے کائنات ﷺ کی سیرت طیبہ اور اسوۂ حسنہ کے واقعات و قصص بھی خوب صورتی کے ساتھ بیان کرنے لگے۔ اس دور کے شعرا میں عبدالرحمٰن اثرؔ (1883ء / 1917ء)، منشی محمد جوہرؔ (1882ء / 1935ء)، حافظ مرادؔ (1860ء / 1928ء)، مولانا اسحٰق مقصدؔ (1266ھ / 1346ھ)، شیخ چاند قمرؔ (1894ء / 1964ء)، محمد امیر میرؔ (1881ء / 1929ء)، محمد یحیٰی انورؔ (1880ء / 1942ء)، منشی ولی اللہ ثاقبؔ (1874ء / 1939ء)، عبدالخالق خلیقؔ (1880ء / 1858ء)، محمد نجیب اللہ ہنرؔ (1897ء / 1967ء) وغیرہم نے کافی گہرے نقوش مرتب کیے۔

عبدالرحمٰن اثرؔ ایک بہترین خطیب اور زود گو شاعر تھے، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد کے فارغ التحصیل اثرؔ صاحب کے کلام میں بلا کی معنی آفرینی پائی جاتی ہے، انھوں نے نعتیہ شعر و ادب میں سیرتِ طیبہ اور اسوۂ حسنہ کے واقعات کو کافی سلیقے سے برتا۔

حافظ مرادؔ کی آواز بڑی پُر اثر تھی، آپ فنِ تجوید و قرأت میں یگانہ تھے، اللہ کریم جل جلالہ نے آپ کو قرآن پاک پڑھنے کا ایسا انداز بخشا کہ سننے والے مسحور ہو جایا کرتے تھے۔ آپ کا شعری ذوق بڑا صاف ستھرا تھا۔ فنِ موسیقی سے لگاؤ کے سبب آپ کے شعروں میں بلا کی روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ آپ اپنے منفرد اور مترنم لب و لہجے میں نعتیہ اشعار سنایا کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ اکثر بزرگانِ دین کے اعراس میں ہونے والی محفل سماع میں آپ شرکت کیا کرتے اور خوش الحانی سے اپنا کلام سنا کر سامعین کے دلوں کو موہ لیا کرتے تھے۔ رسالہ خورشید میرٹھ، جلوۂ یار میرٹھ اور ترقی سخن ممبئی میں آپ کے کلام شائع ہوا کرتے تھے۔ مالیگاؤں میں نعتیہ روایت کے کینوس کو نئے تخیلات سے ہم آشنا کرنے میں حافظ مرادؔ کی سعی بلیغ قابل تحسین ہے۔

مولانا محمد اسحٰق مقصدؔ ایک جامع الصفات بزرگ کا نام ہے۔ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ میں بیعت و خلافت یافتہ اس روحانی شخصیت نے جہاں علوم شریعت کی درس گاہ آراستہ کی وہیں معارف طریقت کے لیے بھی محفلیں سجائیں۔ شعر و ادب میں بھی آپ یگانۂ روزگار تھے۔ نعتیہ شاعری اور تصوفانہ رنگ و آہنگ سے مزین کلام آپ کی شعری کائنات میں شامل ہیں۔ خصوصاً مالیگاؤں میں نعت گوئی کے دوسرے دور کی نعتیہ شاعری میں نئے رجحانات اور داخلی محسوسات اور جذبات کی صداقت کے ساتھ ساتھ فنی و فکری محاسن کی رنگارنگی ان کی شاعرانہ ریاضتوں کا رہینِ منت ہے۔ دوسرے دور کے شعرا نے ایسے ہی نابغہ روزگار شعرا کی رہبری میں اپنی نعتوں میں خوب صورت لفظیات کا انسلاک کرتے ہوئے صنائع لفظی و معنوی کا استعمال کیا۔ منفرد ردیفوں، قوافی اور تراکیب سے نعتوں میں شعری و فنی حُسن بکھیرے۔ دوسرے دور کے

نمائندہ شعرائے نعت کے چند منتخب اشعار ذیل میں خاطر نشین کیجیے۔

دیوانے ہم جمالِ پیمبر کے ہو گئے پروانے شمعِ روئے منور کے ہو گئے

عبدالرحمٰن اثرؔ

دل کو عشقِ نبی منظور ہوا خوب ہوا عشقِ اصنام جو کافور ہوا خوب ہوا
شکر ہے دوستو دیوانہ پنے کا میرے گھر بہ گھر جا بہ جا مذکور ہوا خوب ہوا
مطلق نہیں ہے چاہ کسی رشکِ حور کی جب سے ہے دل کو اس مہ انوار کی طلب
بخش دینے کو ہے اللہ کی رحمت اچھی بخشوانے کو ہے حضرت کی شفاعت اچھی

حافظ مرادؔ

ہر شے میں تیرے نور کا جلوہ ہے یا نبی موسیٰ نہیں کہ طور سے ہو لو لگی ہوئی
تشنہ ہوں عشقِ چشمِ جنابِ رسول کا مرقد میں کیوں نہ آنکھ ہو میری کھلی ہوئی
بندگی کا ہے مزہ جب کہ ہو الفت تیری بے نمک کھانے میں آتی نہیں لذت اچھی
مقصدؔ ہمارے شعروں سے آتی ہے بوئے مشک مصروف وصفِ زلف میں ہم صبح و شام ہیں

مولانا اسحٰق مقصدؔ

میں ثنا خوانِ محمد (ﷺ) ہوں ازل سے بہ خدا میری ہر سانس میں کلمہ ہے نبی کا دم ساز

شیخ چاند قمرؔ

جب طبیعت گیسوے والا کی شیدائی ہوئی ٹل گئی ہر اک بلا سر پہ مرے آئی ہوئی
دشتِ طیبہ میں چبھے جب خار تو دل نے کہا اب تو پوری تیری حسرت آبلہ پائی ہوئی

محمد امیر میرؔ

مدینے کی شام و سحر دیکھتا ہوں مقدر کو میں اوج پر دیکھتا ہوں
محبت ہے اسلام کی جس کے دل میں لٹاتا ہوا اپنا گھر دیکھتا ہوں

محمد یحییٰ انورؔ

جو دیکھوں گا دشتِ دیارِ مدینہ تو پلکوں سے چن لوں گا خارِ مدینہ
ہوا جلوہ فرما جو سلطانِ عالم بڑھا اور بھی افتخارِ مدینہ

عبدالخالق خلیقؔ

زباں کرتی نہیں جنبش دہن میں میرے دلبر کے کسی نے سرخ مچھلی چھوڑ دی ہے حوضِ کوثر میں

منشی ولی اللہ ثاقبؔ

ہم سے رندوں کے لیے روزِ ازل سے ہے بنا آپ کا خانۂ خمار رسولِ عربی
بحرِ وحدت کا سمجھتے ہیں سمجھنے والے آپ کے گوہرِ شہوار رسولِ عربی
باغِ عالم میں نہیں ہے گل خوبی کوئی حُسن میں تم سا طرح دار رسولِ عربی
رنگ لایا ہے نکھر کر چمنستاں کی طرح دامن دیدۂ خونبار رسولِ عربی

محمد نجیب اللہ ہنر

مالیگاؤں میں نعتیہ روایت کے تحت دوسرے دور کے پیش کردہ درج بالا منتخب شعرا کے نعتیہ اشعار واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دینی مدارس و جامعات، دینی تعلیم و تربیت، اخبارات و رسائل اور کتابوں کے مطالعے نے شعرا کے فکر وخیال کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور انھوں نے اپنی نعتوں میں روایتی موضوعات زلف و رخسار،، شفاعتِ مصطفیٰ ﷺ کے یقین کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ صنائع لفظی و معنوی کا بھی برمحل اور عالمانہ دسترس سے استعمال کیا ہے۔ نئے تنقیدی رویوں کے سبب اس دور کی نعت نگاری فنی محاسن کے اعتبار سے کافی بلندی کی طرف گامزن ہوئی۔ درج بالا اشعار کے مصرعے : ''پروانے شمعِ روے منور کے ہوگئے''۔ ''مطلق نہیں ہے چاہ کسی رشکِ حور کی''۔ ''بے نمک کھانے میں آتی نہیں لذت اچھی''۔ ''مقصد ہمارے شعروں سے آتی ہے بوے مشک''۔ ''مرقد میں کیوں نہ آنکھ ہو میری کھلی ہوئی''۔ ''کسی نے سرخ مچھلی چھوڑ دی ہے حوضِ کوثر میں''۔ ''رنگ لایا ہے نکھر کر چمنستاں کی طرح'' اس بات کی واضح عکاسی کرتے ہیں کہ مالیگاؤں میں نعتیہ روایت کے اس دوسرے دور میں نعتیہ شاعری کا کینوس بھی وسعت اختیار کر گیا تھا۔

تیسرا دور :

یہ وہ دور ہے جب کہ اردو شعر و ادب کی فضا میں نت نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ 1936ء سے ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تحریک نے نوجوان نسلوں کو بہت زیادہ متاثر کیا ان کے اندر سرمایہ داروں سے نفرت کے ساتھ ہی مذہب بیزاری اور لادینیت کی وبا بھی عام ہو رہی تھی۔

اِس دور میں ایک طرف اردو نثر و نظم میں شدت پسندانہ خیالات، خدا بیزاری لامذہبیت خاص عنوان بن رہے تھے تو دوسری طرف مذہب پسند شعرا اور ادبا نے دینی اقدار اور اخلاقیات کی حفاظت و صیانت کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی۔ لادینیت کے مقابلے میں دینی اصولوں کو اپنی نثر و نظم میں بیان کیا۔ اخلاقی اقدار اور سماجی، معاشرتی اور تہذیبی ورثے کی حفاظت میں نظم و مضامین لکھے جانے لگے۔ اسم محمد (ﷺ) سے دہر میں اجالا کرنے کی تڑپ نے حمد و نعت کے دامن کو ایک وسیع منظر نامے میں بدل کر رکھ دیا۔ یہ وہ دور ہے جب کہ سائنس و ٹیکنالوجی نے کافی ترقی کی، تعلیم کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ برصغیر

کے عوام دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کے حصول کی طرف بھی تیزی سے راغب ہو رہے تھے۔ دنیا بھر کے حالات کافی بدلنے لگے۔ مالیگاؤں کی نعتیہ شاعری نے بھی اس تبدیلی کے اثرات کو قبول کیا۔ اس دور کے شعرا دینی وعصری درس گاہوں سے منسلک ہوئے تھے اس لیے اب نعت کے مضامین میں بھی تنوع اور جدت و ندرت آنے لگی۔ اہل علم حضرات نے نعتیہ شاعری اور اخلاقی، سماجی، تہذیبی اور ملکی و ملی مسائل کو اپنی غزل، نظم اور نعت وحمد کا موضوع بنایا۔

ایسے لوگوں میں نمایاں طور پر محمد یوسف عزیزؔ، جمال الدین لبیبؔ، عبدالمجید وحیدؔ، منشی سراج الدین سراجؔ، محمد یونسؔ مالیگ (1904ء/ 1982ء)، دین محمد عقیلؔ رحمانی (1906ء/ 1977ء)، محمد الیاس مشتاقؔ برکتی (متوفی 1965ء)، حافظ یعقوب حافظؔ (1911ء/ 1989ء)، محمد نذیر تابشؔ (1919ء/ 2015ء)، الطافؔ انصاری سلطان پوری 1925ء/ 1992ء) وغیرہم شامل ہیں۔ جب کہ دین محمد عقیلؔ رحمانی، منشی سراج الدین سراج اور محمد نذیر تابشؔ تیسرے دور کے ایسے شعرا ہیں جنھوں نے نعت کے سوا کسی اور صنف کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ان میں منشی سراج الدین سراج کا ایک مجموعہ "فی شانِ حبیبہ"، محمد یونسؔ مالیگ کا "جناں بکف"، عقیلؔ رحمانی کے پانچ نعتیہ مجموعے نغمۂ رحمت، شاہنامۂ حرمین، جلوۂ فاراں، گل بانگِ حجاز اور گل زارِ حرم، محمد نذیر تابشؔ کا نعتیہ مجموعہ "متاعِ تابشؔ"، اور عبدالرزاق الطافؔ انصاری سلطان پوری کا نعتیہ دیوان "رُودِ بخشش" اس دور کے شعرا کے نمایندہ نعتیہ مجموعے کہے جا سکتے ہیں۔

اس دور کو مالیگاؤں میں شعر و ادب کا سنہری دور کہا جائے تو یہ غیر مناسب نہیں ہوگا۔ اب مالیگاؤں میں کئی پریس جاری ہو چکے تھے۔ اخبارات و رسائل بھی نکلنے لگے تھے۔ مدارس و جامعات کے ساتھ ساتھ عصری تعلیمی اداروں میں بھی تعلیم و تربیت کا غلغلہ بپا ہو چکا تھا۔ یہ بھی ایک سچائی ہے کہ پریس کے آغاز کے باوجود بھی وسائل کی کمی کے سبب شعرا نے اپنے کلام کی اشاعت میں دلچسپی نہیں دکھائی۔ اس منظر نامے پر ڈاکٹر اشفاق انجم کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ موصوف نے "شعرائے مالیگاؤں" پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر اکثر شعرا کے غزلیہ و نعتیہ اشعار کو یکجا کر دیا۔

یہی وہ دور تھا جس میں ادیبؔ مالیگانوی غزل کی شناخت تھے۔ مسلمؔ مالیگانوی نظم کی پہچان بن گئے۔ سہیلؔ مالیگانوی رباعیات کے قافلہ سالار ہوئے۔ اخترؔ مالیگانوی نے نظم، غزل اور رباعی میں کمال حاصل کیا۔ علاوہ ازیں دیگر شعرا میں محمد نذیر اوج، وقار حیدری، کاملؔ صدیقی، محمد اسحٰق ناصرؔ، سکندر علی منشی، نصیرؔ منشی وغیرہم بھی اپنے اپنے فن میں عروج کی منزلوں پر فائز ہوئے۔ ان اساتذہ نے اپنے شاگردوں کی تربیت کے لیے ادبی انجمنوں کی بنیاد ڈالی اور ماہانہ طرحی نشستوں کا انعقاد کرنا شروع کیا اس طرح مالیگاؤں برصغیر میں اردو شعر و ادب کے ایک محفوظ اور مضبوط قلعے کے طور پر نمایاں ہونے لگا۔ ان

اساتذہ نے نعتیں بھی کہیں مگر طرحی مشاعروں کے لیے لیکن ان کی نعتوں میں جدت و ندرت، نئے رجحانات، بدلتے اقدار اور تغیر پذیر زبان کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی تھی، مثلاً:

محمد مصطفیٰ کے آستانے کا گدا ہوں — چٹائی لے گئی سبقت مری تختِ سلیماں پر
بڑھی ہے اس قدر اب ناتوانی ہجرِ احمد میں — ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

منشی سراج

آنکھوں میں ہے اک بے خودیِ شوق کا عالم — یہ بے خبری بھی مری اک باخبری ہے
ہے گنبدِ خضرا کا پڑا رنگ کچھ ایسا — رنگت دلِ پُر داغ کی دیکھو تو ہری ہے

محمد نذیر اوج

دُرِ عدن ہوا دُرِ دنداں سے منفعل — لعل یمن لبوں سے پشیمان ہوگیا
منور ہے فلک اے نورِ طیبہ کی جھلک تجھ سے — زمیں بھی مرکزِ انوار و عرفاں ہوتی جاتی ہے

محمد یونسؔ مالیگ

ایک پوشاک میں لاکھ پیوند ہیں — پھر بھی خوش حال ہیں پھر بھی خرسند ہیں
اس کے گھر میں نہیں ایک نانِ جویں — جس کی مٹھی میں دونوں جہاں بند ہیں

ادیبؔ مالیگانوی

سبز گنبد کے مکیں تم پر سلام — سرورِ دنیا و دیں تم پر سلام
جسمِ اطہر نور، روحِ پاک نور — جلوۂ شمعِ یقیں تم پر سلام

مسلمؔ مالیگانوی

پئے تبلیغِ دین حق امام المرسلیں آئے — گنہ گارانِ امت را شفیع المذنبیں آئے
بجا باشد اگر غارِ حرا نازد بجاہِ خود — کہ آں جا وحی اول بر امام المرسلیں آئے

جمال الدین لبیبؔ انوری

سنا جس نے دل سے وہ ایمان لایا — اثر گیر تھی گفتگوے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
بڑے جابروں کے بھی سر خم ہوئے ہیں — کہ تسخیر عالم تھی خوے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

عقیلؔ رحمانی

فقط صورت کو دیکھا اور لوگ ایمان لے آئے — صباحت دل کشائی تھی عجب روے محمد میں
یہ طیبہ ہے، مکین لامکاں کی جاے مسکن ہے — کہو رضواں سے آئے باادب کوے محمد میں

محمد الیاس مشتاقؔ برکتی مالیگ

دیکھیے تاثیرِ خطباتِ خطیبِ دوجہاں گوش بر آواز ہیں محراب و منبر آج بھی
بے جان کو جاں بخش دی پتھر کو زباں دی انداز تو دیکھے کوئی اس چارہ گری کا

محمد نذیر تابشؔ

ہم تو ہیں گرویدۂ نورِ مجسم آج بھی تیرگی سے ہم کو نسبت ہے نہ ظلمت سے غرض
جب خالق کونین ہے خود آپ محافظ پھر کیوں نہ بھلا شانِ رسالت رہے محفوظ

الطافؔ سلطان پوری

مقامِ قرب تک وہ مظہرِ نورِ خدا پہنچے کوئی انسان کیا پہنچا جہاں تک مصطفیٰ پہنچے
عقبیٰ کی سب ملا ہے اہلِ حرم کو مژدہ پی کر شرابِ الفت عقبیٰ حصول کیجے

حافظ یعقوب حافظ

اس دور میں چوں کہ ادیبؔ مالیگانوی، وقارؔ حیدری اور کاملؔ صدیقی جیسے اساتذۂ فن نے شعرا کی باضابطہ تربیت کا انتظام کیا تھا یہی وجہ ہے اردو شعر و ادب میں خوب ترقی ہوئی۔ ایسے اساتذہ کے فیضِ صحبت سے بہت سارے شعرا نے جہاں اردو غزل کے میدان میں اپنا مقام بنایا وہیں نعت گوئی میں بھی بعض شعرا نے خوب طبع آزمائی کی اور دنیائے شعر و ادب کو نعتیہ مجموعوں کی شکل میں خوب صورت اور دل آویز، شعری و فنی محاسن سے آراستہ و مزین نعتیہ مجموعے بھی دیے۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ حاجی بلڈانوی (1928ء/ 2004ء) : محورِ حق/کلیم شاہدوی (1926ء/ 2000ء) : عرفانِ کلیم / ڈاکٹر اشفاق انجم (پ 1948 ء) : صلوا علیہ وآلہٖ/ امین صدیقی (1941ء/ 2016ء) : تنزیل/ عبداللطیف لطیفؔ (1943ء/ 2011ء) : حیاتِ مقدسہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا کے علاوہ بعض غزل گو شعرا نے بھی اس دور میں بڑی اچھی اور بہترین نعتیں لکھیں جن میں عتیق احمد عتیق (1923ء/ 2012ء)، جمیل اسدیؔ (1930ء/ 1990ء)، مقیم اثرؔ بیاولی (1941ء/ 2016ء) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان میں مقیم اثرؔ بیاولی کا ایک شعری مجموعہ "سر کے بل" کا مخطوطہ میری نظروں سے گذر چکا ہے۔

ایسے بلند پایہ اساتذۂ سخن کے زیرِ تربیت رہ کر اپنی شعرگوئی کو جلا بخشنے والے نعت نگاروں میں ڈاکٹر اشفاق انجم کی نعت گوئی اپنی جگہ ایک مثالی حیثیت کی حامل ہے۔ موصوف نے اپنے مجموعۂ کلام میں آقائے کریم ﷺ کے لیے ہر جگہ ضمیر تعظیمی آپ کا استعمال کیا ہے، جو یقیناً ایک لائقِ تحسین امر ہے۔ ڈاکٹر اشفاق انجم کی اس شعوری کوشش نے ان کے کلام کو ایک نئے اسلوب اور جہت سے آشنا کیا ہے۔ ان کے یہاں مضامین کا تنوع تو پایا جاتا ہی ہے ساتھ ہی منفرد زمینوں میں بھی ان کے یہاں نعتیہ

اشعار ملتے ہیں، ان کے چند نمایندہ اشعار پیش ہیں ۔

کس کے لیے وجود میں آئی ہے کائنات اس دائرے کا نقطۂ پرکار کون ہے
اک پل میں دو جہان کے رستے سمٹ گئے تو کن ہے کیسا صاحب رہوار کون ہے

اسی دور کے ایک بہترین نعت گو کے روپ میں حاجی بلڈانوی کا نام بھی نمایاں ہے ۔ حاجی صاحب کو ان کے والد سے شاعری ورثے میں ملی جو اپنے وقت کے نامی گرامی قوال تھے اور سماع کی بڑی بڑی مجلسوں میں انھیں عزت و احترام سے بلایا جاتا تھا۔ حاجی کی نعتوں میں روایتی مضامین کے جلو میں ایک پر کیف جذبہ پایا جاتا ہے، حُسن شعری کی کیفیت ہمیں متاثر کرتی ہے ۔

زندگی کی ہر دھڑکن ہے نبی کی دیوانی ہر نفس مرے دل نے یا نبی پکارا ہے
اے الم رسیدہ دل چل دیارِ بطحا میں کوچۂ محمد (ﷺ) میں رحمتوں کا دھارا ہے

ذیل میں تیسرے دور کے مزید چند منتخب نعت گو شعرا کے اشعار پیش ہیں ۔

مدینے کی منزل قریب آ رہی ہے مسلسل نبی کا پیام آ رہا ہے
ادب سے جھکی جارہی ہیں نگاہیں الٰہی یہ کیسا مقام آ رہا ہے
جمالِ لااللہ سے ہو گئے چودہ طبق روشن لیے جب مشعل لا تقنطوا عالی وقار آئے

کلیم شاہدوی

مجھ کو لکھنی ہے نعتِ شاہِ امم حسن پیدا ہو میرے لفظوں میں
ہو عطا دل کو آرزو اس کی میرا مقصد ہو جستجو اس کی
زندگی کا وہی تو حاصل ہے مجھ کو کرنی ہے گفتگو اس کی
سب ہیں ذرے تو آفتاب ہے وہ تیری رحمت میں باریاب ہے وہ
میں تو کچھ بھی نہیں زمانے میں میری ہستی کا انتساب ہے وہ
ہے امینؔ اس کا ایک ادنیٰ غلام اُس پہ لاکھوں درود ، لاکھوں سلام

امینؔ صدیقی

جہاں بھی پائے محمد کی خاک پہنچی ہے پہنچ گیا وہیں نور محمد عربی
قصیدہ پڑھتے ہوئے جھوم کر یہ پہنچے گا مرے جنوں کی ہو محشر میں گر کبھی طلبی

جمیل اسدیؔ

حضور ہو گئے مایوس چل پڑے مکہ جہاں پہ ٹھہرے تھے حضرت مقام تھا نخلہ

پڑھی نماز ہوا جب سکون کا ساماں بڑے ہی سوز سے پڑھنے لگے نبی قرآں
جنوں کی ایک جماعت وہاں سے گذری تھی کلام سنتے ہی حالت عجیب تھی ان کی
ٹھہر کے سننے لگے جن ، حضور سے قرآں سنا کلام تو لائے ، وہ قلب سے ایماں
انھوں نے کلمۂ اسلام کی شہادت دی گئے وہ قوم کی جانب انھیں بھی دعوت دی

عبداللطیف لطیفؔ

مرے رسول کی عظمت بیاں سے باہر ہے کہ خاکِ پائے نبی آسماں سے بڑھ کر ہے
یتیم ہوکے بھی مختارِ دوجہاں ٹھہرے یہ فخر وہ ہے کہ سارا جہان ششدر ہے
بشر تو خیر بشر ہے ، بشر کا دعویٰ کیا کوئی بتائے کہ نبیوں میں ان کا ہمسر ہے

مقیم اثر بیاولی

مالیگاؤں میں اردو نعت گوئی کا یہ دور یقیناً نعتیہ روایت کے ایک مستحکم اور توانا منظر نامے کو پیش کرتا ہے ۔ اس دور میں شعرا نے خوب نعتیں لکھیں اور اس میں نت نئے مضامین کا اضافہ کیا۔ منفرد زمینوں، مشکل بحروں اور نرالی ردیف وقوافی کو برتا۔ جذبات وخیالات کے اظہار میں جدت وندرت کے ساتھ شعری محاسن کو خوش اسلوبی سے اپنی نعتوں میں سموتے ہوئے پیارے آقا ﷺ کی مدحت نگاری کی فصل بہاراں اگائی۔ یہی وہ دور ہے جس نے دورِ حاضر میں نعت نگاری کے منظر نامے کو ایک ایسی مضبوط بنیاد عطا کی جس کے چلتے مالیگاؤں میں نعت گوئی کا عصری منظر نامہ بڑا متاثر کن اور گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔

مالیگاؤں میں نعت گوئی کا عصری منظر نامہ:

جب ہم عصرِ حاضر میں اردو دنیا کے ادبی منظر نامہ پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں اور دیگر اصناف کے مقابل نعتیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو قلب و روح اطمینان وسکون کی کیفیات سے سرشار ہوجاتے ہیں ۔ پہلے پہل نعت گوئی صرف مذہبی حلقوں تک محدود تھی ۔لیکن رفتہ رفتہ جب مذہبی وادبی حلقوں کے شعرا کی مشترکہ کوششیں اس سمت گامزن ہوئیں تو پھر دیکھتے ہی دیکھتے میدانِ نعت میں نعت گو شعرا کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔شاید ہی اردو کا کوئی ایسا بدنصیب شاعر ہو جس نے نعت نہ لکھی ہو، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اردو کے تقریباً ہر شاعر نے بلا مذہب وملت نعت لکھی ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

برصغیر ہندوپاک ہی نہیں بلکہ دنیا میں جہاں جہاں اردو زبان وادب سے منسلک شعرا موجود ہیں وہ اپنا سوزِ دروں اور جذبۂ شوق بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں نعت کے وسیلے سے پیش کررہے ہیں ۔عصرِ حاضر میں نعت گو شعرا جس انداز سے نعت گوئی کی روایت میں نت نئے تجربات کررہے ہیں وہ اس

سے قبل نہیں ہوئے ہیں۔اردو ادب میں رائج جملہ اصنافِ ادب اور نو متعارف شدہ اصناف میں بھی اردو کے نعت گو شعرا نعتیہ کلام پیش کر رہے ہیں۔ ہائیکو، ترائیلے، سانیٹ، ثلاثی اور ماہیے جیسی اصناف میں بھی اردو کے بہ کثرت نعتیہ کلام موجود ہیں۔ نادمؔ بلخی (1928ء/2006ء) اور ڈاکٹر علیمؔ صبا نویدی (پ: 1937ء) کے اردو نعتیہ مجموعہ کلام کلیتہً صنف "سانیٹ" پر ہیں۔ نادمؔ بلخی کے مزید دو نعتیہ مجموعے صنف "دوہا" پر مشتمل ہیں۔اس سے عصرِ حاضر میں اردو نعت گوئی کی مقبولیت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے۔ بعض ناقدین نے اسی روش کو دیکھتے ہوئے اکیسویں صدی کو نعت کی صدی قرار دیا ہے۔

اس عالمی تناظر میں جب ہم مالیگاؤں میں نعت گوئی کا عصری منظر نامہ دیکھتے ہیں تو یک گونہ مسرت ہوتی ہے۔مالیگاؤں کے اکابر شعرائے نعت کے لگائے ہوئے پودے کو دوسرے اور تیسرے دور کے شعرانے اگر شجر سایہ دار بنادیا تو عصرِ حاضر کے نعت گو شعرا اس شجر سایہ دار کو مزید بہاروں سے ہمکنار کر رہے ہیں۔مالیگاؤں میں بھی نعت گوئی کے میدان میں بدلتے رویوں کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہاں بھی عصرِ حاضر میں اردو نعت نگاری میں جو تجربات کیے جارہے ہیں وہ اس سے قبل نہیں کیے گئے اس میں کوئی دورائے نہیں۔عصرِ حاضر کے شعرا عصری شعور کو بڑی خوب صورتی سے اپنی نعتوں میں تحلیل کر رہے ہیں۔نوتراشیدہ اور خود وضع کردہ لفظی تراکیب، مترنم بحروں اور نئی ہیئت و سانچوں کو اندازِ نو سے برت رہے ہیں۔ذات و کائنات کے مسائل ، انسانی دکھوں، تکالیف ، مصائب ، آلام اور پریشانیوں کے مداوا کی بات رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے نعتوں میں کی جارہی ہے۔نئے لہجے اور نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ جدید علامتوں اور اشاروں کو بڑی چابک دستی سے برتا جارہا ہے۔ماضی کے شعرا کی روش پر چلتے ہوئے عصر حاضر میں بھی بہت سے مدحت نگاروں کے نعتیہ مجموعوں کی اشاعت عمل میں آئی۔جن میں سلیم شہزاد (پ:1949ء) :وہ لیلۃ القدر کا ستارا (لاہور یونی ورسٹی) اور کشفیہ/محمد ہارون اکبرؔ :شبستانِ مدینہ،ضیاے ایماں اور رحمتوں کا گھیرا/ظہیرؔ ابن قدسی (پ1944 :ء) :فیضانِ حرم/اشرفی انیس نیرؔ (پ1945 :ء) :شافع محشر/ارشد مینا نگری (پ1942 :ء) :رحمۃ للعالمین/حافظ اسماعیل یار علوی :خورشید جہاں اور مخزنِ ایماں/وقار جعفری (پ1952 :ء) :عقیدت کے گوہر/خالدؔ انور :یہ نبی ہمارا ہے/شیداؔ قادری میرٹھی :ماہِ طیبہ/ماسٹر حسین احمد حامد النوری :ہیں منکر عجب کھانے غرانے والے (طرحی مصرع پر طویل نعت)/ادریسؔ وارثی :رب کے متوا/ڈاکٹر محمد حسین مشاہدؔ رضوی (1979ء) :لمعاتِ بخشش، مشکوٰۃِ بخشش اور تشطیراتِ بخشش/محمد نعیمؔ رضا برکاتی مصباحی :کلام نعیم -تاریخی نام: درمدحتِ نبی حکیم و کریم/عطا ابن یار علوی :سرکار کا جلوہ/عبدالحق تنویر :ورفعنا لک ذکرک شامل ہیں۔

سلیم شہزاد مالیگاؤں کے ادبی افق پر ممتاز ناقد، ماہر لسانیات اور محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے نعت گوئی کی روایت میں اپنی ایک جداگانہ روش بنائی۔ سیرتِ پاک پر ان کی نظموں کا مجموعہ ''وہ لیلۃ القدر کا ستارا'' لاہور یونی ورسٹی سے شائع ہو چکا ہے۔ جس میں نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے نقوش کو نت نئے شعری رویوں اور جدید رجحانات کو بروئے کار لاتے ہوئے نظم کیا ہے۔ اسی طرح ایک حمد و نعت کا مجموعہ ''کشفیہ'' نعت ریسرچ سینٹر کراچی سے حال میں ہی شائع ہوا ہے، کشفیہ سے دو شعر۔

وضو کے چھینٹے گہر تھے، پسینہ تھا مشکباب — صبا مثال زمیں پر خرام تھا اس کا

دنیا کو ناپنے دے خلاؤں کے دائرے — معراجِ مصطفیٰ میں مجھے حق نمائی دے

محمد ہارون اکبیرؔ علیگ عوامی مقبولیت کے پسندیدہ نعت گو شاعر ہیں۔ ان کے زیادہ تر کلام میلاد کی محفلوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ محرم کی مجالس میں ان کے لکھے گئے سلام اور مرثیے بھی گنگنائے جاتے ہیں۔ اکبیرؔ صاحب کا پسندیدہ موضوعِ شاعری نعت و منقبت اور سلام ہے اور عصری منظرنامے پر ان کی نعت گوئی ایک خاصے کی چیز ہے۔ شبستانِ مدینہ، ضیاءِ ایماں اور رحمتوں کا گھیرا ان کے نعتیہ مجموعے ہیں، آپ کے چند نعتیہ اشعار خاطر نشین کیجیے۔

منبعِ جود و سخا میرے نبی — پیکرِ رشد و ہدیٰ میرے نبی

خوش خصال و خوش جمال و بے مثال — آپ کا واصف خدا میرے نبی

عصرِ حاضر میں ظہیرؔ ابن قدسی یوں تو اپنی مزاحیہ شاعری کی وجہ سے مقبول ہیں اور یہی ان کا شناخت نامہ بھی ہے، لیکن جب انھیں حج بیت اللہ اور روضۂ رسول ﷺ کی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تو ان کے جذبات نے نعت گوئی کی سمت سفر شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ''فیضانِ حرم'' کی صورت میں ایک مجموعۂ کلام مالیگاؤں کے نعتیہ افق پر جگمگانے لگا۔ ظہیرؔ قدسی کی نعتوں میں معانی و مفہوم کا نیا رنگ و آہنگ اور اچھوتے خیالات اور جذبات کی وارفتگی ہمیں متاثر کرتی ہے۔

تمنا آرزو حسرت مری آنکھوں میں رہتی ہے — کروں جب آپ کی باتیں نمی آنکھوں میں رہتی ہے

کسی کے کام آجاؤں کبھی انصار کی صورت — سکوں ملتا ہے دل کو اور خوشی آنکھوں میں رہتی ہے

جیسے ہی اشرفی انیس نیر کا نام لیا جاتا ہے تو ذہنوں پر سہرے، رخصتی، ترانے اور الیکشن کے موقع پر پڑھے جانے والے مختلف گیتوں کا تصور ابھرنے لگتا ہے، لیکن انیس نیر کے دل میں محبت رسول ﷺ کا جو جذبہ موجزن تھا اس نے جب کارگاہِ فکر میں شعری پیکر ڈھالنا شروع کیا تو ''شافعِ محشر'' کی صورت میں ایک فکری و فنی محاسن سے لبریز نعتیہ مجموعہ سامنے آگیا، موصوف کے اس مجموعے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے ضمیرِ تعظیمی 'آپ' کے استعمال کی شعوری کوشش کی، جس کے نتیجے

میں ان کی نعت گوئی ایک نئے آہنگ سے ہمکنار ہوگئی، شافع محشر سے چند منتخب اشعار۔

ہردم مجھے طلب سے زیادہ عطا کیا قطرہ جو میں نے مانگا تو دریا بہادیا
عارض نے ماہ تاب کو بے نور کردیا چہرے نے آفتاب کا خاکہ اڑا دیا

ارشد مینانگری مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ ''رحمۃ للعالمین'' ان کی تقدیسی شاعری کا خوب صورت مجموعہ ہے، اس مجموعے کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے مختلف ہیئتوں میں نعتیہ کلام قلم بند کیے ہیں۔ ان کے یہاں غزل، رباعی، قطعہ، سانیٹ، ہائیکو، ثلاثی، ماہیے وغیرہ اصناف میں نعتیہ کلام ملتے ہیں۔

اک بشر صاحبِ معراج بنا عظمتوں کے جہاں کا راج بنا
آپ کا ہر قدم خدا کی قسم عرشِ اعظم کے سر کا تاج بنا

حافظ اسماعیل یارعلوی ایک بہترین خطیب، خوش الحان قاری، اچھے ناظمِ اجلاس اور مترنم لب و لہجے کے حامل خوش فکر و خوش گلو نعت گو شاعر کے رُوپ میں جانے جاتے ہیں۔ کئی برس قبل آپ کے دو مختصر نعتیہ مجموعے ''خورشیدِ جہاں'' اور ''مخزنِ ایماں'' شائع ہو کر اپنے حلقے میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ یارعلوی صاحب کے نعتیہ اشعار۔

مدح خواں شاہِ مدینہ کا ہے تُو یارعلویؔ اس لیے سب ہی ترے چاہنے والے نکلے
خانۂ دل مرا تاریک تھا لیکن اب تو ان کی یادوں کے اجالوں سے یہ معمور ہوا

وقار جعفری مالیگاؤں کے ایک بہترین لب و لہجے کے مقبول شاعر ہیں۔ مشاعروں میں پسندیدگی کے ساتھ سنے جاتے ہیں انھوں نے بھی بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں یوں ''عقیدت کے گوہر'' بکھیرے ہیں۔

جو محمد کی خاکِ پا ہوجائیں بابِ فردوس اُن پہ وا ہوجائیں
گر طرفدارِ مصطفیٰ ہوجائیں سب گنہگار پارسا ہوجائیں

خالدؔ انور کا نام بھی مالیگاؤں کے عصری منظر نامے پر ایک نعت گو شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، مذہبی جلسوں اور نعتیہ مشاعروں میں اپنے مخصوص لب و لہجے اور ترنم کی وجہ سے مقبول ہیں، موصوف کے چند کلام پر مشتمل ایک مجموعہ ''یہ نبی ہمارا ہے'' شائع ہو چکا ہے، خالدؔ انور کے مشہور نعتیہ اشعار۔

پڑھ کے نعتِ پاکِ مصطفیٰ محترم جناب ہوگئے مکّی مدنی صدقے آپ کے ذرے آفتاب ہوگئے
اذانوں سے نمازوں تک محمد ہی محمد ہے گلوں سے عطر دانوں تک محمد ہی محمد ہے

مالیگاؤں کے حالیہ نعتیہ منظر نامے پر ادریسؔ وارثی بھی اپنے ترنم اور پوربی لب و لہجے کے سبب

پسند کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے نبی کریم ﷺ کی مدحت کے خوب صورت گل بوٹے بکھیرتے ہوئے ''رب کے متوا'' کے نام سے ایک مجموعے کی شکل میں مالیگاؤں کے نعتیہ افق پر اپنی عقیدت کا نشان مرتب کیا۔

اگر دنیا کو قدموں میں جھکانا ہے تو لازم ہے رسولِ پاک کی سیرت کو اپنے درمیاں کرلیں
مرا یہ فرض بنتا ہے کہ دشمن کو دعا دے کر نبھاؤں سنتِ احمد کسی پتھر کو نم کردوں

ماسٹر حسین احمد حامد النوری نے کافی نعتیں لکھیں، نعت کے علاوہ سلام اور بزرگانِ دین کی شان میں منقبتیں بھی لکھیں۔ ''ہیں منکر عجب کھانے غرانے والے'' ان کی ایک طرحی مصرع پر طویل نعت تھی جسے انھوں نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ موصوف کے یہاں سادگی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے، ان کا کلام عقیدے و عقیدت کی ترجمانی کرتا ہے۔

پڑھا کر پڑھا کر تو کلمہ پڑھا کر مگر دل میں عظمت نبی کی بسا کر
یہ روشن جہاں کل خدا نے کیا ہے مگر نور محبوب پہلے بنا کر

مالیگاؤں کے شعری افق پر اچانک شیدا آقادری میرٹھی اپنے غزلیہ مجموعے ''کلمۂ حباب'' کے ذریعے وارد ہوئے اور نہایت قلیل عرصہ میں ''ماہِ طیبہ'' کے نام سے ایک نعتیہ مجموعے کی اشاعت بھی کی، ان کے اشعار۔

ہادیِ برحق کو بھیجا ہے ہمارے بیچ بندوں پر ہے یہ تیرا احسان خدا
واسطہ تجھ کو تیرے ہی محبوب کا ہے مجھ کو بنادے طیبہ کا مہمان خدا

محمد نعیمؔ رضا برکاتی مصباحی، جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے فارغ التحصیل جواں سال عالم و فاضل اور مفتی ہیں، دورانِ طالب علمی انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے تئیں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے جو شعری سرمایہ جمع کیا تھا وہ ''کلامِ نعیم - تاریخی نام: درمدحتِ نبی حکیم و کریم ''ـ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، کلامِ نعیم سے چنیدہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

طفیلِ نعتِ نبی نغمگی چمکتی ہے ہلاؤں لب تو زباں پیشگی چمکتی ہے
تمام شاہوں کی شاہی تو مٹ گئی لیکن مرے نبی کی ابھی خسروی چمکتی ہے

عطا ابن یار علوی بچپن سے نعت خوانی اور نعت گوئی کی طرف مائل بہ پرواز ہیں، اپنے مترنم لب و لہجے کے سبب مشاعروں کی دنیا میں رفتہ رفتہ مقبولیت حاصل کرنے والے عطا ابن یار علوی نے نہایت کم عمری میں ایک نعتیہ دیوان ''سرکار کا جلوہ'' کے ذریعے مالیگاؤں کے نعتیہ افق میں دل کش اضافہ کیا۔ عطا کے چند اشعار نشانِ خاطر کریں۔

جو دیکھ لے بن جائے وہ کردار کا پیکر ہے سب سے الگ آپ کے کردار کا جلوہ
کہتے ہیں لوگ سایہ نہیں ہے رسول کا ہم مانتے ہیں سایہ ہے ان کا جہان پر

جس وقت ''مالیگاؤں میں اردو نعتیہ شاعری کی روایت'' اس عنوان پر مضمون لکھنے کے لیے راقم کو دعوت دی گئی اسی دوران عبدالحق تنویرؔ اپنے زیرطبع مجموعہ ''ورفعنا لک ذکرک'' کا مسودہ لے کر ناچیز کے غریب خانہ پر تشریف لائے تھے، چوں کہ موصوف کا یہ مجموعہ اشاعت کے لیے بالکل تیار ہے لہٰذا ''مالیگاؤں میں نعت گوئی کا عصری منظر نامہ'' کے راقم صاحب کتاب نعت گو شعرا کے ضمن میں ان کا ذکر کرنا بھی مناسب تصور کرتا ہے۔ موصوف ایک کہنہ مشق اور بہترین شاعر ہیں۔ زبان و بیان، شعری محاسن اور تقدیسی شاعری کے رموز و اسرار سے واقف ہیں۔ خوب صورت لب و لہجے میں جب وہ اپنا کلام سناتے ہیں تو سامعین پر ایک کیف طاری ہوجاتا ہے۔ موصوف برسوں سے شعری ریاضت اور نئے لکھنے والوں کی تربیت کے حوالے سے چھوٹوں اور بڑوں میں یکساں مقبول ہیں۔ ان کے زیرطبع نعتیہ مجموعے سے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کردو آقا کرم کی نظر دھوپ میں جل رہا ہے یہاں ہر بشر دھوپ میں
کل تک تھی روشنی سے بہت دور کائنات نورِ نبی سے ہوگئی پُرنور کائنات

اب تک ''مالیگاؤں میں نعت گوئی کے عصری منظر نامہ'' کے تحت ان شعرا کا تذکرہ کیا گیا جو کہ صاحب کتاب نعت گو ہیں۔ مالیگاؤں میں ان کے علاوہ بھی دورِ حاضر میں بیشتر شعرا ایسے ہیں جنھوں نے غزلوں کے ساتھ ساتھ بڑے ہی خوب صورت انداز میں نت نئے رجحانات، خیالات، افکار اور معنی آفرینی کے ساتھ نعتِ مصطفیٰ ﷺ کے حسین و جمیل گل بوٹے کھلائے ہیں، جن میں فاروق اختر مالیگؔ، عادل فاروقیؔ، ڈاکٹر الیاس وسیمؔ صدیقی، صالح ابن تابشؔ، شبیر آصفؔ، عبدالمجید مظہرؔ صدیقی، ڈاکٹر نعیم اخترؔ، اثرؔ صدیقی، اقبال احمد آصفؔ ملّی، عبدالواحد انصاری، الطاف ضیا، فرحان دل، رفیق سرورؔ، لطف ہارونی، نجمیؔ ابن جاوید، ندیم ظفرؔ، ظہیرؔ اکمل، عرفان ندیمؔ، مقصود اشرفی وغیرہم نہ جانے ایسے کتنے شعرا ہیں جو دیگر اصناف کے شانہ بہ شانہ نعت نگاری میں بھی اپنی جولانی بکھیرتے ہوئے مالیگاؤں میں نعتیہ روایت کو مستحکم اور توانا بنانے میں مصروف ہیں۔ ذیل میں مالیگاؤں کے چند منتخب معاصر شعرا کے چنیدہ نعتیہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

زمین عرشِ بریں کا جواب لگتی ہے یہ بارگاہِ رسالت مآب لگتی ہے
ہیں جاں نثار صحابہ کے درمیاں آقا زمیں میں انجمن ماہ تاب لگتی ہے

فاروق اختر تشنہ مالیگ

یہ کون آیا کہ جس کی تمکنت سے نظام بت کدہ سہما ہوا ہے
تبھی اک نور کی بارش ہوئی تھی اُجالا آج تک پھیلا ہوا ہے

عادلؔ فاروقی

اذیتیں دشمنوں کا پیشہ ، معاف کرنا تمہارا شیوہ
اِدھر تھا مرہم ، اُدھر تھے نشتر جنابِ عالی حضورِ والا
عداوتوں کے عوض محبت ، دعائیں دیں گالیوں کے بدلے
وہاں تھے پتھر یہاں گل تر جنابِ عالی حضورِ والا

ڈاکٹر الیاس وسیمؔ صدیقی

ہو غیرت ماہتاب کوئی کہ رشک صد آفتاب کوئی
نہ لا سکا ہے نہ لا سکے گا مرے نبی کا جواب کوئی
سفر ستاروں کا کرنے والے سکوں کی خاطر تڑپ رہے ہیں
اب اُن کی سب کالجوں کو دے دے نبی کا بخشا نصاب کوئی

صالحؔ ابن تابشؔ

حسب نسب کی مٹادیں تمام تفریقیں فروغِ عشق پہ مامور ہے پیامِ رسول
ہم اپنے دشتِ سفر میں بھٹک نہیں سکتے نشانِ منزلِ مقصود ہے نظامِ رسول

شبیر آصفؔ

عرب کی سرزمیں اخلاص کا گہوارہ لگتی ہے جہاں تخریب اب تعمیر کے سانچے میں ڈھلتی ہے
یہ اس معمارِ اعظم ہی کی سب تعمیر لگتے ہیں جنھیں خیرالبشر کے نام سے ہم یاد کرتے ہیں

عبدالمجید مظہرؔ صدیقی

یہ شمس بھی شہِ انوار تک نہیں پہنچا کسی کا قد مرے سرکار تک نہیں پہنچا
ابھی سے خوشبوئیں آنے لگیں تقدس کی ابھی میں آپ کے دربار تک نہیں پہنچا

ڈاکٹر نعیم اختر

اے مزمل، اے مدثر، اے مرے خیر البشر
چشمِ نم کی طشتری میں مثل ناسفتہ گہر
لے کے آیا ہوں میں تسلیمِ نظر
اے چراغِ کعبہ! اے مرے ظلمت شکن

اس لیے سرشار ہے سیلِ کلام
ہے رقم قرطاسِ لب پر مصرعہ حرفِ سلام
رونقِ شہرِ نبوت! اے بہارِ خاک داں
آخرِ شب عالمِ تنویر میں
روح کی گہرائیاں آداب کہتی ہیں
تجھے

سید السادات! میرے محسنِ انسانیت

اثر صدیقی

وہ تو سراپا نور ہیں کیسے ثنا لکھوں
سورج کو ہے چراغ دکھانے کے ہو بہو
اُن کا مقام کیا ہے اذانوں سے ہے عیاں
جن کے طفیل حشر میں ہم ہوں گے سرخرو

اقبال احمد آصف سملی

گناہگاروں کی محشر میں اک ہنسی کے لیے
حضور روتے تھے راتوں کو اُمتی کے لیے
سلام دائی حلیمہ تری غریبی کو
چُنے گئے ہیں نبی تیری جھونپڑی کے لیے

عبدالواحد واحدؔ انصاری

کہیں نعتِ احمد پڑھی جا رہی ہے
مرا دردِ دل دیکھو کم ہو رہا ہے
وہاں حُسنِ یوسف پہ اُنگلی کٹی تھی
یہاں عشق میں سر قلم ہو رہا ہے

الطاف ضیا

زمانے میں جسے کاغذ قلم دونوں میسر ہیں
وہ کاغذ اور قلم سے کام لے لے ایسا تھوڑی ہے

خدا توفیق دیتا ہے تو لب حرکت میں آتے ہیں
کوئی بھی مصطفیٰ کا نام لے لے ایسا تھوڑی ہے

فرحان دلؔ

جو دیا حق نے روشن کیا کب کسی سے بجھایا گیا
ہو گیا جھوٹ کا سر نگوں سچ کا مژدہ سنایا گیا

لطف ہارونی

نہیں رکھتے لعل و گہر سے تعلق ہے جن کا محمد کے در سے تعلق
عطا جو کرے دشمنوں کو بھی سایا ہمارا ہے ایسے شجر سے تعلق

نجمی ابن جاوید

خدا کے نور کی آمد ہے آسمانوں پر
کھڑے ہیں سینکڑوں مہتاب دیکھنے کے لیے
ہزار بار مدینے کو دیکھ کر بھی لوگ
ہزار بار ہیں بیتاب دیکھنے کے لیے

رفیق سرورؔ

ہوں نعت گو نبی کا، میرے روبرو کمال کی
حدوں سے بھی گذر کے تم کمال کر نہ پاؤ گے
اگر نبی نے فکر پر مری عروج لکھ دیا
تو پھر کبھی بھی تم اسے زوال کر نہ پاؤ گے

طاہرؔ انجم صدیقی

آسائش دنیا کی طلب خاک بھلا ہو
جب ذکرِ نبی روح کی مرغوب غذا ہو
اس عشق میں آتی نہیں قانونی رکاوٹ
سرکارِ مدینہ سے جو منظور شدہ ہو

پروازؔ اعظمی

کی دعا جب آپ نے محور سے ہٹ کر آگیا
آپ کی تعظیم میں سورج پلٹ کر آگیا
آپ نے انگلی کا اک ہلکا اشارہ جب کیا
سب نے دیکھا چاند دو ٹکڑوں میں کٹ کر آگیا

عبدالقدوس ارحم

خوشبوؤں میں ڈھلی پوشاک بدل کر نکلی
میری ہر بات مرے منہ سے سنبھل کر نکلی
جب بھی گستاخ نے توہین رسالت کی ہے
پھر تو تلوار میانوں سے اچھل کر نکلی

ڈاکٹر انیس بوستانی

تاج و حکومت اور نہ مسند کے ارد گرد
کھو جائیں ہم مدینے کی سرحد کے ارد گرد
کلمہ بتا رہا ہے بلندی رسول کی
دیکھو خدا کا نام محمد کے ارد گرد

ارشاد انجم

ہے بے مثال گنبدِ خضرا رسول کا
جنت ہے اس زمین پہ روضہ رسول کا
پتھر شکم پہ آپ کے یوں ہی نہیں بندھے
اعزازِ بندگی ہے یہ فاقہ رسول کا

جمیل ساحر

جو عاشق ہیں تصور ہی میں روضہ دیکھ لیتے ہیں — اگر عشقِ نبی ہو دل میں تو ویزا نہیں لگتا
نبی کے در پہ جانے کو ظفر تقدیر لگتی ہے — وہاں کی حاضری کے واسطے پیسا نہیں لگتا

ندیم ظفر

رقص کرتی ہے رحمت مصطفیٰ کے آنگن میں — دیکھو جلوۂ قدرت مصطفیٰ کے آنگن میں
لوٹ لے گا یہ اکملؔ جب بلائیں گے آقا — جا کے صدقۂ عترت مصطفیٰ کے آنگن میں

ظہیر اکملؔ

جو بھی شیدائے خیرالبشر ہوگیا ساری دنیا میں وہ معتبر ہوگیا
خار گل بن گئے دشت گلشن بنا جس طرف سے نبی کا گذر ہوگیا

عرفانؔ ندیم

مختصر یہ کہ عصرِ حاضر میں عالمی منظرنامے کے ساتھ ساتھ مالیگاؤں میں بھی اردو نعت میں لسانی، ہیئتی اور شعری تجربوں سے اسے نئی سمتوں اور جہتوں سے ہم کنار کرنے والے شعرا کی فہرست مکمل طور پر پیش نہیں کی جاسکتی۔ اردو نعت گوئی کا یہ نہ رُکنے والا سلسلہ مسلسل جاری و ساری ہے۔ جذبات کا ایک سیلاب ہے جو امنڈا چلا آرہا ہے۔ تھمائے نہیں تھمتا، سب کی نگاہیں ایک ہستی کی طرف لگی ہوئی ہیں، اپنی اپنی بساط کے مطابق سب جلوے سمیٹ رہے ہیں۔ فکر و خیال کی جھولیاں بھر رہے ہیں۔ دنیائے جدید کی تاریک فضاؤں میں نور بکھیر رہے ہیں۔ دل گرمارہے ہیں۔ رُوح جگا رہے ہیں۔ قدم قدم روش روش گل کھلا رہے ہیں۔

حاصلِ مطالعہ کتب :

نقوش	:	حفیظ مالیگانوی
مالیگاؤں میں اردو نثر نگاری	:	ڈاکٹر الیاس صدیقی
مالیگاؤں کی سیاسی اور سماجی تاریخ	:	ڈاکٹر الیاس صدیقی
مسلم مالیگانوی : فن اور شخصیت	:	ڈاکٹر ساجد انصاری
گلدستۂ سخن	:	بزمِ سخن، اسلام پورہ، مالیگاؤں
نعت رنگ، کراچی	:	شمارہ 26، دسمبر 2016ء
مالیگاؤں کے منتخب شعرا	:	ڈاکٹر شاہینہ صدیقی
مختلف نعتیہ و غزلیہ مجموعے	:	متفرق شعرائے مالیگاؤں

ooo

فکر و فن

کھلا ہے چہرۂ مدحت کتاب کی صورت
ہمیں ہے نعت سرائی نصاب کی صورت

(محمد بشیر رزمی)

ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی، فیصل آباد

خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری میں حبِ پیغمبر ﷺ

ABSTRACT: Khwaja Ghulam Fareed (R.A) is a renowned mystic poet of Saraiki language. He was actually multi linguistic poet and scholar of his time. He composed poems denoting high intensity of love and affection for Holy Prophet Muhammad (S.A.W). His creative trends show his mystic approach to express his sensational feelings. He was not satisfied with general trends of listening; rather he tried to inquire into his deep inner self to comprehend reality of religious experience. Some couplets of his are presented in this article to introduce thought content of his poetry.

صوفیانہ شاعری کے منظرنامے پر سرائیکی کافیوں کے خاص سوز و گداز اور اُن میں زبان کے مخصوص رس کے باعث خواجہ غلام فریدؒ کا نام ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ اس نمایاں شناخت میں اُن کے تخلیقی عمل کی ریاضت اور رچاؤ کے ساتھ ساتھ علم و تحقیق کے میدان میں اُن کی نگاہِ بصیرت کا دخل بھی ہے کہ وہ محض کسی کنجِ سکون میں بیٹھ کر شعر کہنے والے نہ تھے بلکہ مجالس میں تشنگانِ علم کی سیرابی کو بھی اپنا فریضۂ خاص تصور کرتے تھے۔

یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ مقامی سطح پر اگرچہ اُن کی پہچان اُن کی سرائیکی کافیاں ہیں۔ تاہم اُن کے تخلیقی کام کو وسیع پیمانے پر دیکھیں تو ان کا کلام کئی ایک زبانوں میں دستیاب ہے اور انھیں اگر شاعرِ ہفت زبان کہا جاتا ہے تو بجا ہے۔ یہ بھی ایک دلچسپ پہلو ہے کہ وہ جن زبانوں میں شاعری کرتے تھے ان میں مقامی زبانیں بھی شامل ہیں اور وہ زبانیں بھی ہیں جو مقامی تو نہیں ہیں لیکن مقامی ماحول پر اُن کے تہذیبی اثرات ضرور ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی عربی اور فارسی شاعری بطورِ خاص لائقِ توجہ ہے۔ اُن کا یہ فارسی شعر ملاحظہ ہو جس میں تہذیبی رنگ اپنی ایک خاص آب و تاب کا حامل ہے:

سروِ قدش آزاد چو می دید موزن
رَفت از دہنش لفظِ فلاح قد و قامت (۱)

خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی پر نظر ڈالیں تو اُن کا شجرہ نسب حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ اُن

کے آباؤ اجداد ہجرت کر کے سندھ میں آباد ہو گئے۔ آپ کی ولادت مصنف ''مناقبِ فریدی'' کے مطابق:

''۲۶ ذیقعد ۱۲۶۱ھ/ ۲۶ نومبر ۱۸۴۵ء میں حضور نے تولد ہو کر سرزمین چاچڑاں شریف کو مشرف کیا۔'' (۲)

چار برس کی عمر میں والدہ اور آٹھ برس کی عمر میں والدِ گرامی کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آپ کی پرورش پہلے ماموں اور بعد ازاں برادرِ بزرگ حضرت خواجہ فخر الدینؒ نے کی جن کے ہاتھ پر آپ نے بیعت بھی کی۔ یوں وہ آپ کے مرشد بھی قرار پاتے ہیں۔ اُن کے فیضِ خاص سے آپ نے چھے (۶) برس کی عمر میں بیشتر علوم پر دسترس حاصل کر لی۔

حضرت خواجہ فخر الدینؒ کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد آپ سجادہ نشین ہوئے۔ بعد ازاں آپ روہی تشریف لے گئے اور اٹھارہ سال عبادتِ حق میں مشغول رہے۔ ۱۸۷۵ء میں آپ نے حج کی سعادت حاصل کی۔

جہاں تک آپ کی عائلی زندگی کا تعلق ہے تو آپ کی پہلی زوجہ زہرہ بی بی تھیں، جن کے بطن سے ایک فرزند خواجہ محمد بخش اور ایک دختر پیدا ہوئیں۔ آپ کی دوسری اہلیہ ہوت بی بی جبکہ تیسری اہلیہ کا نام جان بی بی تھا مگر ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

آپ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ/ ۲۴ جولائی ۱۹۰۱ء راہی ملکِ بقا ہوئے جس کے بعد اُن کے فرزند کو سجادہ نشینی عطا ہوئی۔

آپ کے علمی و ادبی سرمائے میں آپ کے شعری دواوین سرائیکی، اُردو اور فارسی کے علاوہ درج ذیل تصانیف قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ حاشیہ لوائح جامی
۲۔ شرح لوائح جامی
۳۔ حسنات العارفین
۴۔ فوائدِ فریدیہ
۵۔ مناقبِ محبوبیہ
۶۔ مکتوباتِ فریدی
۷۔ مقابیس المجالس

مذکورہ تصانیف میں خواجہ غلام فرید نے علم و عرفان کے کئی ایک پہلوؤں پر بحث کی ہے جن موضوعات سے اُن کی خصوصی دلچسپی نظر آتی ہے اُن میں الٰہیات، تصوف، منازلِ سلوک اور مسائل بقا و

فنا بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

خواجہ غلام فرید کی کافیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اگرچہ بیشتر کافیوں میں عشق ایک بنیادی موضوع ہے تاہم بعض کافیوں میں آپ نے ذاتِ خداوندی سے متعلق روحانی عقائد ونظریات کو پوری شرح و تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بقول کرسٹوفر شیکل:

> "The centre of this inspiration lies in his adherence to the Sufi doctrine of the unity of being, according to which nothing - if rightly regarded - is separate from God, who may be directly apprehended through one's own heart. This is certainly no easy process, as the suffering endured by those who attempt to follow this mystical path of love so clearly shows. But the alternative is to be lost in the most serious of sins, the separation from God and imprisonment in a false picture of self-identity, which stem from the dualism of self-esteem."(3)

اُن کی کافیوں میں جہاں حبِ الٰہی کی جلوہ گری پوری آب وتاب کے ساتھ ہے۔ وہاں رسولِ کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے محبت کی تابانی بھی پورے طور پر موجود ہے اور وہ اپنی شاعری مضامین حب اور عقیدت واردات کا اظہار نہایت احسن پیرائے میں کرتے ہیں اور اُس احتیاط کا التزام بھی کرتے ہیں جو آپ ﷺ سے محبت کا تقاضا ہے۔ بقول مسعود حسن شہاب:

> ''سالکانِ راہِ طریقت کے لیے یہ منزل بڑی احتیاط کی طلب گار ہوتی ہے۔ یہاں اگر ذرا بھی پاؤں میں لغزش آجائے تو تمام ریاضت اور محنت اکارت چلی جاتی ہے۔ اس لیے تو کہا گیا ہے:
>
> ع با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار
>
> خواجہ صاحب نے سلوک کی یہ راہ بڑی احتیاط سے طے کی اور منزل رسی کے شوق میں کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھایا جو شانِ محمدیہ کے خلاف ہو۔ وہ اس راہ میں سر کے بل جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔''(۴)

خواجہ غلام فرید کے نزدیک حسنِ الٰہی کا ظہور رسالت مآب ﷺ کی صورت میں ہوا۔ حسنِ ازل کا مقام نہایت ارفع ہے اور وہاں تک فکرِ انسانی کی رسائی ممکن نہیں ہے یہ وہ منزل ہے جہاں نہ تو کوئی

طالب ہے نہ مطلوب۔ انسان کی نگاہ بصیرت جس قدر بھی ہو یہ ممکن نہیں ہے کہ ارفع ذات اُسی کے احاطۂ ادراک میں آسکے کہ وہ ماورائے بصارت ہے۔

حسن ازل نے غیب کے دیس سے شہادت کے شہر میں بسیرا کیا اور اپنے رخ سے ادایت کا نقاب اتار کر خود کو ظاہر کیا چونکہ پیمبر کی صورت میں حسنِ الٰہی ظہور کر رہا ہے اس لیے آپ ﷺ کا حسن بے مثال ہے۔

خواجہ غلام فرید نے اپنی ایک کافی میں جہاں مذکورہ حقائق اور محاسنِ جمال کو صوفیانہ اسلوب میں بیان کیا، وہاں اس امر پر بھی اطمینان کا اظہار کیا آپ ﷺ کی بعثت سے علم و تحقیق کو فروغ حاصل ہوا۔ وہ اس امر پر شکر ادا کرتے ہیں کہ اُن کے مرشد یعنی حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ کامل ہے۔ آپ ﷺ نے عرب معاشرے میں توہمات کے بت گرا کر شکوک و شبہات کو شکست دی اور جہالت کے اندھیروں میں علم و تحقیق کے چراغ اِس انداز میں فروزاں کیے کہ انسانوں پر اصل مگر مخفی حقائق واضح ہو گئے۔ آپ فرماتے ہیں:

گئی تقلید آئی تحقیقے   تھئے واضح مکشوف دقیقے

فاش مُبین کُل اسرار   برزخ زیر زبر شد مد

(سنی سنائی پہ عمل کرنے کا دور گزر گیا۔ تحقیق کا دور آگیا کیونکہ اب تو ہم پہ حقائق اپنی باریکیوں سمیت ظاہر ہو گئے ہیں اور برزخ اور سر لا الہ اور اس کے اسرار و رموز واضح طور پر منکشف ہو چکے ہیں۔)

کیتا ازلی لطف ظہورا   سو سو شکر ملیا گر پورا

تھیا دل کوں تسکین قرار   ہوئے خطرات شکوک سبھے رد

(لطف ازل کا ہم پہ اظہار ہوا، مقام تشکر کہ مرشد بھی کامل ملا۔ تمام شکوک و شبہات مٹ گئے اور قلب مطمئنہ حاصل ہو گیا۔)

پیر مغاں مسجود جتوسے   فرض فرید نماز نیتوسے

کیتا من کر من اقرار   ہے خود اصل حقیقی مقصد (۵)

(مرشد کامل کو ہم نے اپنا مسجود بنا لیا، اس کے احکامات کو فرض سمجھ لیا اور نماز عشق قائم کر لی اور مشاہدہ کے بعد یہ اقرار کر لیا ہے کہ یہی اصل ہے اور یہی مقصد حقیقی ہے۔)

۱۸۷۵ء میں حضرت خواجہ غلام فریدؒ کو سعادتِ حج نصیب ہوئی۔ سرزمینِ حجاز پہنچ کر آپؒ نے اپنے محسوسات کو جن الفاظ کا روپ دیا، اُن کی انفرادیت اپنی مثال آپ ہے۔ ان اشعار میں وصل کی سرشاری کے لیے خواجہ صاحب نے سرزمینِ عرب کی تمثال کاری اپنے مخصوص ثقافتی رنگ میں کی۔ آپؒ

کے نزدیک اس دیارِ مقدس کا جمال باغِ بہشت سے کم نہیں۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ کافی کی صنف میں جزئیات نگاری کی گنجائش قدرے کم ہوتی ہے لیکن خواجہ غلام فرید نے رسولِ کریم ﷺ کی محبت کے باعث ملکِ عرب اور شہرِ مدینہ کے مناظر کا نقشہ بڑی دلاویزی کے ساتھ کھینچا ہے۔ جس میں بعض ضروری تفصیلات کی تمثالیں بڑی دلکشی کے ساتھ نمایاں ہیں۔

جیندیں عرب شریف ڈٹھوسے   لُہندیں سکدیں نہ مرگیوسے
سوہنے سانول یاد کیتوسے   ہار سنگھار سہاندے ہن

(تمناؤں میں گھلتے اور ترستے ہوئے مرجانے سے پہلے جیتے جی عرب شریف کا دیدار کرلیا، محبوب دل نواز نے آج یاد فرمالیا، آج تو ہار سنگار زیب دے رہے ہیں۔)

وادیاں راہ مدینے والایاں   ساگی باغ بہشتی چالیاں
ہر ہر آن سدا خوش حالیاں   سُکھ سہرے ڈُکھ ماندے ہن

(مدینے کی وادیاں، رشکِ فردوش ہیں کتنی خوش حال ہیں، یہاں پہ آکے دکھ کمزور ہوگئے اور سکھ طاقت ور ہوگئے۔ عرب شریف کے انداز بہت خوبصورت ہیں۔ یہ تو دل کے اندر محبت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔)

عرب شریف دی سوہنی ریتے   لاوے دل نوں پرم پلیتے
وسرے چاچڑ صدقے کیتے   اصلوں محض نہ بھاندے ہن

(چاچڑان اس پر قربان، اب تو ہمیں نہ وہ یاد ہے نہ وہاں جانا پسند ہے۔)

حسن جمال دی دھرتی آئی   سبھ شے چاہری طرز ڈِکھائی
فرحت روز فرید سوائی   ڈھوکڑے ماندے ساندے ہن(۶)

(حسن و جمال کی سرزمین آگئی، ہر چیز شگفتہ و شاداب دکھائی دینے لگی، فرحت دل روز افزوں اور ملال و اضمحلال کمزور و شکستہ خاصر ہیں۔)

حجاز کے دلکش مناظر اور وصل کی سرشاری کی کیفیات، جس عمدگی سے خواجہ صاحب نے بیان کی ہیں، اُن کی بعض کافیوں میں رسول کرم ﷺ سے ہجر و فراق کے احساسات بھی نہایت دردمندی سے ظاہر ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض کافیوں میں تو براہِ راست اس رنج کا اظہار ہے جبکہ دیگر کافیوں میں فراق کا دکھ ایک عمومی پیرائے میں ملتا ہے۔

خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں میں کیفیاتِ وصل ہوں یا رنجِ فراق رسول کریم کی ذات والا صفات سے محبت ہی کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ وہ لفظ ''عشق'' کا استعمال ہی ایسے اسلوب میں کرتے ہیں

کہ قاری کا ذہن عشقِ رسول کے علاوہ کسی اور سمت جاتا ہی نہیں۔ مظاہر کائنات ہوں یا زندگی کی عام دلچسپی کی اشیا، وہ ہر شے کے وجود کو محبوبِ الٰہی سے دلی وابستگی کے تناظر ہی میں دیکھتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید کی کافیوں میں ایک دلچسپ عنصر یہ بھی ہے کہ وہ رسول کریم کا سراپا ایک ایسے منفرد پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ سرائیکی وسیب کے ایک ''سانولے محبوب'' دکھائی دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب اسی سلسلے میں کبھی ''سانولڑا''، کبھی ''سانول'' اور کبھی ''ڈھولن یار'' کے لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اُن کا یہ اسلوب کیفیات کی پُراثر عکاسی کے لیے بھی ہے کہ اُن کا قاری محبت کے جن احساسات کو مقامی سطح پر اپنے باطن میں جس طرح محسوس کر رہا ہے وہ رسول کریم سے محبّ کا بھی حقیقی وجودی تجربہ محسوس کرے۔ خواجہ صاحب کی کافیوں کا مطالعہ کریں تو اُن کا یہ اسلوب اپنے اندر حزم واحتیاط کا بھی پورا اہتمام رکھتا ہے اور وہ اپنے بیان میں کسی ایسی لغزش کا شکار نہیں ہوتے کہ اُن کے شعری پیرائے میں حقیقی محبت کا عکس اگر محبوبِ مجازی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے تو رنگِ تقدیس ماند پڑے۔

اَج سانولڑے مُکلایا ، سر بار ڈُکھاں دا چایا

(آج محبوب ملیح ہم سے رخصت ہونے لگا۔ سر پر دکھوں کا بوجھ آپڑا۔)

کر یاد حریم حرم کوں رکھ پیش پُرانے غم کوں
دل آکھے کھانواں سم کوں ہے جیون کوڑ اجایا

(حرم کعبہ کو اور اپنے سوزِ دیرینہ کو یاد کر کے، دل کہتا ہے، زہر کھالے، کیونکہ اس کے بغیر، زندگی، بے مصرف ہے۔)

دل دلبر کیتے سِکّے گھر شہر بازار نہ ٹِکے
ونج کھوسوں طوف دے ڈِھکے دل جیکر بخت بھڑایا

(دل، دلبر کے لیے ترستا ہے گھر، شہر، بازار کسی جگہ قرار نہیں پاتا اگر بخت نے یاوری کی تو ایک دفعہ پھر طواف کے مراحل ضرور طے کریں گے۔)

بن یار فرید نجرساں رَت رو رو آہیں کرساں
غم کھا کھا اُوڑک مرساں ڈکھ ڈکھڑیں جیڑا تایا(۷)

(فرید، میں دوست کے بغیر گھلتا رہوں گا، خون کے آنسو بہاؤں گا اور غم کھا کھا کر آخر کار مر جاؤں گا، درد و غم کی آگ نے مجھے جلا دیا ہے۔)

عشقِ حقیقی کو مجازی محبت کے روپ میں بیان کرنے کا وصف خواجہ غلام فریدؒ کی کافیوں کا خاصہ ہے۔ اُن کے ہاں یہ قرینہ احترام واکرام کے پورے التزام کے ساتھ موجود ہے۔ دراصل کافی کے سلسلے میں اس

پہلو کو ضرور مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ یہ موسیقی کی بھی اصطلاح اور گیت کی اُس روایت کے ساتھ بھی جڑی ہوئی ہے۔ جس میں عشق و محبت کا اظہار نسائی وجود کے ذریعے ہوتا ہے۔ خواجہ غلام فرید کا یہ کمال ہے کہ وہ اس روایت کو نبھاتے ہوئے اپنی کافیوں میں نعتیہ اسلوب اور آہنگ کو پوری طرح برقرار رکھتے ہیں۔

خواجہ غلام فرید کی بعض نعتیہ کافیوں میں عشق کا اظہار نہ صرف یہ کہ نسائی وجود کے ذریعے ہوتا ہے بلکہ اُن میں زیبائش و آرائش کے سامان کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اُن کی کافیوں کا یہ پہلو غالباً دنیا بھر کے نعتیہ ادب میں بہت منفرد دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی کافیوں کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

اِتھاں میں مُٹھڑی نت جان بہ لب　　او تاں خوش وسدا وچ ملک عرب

(یہاں پر میں بدنصیب جان کنی میں مبتلا ہوں، لیکن وہ ملک عرب میں خوش و خرم بس رہا ہے۔)

تتی تھی جوگن چودھار پھراں　　ہند، سندھ، پنجاب تے ماڑ پھراں
سنج بار تے شہر بزار پھراں　　متاں یار ملم کہیں سانگ سبب

(میں سوختہ جاں جوگن بن کے چاروں اور تجھے تلاش کر رہی ہوں، ہند، سندھ، پنجاب اور مارواڑ میں تجھے تلاش کیا اور ویرانوں اور شہروں میں تجھے تلاش کیا کہ شاید کسی طرح تو مجھے مل جائے۔)

توڑیں دِھکڑے دھوڑے کھاندڑیاں　　تیرے نام تے مفت وکاندڑیاں
تیڈی باندیاں دی میں باندڑیاں　　ہے در دیاں کتیاں نال ادب

(چاہے میں ٹھوکریں کھا رہی ہوں پھر بھی تیرے نام پہ بکی ہوئی ہوں، تیرے غلاموں کی غلام ہوں، تیرے تو سگ آستان بھی میرے لیے باعث احترام ہیں۔)

واہ سوہنا ڈھولن یار سجن　　واہ سانول ہوت حجاز وطن
آ ڈیکھ فرید دا بیت حزن　　ہم روز ازل دی تانگھ طلب (۸)

(سبحان اللہ تو کیسا پیکرِ حسن و جمال ہے، تو حجاز کا کیسا محبوب ملیح ہے، آ کر کبھی فرید کا غم کدہ تو دیکھ، میں تو روزِ ازل سے تیرا طلبگار ہوں۔)

اِسی طرح ایک اور کافی میں آپ یوں ارشاد فرماتے ہیں:

اَج زیور پئے ٹھہندے ہن　　متاں ڈینہ سہاگ دے آندے ہن

(آج زیورات کی سج دھج قابل دید ہے، شاید خوش بختی کے دن آنے والے ہیں۔)

کجلہ مارو دیداں بھالے　　سرخی مسک مسک غم ٹالے
بولے بینے تے کٹمالے　　سبھوں لچھے کھاندے ہن (۹)

(سرمہ آلود آنکھوں کا اندازِ نظر قاتلانہ ہے، سرخی خندہ بلب ہے، بولے، بینے اور کٹمالے، خوشی

سے جھوم رہے ہیں ۔)

خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری میں حبِ پیغمبر کے اظہار کے یہ اسالیب منفرد بھی ہیں اور معلوم شعری منظر نامے میں نادر و نایاب بھی ۔ آپؒ کی کافیاں مجموعی طور پر بھی ایک خاص سوز و گداز اور رس رکھتی ہیں اور اپنے قاری کو جذب و اثر کی فضا میں بے خود کر دیتی ہیں لیکن اِن کافیوں میں جب رسولِ کریم ﷺ کی محبت کا مضمون ادا ہوتا ہے تو اِن کو پڑھ کر قاری نہ صرف عشق کی جذب و مستی سے سرشار ہوتا ہے بلکہ خواجہ غلام فریدؒ کے منفرد اسلوب اور اُن کی نایاب فنی جہات کو بھی وہ دیدۂ حیرت سے دیکھتا ہے ۔ یہ فنی جہات محض تحسین طلب نہیں ہیں بلکہ اپنے امکانات کی رو سے نقد و تحقیق کا تقاضا بھی کرتی ہیں ۔

حوالہ جات

۱۔ خواجہ غلام فرید، ''خلخلِ جاناں'' (فارسی دیوان) مرتبہ: ڈاکٹر بشیر انور اَبروہی، ملتان سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۲ء، ص ۶۷

۲۔ مرزا احمد اختر، ''مناقب فریدی'' (حصہ اوّل) بہاول پور: سرائیکی ادبی مجلس، ۲۰۰۴ء، ص ۸۳

3. C. Shacle, Dr, "Fifty Poems of Khawaja Farid", Multan, Bazm-e-Saqafat, 1983, P-XIII, XIV

۴۔ مسعود حسن شہاب، ''خواجہ غلام فرید'' بہاول پور: اردو اکادمی، ۱۹۶۳ء، ص ۱۴۰

۵۔ خواجہ غلام فرید، ''دیوانِ خواجہ فرید''، مرتبہ: خواجہ طاہر محمود کوریجہ، لاہور: الفیصل، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲۹۔۱۳۰

۶۔ ایضاً، ص ۲۸۴۔۲۸۵

۷۔ ایضاً، ص ۴۸۔۴۹

۸۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔۱۰۱

۹۔ ایضاً، ص ۲۸۳

(خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری کے اُردو تراجم راقم نے نہیں کیے بلکہ اُن کے دیوان ہی سے ماخوذ ہیں جو دیوان کے مُرتب خواجہ طاہر محمود کوریجہ کی کاوش ہیں ۔ مقالہ نگار)

☆☆☆

ڈاکٹر جہاں آراء لطفی، کراچی

عبدالعزیز خالد کی نعتیہ شاعری پر عربی زبان کے اثرات

ABSTRACT: Abdul Aziz Khalid is a well-known Pakistani poet of Urdu literature who belongs to 20th century. In the present era Abdul Aziz Khalid has a very high status as a Natiya poet. His name is very prominent in Urdu Naatiya literature. He is a scholar and researcher of various languages of the East and West. He used Persian, Arabic, Turkish, Hindi and Ebrani languages in his poetry along with Urdu. A reader can study the words, sentences, idioms, phrases of the languages he mostly use in his poetry especially Qur'anic Ayat, Ahadith Rasool (S.A.A.W) and Historical Refrences can be seen in his poetry very commonly. Particularly use of Arabic language gave his poetry more perpetuity that never became any other poet's in 20th century. Some of his books gained immense popularity especially Lehun-e-Sareer, Munhamna, Hamtaya and Farqaleet, from which I have also included in this article.

عبدالعزیز خالد ۱۹۲۷ء میں شاہ محمد کے گھر برجیاں کلاں تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ایم ۔اے اقتصادیات میں کیا۔انکم ٹیکس آفیسر رہے۔خالد نے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کی۔خالد کے نعتیہ مجموعے فارقلیط، منحمنا، ماذ ماذ، طاب طاب، عبدہٗ بہت مشہور ہوئے۔خالد نے فارسی و عربی کے علاوہ عبرانی، ترکی اور کئی قدیم زبانوں کو جن سے وہ واقف تھے، اپنی شاعری میں استعمال کیا۔[۱]

عبدالعزیز خالد کا ایک مجموعہ کلام ''زرداغ دل'' میرے ہاتھ میں ہے اس میں خالدؔ نے کچھ عربی اور انگریزی نظموں سے متاثر ہو کر تمثیلی نظمیں کہی ہیں مجھے اس نسخے کے آخری صفحات پر شاعر کا اپنا اور انکی چونکا دینی والی شاعری کچھ تعارف ملا میں اسے یہاں شامل کر رہی ہوں تا کہ عبدالعزیز خالد کے ''اندرون خانہ'' کا بھی کچھ پتہ چلے، لکھتے ہیں۔

''سخنور کے لئے اپنی نگارشات کی قیمت اور تخیلات کی اہمیت کا تعین بہت مشکل ہے اپنی شخصیت اکثر دلآویز معلوم ہوتی ہے اور اپنے تجربات، جذبات، احساسات، پرانوکھے اور اچھوتے

ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ اپنی ذات اور اپنے عمل کو حریفانہ دیکھ سکنے کی صلاحیت اور سکت بہت کم جگر داروں کے حصے میں آتی ہے۔[۲]

عبدالعزیز خالد نے اپنے بارے مزید کہتے ہیں،

''راقم کو اس بات کا اعتراف ہے کہ منزل شوق کے متعدد مرحلے ابھی ناپیمودہ ہیں۔ طالب دیدار کو ہر لحظہ نیا طور نئی برق نئی تجلی نظر آتی ہے۔ طلب صادق ہو شوق محکم ہو اور طبیعت محنت پسند ہو تو ہفت خواں علم و فن کے طے ہو ہی جاتے ہیں۔ دیار ہنر میں فراغت موت کے مترادف ہے۔ جہاں ہنرمند نے اپنی کارکردگی پر طمانیت کا اظہار کیا وہیں سے اس کے فن کا زوال شروع ہوا۔ ناتمامی اور ناتمامی کا احساس تخلیق کا بنیادی جزو اور ناگزیر المیہ ہے۔ صدائے کن فیکوں کبھی مدہم نہیں پڑتی۔ نگار فطرت کبھی آرائش جمال سے فارغ نہیں ہوتی[۳]

عبدالعزیز خالد علم عروض کی پابندیوں سے بھی گھبراتے ہیں بلکہ ان زنجیروں کو توڑنا چاہتے ہیں تا کہ اپنے دل میں آنے والے جذبات و خیالات کو نت نئے پیراہن پہنا سکیں گویا کہ وہ ایک جیسی وردی سے اکتا گئے ہوں اور اپنے کلام کو نیلے نیلے، پیلے پیلے، اودے اودے پیرھن میں دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے جتنی زبانیں ان کے اندر رچ بس چکیں، پھل پھول کر توانا ہوئیں، وہ ان سب زبانوں کے پیراہن اپنے معانی کو پہنا دیتے ہیں اس بارے میں کہتے ہیں۔

''یہ دور بھی پرانے ادوار کی طرح اپنے براہیم کی تلاش میں ہے جو قدماء وسلفا کی صالح اور برگزیدہ اقدار کا احترام کرنے لیکن محض مقلد اور مجاور بن کر نہ رہ جائے جو شخصیت کے سحر سے واقف اور تنقیح و تلقیح کے فوائد و حکم سے آگاہ ہو جو ماضی کی گل زمینوں میں نئے خیالات کی کاشت کرے پرانے بیل بوٹوں کی قطع برید کرے۔ خس و خاشاک کو چنے پیوند کاری سے شاخ میں نئے فنون کو داخل کر کے نونہالان گلستان کو بالیدگی اور خوش صفیران چمن کو ترنم خیزی کا اذن دے[۴]

عبدالعزیز خالد علوم و فنون میں تعصب کے قائل نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ عربی فارسی، عبرانی، اردو، ہندی اور دیگر معلوم زبانوں کے الفاظ بے اختیار استعمال کرتے ہیں اور نہ صرف خود استعمال کرتے ہیں بلکہ اپنے دور کے نئے آنے والوں کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں لیکن ان ہم عصر شعراء ان کے اس ابلاغ سے متاثر ہوتے دکھائی نہیں دیتے چنانچہ ان کے انداز پر کام کرنے والوں کی کمی ہے اور خال خال ہی ان کے مسلک پر چلنے والے سالکین دکھائی دیتے ہیں۔ جدت اور ندرت کے اسی داعی نے جو خدمت عربی کے فروغ کے لئے انجام دی، اور اپنے اسلاف کے جس اسلوب کو زندہ کیا، اسکی تقلید کرنے والے نعت گو شعراء عبدالعزیز کے ہم پلہ تو نہیں لیکن وہ ایک ایسی صف میں ضرور آ کھڑے ہوئے ہیں جس میں وہ

شعراء صف آراء ہیں جن کے کلام پر لسان عربی مبین کے اثرات واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔

''نیا اور پرانا ادب'' ڈاکٹر فرمان فتح پوری مرحوم جیسے صاحب الرائے اور دقیق النظر استاذ الاساتذہ کی تصنیف ہے۔ عبدالعزیز خالد کے بارے میں اپنی اس کتاب میں ایک مضمون شامل کیا ہے جو عبدالعزیز خالد کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرتا ہے اور بڑی خوبصورتی سے کرتا ہے۔ عبدالعزیز خالد کو بطور نعتیہ شاعر جاننا ہمارا موضوع ہے تو اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے ہمارے لیے تقویت کا باعث ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''عبدالعزیز خالد کا نعتیہ شاعری کی طرف توجہ دینا ایک اور سبب سے نہایت اہم خیال کیے جانے کے لائق ہے۔ آج کے لادینی عہد میں جبکہ مسلم معاشرہ ستی شہرت اور دولت کے جائز اور ناجائز حصول کو سب کچھ سمجھتا ہے اور دین کی صالح اقدار و روایات کو اپنی کج فہمی سے حصہ ماضی خیال کرتا ہے، اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ ایسے صاحب مطالعہ اور صاحب فکر حضرات ان اقدار و روایات کی اشاعت و حفاظت کا ذمہ لیں جو اپنی خلاقانہ صلاحیتوں اور فنکارانہ سحرکاریوں کے ذریعے معاشرے کو بہ آسانی اپنی طرف متوجہ کرسکتے ہیں۔[۵]

عبدالعزیز خالد کی قادر الکلام اور عربی داں شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی رائے اس سلسلے میں بھی بڑی دوٹوک اور واضح ہے، لکھتے ہیں:

''جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے عبدالعزیز خالد کا علم، کرم اور دم کی زمین میں تقریباً ۵۰۰ اشعار کا قصیدہ کہنا ہی قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ قصیدے کا ایک ایک مصرعہ اس بات کی شہادت ہے کہ شاعر کا مطالعہ وسیع اور اردو و فارسی کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر بھی اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ عربی زبان کے بعض فقرے تو اس خوبی کے ساتھ اشعار میں در آئے ہیں گویا وہ ایک مدت سے اردو میں مستعمل ہیں اور ہماری زبان کا جز ہیں۔ چند شعروں میں ان کا مصرف دیکھیے:

اگر بقا کا ہے ارمان تعاهدوا القرآن — کہ ہے یہ سیل فنا میں حصار مستحکم
لبوں پہ ہے یہی تسبیح لاتزغ قلبی — ہے دشت شوق میں ہر گام جان جوکھم کا[۶]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے عبدالعزیز خالد کی عربی آمیز شاعری کے بارے میں ایک اور بڑی اہم بات کہی ہے میں سمجھتی ہوں اس کو یہاں بیان کرنا بے حد ضروری ہے۔ یہ رائے ایک ایسی تکلیف دہ حقیقت بھی ہے۔ جس کی نشاندہی ڈاکٹر فرمان جیسے نبض شناس کے علاوہ کئی اور دانش وروں کی بھی ہے لیکن ہمارے دل کے داغ اگر جل اٹھے ہیں تو وہ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے کہ اے کاش اس ملک میں عربی زبان کا دور دورہ ایسا ہی ہوتا جیسا کہ انگریزی زبان کا ہے تو آج ہمارے اور عرب ممالک کے

درمیان بلکہ ہمارے اور عربوں کے درمیان خلیج وسیع حائل نہ ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

''لحن صریر کی رباعیوں میں درجنوں ایسی ہیں جن میں مصرعے کے مصرعے اور بعض جگہ پورے کے پورے شعر عربی میں ہیں۔ عربی کے فقرے تو اس کتاب کی ہر دوسری رباعی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس طرز عمل سے خالد کی عربی دانی اور مختلف زبانوں پر دسترس کا سکہ تو قاری کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے لیکن اس سے ان کی شاعری کا وہ حسن اکثر مقامات پر زائل ہو جاتا ہے جو روزمرہ زبان کے فطری برمحل اور پاکیزہ مصرف کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ الفاظ یا زبان و بیان کا ایسا فنی عمل جو کلام کی اثر آفرینی میں حائل ہو، مستحسن نہیں ہو سکتا۔ امید ہے کہ خالد صاحب میری اس مخلصانہ رائے پر توجہ دیں گے اور اپنے اسلوب کو مزید خراد پر چڑھائیں گے یہ دو سبب سے ضروری ہے اول اس لیے کہ پاک و ہند سے عربی و فارسی کا ذوق رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور آثار ایسے ہیں کہ آئندہ ان کا ذوق رکھنے والے ڈھونڈے سے بھی نہیں ملیں گے، فارسی کو سمجھنے اور اس سے لطف لینے والے تو خیر اب بھی تھوڑے بہت موجود ہیں لیکن عربی کے مذاق سے ہمارا معاشرہ تقریباً نا آشنا ہے۔[۷]

عبدالعزیز خالد کو اپنے اس خاص اسلوب پر اسقدر اعتماد تھا کہ انہوں نے بغیر کسی تردد کے اپنی شاعری کو جاری و ساری رکھا، سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری کے مجموعوں کا مطالعہ ایک منفرد اور فرحت بخش فضا میں لے جاتا ہے میں یہاں ان کی کتابوں کا طائرانہ جائزہ پیش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، اس امید کے ساتھ کہ شاید ان کے شاعری کے اسلوب کی ایک واضح تصویر سامنے آسکے۔

برگ خزاں:

عبدالعزیز خالد کا مجموعہ کلام ہے۔ اس میں قرآن کریم کی آیت نمبر 28-31 اور عہد نامہ عتیق کے باب پیدائش ب 4-15.1 کو پس منظر میں رکھتے ہوئے قصہ آدم اور ہوا و ہابیل اور قابیل بیان کیا ہے۔ اس میں ان کی کچھ ابیات مکمل عربی میں ہیں، جو یہاں شامل کی جا رہی ہیں۔ آدم کہتے ہیں۔

تغیرت البلاد ومن علیھا — فرجۃُ الارض مغیر قبیح
تغیر کل ذی طعم ولون — وقل بشاشۃ الوجہ الملیح
فواا سفیٰ عملیٰ ھابیل ابنی — قتیلاً قدنضمنہ الضریحُ
وجاورناعد ولیس یغنی — لعین لایموت فنستریح
اھابیل ان قتلت فان قلبی — علیک الیوم مکتب قریح
اری طول الحیاۃعلی عمھا — وما انا فی حیاتی مستریح! [۸]

ابلیس کہتا ہے۔

تنح عن الجنان وساکنیها	ففی الفردوس ضاق بک الفسیح
وکنت بهازوجک فی رخاء	وقلبک من اذی الدنیا مریح
فمابرحت مکایدتی ومکری	الی ان فاتک الثمن الربیع
ولولارحمته الرحمن امسی	بکفک من جنان الخلدریح [۹]

هاتف یعنی (هاتف غیبی)	ابا هابیل و قد قتل اجمعیاً
وصارالحئی کالمیت الذبیح	وجاء بشدّة قد کان منها
علی خوفٍ فجاء بها یصیح	بنی الدنیا بنی لمع السراب
لدوا للموت و ابنو للخراب	فکلکُم یصیرالی الذهاب[۱۰]

جناب عبدالعزیز خالد کے تین نعتیہ مجموعوں "فارقلیط" "منحمنا" اور "لحن حریر" نے اردو نعتیہ شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔اس کمال کی شاعری ہے، کہ روانی سے بہتے دریا کا گمان ہوتا ہے جس میں ہر موج کا مدّ و جزر جدا جدا ہے مگر سب کے ایک ساتھ مل کر بہنے سے ایک دریائے لطافت و فصاحت وجود میں آ رہا ہے۔عبدالعزیز خالد کی جن زبانوں میں مہارت و قدرت تھی اپنی شاعری میں ان کا بھرپور استعمال کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اردو زبان کے خزانہ لغت میں بیش قدر اضافہ کیا۔ فارقلیط حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ نام نامی ہے جو انجیل میں آیا ہے۔ فارقلیط کی ابتداء میں ایک صفحے پر آپ نے انجیل کا ریفرنس دیا ہے لکھتے ہیں۔

"وانا اطلب من الأب فیعطیکم فارقلیط" یوحنا14 :15-16

موجودہ محرف یونانی نام......پیریکلیطاس

اصل، پیریکلیوطاس (کمافی الانجیل برناباس)[۱۱]

فارقلیط کا ترجمہ احمد ہے یا احمد کا ترجمہ فارقلیط ہے، عبدالعزیز خالد نے اپنے مجموعے میں وہ آیت بھی درج کر دی ہے جو قرآن مجید میں کی سورۃ الصّف کی آیت نمبر 6 ہے۔جس میں حضرت عیسیٰ نے بشارت دی ہے کہ میرے بعد جو نبی آئیں گے ان کا نام احمد ہوگا۔عبدالعزیز خالد نے اپنی اس طویل نظم کو سات حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصے کو کتاب کا نام دیا ہے یعنی پہلی کتاب، دوسری کتاب تیسری کتاب وغیرہ ہم نے یہاں وہ اشعار منتخب کئے ہیں جن میں عربی کے الفاظ کا استعمال زیادہ ہے مثلاً

کریم السجیه جمیل الطویه	تو خیر البریة ،شهد انبیاء هے

طلیق اللسان ،فصیح البیان — سخن سنج حیرت سے منہ تک رہا ہے [۱۲]

عبدالعزیز خالد کی تقریباً تمام تصنیفات اسلامی تاریخ کے بہت سے دریچوں کو وا کرتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید کو بھی اردو شاعری کا پیرہن پہنایا ہے۔ بہت سے عربی قصائد کی جھلک انکے اردو اشعار میں واضح نظر آتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ کیجیے،

اسلامی تاریخ سے تلمیحات کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

خریدو نہ بیچو نہ رشوت و بولو
یہ قاضی شریح آپ سے سن رہا ہے [۱۳]

عربی قصائد کا مطالعہ کس طرح ان کے کلام میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ کہتے ہیں۔

جابجا جلوہ نماہ ہے غزل حافظ میں — ابن میمون کے اشعار کی تاثیر خفی
امرو القیس ہو خالد مجھے کیونکر نہ عزیز — گونج ہے میرے تغزل میں قفانبک کی [۱۴]
فصوص الحکم تیری پرمغز باتیں — نہاں ان میں رمز دوام و بقا ہے
ضلیع الضم اشکل العین ابیض — نہ تاب نظارہ نہ تاب ثنا ہے
ہے ضرب المثل خافض الطرف اکحل — یہ اثمد کا سرمہ بھی کحل دجی ہے [۱۵]
رفیع العماد عظیم الرماد — طویل النجار سراپا سخا ہے [۱۶]
بچایا ہے لوگوں کے نرغے سے تجھ کو — کہ خاصہ بماتو مر آشوب زا ہے
فان الھوم بقد الھمم کا — مقولہ تری زندگی سے ملا ہے
جب آیا تو نزدیک قرن الثعالب — ملاک الجبال آ کے گویا ہوا ہے [۱۷]
واشکر الی اللہ بثی و حزنی — وہی فیض گستر وہی غم رہا ہے [۱۸]
کہا ایھاالناس افشو السلام — کہ امن واماں ہی میں سب کا بھلا ہے [۱۹]
الٰہی ! میں ہوں طالب فتح ونصرت — لک الخلق والامر تو کبریا ہے [۲۰]
واملی لھم ان کیدی متین — خبردار میرا عصابے صدا ہے [۲۱]
وأنت المقدم وأنت الموخر — تو منزل ہے مقصود ہے مرتجیٰ ہے [۲۲]
برد المنایا تصیب وتخطی — توکل براسباب ظاہر خطا ہے [۲۳]
صیافت ہے لاتسئلو الناس شیئاً — تعفف خوئے مردبا حوصلہ ہے
سن !احسن کما احسن اللہ الیک — جو بے فیض ہے خرمن سوختہ ہے [۲۴]
رفیق برقلیطس و منحمنا — جو کار آزما ثانی ازھماہے

سلامی علیکم و قلبی لدیکم — وداد و محبت کا یہ رابطہ ہے [۲۵]
کہاں نعت و نام رسول تہامی — کہاں وزباں جو کہ لکنت زدہ ہے [۲۶]

حدیث خواب سے انتخاب

قاب قوسین او ادنیٰ ہے قدمگہ جس کی — یارب اس خاصہ خاصاں رسولاں پہ سلام [۲۷]
زہے حلاوت و ذوق حضور و استغراق — خوشانشاط سنفرنک فلاتنسی [۲۸]
قداسلمت و تابعت محمدؐ — تو ناواقف نہیں بار خدایا [۲۹]
قداسلمنا وتابعنا محمدؐ — اٹھیں گے اب نہ اس کے آستاں سے [۳۰]

عبدالعزیز خالد کے مجموعہ کلام کا گیٹ اپ بھی ان کی افتادطبع اور جدت طرازی اور حسن تدبر کی تصویر دکھائی دیتا ہے، انہوں نے اپنی کتابوں کے سرورق اور رسم الخط میں اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا بڑا انوکھا انداز اپنایا ہے ،اگر آپ وہی نسخے دیکھیں جو ۱۹۷۰ سے پہلے کے ہیں خصوصا زرداغ دل (۱۹۵۶ء) منحمنا (۱۹۶۶) اورلحن صریر (۱۹۶۷ء) تو آپ ان کے ذوق ہنر کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیں گے ۔بہر حال اب میں اصل موضوع کی طرف آتی ہوں اوران کے مشہور ومعروف مجموعہ ہائے کلام سے انتخاب بطور نمونہ پیش کرتی ہوں، ملاحظہ ہوں۔

لحن صریر:

عبدالعزیز خالد کا مجموعہ کلام جو"لحن صریر" کے نام سے ،بے حد فکر انگیز اور عمیق پیغامات کا داعی ہے اوران کے اسلوب خاص کا شاہکار ہے ۔جی چاہتا ہے اس میں موجود ہر رباعی یہاں درج کردوں لیکن چونکہ یہ ممکن نہیں ہے۔اس لیے چند رباعیوں پر قناعت کرتی ہوں۔

وہ شعر تھا مرغوب رسول عربیؐ
جس میں نہ آمیزش شرک و شرکی
آتا ہے امیہ بن ابی الصلت پہ رشک
قال: ہو عندَ کُلِ بیتِ آیۃٌ[۳۱]

منظور و مراد حضرت پیغمبرؐ
ہے اس کی زباں نطق خدائے اکبر
کہتا ہے وہی جو اس کا ہے مرتبہ داں
لوکان نبی بعد کان عمرؓ[۳۲]

عبدالعزیز خالد کی شاعری پرعربی زبان کے اثرات ان کے بعض مجموعہ ہائے کلام میں بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ غالباً جوطبع زاد کلام ہے وہ عربی زبان کی شیرینی واثر انگیزیزی سے لبالب ہے ۔''غزل الغزلات'' چونکہ حضرت سلیمان کا ایک نغمہ ہے جس کا تعلق عبرانی سے ہے۔ چنانچہ ہم اسے محض ترجمے کی ہی نظر سے دیکھیں گے ایک خاص تبدیلی ہمیں ان کے مجموعہ کلام ''منحمنا'' میں نظر آتی ہے جو ۱۹۶۶ء میں زیور طبع سے آراستہ پیراستہ ہوا۔

اس میں نت نئی جہتوں کا آغاز ہے۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت کونپلوں کی مانند ان کے کلام کا حسن نکھارتی اپنے وجود کا شدت سے احساس دلاتی یہ عربی تراکیب وتلمیحات استعارے وتشبیہات ان کے نت نئے تجربات کی خبر دے رہے ہیں جبکہ اردو شاعری میں ان سے پہلے کے شعراء جھجکتے ہوئے سہج سہج چلتے ہوئے ایک دوسرے کے نقش کف پا کو بغور دیکھ کر تقلید کے مسلک کو مضبوطی سے تھامے ہوئے شاعری کرتے رہے ،خالد اس معاملے میں بے دھڑک بلا جھجک بغیر کسی خوف وخدشے کے مختلف زبانوں کی عبارتوں کو اپنے کلام کی زیب وزینت بناتے ہیں اور بڑے پراعتماد ہوکر اپنے اس رستے پر رواں دواں رہتے ہیں۔''منحمنا میں قرآنی تلمیحات کا جس طرح استعمال ہوا ہے اس نے اردو نعتیہ شاعری میں خوش آئند روش کو جنم دیا ہے وہ محض چند قرآنی تلمیحات تک محدود نہ رہے جنہیں ان کے اسلاف یکے بعد دیگرے استعمال کرتے چلے آرہے تھے۔ بلکہ ان کے کلام میں قرآن، حدیث وتاریخ اسلامی کا عمیق مطالعہ کھل کر سامنے آتا ہے۔

خالد خود اس بات کو شعر میں اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

سخن میرا معنون باہمہ ایں ست عہد
بنام شاہد نازک خیالاں یارسول اللہ ![۳۳]

گرہ کھولی زباں کی رفتہ رفتہ طبع موروں نے
تھا لکنت کا سبب حرف پریشاں یارسول اللہ[۳۴]

ہو میرا شعر مصداق نفخت فیہ من روحی
رہے یہ شمع بجھ کر بھی فروزاں یارسول اللہ[۳۵]

وہ لکھتے ہیں۔

وہ عبدہ ورسولہ وہ اسمہٗ احمد
کتاب و حکم و نبوت کا خاتِم و خاتَم[۳۶]

اس شعر میں ''خاتِم'' اور'' خاتَم'' اسم الفاعل واسم المفعول کا خوب استعمال ہے اور یہ عربی زبان سے بخوبی واقف ہونے والا ہی کرسکتا ہے۔ اسی طرح ''**کان خُلقُہٗ قرآن**'' جوحضرت عائشہؓ سے مروی ایک حدیث کا حصہ ہے آپ نے اس کا استعمال کیا ہے۔ صنعت تلمیح میں اس خوبصورت شعر کا حصہ ملاحظہ ہو۔

وہ جس کا وصف و بیاں کان خُلقُہٗ القرآن
جو ہر جہت سے ہے فَخْمٌ و مُفَخَّمٌ و اَفْخَمٌ [۳۷]

ملاحظہ ہواس شعر کے دوسرے مصرعے میں فخم سے مشتق کلمات فخم ومفخم وافخم کا استعمال کس قدر فصیح و بلیغ انداز میں کیا گیا ہے، اس سے ان کے عربی ذخیرہ الفاظ پر گرفت کا اندازہ بھی بخوبی ہوتا ہے، اس ضمن میں مزید اضافہ کرتی ہوں،

اسی کو صاحب خلق عظیم کہتے ہیں
وہی ہے نوع بشر کا معلم اعظم [۳۸]

احد نے بخشی ہے ماینطق کی جس کو سند
وہ نکتہ سنج ہے رمز آشنائے کیف و کم [۳۹]

کہے جو مضطرب اعرابیہ سے لاتخشین
پسر ہوں اس کا تھی، جس کی غذا قدید و عشم [۴۰]

پکارتا ہے پیاپے! انارسول اللہ
خیال سود وزیاں ہے نہ فکر مدحت و ذم [۴۱]

ضیاء و زمزمہ بخشے اصم واعمیٰ کو
بحکم قل ھو سخن آشنا لب ابکم [۴۱]

صفت ہے عاصم و معصوم و معتصم جس کی
جو محتشم کہ ہے تمثال اعتصام و عصم [۴۲]

ہے جس کی شان فاوحیٰ الیہ ماواوحیٰ
وہ آسماں خیم، انجم حدم، سپہر حشم[۴۳]

ملا دنیٰ فتدلیٰ کا جس کو مجد وشرف
فلق مخائل و طوبیٰ محاسن و میسَم[۴۴]

ہے غُلغُلہ :فلنعم المجی جاء کا
ہیں فرش راہ دل و دیدہ تن بدن جاجم [۴۵]

ضمیر آیۃ لولاک وفخرِ مُوجودات
یم مکارم اخلاق وژندہ رود کرم [۴۶]

حمطایا

عبدالعزیز وہ تلمیحات بھی استعمال کرتے ہیں جو برصغیر کے نعتیہ ادب کے سابقون الاولون نے اپنی نعتیہ شاعری میں استعمال کیں مثلاً لولاک، اُمی ،صل اللہ علیہ وسلم ،صلوعلیہ وسلمو تسلیما کن فیکون ،یاوہ القاب وصفات جوحضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بیان ہوتی چلی آرہی ہیں ۔مکی مدنی ،ھاشمی ،مطلبی ،یارسول اللہ یانبی اللہ حامد،محمود ،احمد نوید مسیحا دعائے ابراھیم وغیرہ لیکن عبدالعزیز خالد نے کچھ نیا کام کیا ہے وہ یہ کہ نت نئی تلمیحات اور قرآنی خطابات کو اپنے اشعار میں شامل کیا ہے۔

جس کا صحیفوں میں نام ہے حمطایا
جس کو حرا میں ملا پیام اقراء

اسی شعر کے پہلے مصرے میں ''حمطایا'' جوحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام قدیم کتب میں ہے استعمال کیا اور اپنے مجموعہ کلام کا نام جس میں یہ شعر شامل ہے ''حمطایا'' ہی رکھا۔اپنی اس کتاب کی ابتداء میں انہوں نے اس نام کی مکمل تفصیل اور تشریح بیان کی ہے۔اپنی کتاب ''حمطایا'' کی ابتداء میں عبدالعزیز خالد نے حمطایا کا مکمل تعارف پیش کرنے کے بعد نظم کی شکل میں اس کی ''قاموس'' بڑے جامع اور مدلل انداز میں لکھی ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ''حمطایا'' کے بارے میں مجمع البحار سے معانی اخذ کر کے لکھتے ہیں ۔قال ابو عمر اسالتُ بعض من اسلم من الیھود عنہ، فقال :معناہ یحمی الحرم ویمنع من الحرام ویعطی الحلال ،اس کو اشعار کی شکل میں خالد اس طرح بیان کرتے ہیں۔

کام جس کا ہے امر بِالمَعرُوفِ
دے جو انسان کو خیر و شر کا وقوف
کہتے ہیں مُحَرِّمَ و مُحَلِّلَ جس کو
حرام کام سے انساں کو روکنے والا[۴۷]

مزید لکھتے ہیں۔

یَارسولَ اللہ لبیکَ وسَعدیکَ کہے
یہ مقیم شہر دور افتادگاں پہ خستہ پا[۴۸]

خبر کرو سپہ کفر و ظلم و عصیاں کو
انَا رسولُ اللہِ بُعِثتُ مَرغَمةً[۴۹]

خطاب جس سے کریں لوگ کہہ کے: انظرنی
سلام بھیجے جسے ربُّ قَادر وذُوالمنن[۵۰]

کہوں: لَانتَ اَحَبَّ اِلَیَّ مَنْ نفسی
یہ رعب حسن سے ہے دم بخود لب الکن[۵۱]

خالد بڑی مہارت سے عربی اردو فارسی، عبرانی اور ہندی کے سنہری، روپہلی، ریشمی، اونی اور سوتی تاروں سے اپنے اشعار کی بنت کرتے ہیں جو دیکھنے سننے پڑھنے اور سمجھنے میں کمال ہنر کی داد خوب بڑھ کر وصول کرتے ہیں ذرا دیکھئے کہاس بُنت کے ذریعے جو چیز وجود میں آرہی ہے وہ کیسے دل و دماغ کو لبھا رہی ہے۔

کان النبیُ اذا فَرِحَ غَضَّ طرفَهُ
دیکھا نہ ہم نے ایسا کریم سخا سگال
تیری صفت ہے لیسَ بفظِ ولا غَلِیظ
ہے قامت و خلق میں سراپا تو اعتدال
کنتَ تُداعبُ الرَّجُل ان یَسُرَّہ
تو نے ابھارے عظمت انساں کے خدو خال

هذا الامینُ جاءَ رَضینا بَحُکمِهِ
ہم کو یہ کہہ نہ سکنے کا ہے آج تک ملال[۵۲]

اے حبیب خدائے بے ہمتا!
لَاشَرِیکَ لکَ وَلاانداداا
سایہ پروردگار کا تجھ پر
نحنُ لانَعدِل بکَ شَنیا
کون تیرے سوا منفسِ غم !
اَنت مَولانا اَنتَ سیدُ نا
وَجہکَ کان قطعۃَ قمرِ
سرِ فاراں سے جو طلوع ہوا
کُنتَ شَھماً و اَشھلَ العَینَین
کوئی ہو گا نہ دلربا تجھ سا[۵۳]

تیرے بارے میں ارباب رائے نے ہر دور میں یہ کہا
وہ حبیب خدا ہے ھُو صَفوۃُ اللہِ من خَلقِہِ
کام راہ طلب کا وفاداری واستواری کا ہے
ہے عَلیکم بِدین العَجَائز کی رمز نہانی یہی[۵۴]

اطرافُ و طَرائفُ احادیثُ و حَکَمُ
اُوتیتُ جوامعُ الکلمِ بے شُبھا
خیرُ الھدی ھُدی مُحمَّد !خالد
ہچوں نفس باد صبا غالیہ سا[۵۵]

عبدالعزیز خالد کے کلام میں معنویت بھی موجود ہے ان کی شاعری میں ابہام یا پر سراریت نہیں جیسا کہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ مختلف زبانوں کے الفاظ استعمال کرنے سے معنویت خارج ہو جاتی ہے بلکہ عربی زبان اور خصوصاً قرآنی آیات کے استعمال سے پر سراریت یا ابہام کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور موضوع کی معنویت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ جیسا کہ ان اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے،

انا جبریل اَبشر یامُحمَّد
تو اب سے رَحمتہُ للعالمین ہے
ابد تک سلطنت تیری رہے گی
تو سلطان سماوات و زمیں ہے [۵۶]

اب دیکھیے مندرجہ ذیل اشعار میں لو لاک لماخلقت الافلاک کا استعمال اس کی معنویت اور فصاحت کو بڑھا رہا ہے۔ تلمیحات کے استعمال کا مقصد ہی یہی ہے۔

کرتا ہے خطاب تجھ سے ربُّ الاَربَاب
قد اتینَاک من لدُنا ذکرًا
تیرے ہی لئے خالق عزوجل نے
لَولاکَ لَمَاخَلقتُ الاَفلاکَ کہا [۵۷]

فَسُبحَانَ الذِی اسریٰ بِعَبدِہ
تو مہمان الاہُ العلمِین ہے [۵۸]

الاہ ک کو یہاں اسی طرح لکھا گیا ہے جیسا کہ مجموعے میں ہے۔ جبکہ یہ "الہ" ہے۔ آگے لکھتے ہیں۔

فکان قابَ قُوسین اوادنیٰ
تو نور سرمدی کا ہمنشیں ہے [۵۹]

عبدہٗ

عبدالعزیز خالد کا کلام تو ہے ہی منفرد اور کثیر الجہت ،لیکن اگر آپ ان کے مجموعہ کلام کا حسن و جمال دیکھیں تو بھی حیرت میں رہ جائیں وہ اپنے اختراعی ذہن سے عجب کام لیتے ہیں یعنی یہ کہ اس میں کاغذ کا استعمال، سرورق، صفحات کی سجاوٹ، رنگوں کا استعمال اور چناؤ خطاطی وغیرہ عام روش سے ہٹ کر دکھائی دیتا ہے۔ سو اس لحاظ سے بھی ان کی کتابیں انفرادیت کی حامل قرار پاتی ہیں، مثلاً کتاب "عبدہٗ" کو ہی دیکھ لیجئے اول صفحے پر لکھا ہے "مصنف کے سواد خط میں" اور پوری کتاب شروع سے آخر تک بقلم خود رقم کی ہے۔ اپنی اس کتاب میں عربی قواعد کے طریقہ اشتقاق سے بہت کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں،

وہ جس پر عرش سے نازل ہوئی کتاب شفا وہ شَافِعٌ و مُتَشَفَّعٌ، شَفِیعٌ، و مُستَشفِعٌ
وہ مرد حق عَبدُاللہ ابنُ عبدِاللہ طَھُورٌ و طاھرٌ و طَھرٌ و مُطھرٌ و اَطھرُ

کوئی بعد اس کے نہ بار نبوت کہاں وہ کہاں دعوی جاہلیت
الاسلام یُھدِم ماکان قَبلَهُ بُعِثَ الیٰ اُمّةٍ اُمیّةٍ[٦٠]

یہاں صیغہ مبالغہ اور اسم فاعل کا استعمال کتنی روانی سے ہے اور با معنی بھی

وہ حَمّالٌ و حَامِلٌ
وہ قوّالٌ و قائلٌ
وہ عَامِلٌ و ہ عَادِلٌ و ہ عَائِلٌ
کہ ہے نَدبٌ و بَاذِلٌ
وہ رَاجِلٌ و ہ رَاجِفٌ [٦١]

عبدہٗ میں نت نئے تجربات کئے گئے ہیں گو کہ ان کی تقلید نہیں ہوئی تاہم یہ تجربات اپنی مثال آپ ہیں پڑھنے والے اور سننے والے دونوں ہی مسحور ہو جاتے ہیں ان میں بڑا ربط و ضبط، تسلسل اور ردھم پایا جاتا ہے، کہتے ہیں۔

اسے زیب دیتا ہے دعویٰ اَنا الساعة المُوعِدِ کا
ہے بہر خدا اس کی ساری شفاعت
رحیبُ الذّراع
عظیمُ اللّواء
عتیقُ النّجّار
بعیدُ المغار
طویلُ الیمین
اَغرُّ الجَبینِ
مکمل کیا اس نے کار رسالت
اٹھائے گا اب تاقیامت
وہ غارسٌ وہ را غارقٌ
وہ مَعرُوفٌ و عَارِفٌ
وہ مَدعُو و داعی
وہ مَسئُول و مُعطِی
وہ ھَادِی وہ مِھدِی و مِھداۃُ و مھدٰی

رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ شان جس کی
ہے جس کی ندا
قَبْلَ اَنْ تَفْقِدُونِی سَلُونِی!
ملا جس کو
العجزُ فَخرِی و الطالعُ لی
انا العاقبُ الذِی لیسَ بعدِی نبیٌ [۶۲]

خروش خم

عبدالعزیز خالد نے ۱۹۷۴ء میں ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کے لیے بھی کلام کہا ہے۔ جناب جمیل الدین عالی کی نظم بھی اس حوالے سے بڑی مشہور ہے جو انھوں نے پاکستان میں ہونے والے اس عظیم الشان کانفرنس کے لیے لکھی تھی وہ کیوں کہ بطور ترانہ گائی گئی تھی اس لیے بے حد مقبول ہوئی، اس کے بول ہیں ''ہم تا بہ ابد سعی و تغیر کے ولی ہیں۔ ہم مصطفوی مصطفوی مصطفوی ہیں''۔ جبکہ عبدالعزیز خالد کی اس نظم کو نہ گائے جانے کی وجہ سے ایسی شہرت نہ مل سکی تاہم عبدالعزیز خالد کی اس نظم میں جو اشعار یا مصرعے یا مصرعوں کے حصے عربی میں ہیں وہ بے حد مکمل ہیں اور جامع الصفات ہیں۔ چند ابیات ملاحظہ ہوں، یہاں وہ اشعار شامل کیے جا رہے ہیں جن میں عربی کے الفاظ ،کلمات ،تراکیب یا قرآنی آیات یا ضرب المثل ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ تسلسل ایسا نہ بن سکے جیسا کہ اس نظم میں پایا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

ہے یہ تقریب ان اولو العزمان عالی شان کی
جن کی خاطر ہر طرف نوروز کا منظر کھلا
ہے یہ آمد اپنے گھر سے اپنے گھر تک کا سفر
اے ضیوف مقتدر اھلاً و سھلاً مرحبا
عمر بھر جو خواب دیکھا حضرت اقبال نے
ہے اسی کی اک جھلک القِمّۃُ الاسلامیۃ
اختلافُ امتی رحمۃٌ ہے رمزِ اتحاد
ہے تنوع پر مدار گردش ارض و سما
ان وعدُ اللہ حقٌ فاصْبِرُ وا کے ساتھ ساتھ
سن رہے ہو ماتقولُ الطیرُ فی جوفِ السّمآءِ
ظالموں کو چین لینے دو نہ زیر آسماں
کل یوم مستقر الیوم یوم المحمہ
اے مسلماناں یُوفَی الصَّابِرونَ اجرُھُم
تاقیامت ہے مکافات عمل کا سلسلہ
شان و شوکت دختر صیون کی جاتی رہے
یا مُجیبُ و مُحسِنُ اَحْسَنَ فی جمیع اصوالینا
یاالٰھی ذلکَ نَحنُ و فِینا الصَّالحُون
کی نکو کاروں کو دیتا ہے بدوں کی تو سزا
ہم تحیر پیشگاں کو ہے غم نا محرمی
یا غیاثُ المُستغِثِینَ الیکَ المُشتکی [۶۳]

اپنے مہمانوں کو ایک اور نغمہ بعنوان ''حرف تبریک'' میں اس طرح خوش آمدید کہتے ہیں:

ہم اپنے صاحب اقبال مہمانوں کو
سلام کرتے ہیں خوش آمدید کہتے ہیں
تجھے پکارتے ہیں تیرا نام لیتے ہیں
تَبارَکَ اِسمُکَ یَا ذُالجلالِ والِاکرام
یُجَاھِدُونَ بَاموَالِھِم واَنفُسِیھِم
عطا ہوان کو فلاح و صلاح و استحکام

ہیں بے اثر کرامت ترے حبیب کی ہیں
ہو بارے حسب مردان کے گردش ایام [۶۴]

جناب حسرت کاس گنجوی نے خالد کے بارے میں اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ادب'' میں ایک مضمون لکھا ہے۔ جس کا نام ہے عبدالعزیز ایک انوکھا شاعر'

ان کے انوکھے پن کے متعلق لکھتے ہیں:

''خالد کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ خالد کی شخصیت کو سمجھا جائے، خالد کا مطالعہ وسیع ہے، انہیں کئی زبانوں پر عبور ہے، انجیل، توریت، زبور خواہ جس حالت میں بھی ہیں انھوں نے تفصیل سے پڑھی ہیں۔ مختلف مذاہب میں خدا کا جو بھی تصور ہے، وہ اس سے واقف ہیں اور اس لیے انھوں نے دنیا کی قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اور بہت سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان تمام قوموں کی تاریخ کو کو وہ قرآن پاک کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور اس کے بعد مسلمانوں کے عروج و زوال پر بھی نظر رکھتے ہیں اور ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ وہ نظم کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں بلکہ قادر الکلام ہیں''۔ [۶۵]

خالد نے اردو الفاظ کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ یوں تو اردو شاعری میں سب سے زیادہ الفاظ میر انیس نے دیئے ہیں۔ انیس الفاظ سازی کے بادشاہ تھے۔ وہ جس طرح چاہتے الفاظ تراش لیتے تھے۔ ان کے بعد اقبال اور جوش نے نئے نئے الفاظ تراشے اور اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ [۶۶]

اردو زبان ایک خوش نصیب زبان ہے جس کے الفاظ میں کثرت سے اضافہ ہو رہا ہے اور اس اضافے کی بدولت وہ بڑی مال دار زبان بن رہی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جیسے عربی اپنے اندر اجنبی و عجمی الفاظ کو سمونے سے انکار کرتی ہے، اردو دیگر اقوام کی زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی اتنی ہی گنجائش رکھتی ہے یہ دونوں زبانوں کے خصوصی وصف ہیں۔ اور دونوں کے لیے مفید اور مثمر بھی۔ خالد نے اردو زبان کی اس خوبی اور خصوصیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بلا جھجک اٹھایا۔ یوں وہ اردو کو

سخی داتا بن کر نوازنے والے بن گئے۔ حسرت کاس گنجوی کہتے ہیں،

''خالد نے فکر وسخن میں بڑی جانفشانی سے کام لیا ہے بلکہ اسے ریاضت کے طور پر برتا ہے۔ بہت مختصر سے عرصے میں انھوں نے بہت سی کتابیں تخلیق کیں وہ ذود گو ضرور ہیں مگر پُر گو نہیں۔ وہ مشاعروں کے شاعر نہیں، وہ بہت خاموشی سے کام کرنے والے ہیں۔[٦٧]

خالد کی کتاب ''فارقلیط'' جس کا ذکر میں کر چکی ہوں، جناب کاس گنجوی اس سے بے حد متاثر ہیں اوران الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں،

''فارقلیط ضخیم کتاب ہے جس کی تخلیق میں خالد نے بڑی جگر کاری کی ہے۔ قدیم زمانے کے اسما ،القاب اور تشبیہات وتلمیحات کا اس روانی سے استعمال بہت مشکل تھا، یہ ایک قادر الکلام شاعر ہی کے بس کی بات تھی۔ یہ ایک نعتیہ نظم ہے اور سات ابواب میں منقسم ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ نے فارقلیط کی پیش گوئی کی تھی پوری نظم اختتام تک غزل کے انداز سے قوافی اور ردیف کی پابند ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خالد کے ہاں آمد ہے ان کے ہاں جذبہ اور علمیت ہے۔ ان کے ہاں پوری پوری آیتیں، فقرے اور جملے مصروں کی شکل میں ملتے ہیں۔[٦٨] مثلاً،

مٹی کا یہ برتن اک دن آخر ٹوٹے
جیون پد کا ساتھ ہے کچا چھوٹے
آمنتُ بِکَ ربّ توکلتُ علیک
ہیں تیرے سوا سارے سہارے جھوٹے[٦٩]

کم کھانا ،کم سونا ،اکثر رونا
اکیسر ہے مٹی کو بنا دے سونا
کل بنی آدم خطا پر
خیرُ الخَطّائین التوّابُون[٧٠]
مطاع آدم و انجم متاع لوح وقلم
محمدؐ اُمتی محبوبؐ کبریا صلعم
محمد انجمن کن فکاں کا صدر نشیں
محمدؐ افسر آفاق وسروَر عالم
وہ عبدہُ رسولہٗ ، وہ اِسمہُ اَحمدُ
کتاب وحکم ونبوت کا خاتم و فاتم[٧١]

وفا راشدی بے حد اچھے لکھاری ہیں، خالد کے بارے میں ان کی رائے قابل توجہ ہے۔ کہتے ہیں:

''خالد نے اپنی شاعری کو بہت سی فرسودہ رسوم و قیود سے آزاد کرالیا ہے۔ انھوں نے شاعری میں اتنے انوکھے اور موہ لینے والے تجربے کیے ہیں کہ اردو ادب کا قاری انھیں کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتا۔[۷۲]

وفا راشدی نے خالد، ایک نیا آہنگ، کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی ہے جو خالد پر ان کی شاعری پر مدلل کتاب ہے۔ وہ خالد کی شاعری میں شامل مشکل الفاظ کے حوالے سے بڑی پیاری بات کہتے ہیں جو میرے بھی دل کی آواز ہے، وہ کہتے ہیں:

''ممکن ہے بعض لوگ ان کی شاعری پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہوں کہ ان کے ہاں الفاظ ثقیل ہوتے ہیں، بغیر ڈکشنری کے قاری آگے نہیں بڑھ سکتا، استعارے اور تشبیہات اور تاریخی حوالے زیادہ ہوتے ہیں یہ صحیح ہے لیکن ایک لمحے کے لیے سوچیے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ آپ کو سمجھانے کے لے شاعر آپ کی سطح پر ہی اتر آئے۔[۷۳]

عبدالعزیز خالد کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ دور حاضر کے نعت گو شعراء میں ان کا مقام بہت نمایاں اور کلام بہت منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی عمیق نظر، وسعت علمی، سلاست و روانی لب و لہجے کا رعب و دبدبہ کٹھن اور مشکل مراحل کو بآسانی عبور کرنا، عربی قصائد اور فارسی تغزل کو یکجا کر کے اردو و ہندی سے خمیر اٹھانا وہ صفات ہیں جو ان کو باقی شعراء سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ وہ خداداد صلاحیتیں ہیں جو اللہ تعالی نے انہیں عطا فرمائیں اور انھوں نے اپنی ان صلاحیتوں کو بھرپور طریقے پر استعمال کرتے ہوئے کلام ربانی واحادیث نبوی ﷺ کے فروغ کا کام کیا۔ اللہ ان کے اس کام کو قبول فرمائے اور ہمیں اس کی ترویج واشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

حواشی:

[۱] سید قاسم محمود، پاکستان کے نعت گو شعرا، جلد اول، ہارون اکیڈمی، اورنگی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۶۲

[۲]۔ عبدالعزیز خالد، زرداغ دل، ، مکتبہ شعور، مانڈی والا لین، پریڈی کا اسٹریٹ، صدر کراچی، ۱۹۵۶ء، ص:۴۲۹

[۳]۔ زرداغ دل۔ ص:۴۳۳

[۴]۔ ایضا، ص:۴۳۵

[۵]۔ نیا اور پرانا ادب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، الاعجاز پبلی کیشنز۔ لاہور، سال اشاعت ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۳

[۶]۔ ایضاً،

[۷] ایضاً، ص:۱۸۰

[۸]۔ عبدالعزیز خالد، برگ خزاں، ، دوآبہ کوآپریٹو پبلشرز لمیٹڈ کراچی، طبع دوم 1964 ص:۶۲

[۹]۔ایضاً

[۱۰]۔برگ خزاں،ص:۶۳

[۱۱]۔عبدالعزیز خالد، فارقلیط ایوان پبلشرز 4۔فیض محمد فتح علی روڈ ، پاکستان چوک کراچی،پہلی بار ستمبر 1964ص:۵

[۱۲]۔ایضاً، ص:

[۱۳]۔فارقلیط۔ص:190

[۱۴]۔فارقلیط۔ص:37

[۱۵]۔ایضاً۔ص:24

[۱۶]۔ایضاً۔ص:28

[۱۷]۔ایضاً۔54

[۱۸]۔ایضاً۔ص:90

[۱۹]۔ایضاً۔ص:94

[۲۰]۔ایضاً۔ص:107

[۲۱]۔ایضاً۔ص:114

[۲۲]۔ایضاً۔ص:119

[۲۳]۔ایضاً۔ص:121

[۲۴]۔ایضاً۔ص:158

[۲۵]۔ایضاً۔ص:234

[۲۶]۔ایضاً۔ص:248

[۲۷]۔عبدالعزیز خالد،حدیث خواب،،ماورا پبلشرز کالج روڈ راولپنڈی جولائی 1974ص:۱۴۸

[۲۸]۔ایضاً۔ص:150

[۲۹]۔ایضاً۔ص:172

[۳۰]ایضاً،ص:۲۰۸

[۳۱]۔عبدالعزیز خالد،لحن صریر۔بک لینڈ۱۲محمد بلڈنگ بندرروڈ کراچی۔ا،ص:۲۵۵

[۳۲]۔ایضاً،ص۱۱۱

[۳۳]۔عبدالعزیز خالد، منحمنا ، بک لینڈ۱۲محمد بلڈنگ ، بندرروڈ کراچی۔طبع اول۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء،ص:۱۹

[۳۴]۔ایضاً،ص:۲۰

[۳۵]۔ایضاً،ص:۸

[۳۶]۔ایضاً

[۳۷]۔ایضاً۔ص:۱۵

[۳۸]۔ایضاً،ص:۱۰

[۳۹]۔ایضاً،ص:۱۹

[۴۰]۔ایضاً،ص:۲۳

[۴۱]۔ایضاً،ص:۲۶

[۴۲]۔ایضاً،ص:۲۹

[۴۳]۔ایضاً،ص:۳۷

[۴۴]۔ایضاً

[۴۵]۔ایضاً،ص:۳۸

[۴۶]۔ایضاً،ص:۴۵

[۴۷]۔عبدالعزیز خالد،حمطایا ،مقبول اکیڈمی،ادبی مارکیٹ،چوک انارکلی،لاہور،اپریل ۱۹۷۶ء،ص:۵۔۶

[۴۸]۔ایضاً،ص:۱۲

[۴۹]۔ایضاً،ص:۱۶

[۵۰]۔ایضاً۔ص:۱۷

[۵۱]۔ایضاً۔ص:۱۸

[۵۲]۔حمطایا،ص:۴۲۔۴۳

[۵۳]۔ایضاً،ص:۲۹۔۳۰

[۵۴]۔ایضاً،ص:۵۱

[۵۵]۔ایضاً۔ص:۶۶

[۵۶]۔ایضاً۔ص:۷۳

[۵۷]۔ایضاً،ص:۶۴

[۵۸]۔ایضاً،ص:۷۵

[۵۹]۔ایضاً،ص۔۷۶

[۶۰]۔عبدالعزیز خالد،عبدہٗ،نعت اکادمی،فیصل آباد،طبع الاول ۵ جمادی الثانی ۱۴۰۲ھ۔ص:۱۹

[۶۱]ایضاً،ص:۲۰

[۶۲]ایضاً،ص:۵۲۔۵۳

[۶۳]۔عبدالعزیز خالد،خروش خم،،شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز،لاہور،طبع سوئم،اگست ۱۹۷۶ء،ص ۱۳۳تا۱۳۹

[۶۴]۔ایضاً۔ص:۱۴۱

[۶۵]حسرت کاس گنجوی،ڈاکٹر،بیسویں صدی میں اردو ادب، ،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی،باراول،۱۹۸۸،ص ۳۹۶

[۶۶]۔ایضاً،ص:۳۹۸

[۶۷]۔ایضاً،ص:۴۰۰

[۶۸]۔ایضاً،ص:۴۰۲

[۶۹]۔ایضاً،ص:۴۰۵

[۷۰]۔ایضً،ص:۴۰۶

[۷۲]۔ایضاً،ص:۴۰۷ [۷۳]ایضاً،ص:۴۱۴(عبدالعزیز)

☆☆☆

ڈاکٹر عابد حسین حیدری، سنبھل (انڈیا)

دلّو رام کوثری کی نعت گوئی

ABSTRACT: Naatia and Manqabati Poetry composed by a Hindu poet Dallu Ram Kausari, has been evaluated in this article to judge feelings of a non-Muslim towards admiring grandeur of Prophet of Islam Muhammad (S.A.W) and His companions (R.A.)/relatives. Brief biographical features have also been presented here to introduce the poet. Couplets of Naats and Manaqib have also cited for showing poetic trend and worth of verses composed by Kausari. The literary work of Dallau Raam Kausari appears to be a magnificent effort of composing sacred text of poetry.

نعت نگاری کی روایت آغازِ اسلام ہی سے شروع ہوتی ہے اور یہ اٹوٹ سلسلہ چودہ سو برس سے زائد عرصے سے چلا آ رہا ہے۔ نعتیہ شاعری کی عرب شعراء نے خوب خوب آبیاری کی لیکن جب دولت عباسی کے آخری خلیفہ معتصم باللہ کی ناعاقبت اندیشی سے عربوں کی جاہ وحشمت انحطاط پذیر ہوئی تو عجمیت کا غلبہ ہوا اور ایرانی تہذیب نے اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ مآل آخر فارسی شاعری نے عربی شاعری کی جگہ لے لی۔ یہاں تک کہ فارسی میں بھی نعتیہ شاعری کا آغاز ہوا اور اس طرح نعتیہ شاعری ایران وترکستان ہوتی ہوئی ہندوستان میں وارد ہوئی۔ نظامؔی، رومؔی، عطارؔ، سعدؔی، جامؔی، قدسؔی اور امیر خسرؔو وغیرہ نے فن نعت گوئی کو عروج بخشا لیکن عرب شعرا کی طرح فارسی شعرا کی مساعی بھی صنفی حیثیت سے قصائد ہی کے ضمن میں آتی ہیں۔ البتہ جامؔی کی مسلسل غزلیں نعت گوئی کے موجودہ اظہار بہ انداز غزل کا پہلا تجربہ کہی جاسکتی ہیں۔

اردو شاعری میں نعت گوئی ہر شاعر وادیب کی بسم اللہ بنی۔ مدحیہ قصیدوں، طبع زاد داستانوں اور مثنویوں کا آغاز بطور تبرک وتقدس حمد باری تعالیٰ کے ساتھ نعتیہ اشعار سے کیا جانے لگا اور پھر نعت گوئی اردو میں اظہارِ جذبات اور عقیدت ومحبت کا ذریعہ بن گئی جس کی مثالیں قدیم دواوین میں بکثرت مل جاتی ہیں۔ نعت کا سفر خاصہ طویل ہے۔ نعت شعر کی مختلف اقسام کو اپنی منزل بناتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ پس

قصائد، معراج نامے (جو مثنوی کے طرز پر لکھے گئے) معجزات وغزوات نبوی، ولادت مبارکہ، میلاد و مناجات وغیرہ کو نعت کے احاطے سے باہر نہیں سمجھا جا سکتا۔ قصائد کے باب میں سودا، میر، مومن، شہیدی، حالی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، سید سرسوی، قیس زنگی پوری اور عزیز لکھنوی نے خاصی شہرت پائی۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اردو شاعری میں نعت گوئی ہر شاعر کی بسم اللہ بنی لیکن بعض شعرا نے اس پر سنجیدگی سے طبع آزمائی کی۔ ابتدائی دکنی شعرا میں محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، خواجہ بندہ گیسو دراز، نصرتی، وجہی، ابن نشاطی، سراج اور ولی وغیرہ نے خوب خوب نعتیں کہی ہیں۔ شمالی ہند میں سودا، ذوق، بیدار وغیرہ کے دواوین میں نعتیہ کلام موجود ہے۔

نعت کو غزل کے فارم میں کہنے کا اردو میں پہلے پہل تجربہ فدوی خاں فدوی اور میر محمد شریف مفتوں کے سر ہے۔ لیکن اردو شعرا میں مومن اولین نعت گویوں میں ہیں جنھوں نے نعت کو فنی حیثیت سے برتا۔ ان کے تمام قصائد حمدیہ اور نعتیہ ہیں۔ انشا اور مصحفی کے اسکول نے بھی نعت کے فن کو بڑھاوا دیا۔ ساتھ ہی مرثیہ نگاروں نے بھی اپنے مراثی میں اس موضوع کو خاص جگہ دی۔ لیکن اس فن کو معراج تک پہنچانے والے مولانا کفایت علی کافی مرادآبادی، غلام امام شہید، لطف علی خاں لطف، شہید بریلوی، امیر الدین آزاد، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، حالی، شبلی، محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خاں بریلوی، مولانا حسن رضا خاں حسن، عزیز لکھنوی، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر محمد اقبال، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، بیدم شاہ وارثی، امیر بدایونی اور قیس زنگی پوری وغیرہ ہیں۔ ان حضرات کی نعتیہ مساعی نعت کے فن کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ حالی اور اقبال نے اپنی کوششوں سے نعت میں جدیدیت کے باب وا کئے۔ آپ ﷺ کے بے پناہ اخلاق و کردار کو شعری جامہ پہنا کر پیش کیا۔ جس کا اثر ان کے ہم عصروں اور بعد والی نسلوں نے سلیقے سے قبول کیا۔ حافظ پیلی بھیتی، اقبال سہیل، دلورام کوثری، شیو پرشاد وہبی، بہزاد لکھنوی، عرش ملسیانی، لطف بدایونی، ضیاء القادری، شفیق جونپوری، آسی غازی پوری، حفیظ جالندھری اور ماہر القادری کی نعتیہ شاعری نعت کے اس جدید تصور کا بڑی حد تک صحیح معیار متعین کرتی نظر آتی ہے۔

اردو میں نعت گویوں کے درج بالا عظیم مجمع کی کاوشوں کا نتیجہ یہ رہا کہ لفظ نعت اردو میں حضرت خیر المرسلین ﷺ کے وصف و مدح کے لئے مخصوص ہو گیا اور آج یہ لفظ مدح رسول ﷺ مقبول کے لئے مخصوص ہے اور اردو ادب کے نقادوں اور مورخوں ہی نے نہیں بلکہ لغت نویسوں نے بھی اس تخصیص کو قبول کر لیا ہے۔

اردو کے ابتدائی نعت نگاروں کی صف میں صرف مختلف الخیال مسلمان ہی تھے۔ لیکن ہندوستان میں جیسے جیسے صوفیائے کرام کی کوششوں سے اسلام کا آفاقی پیغام پھیلتا گیا تو اس کے آفاقی پہلوؤں اور حضور اکرم ﷺ کے سیرت پاک کی دلکشی سے متاثر ہو کر غیر مسلم شعرا نے بھی طبع آزمائی شروع کی۔

اگرچہ عام طور سے ان حضرات نے روایتی عقیدت کے حدود کو قبول و تسلیم کیا۔ لیکن ان کے ذاتی خیالات و ترجیحات کا پرتو ان نعتوں میں نظر آنے لگا۔ علی جواد زیدی نے اس صورت حال کی عکاسی درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

'اردو نعتوں میں عربی و فارسی نعتوں سے کسب نور ضرور کیا ہے، لیکن ہندوستان کی عام عقیدت مندانہ اور عارفانہ شاعری، بالخصوص بھگتی کے رنگ و آہنگ سے بھی متاثر ہوئی ہے۔ فارسی میں یہ سلسلہ عرفا و صوفیا کے کلام میں شروع ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے اس میں اضافہ ہوا ہے۔'

(حرف آغاز: علی جواد زیدی: نعت خیر المرسلین نمبر: دو ماہی العلم بمبئی: اگست ۱۹۹۴: ص ۱۲)

اردو نعت کے عظیم الشان ذخائر کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعت نگاری میں تمام مسالک اور مکاتب خیال نے دل کھول کر داد سخن دی ہے اور سرکار مدینہ کی خدمت میں والہانہ نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ بلکہ اس رنگا رنگ سدا بہار گلدستہ میں دوسرے فرق و مذاہب کے شعرا بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری میں مسلمان نعت گویوں کے ساتھ ساتھ ہندو نعت گویوں کی بھی بہت بڑی تعداد ہے۔ جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں متعدد ہیئتوں میں سرکار رسالت کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان نعت گویوں میں سادھو رام آرزوؔ، عرشؔ ملسیانی اور دلو رام کوثریؔ کا نام بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ دلّو رام کے تعلق سے خواجہ حسن نظامی دہلوی رقم طراز ہیں:

'جناب چودھری دلّو رام صاحب کوثری ساکن نانڈری ضلع حصار، پنجاب کا نعتیہ کلام رسالہ صوفی اور اکثر رسائل و اخبارات میں چھپا کرتا ہے۔ صحابۂ کرام کی شان میں بھی انہوں نے بہت سے منظوم مناقب لکھے ہیں۔ وہ بہت بے تعصب ہندو ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں آں حضرت ﷺ کی سچی محبت ہے۔'

(ہندو کی نعت و منقبت: دلّو رام کوثری: مرتبہ خواجہ حسن نظامی دہلوی: محبوب المطابع دہلی: ۱۹۲۴ء: ص ۱/)

علی جواد زیدی کوثریؔ کی نعت و منقبت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

'کوثریؔ کا نام نعت و سلام و مرثیہ بالخصوص نعت کے سلسلے میں اہم ہے۔ انہیں محمد ﷺ و آل محمد سے دلی خلوص تھا۔ ان کی نعتوں اور مراثی ہی میں نہیں بلکہ ان کی غزلوں تک میں ان کا یہ خلوص جھلکتا ہے۔'

(فٹ نوٹ: علی جواد زیدی: دو ماہی العلم بمبئی، مرثیہ و سلام نمبر: جون ۱۹۹۳ء: ص ۱۳۳/)

'ہندو کی نعت اور منقبت' دراصل دلّو رام کوثری کا مجموعۂ نعت و منقبت ہے۔ جسے حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم نے ۱۹۲۴ء میں حلقۂ مشائخ دہلی سے شائع کیا ہے۔ دلّو رام کوثری کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا کلام حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی جیسی عظیم شخصیت نے مرتب کیا ہے۔ یہ نایاب مجموعہ عاشق پبلک لائبریری، سنبھل میں موجود ہے۔ اس مجموعہ کا ذکر پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے اپنے مضمون 'دلّو رام کوثری' میں کیا ہے۔ یہ مضمون العلم کے مرثیہ و سلام نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر اکبر حیدری نے لکھا ہے کہ' سالار جنگ میوزیم حیدر آباد میں یہ واحد نسخہ ہے'اس مضمون میں موصوف نے 'ہندو کی نعت و منقبت' میں مشمولہ کوثری کے خودنوشت کو بھی شامل کیا ہے۔ جس سے مضمون کی ضخامت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کی اطلاع کے مطابق 'ہندو کی نعت و منقبت' کے علاوہ کوثری کی تصانیف میں 'آبِ کوثر، قرآن اور حسین، بشارت انجیل' اور 'اعجاز جعفری' سالار جنگ میوزیم حیدر آباد میں موجود ہیں۔

دلّو رام کوثری دراصل بشنوئی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ لاہور میں انٹرنس کی تعلیم کے درمیان شاعری کا شوق ہوا اور تعلیم چھوڑ دی اور غزل گوئی میں مصروف ہوا اور مشاعروں میں جانے لگا۔ ایک دن ایک غزل جس کا مطلع تھا:

پہلے نہ سوجھتی تھیں یہ چالیں صبا تجھے کوئے صنم کی لگ گئی شاید ہوا تجھے

پڑھی مطلع کی تعریفیں ہوئیں مگر بعد ازاں ایک شعر کے ناموزوں ہونے پر ایک عالم فاضل سے علم عروض پڑھنا شروع کیا۔ نعت و منقبت کی طرف رجحان اور اس صنف سے دلچسپی کی وجہ کوثری کی خود نوشت سے ظاہر ہوتی ہے:

> 'لاہور ہی میں ایک عالم فاضل سے عروض پڑھنا شروع کیا۔ دو سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مگر طبیعت سیر نہ ہوئی بالآخر سامانہ ریاست پٹیالہ پہنچا وہاں ایک عالم اعلم حضرت سید عنایت علی صاحب مجتہد العصر و الزمان مرحوم کی خدمت میں دس بارہ برس رہ کر متعدد فارسی اور علم عروض و فن شعر کی کتابیں پڑھیں اور انتیس سال کی عمر میں بعد تحصیل فن شعر و ادب واپس وطن آیا۔ پہلے غزل لکھتا تھا مگر بعد ازاں جب زمانے کا رنگ دیکھا تو طرز شاعری کو بدلا اور اسلامی روایات پر بے شمار نظمیں لکھیں۔ خصوصاً اہل بیت اطہار کی مدح و ثنا میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ مگر صحابہ کی تعریف میں بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔'

(کوثری صاحب کے خودنوشت حالات مشمولہ ہندو کی نعت و منقبت: ص ب و ج)

کوثری کے استاد سید عنایت علی مجتہد العصر والزمان کا تذکرہ 'مطلع انوار' میں مرتضیٰ حسین فاضل نے تفصیل سے کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف شیخ مرتضیٰ انصاری (صاحب رسائل) کے شاگرد رشید اور ان کے معتمد تھے۔ مرتضیٰ حسین فاضل نے لکھا ہے:

'مولانا عنایت علی صاحب، صاحب کرامات، متقی، خطیب، واعظ اور فقیہ تھے۔۔۔ان کی زبان میں تاثیر اور عمل میں کشش تھی۔ ہندو، سکھ، عیسائی سب ان کا احترام کرتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو میں شعر کہتے تھے۔ مگر دیوان جمع نہ کیا۔ جو کچھ متفرق تھا وہ ضائع ہوگیا۔ پنجاب میں ان کے فیوض و برکات سے بے شمار حضرات بہرہ ور ہوئے۔ مسجدیں اور امام باڑے بنے اور آباد ہوئے۔'

(مطلع انوار: مرتضیٰ حسین فاضل: رشید آرٹ پریس لاہور: ۱۹۸۱ء: ص ر ۳۸۰)

کوثری نے سید عنایت علی جیسے عالمِ اجل کے سامنے بارہ سال زانوئے ادب طے کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوثری کو عربی و فارسی کا خاصا علم ہوگیا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہنے لگے۔ اور قرآنی آیات اور عربی جملے ان کی شعریات کا حصہ بننے لگے۔ سلام و منقبت کے درج ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ جس سے میری بات کی تائید ہوتی نظر آتی ہے:

قرآں حسینؑ پڑھتے تھے اس وقت بالیقیں
سینے پہ تھا چڑھا ہوا جب قاتل لعیں

آواز درد ناک سے کہتے تھے شاہ دیں
ایاك نعبد کبھی ایاك نستعیں

تشبیہ ہم دگر ہیں نہیں اس میں اشتباہ
والشمس و الضحی ہیں جبین و جمال شاہ

خون چکیدہ نے بھی رفاقت کی بات کی
ہر قطرے میں صدا تھی اقیمو الصلاۃ کی

حلق بریدہ پڑھتا تھا یٰسین و ھل اتیٰ
نیزہ پہ سر حسینؑ کا کہتا تھا قل کفیٰ

کوثری نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے:

'میں نے علما سے فن شعر، علم عروض، اردو، فارسی لٹریچر برسوں تک پڑھا ہے، مگر شاعری میں کسی شاعر کو اپنا استاد نہیں بنایا کیونکہ ایک عالم ذی علم نے مجھے ہدایت فرمائی کہ کسی شاعر کو استاد نہ بناؤ۔ تم قدرتی ایک بڑے شاعر بنو گے۔ اس لئے کسی شاعر سے اصلاح نہ لی۔ حالانکہ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں حالی، داغ، امیر جیسے اساتذۂ باکمال موجود تھے۔'

اپنی شاعری کی شہرت اور تخلص کے تعلق سے کوثری اپنی خودنوشت میں رقم طراز ہیں:

'میری عمر اس وقت اکتالیس سال ہے اور تمام ہندوستان میرے نام سے

واقف ہے۔ بلکہ دیگر ممالک تک بھی میری نظمیں پہنچی ہیں اور وہاں سے بھی خطوط دادِ تحسین حاصل ہوئے ہیں۔ کوثریؔ تخلص میں نے خود دہلی میں برف سرائے کے سامنے ٹہلتے ہوئے سوچا تھا۔ یہ تخلص نیا ہے۔ فردوسیؔ کا ہمسایہ ہوں۔ فردوس اور کوثر آس پاس ہیں۔ مگر فردوسیؔ کے بعد کوثریؔ تخلص کسی کو بھی نہ سوجھا۔'

کوثریؔ نے اپنی خودنوشت خواجہ حسن نظامی دہلوی کی فرمائش پر زیرِ نظر مجموعہ کے لئے لکھی تھی۔ جسے خواجہ صاحب نے قارئین کی دلچسپی کے لئے کتاب میں شائع کر دی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ کوثریؔ قادر الکلام شاعر تھے۔ انہیں نعت، منقبت، مرثیہ، قصیدہ، نظم اور غزل کے علاوہ رباعی کہنے میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ایک رباعی ملاحظہ فرمائیں جس میں فن کارانہ صناعی کے ساتھ جوش عقیدت بھی قابل دید ہے:

کیا پہنچا مسیحا جو فلک پر پہنچا — مقصود کو اپنے نہ سکندر پہنچا
اللہ غنی کوثریؔ ایسا چالاک — گنگا سے جو پھسلا لب کوثر پہنچا

کوثریؔ کا عقیدہ ہے کہ رسولِ خدا ﷺ قرآن کے مطابق صرف رحمۃ للمسلمین نہیں بلکہ رحمۃ للعالمین ہیں۔ اس عقیدے کو کوثریؔ نے ایک خوبصورت مکالمہ کا روپ دیا ہے:

محشر میں دی فرشتوں نے داور کو یہ خبر — ہندو ہے ایک احمدؐ مرسل کا مدح گر
ہے بت پرست گرچہ وہ لیکن ہے نعت گو — احمدؐ کی نعت لکھتا ہے دنیا میں بیشتر
ہے نام دلّو رام تخلص ہے کوثریؔ — لے جائیں اس کو خلد میں یا جانب سقر
سنتے ہی یہ ملائکہ سے اک انوکھی بات — فرمایا ذو الجلال نے جنت ہے اس کا گھر
اللہ اکبر احمدؐ مرسل کا یہ لحاظ — کی حق نے لطف کی سگ دنیا پہ بھی نظر

کوثریؔ کو دیوانہ محمدؐ ہونے پر فخر ہے۔ اور دیوانہ محمدؐ ہونے کے سبب اپنی بخشش کا تمنائی بھی ہے:

مجھے لوگ کہتے ہیں دیوانہ تیرا — کہوں اور کیا ماجرا یا محمدؐ
خدا تیرا عاشق، تو عاشق خدا کا — میں تم دونوں پر ہوں فدا یا محمدؐ
خدا کی خدائی میں تجھ سا نہیں ہے — تو یکتا ہے بعد از خدایا محمدؐ
میں تیرا بنا ہوں مرا تو بھی بن جا — مرا کون ہے دوسرا یا محمدؐ
تمہاری بدولت خدا مجھ کو بخشے — ہو مقبول میری دعا یا محمدؐ
ترا کوثریؔ رہتا ہے ہندوؤں میں — ہے ظلمت میں آبِ بقا یا محمدؐ

کوثریؔ کا عقیدہ ہے کہ سرکارِ مدینہ کی شان نرالی ہے۔ وہ اس شانِ لم یزل کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں جیسے ان کی زبان کوثر و تسنیم سے دھلی ہو اور اس طٰہٰ و یٰسین و مزمل کی عظیم المرتبت شان کو دوبالا کرنے میں پنجتن پاک کی ذواتِ مقدسہ کا تذکرہ بھی کوثریؔ کی عقیدت کے مظہر ہیں:

عظیم الشان ہے شانِ محمدؐ — خدا ہے مرتبہ دانِ محمدؐ

خدا کا نور ہے نورِ پیمبرؐ — خدا کی شان ہے شانِ محمدؐ

علیؓ و فاطمہؓ، شبیرؓ و شبرؓ — بسا ان سے گلستانِ محمدؐ

علیؓ ان میں وصیِ مصطفیٰؐ ہے — علیؓ ہے رنگِ بستانِ محمدؐ

علیؓ کا نفس ہے نفسِ پیمبرؐ — علیؓ کی جان ہے جانِ محمدؐ

بتاؤں کوثریؔ کیا شغل اپنا — میں ہوں ہر دم ثنا خوانِ محمدؐ

کوثریؔ کو اپنے ہندو ہونے پر فخر ہے۔ لیکن اس فخر و مباہات میں توصیفِ محمد ﷺ کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کو نعتِ رسول ﷺ کی تشویق کچھ اس انداز سے دلاتے ہیں:

کرا اے ہندو بیاں اس طرز سے توصفِ احمدؐ کا
مسلماں مان جائیں لوہا سب تیغِ مہند کا

ان کا خیال ہے کہ عشقِ رسولؐ کے لئے مسلمان ہونے کی شرط نہیں بلکہ اس کائنات کی کوئی بھی مخلوق رسولؐ سے عشق کرسکتی ہے۔ اور یہی عشقِ رسولؐ اسے جہنم سے نجات دلائے گا:

کچھ عشقِ پیمبرؐ میں نہیں شرط مسلماں — ہے کوثریؔ ہندو بھی طلب گارِ محمدؐ

محشر میں بچا لیں گے نبیؐ مجھ کو یہ کہہ کر — چھیڑو نہ اسے یہ تو ہے دیوانہ ہمارا

جس دم دبایا مجھ کو گناہوں کے بار نے — میں شافع گناہ کو لگا پھر پکار نے

حضرت نے آ کے مجھ کو سبک دوش کردیا — رحمت بڑی کی شافعِ روزِ شمار نے

کوثریؔ کا خیال ہے کہ محبوبِ خدا، سرورِ کائنات شافعِ روزِ جزا ہیں۔ ان کا یقین اس حد تک محکم ہے کہ میں ہندو ہوں لیکن رحمۃ للعالمین کا بے پایاں کرم مجھے جہنم میں جانے سے مانع ہے۔ اس عقیدے کو کوثریؔ نے اپنی صناعانہ منظوم پیش کش سے اردو کی خوبصورت شعریات کا حصہ بنادیا۔ آپ بھی کوثریؔ اور جہنم کے مکالمہ سے لطف اندوز ہوں اور کوثریؔ کی عقیدت بھری قادر الکلامی کی داد دیں:

ہندو سمجھ کے مجھ کو جہنم نے دی صدا — میں پاس جب گیا تو نہ مجھ کو جلا سکا

بولا کہ تجھ پہ کیوں میری آتش ہوئی حرام — کیا وجہ تجھ پہ شعلہ جو قابو نہ پا سکا

کیا نام ہے تو کون ہے مذہب ہے تیرا کیا — حیراں ہوں میں عذاب جو تجھ تک نہ جا سکا

میں نے کہا کہ جائے تعجب تو یہ نہیں — واقف نہیں تو میرے دل حق شناس کا
ہندو سہی مگر ہوں ثنا خوان مصطفیٰؐ — اس واسطے نہ شعلہ تیرا مجھ تک آ سکا
ہے نام دلّو رام تخلص ہے کوثریؔ — اب کیا کہوں بتا دیا جو کچھ بتا سکا

کوثریؔ اپنے آپ کو حسان کا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نعت گوئی میں اگر عربوں میں حسان ابن ثابت سرفہرست ہیں تو ہندوستان میں میں ہوں۔ اس تقابلی اندازِ نظر کو بھی ملاحظہ فرمائیں اور کوثریؔ کے حسن نظم کی داد دیں:

نبیؐ کے ہوئے نعت گو دو برابر — کہ دونوں کو اک مدح خوانی میں رکھا
ہے حسان پہلا تو میں دوسرا ہوں — نہیں فرق اول میں ثانی میں رکھا
خدا نے اسے سونپی محفل عرب کی — مجھے بزمِ ہندوستانی میں رکھا
اسے سیر دکھلائی دشت بیاں کی — مجھے غرق بحر معانی میں رکھا
عرب میں وہ صحرائے قدرت سے پہنچا — اسے ریگ ہی کی روانی میں رکھا
میں پنجاب سے آیا کوثر پہ یارو — مجھے حق نے پانی ہی پانی میں رکھا
لکھیں کوثریؔ عمر بھر ہم نے نعتیں — نہ کچھ اور غم زندگانی میں رکھا

کوثریؔ کا خیال ہے کہ رحمتہ للعالمین، شفیع المذنبین کا دامن اگر ہاتھ میں ہو اور ان کا کرم شامل حال ہو تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور دنیا کیا چیز ہے آخرت میں بھی وہی کامیاب ہے جو محبوب خدا اور ان کی آل پاک سے متمسک ہے۔ کوثریؔ کا یہ عقیدہ خوبصورت اشعار کی شکل میں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

کوثری تنہا نہیں ہے مصطفیٰؐ کے ساتھ ہے — جو نبیؐ کے ساتھ ہے وہ کبریا کے ساتھ ہے
کس لئے پھر درپئے آزار ہیں اشرار قوم — اس کا کیا کرلیں گے جو خیرالورا کے ساتھ ہے
کچھ نہیں حسرت ید بیضا کی مجھ کو اے کلیم — ہاتھ اپنا دامن آل عبا کے ساتھ ہے
لے کے دلّو رام کو حضرت گئے جنت میں جب — غل ہوا ہندو بھی محبوب خدا کے ساتھ ہے

'ہندو کی نعت و منقبت' میں جہاں ایک حمد پاک اور چودہ نعتیں ہیں وہیں خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی شان میں دو منقبتیں بھی شامل ہیں۔ 'فاتح بیت المقدس تیرا ہے بیشک لقب' اور 'یاد کرتا ہے تری رفتار کو یورو شلم' کے عنوان سے یہ منقبتیں خلیفۂ دوم کے جاہ و حشم اور ان کے عادلانہ فیصلوں کی داستان ہے:

تیری شان مملکت کا ہو نہیں سکتا بیاں — تیری طرح عدل کی توصیف میں ہیں بندلب
پست تو نے کر دیا اوج عظیم روم کو — ہو گئی ڈھیلی بنائے قصر ہرقل ایک دم

حدِ شرع پاک جاری تو نے کی فرزند پر
مر گیا بیٹا جواں اور کچھ نہ تھا تجھ کو الم

زیب دیتا ہے تجھے سالار عادل کا لقب
عدل بھی کھاتا ہے تیرے قول فیصل کی قسم

'ہندو کی نعت و منقبت' میں تین منقبتیں مولائے کائنات حضرت علیؓ مشکل کشا کی مدح میں ہیں۔ مناقب مولائے متقیان کوثریؔ کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

حب علیؓ سے دل ہے غنی فقر و عسر سے
ہے کوثریؔ غریب بھی اور مالدار بھی

کہوں کوثریؔ کیا میں اس کے فضائل
خود اللہ کا نام نام علیؓ ہے

جس کا مولا مصطفیؐ ہے اس کا مولا تو بھی ہے
دوست رکھتے ہیں تجھے سب دوستانِ مصطفیؐ

نور تیرا نور احمدؐ ، نور احمدؐ نور حق
شان تیری شان حق ہے یا ہے شانِ مصطفیؐ

کوثریؔ کو غم حسینؓ اور اس کے بیان سے خاص انسیت تھی۔ ذکر حسینؓ کبھی منقبت و سلام کے حوالے سے کرتے ہیں تو کبھی مرثیہ کے ذریعہ امام حسینؓ اور شہیدان کربلا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

کوثریؔ پھر قبر میں کیا ہوتی ایذا جب کہ ہم
عمر بھر ذکر شہید کربلا کرتے رہے

'قرآن اور حسینؓ' کوثریؔ کا بے مثال مرثیہ ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری پر ڈاکٹر ہلال نقوی اور عاشور کاظمی نے تفصیلی بحث کی ہے۔ 'قرآن اور حسینؓ' ۷۷ر بند پر مشتمل ہے۔ مقطع ملاحظہ فرمائیں:

کہنے لگا یزید غبی سن کے یہ بیاں
اس گھر کی لڑکیاں بھی ہیں صد فخر مرسلاں

اب کوثریؔ خدا سے دعا کر بصد فغاں
دنیا میں آخرت میں خدا وند دو جہاں

قرآن و اہل بیت مرے پیشوا رہیں
میں ان سے ہوں جدا نہ یہ مجھ سے جدا رہیں

(رزم نگاران کربلا: ڈاکٹر صفدر حسین: ص ر۲۸۹)

کوثریؔ نے 'بشارت انجیل' میں حضرت علیؓ کی ولادت سے شہادت تک کے حالات نظم کئے ہیں۔ ذیل میں مطلع اور مقطع پیش کیا جا رہا ہے:

انجیل مقدس میں بشارت یہ رقم ہے
گردوں پہ نشاں ایک بصد جاہ و حشم ہے

بی بی کوئی پاکیزہ و فرخندہ شیم ہے
خورشید ہے ملبوس قمر زیر قدم ہے

سر پر بھی بڑا سایۂ الطاف خدا ہے
اک تاج میں بارہ ستاروں کا دھرا ہے

بس کوثریؔ خدا سے دعا کر کہ اے خدا سلطان اولیا کی عطا کر مجھے ولا
مرغوب پیروی ہو علیؓ کی مجھے سدا دنیا میں رزق جلد پس مرگ ہو عطا
مجھ بندۂ غریب پہ رحمت ہو اب تری دونوں جہاں میں مشکلیں آسان کر مری

(دو ماہی العلم بمبئی: مرثیہ وسلام نمبر: ص ۱۵۳۔۱۵۱)

'ہندو کی نعت ومنقبت' میں ایک مسدس جنت البقیع پر بھی ہے۔ یہ مسدس پہلے 'آب کوثر' میں بھی شائع ہوا۔ 'آب کوثر' مثنوی کی ہیئت میں ائمہ اثنا عشر کی منقبت ہے۔ لیکن اس مجموعہ میں کوثریؔ نے اس مسدس کو بھی شامل کیا ہے۔ جس سے جنت البقیع کی عظمت ورفعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مطلع ملاحظہ فرمائیں:

کیا جنت البقیع کی شان رفیع ہے برج فلک ہر ایک مزار بقیع ہے
چھپ جائے عرش جس میں وہ دامن وسیع ہے بارہ مہینے سیر بہار ربیع ہے
خلد نہم جہاں میں یہی ارض پاک ہے کحل البصر یہیں کی زمانہ میں خاک ہیں

جنت البقیع میں کوثریؔ نے ان بزرگوں، خاص کر صحابہ کرام اور اہل بیت علیہم السلام کا ذکر کیا ہے۔ جن کی قبریں وہاں موجود ہیں اور مسلمانان عالم وہاں جا کر زیارت کرتے ہیں اور نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں:

ہے جنت البقیع بزرگوں کی یادگار ہیں اہل بیت پاک کے اکثر یہیں مزار
قبر جناب فاطمہ زہرا کے میں نثار جس پر ہے اس کے فضل وفضائل کا انحصار
شامل جو اس میں خاک ہے آل رسولؐ کی اس واسطے خدا نے یہ حرمت قبول کی

بہر حال 'ہندو کی نعت ومنقبت' کوثریؔ کا ایسا عظیم کارنامہ ہے جس پر اردو ادب جتنا فخر کرے کم ہے۔ اسی لئے اس قادر الکلام شاعر کی قادر الکلامی کا اعتراف بیشتر اہلِ نظر نے کیا ہے۔ یہاں پر مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ کے درج ذیل شعر سے اپنی بات کو ختم کر رہا ہوں جس سے کوثریؔ کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ہے سخن گوئی میں فرد منتخب
کوثریؔ بھی انوریؔ سے کم نہیں

☆☆☆

ڈاکٹر زاہد منیر عامر، لاہور

خورشید رضوی کی نعتیہ شاعری

Abstract: Dr Khurshid Rizvi (B;May 19,1942) is a well known poet and researcher. Five anthologies of his poetical works entitled Shakh e Tanha(1974) Sarabon Ke Sadaf(1981) Raegan(1996) Imkan(2004) and DairYaab (2013) have been published. A collection of the first four books captioned Yakja has also appeared(2007) He has notable inclination towards religious poetry, especially for Na'at . In this article, his Na'ats are critically discussed and evaluated. The author opines that Khurshid Rizvi desires to see the era of Holy Prophet (PBUH) without any temporal or spatial gap.

علم اور فن کے امتزاج سے کھلتے پھولوں کو دیکھنا ہو تو خورشید رضوی کی شاعری دیکھیے ...... زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے کہنے والے کی مشکل یہ تھی کہ ان ذرائع سے گزر کر بھی اپنا سراغ ہاتھ آتا دکھائی نہیں دیتا...... اپنا سراغ پانے کے لیے سراغوں کا نشاں بتانے والے کی رہبری چاہیے۔ خورشید رضوی انھی نقوشِ قدم کے جویا ہیں جو راہوں ہی کا نہیں منزلوں کا نشان بھی بتا دیں۔ اس سفر میں ان کے داخل کی روشنی ان کی راہ نما ہے۔ وہ ایک صاحبِ علم فن کار ہیں۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ فن کار زیادہ صاحبِ علم ہو تو فن وفورِ علم کے باعث دب کر رہ جاتا ہے لیکن یہاں صورت حال ایسی نہیں ہے۔ ان کی غزل میں خاص طور پر، اور نعت میں بھی، علم کا اظہار گرانی پیدا نہیں کرتا اور فنی لطافت اس پر غالب رہتی ہے۔ ان کا سارا ہی کلام اس کی مثال ہے کہیں کہیں بعض ایسے نکات ظہور کرتے ہیں جن کی تفہیم پس منظری علم کے بغیر ممکن نہیں مثال کے طور پر حمدیہ لہجے کا حامل یہ شعر:

تو پرندوں کو فضا میں تھامتا ہے دم بدم
بال و پر کا زور ہمت کی توانائی ہے تو!

شعر اپنی جگہ مکمل ہے اور مضمون عام کہ بال و پر میں اگر زور ہے تو وہ اسی کا عطا کردہ ہے اور ہمت اور تاب و تواں بھی اسی کی عطا ہے لیکن اگر قاری کے ذہن میں سورۂ ملک کی وہ آیت بھی ہو جو اس شعر

کے اندر روح کی طرح کارفرما ہے تو خواندگی و سماعت کا لطف کتنا بڑھ جائے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں سورۂ ملک کی آیت ہے اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَھُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍۢ بَصِیْرٌ [۲] کیا انھوں نے اپنے سروں پر اڑتے پرندوں کو نہیں دیکھا جو پروں کو پھیلاتے رہتے ہیں اور ان کو سکیڑ بھی لیتے ہیں، اللہ کے سوا انہیں کوئی تھام نہیں سکتا بیشک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

اب شعر کو پڑھیے تو اس کا لطف کچھ اور ہی ہے۔

اسی طرح یہ شعر کہ

بانت سعاد و بردۂ پاکیزہ کے طفیل
حاصل مجھے بھی فیضِ ردائے رسول ہو

بہ ظاہر تو کچھ شعری تلمیحات کے ساتھ حصولِ سعادت کی خواہش کا اظہار ہے لیکن ان تلمیحات کو کھولنا خاصی تفصیل چاہتا ہے ''بانت سعاد'' جناب کعب بن زہیرؓ کے قصیدے کا نام ہے جو انھوں نے سرکار رسالتمآب ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور آپ سے چادر انعام پائی۔ اور بردۂ پاکیزہ سے مراد امام بوصیری کا قصیدہ الکواکب الدریہ فی مدح خیر البریہ ہے جو روایت کے مطابق انھوں نے فالج کا شکار ہو جانے پر لکھا اور عالم رویا میں حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے اس پر خوش ہو کر اپنی چادر عنایت فرمائی یا دستِ مبارک پھیرا جس سے جناب بوصیری کی بیماری جاتی رہی۔ کہتے ہیں صبح جب بوصیری باہر آئے تو ان کے معاصر صوفی بزرگ ابوالرجا ملے جنھوں نے بوصیری سے قصیدہ کواکب الدریہ سنانے کا مطالبہ کیا تو وہ متعجب ہوئے کہ یہ قصیدہ تو میں نے ابھی تک کسی کو نہیں سنایا اس پر ابوالرجا نے کہا کہ جب آپ یہ قصیدہ رات بارگاہ رسالتمآب ﷺ میں پڑھ رہے تھے تو وہاں میں بھی موجود تھا اور حضور نبی کریم ﷺ اس کو سن سن کر لہلہاتی پھل دار ٹہنی کی طرح دائیں بائیں جھوم رہے تھے۔ [۳]

جناب کعبؓ بن زہیر کو ملنے والی چادر، مدتوں ان کے خانوادے میں محفوظ رہی ہر چند کہ وقت کے حکمرانوں نے ان سے اس چادر کو لینا چاہا لیکن انھوں نے اسے حرزِ جاں بنائے رکھا تاہم خلفائے وقت ان سے لے کر عیدین وغیرہ کے مواقع پر یہ چادر لپیٹ کر خطبہ دیا کرتے تھے، ہلاکو کے حملے کے بعد اس چادر کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گئی؟

یوں تو خورشید رضوی کی شاعری میں عربی فارسی کے وفور کا اظہار راہ نہیں پاتا لیکن نعت کی دنیا میں بعض جگہوں پر اس کا اظہار ہوا ہے مثلاً اسی نعت کے یہ اشعار دیکھیے۔

شہنشہا ! توئی روز حساب امیدم
کہ لیس لی عمل غیرمدحتی ایاک
جو تیرے ساتھ رہا وہ خدا کے ساتھ رہا
نصیب اہل مدینہ کہ اکرموا مثواک
بگیر دست توئی سیدی و مولائی
بساز چارہ کہ لاابتغی ولاء سواک

اے شہنشاہ حساب کے دن تو ہی میری امید ہے کہ میرے پاس تیری مدحت کے سوا اور کئی عمل اس قابل نہیں جسے روز حساب پیش کیا جا سکے۔ جو رسول خدا کے ساتھ وہ گویا خدا کے ساتھ رہا کیونکہ آپ کی ساری زندگی اطاعت الٰہی کا مظہر ہے اہل مدینہ کے کیا اچھے نصیب تھے جنھوں نے آپ کی عمدہ میزبانی کی ویسی جیسے کی عزیز مصر نے حضرت یوسفؑ کو زلیخا کے سپرد کرتے ہوئے کہا تھا کہ اکرِمی مَثْواہُ [۴] اس کا خیال رکھنا تو اہل مدینہ نے آپ کا خیال رکھا۔ میرا ہاتھ تھام لیجیے کہ آپ ہی میرے مولا و آقا ہیں میری چاری چارہ سازی کیجیے کہ میں آپ کے سوا کسی کا جویا نہیں اور آپ کے سوا کسی تعلق کا خواہاں نہیں ہوں۔

ان نعتوں میں دوسری شے جو انھیں ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ شاعر کے ہاں عہد نبویؐ کے منظر نامے کو تاریخ یا عقیدتوں کی عطا کردہ کسی آرائش کے بغیر دیکھنے کی خواہش ہے۔ اس روپ میں جو حقیقیؐ ہے اور جو سادہ اور سب سے خوب صورت ہے اس کی سب سے نمایاں نظم ''مدینہ میں'' ہے، جس میں شاعر صورتِ موجود کے حسن کو تسلیم کرتے ہوئے ایک اداس لہجے میں گویا ہوتا ہے۔

کیا حسیں گنبد و محراب ہیں لیکن مرا دل
ڈھونڈتا ہے وہی مٹی کے مکاں
چھت پہ وہی عود نخیل
اور دروازوں پہ حجروں کے
سیہ اون کے موٹے پردے......[۵]

ایسے میں چشم تصور وا ہوتی ہے اور زمانوں کی دیوار کو ہٹا کر منظر کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے موجود مناظر کے پیچھے پوشیدہ منظر جسے صدیوں نے ڈھانپ رکھا ہے، جہاں شاہراہوں کے جال بچھے ہیں وہاں کیا کیا تھا کون کونسے نشیب و فراز کو ان شاہراہوں نے نگل لیا ہے شاعر یہ سوچ کر شاہراہوں کو اژدر کہتا ہے اور سوچیے تو طول طویل شاہراہوں کے لیے جنھوں نے تاریخی آثار کو نگل لیا ہو یہ کیسی تشبیہہ ہے

اور دیکھیے کس مہارت سے آئی ہے۔

شاہراہیں ہیں کہ اژدر ہیں
جو نگلے ہوئے ہیں کتنے نشیب اور فراز
جن سے وابستہ مرا کھویا ہوا حافظہ ہے
خوں رُلاتی ہے مجھے چشمِ تصور کی بھی نابینائی
کچھ بھائی نہیں دیتا کہ کہاں کیا کیا تھا
تف ہے اے چشمِ تصور تجھ پر...... [۶]

ایسے میں تصور کی آنکھ کثرتِ نظارہ سے دھندلا کر رہ جاتی ہے شاعر کا دل چھلنی ہو جاتا ہے لیکن ایسی چھلنی کہ جس میں خاکِ بقیع چھانی جانے لگتی ہے تو ستارے جگمگا اٹھتے ہیں اور شاعر پکار اٹھتا ہے۔

میرا دل صورتِ غربال ہے یادوں سے فگار
چھاننا چاہتا ہے خاکِ بقیع
جس میں ہیں اتنے ستارے کہ فلک پر بھی نہیں [۷]

اب اگر آپ کے ذہن میں اصحابی کالنجوم والی روایت ہے جس میں صحابہ کو ستاروں کی مانند قرار دیا گیا ہے [۸] تو خاکِ بقیع میں مدفون ستاروں کے اس تذکرے کی لطافت کئی گنا بڑھ جاتی ہے ۔ یہاں پہنچ کر یوں لگتا ہے کہ زمانے کی رِدا شاعر کی آنکھوں سے ہٹ جاتی ہے اور وہ مناظر کو براہِ راست دیکھنے لگتا ہے اس کے لیے ہر منظر کا سب سے بڑا حسن یہ احساس ہے کہ اس خاک کو رسول پاک کے قدموں نے سرفراز کیا ہے۔

ہر نقشِ قدم میں وہ قدم دیکھ رہا ہوں
آنکھوں پہ مری چاک زمانے کی ردا ہے [۹]

یہاں پہنچ کر شاعر خود کو مدینہ کے ہر گلی کوچے سے آشنا محسوس کرتا ہے اسے کوئی راستا کسی سے پوچھنا نہیں پڑتا ، ایک اجنبی مسافر ، مانوس معاصر بن جاتا ہے اور کیسے اعتماد سے ان گلیوں میں چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے کہ اب اس کی راہ نمائی یہاں کے سردار کر رہے ہیں ان کی محبت ان کے نقوش قدم کر رہے ہیں۔

مجھ کو کسی سے پوچھ کے جانا نہیں پڑا
وہ رہگزر ہی راہنما ہو گئی مجھے [۱۰]

اس کے تخیل نے اسے مدینہ کی گلیوں سے اتنا مانوس کر دیا ہے کہ اسے یہاں کا ہر منظر مانوس

لگتا ہے اور وہ خود کو یہیں کا باسی محسوس کرنے لگتا ہے۔

دیکھی دیکھی ہوئی لگتی ہے مدینے کی فضا
اس سے پہلے بھی یہاں خواب میں آیا ہے فقیر [۱۱]

اس براہ راست تعلق کے باعث جب اسے اپنے اور حسین زمانے کے درمیان روایتوں کے انبار دکھائی دیتے ہیں تو اس کے باطن میں ایک بار پھر راست تعلق کی خواہش انگڑائی لیتی ہے اور وہ حقیقت کو سہاروں کے بغیر براہ راست دیکھنے کی اپنی تمنا کا یوں اظہار کرتا ہے

شیشہ جاں میں نہ ہو بال کوئی — دل میں اٹھتا نہ ہو سوال کوئی
اہل منزل نہ راستا پوچھیں — آنکھ سے دیکھ لیں تو کیا پوچھیں
سامنے نور ہو حقیقت کا — ابر حائل نہ ہو روایت کا
نہ دلیلوں کی ٹھوکریں کھائیں — جو سنیں دوڑ کر بجا لائیں [۱۲]

ان اشعار میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ حقیقت کو بے دلیل تسلیم کرنے کی خواہش ہے، غیر ضروری بحث مباحثوں سے دوری ہے، خبر پر نظر کو ترجیح ہے۔ نور کے راست مشاہدے کی تمنا ہے، روایت اور حکایت کی بجائے حسن کو محسوس کرنے پر زور دیا گیا ہے اور منطقیت پر عمل کو ترجیح دی گئی ہے **اَطِیعُو اللہ وَاَطِیعُو الرَّسُول** [۱۳] کا خوب صورت شعری اظہار ہے۔

شاعر کی طبیعت، روایات و مباحثوں سے کس قدر دور ہے اور اسے اپنے باطن کی آنکھ پر کتنا اعتماد ہے اس کا اندازہ اس کی ایک اور نظم سے بھی کیا جاسکتا ہے جو نعتوں کے اس مجموعے میں تو شامل نہیں لیکن ان کے ایک اور مجموعے امکان میں ''تہ دل'' کے نام سے موجود ہے

اے تہ دل
تجھ میں ہے کتنی طہارت
اہل ظاہر جس کی تابانی کے آگے خیرہ چشم
اہل فتویٰ جس کے آئینے کے آگے روسیاہ
جو طہارت چوب منبر کو بنائے چوب دار
اے تہ دل اس طہارت سے بہت ڈرتا ہوں میں..............

اسی نظم میں آگے چل کر یہ بھی کہا ہے کہ

اہل ظاہر کی صدائے آفریں کے باوجود
جس کی آمیزش سے لگتا ہے مجھے
حسن عمل کار گناہ.............. [۱۴]

شاعرانہ کیفیات میں جینا چاہتا ہے لیکن زندگی کی ہماہمی اسے چند در چند بکھیڑوں میں الجھائے رکھتی ہے، وہ چندے ان میں الجھتا ہے لیکن پھر اس کے باطن کا احساس جلد اسے مدینے کی جانب لے جاتا ہے۔

کس محبت سے مدینہ مجھے یاد آتا ہے ابر ساون کے کڑی دھوپ میں چھا جاتا ہے
پھر اسی بارگہ پاک میں لے جاتا ہے[۱۵] کوئی پھر عہد گزشتہ مجھے دکھلاتا ہے

حواشی

۱ خورشید رضوی دیریاب لاہور: القا پبلی کیشنز ۲۰۱۳ء ص ا
۲ القرآن ۶۷:۱۹
۳ شرف الدین ابوعبداللہ محمد بن سعید البوصیری دیوان امام بوصیری مترجمہ محمد ذکاء اللہ سعیدی جہلم: بک کارنر ۲۰۱۳ء، ص ۳۳
۴ القرآن ۱۲:۲۱
۵ خورشید رضوی امکان لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء ص ۲۲
۶ ایضاً ص ۲۴
۷ ایضاً ص ۲۳
۸ ابن الاثیر جامع الاصول فی احادیث الرسول تحقیق: د/عبدالقادر الارناؤوط، مکتبہ دارالبیان ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء، رقم ۶۳۶۹ ج ۸، ص ۵۵۶
۹ خورشید رضوی نسبتیں ترتیب ارسلان احمد ارسل انٹرنیشنل نعت مرکز ۲۰۱۵ء ص ۷۷
۱۰ ایضاً ص ۶۸
۱۱ ایضاً ص ۳۹
۱۲ ایضاً ص ۵۷
۱۳ القرآن ۴:۵۹ اور ۶۴:۱۲
۱۴ خورشید رضوی امکان ص ۴۴
۱۵ نسبتیں ص ۴۸

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

ستیہ پال آنند کی نعتیہ شاعری کا اسلوبیاتی جائزہ

ABSTRACT: An analysis of poetry of Satiya Pal Annand has been carried out in this article to show craftsmanship of poet in rendering devotional poetry. Stylistics study shows that figurative expression, stylistic structure, Etymological and Syntax elements have been knitted with artistic skill in the poetry for paying tribute to Holy Prophet Muhammad (S.A.W) by the poet. Shades of Constructional Parallelism, Sound Symbolism and Inversion, have also been traced, in the poems under stylistics study. Devotional poetry done by the Satiya Pal Annand reflects sensibility of poet to avoid traditional words and semantics in the verses so composed.

اسلوبیاتی مطالعہ کرتے ہوئے شاعری میں اسلوب و انداز، زبان و بیان اور لسانی شعور کو سامنے رکھ کر الفاظ و تراکیب، اور ان کی ترتیب و ترکیب کا معائنہ اور مطالعہ ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

نعت میں الفاظ و تراکیب اور تلمیحات کا درست استعمال اپنی جگہ نہایت اہم اور نازک کام ہے جس کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ دوسری اصناف میں جہاں علم عروض، علم لغت اور علم زبان کی پوری صداقت کا ہونا ضروری ہے۔ وہاں اردو نعت میں ان علوم سے بہرہ مندی اور الفاظ و معنی کی تہ داری سے ہم راز ہونے کا شرف حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح قواعد، املا اور تلفظ کی درستی بھی نعت رسول مقبول کے ضمن میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

اسلوبیاتی مطالعہ میں بنیادی مطالعہ زبان کا کیا جاتا ہے۔ زبان میں صرفی ونحوی مطالعات کے ساتھ ساتھ صوتیاتی حوالے سے بھی لفظ و آہنگ کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

صوتی تجزیہ

صوتی رمزیت (sound symbolism)

تجنیس صوتی (Alliteration)

قافیہ بندی

نحوی تجزیہ	(Syntax Analysis)
عکس ترتیب یا تقلیب	(Inversion)
ساختی متوازیت	(Constructional parallelism)
تکرار	(Repetion)
شماریت	(Enumeration)
تضاد	(Antithesis)
معنیاتی تجزیہ	(Semantic Analysis)
لسانی انحراف	
بدیعی تجزیہ	(Figurative Analysis)
تشبیہ	
تقابل	

ہم جہاں لفظ کے حوالے سے تضادات، مترادفات، استعارات، تشبیہات، تلمیحات، قافیہ وردیف کا مطالعہ کرتے ہیں وہاں ہم جملوں کی ساخت، مصرعوں کی بناوٹ، لفظوں کی ترتیب وتکرار کے مطالعہ وتجزیہ کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ جملوں میں لسانی انحراف کی صورتوں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ الفاظ اور مختلف لفظی تصویروں کو تقابل ومماثل لسانی تکنیکوں سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ستیہ پال آنند کا نام اردو نظم میں اہمیت کا حامل ہے۔ وہ کئی دہائیوں سے اردو نظم لکھ رہے ہیں اور اس حوالے سے ان کے ہاں موضوعات کا تنوع بھی پایا جاتا ہے۔ چونکہ وہ ایک دنیا دیکھ چکے ہیں اور زبان وبیان کے حوالے سے اردو میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی آگاہ ہیں، جس نے ان کی نظم کو اردو نظم کے معاصر منظر نامے میں شامل کیا ہے۔ انھوں نے نظم میں جہاں دیگر موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہاں انھوں نے نعت بھی لکھی ہے۔ نعت رسول مقبول ﷺ سے لگتا ہے کہ ان کو حضورِ اکرم ﷺ کی ذات اقدس سے ایک ایسا لگاؤ ہے جو ان کی شاعری میں الفاظ کے در وبام سے جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ان کی نعتیہ نظم ''پیغام رساں'' کا عنوان دراصل ایک استعارہ ہے اور استعارے سے بڑھ کر علامت ہے پیغمبری اور رسالت کی، رشد وہدایت کی۔ اس نظم کے ابتدائی مصرعوں کے اسلوبیاتی ڈھانچے پر نظر ڈالیے کہ کس طرح صرفی ونحوی اور لسانی مہارتوں سے کام لیا گیا ہے۔

وہ اکیلے تھے

حبیبِ کبریا انوارِ کل۔ شاہِ امم، حضرت محمد ﷺ

رات تھی اور ان کا بستر
ایک بے حد کھردرا سا بوریا تھا
فرش ناہموار تھا غار حرا کا
غار تیرہ تھا مگر روئے مبارک روشنی کا قمقمہ تھا
بند تھیں آنکھیں، مگر گہرائی میں اُترے ہوئے وہ سن رہے تھے
گھنٹیوں کی جانی پہچانی سی اک آواز... جو لمحہ بہ لمحہ
پاس آتی جا رہی تھی
روشنی کے نرم گالے
برف سے اجلے گرے روئے مبارک
مطلع نورِ ہدیٰ پر

حبیبِ کبریا، روئے مبارک، مطلع نورِ ہدیٰ جیسی تراکیب استعمال کی گئی ہیں۔ روئے مبارک کو روشنی کے قمقمے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ایک بے حد کھردرا سا بوریا، میں شماریت کی لسانی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔ اس میں لفظیات کے حوالے سے بھی جدت سے کام لیا گیا ہے۔ جس نے ان کے اسلوب کو مرتب کیا ہے۔ اس میں صوتیات کے حوالے سے سننا اور گھنٹیوں کی جانی پہچانی آواز کی نسبت موجود ہے۔ کھردرا سا بوریا اور اس سے اگلے مصرعے میں فرش ناہموار میں ساختی متوازیت (Constructional Parallelism) پائی جاتی ہے۔ اس سے اگلے مصرعے میں غار تیرہ اور روئے مبارک روشنی کا قمقمہ تھا، میں صنعت تضاد سے کام لیا گیا ہے۔

گھنٹیوں کی آواز ایک مسلسل اور ایک ہی ردم کے ساتھ بلند ہونے والی آواز نہیں ہوتی بلکہ اس میں گھنٹیاں ہلنے کی وجہ سے آواز میں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں شاعر نے اسی اتار چڑھاؤ کی مدد سے حسیاتی طور پر قاری کو ایک گنگناتے ہوئے اسلوب سے روشناس کرایا ہے۔

اسی طرح روئے مبارک اور مطلع نورِ ہدیٰ میں ساختی متوازیت (Constructional Parallelism) پائی جاتی ہے۔ گھنٹیوں، آواز میں ساختی متوازیت اور اسی طرح جانی پہچانی میں ہم قافیہ بندی سے صوتی تکرار کا کام لیا گیا ہے۔

ان مصرعوں میں موجود: وہ اکیلے تھے، انوارِ کل، ایک بے حد کھردرا سا بوریا، گھنٹیوں کی جانی پہچانی سی اک آواز میں لسانی اصطلاح شماریت سے بھی کام لیا گیا ہے۔

''پیغام رساں'' کے آخری مصرعے ملاحظہ کیجیے:

اور شہنشاہِ امم تو خود سراپا روشنی تھے
نا ملائم کالی کملی، بوریے کی نور بافی
اور ان کی بیخ و بن میں
نور عالم تاب کی کرنیں یکا یک یوں سمائیں
غار کے منہ سے ہویدا
روشنی ہی روشنی چاروں طرف پھیلی جہاں (۱)

ان کے مصرعوں میں قافیوں کا اہتمام عمدہ طریقے سے ملحوظ خاطر رکھا گیا۔ جیسا کہ ہم قافیہ الفاظ کالی، کملی، بافی، جیسے ہم قافیہ الفاظ۔ اس کے علاوہ نا ملائم اور بوریے میں معنوی حوالے سے ساختی متوازیت (Constructional parallelism) پائی جاتی ہے۔ بقول قیصر نجفی:

''انتخاب و استعمال الفاظ میں حزم و احتیاط کے ساتھ ساتھ جس شاعرانہ ہنروری سے کام لیا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔'' (۲)

اس نظم میں انھوں نے جو تراکیب تراشی ہیں ان میں نیا پن پایا جاتا ہے۔ شہنشاہِ امم، سراپا روشنی، نا ملائم کالی کملی، بوریے کی نور بافی، نور عالم تاب کی کرنیں، بیخ و بن جیسی تراکیب کا استعمال خوب ہے اور اردو نظم، نعت میں عمدہ لسانی حوالہ ہے۔

روشنی ہی روشنی چاروں طرف پھیلی جہاں
اور جب آواز پاس آئی تو پوچھا
''آ فرشتے!
بول کیا پیغام لایا ہے میرے مالک سے امشب؟''

ان آخری مصرعوں میں ایک لسانی عمل وقوع پذیر ہوا ہے کہ یہاں چاروں طرف پھیلتی ہوئی روشنی صدا میں بدلی ہے۔ اور صدا سوال بن کر ایک مقام پر آ کے کھڑی ہوگئی ہے۔ آخری مصرعے میں اس عمل انگیزی کو جو کہ نظم کے آغاز سے شروع ہوئی تھی، استفہامیہ موڑ پہ لا کر ختم کر دیا ہے۔ یہاں نظم اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے، اور اسے نیچے لے جانے کے بجائے شاعر نے اسے اسی لسانی موڑ پر چھوڑنا مناسب سمجھا۔

ان کی شاعری میں الفاظ کو بڑے سلیقے کے ساتھ برتا گیا ہے اور لفظیات کے معاملے میں یہ بات نظر آتی ہے کہ لفظی انتشار موجود نہیں ہے۔ بقول قیصر نجفی:

''ان کے ہاں نہ تو کہیں فکری بدنظمی نظر آتی ہے اور نہ ہی لفظی انتشار... بلکہ ہر پہلو ایک سلیقے کا احساس ہوتا ہے۔۔۔ وہ نظم نگاری کے تمام تر رموز واسرار

سے بخوبی واقف ہیں۔" (۳)

ان مصرعوں میں روشنی کی تکرار سے صوتی رمزیت (Sound Symbolism) پیدا ہو رہی ہے۔ آخری مصرعہ ایسی ساخت کا ترتیب دیا گیا ہے جو کہ قواعد کی رو سے سیدھا جملہ نہیں ہے اس میں عکسِ ترتیب یا تقلیب (Inversion) کا عمل پایا جاتا ہے، وزن پیدا کرنے یا شدت کو بڑھانے کے لیے جملے یا مصرعے میں لفظوں کی ترتیب کو آگے پیچھے کر دینا۔ یہ ساخت سیدھی اور سادہ ہونے کے بجائے دلچسپ نحوی ساخت میں بدل جاتی ہے۔ جس سے لفظوں کو توڑ کر الگ الگ ترتیب سے پڑھنا پڑتا ہے۔

بول کیا پیغام لایا ہے میرے مالک سے امشب؟

یہ مصرعہ قواعد کے حوالے سے سادہ نحوی ساخت پر مشتمل ہوتا تو یوں بھی ہو سکتا تھا

بول! میرے مالک سے امشب کیا پیغام لایا ہے؟

مگر پھر یہ وزن اور بحر میں نہ رہتا۔ شاعری میں اکثر اوقات عکسِ ترتیب یا تقلیب (Inversion) مصرعے کے وزن کی وجہ سے بھی عمل میں آتی ہے۔

ان کی ایک اور نعت ملاحظہ کیجیے، جو کہ انھوں نے جدہ میں لکھی تھی جب کہ وہ ریاض جانے والی پرواز کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نعت میں جہاں شہِ امم کے دربار میں حاضری کو پیش کیا گیا ہے وہاں اس نارسائی کے کرب کو بھی نشان زد کیا گیا ہے جو کہ دور سے دید کرنے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔

حضورِ اکرم
فقیر اک پائے لنگ لے کر
سعادتِ حاضری کی خاطر
ہزاروں کوسوں سے آپؐ کے در پر آ گیا ہے

اس میں تخاطب کا انداز ہے، لفظیات کے حوالے سے فقیر، پائے لنگ، ہزاروں کوس، در، آنا یہ سب تلازمے ایک مخصوص کیفیت کو پیدا کرتے ہیں۔

نبیؐ برحق
یہ حاضری گرچہ نامکمل ہے
پھر بھی اسے قبول کیجیے

ان مصرعوں کے آغاز میں نبی برحق کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ یہاں حاضری، نامکمل اور قبول کی ایک لفظی مثلث وجود میں آ رہی ہے۔ اس پوری نظم میں حضورِ اکرم، نبی برحق، حضور، آقائے محترم، نبی

اکرم، سایۂ رحمت، شہِ مرسلیں ساختی متوازیت (Constructional Parallelism) کی مثال ہیں۔ ان میں معنوی سطح پر مترادف لسانی اور لفظی امیج ابھرتا ہے۔ جو کہ اس نظم کی لفظیات کی عکاسی کرتا ہے۔

حضورؐ، آقائے محترم
یہ فقیر تو اتنا جانتا ہے
کہ قبلۂ دید صرف اک فاصلے سے اس کو روا ہے
اس کے نصیب میں مصطفیٰ کے در کی تجلیاں دور سے لکھی ہیں
نبی اکرمؐ
وہ سایۂ رحمتِ پیمبر
جو صف بہ صف نمازیوں کے سروں پہ ہے

در اور دور سے، سایہ اور سر، صف بہ صف جیسی تراکیب میں ستیہ پال آنند نے صوتی تکرار سے کام لیا ہے۔

اس کا ایک پرتو
ذرا سی بخشش
ذرا سا فیضانِ عفو و رحمت
اسے بھی مل جائے
جو شہِ مرسلیں
دستِ دعا اٹھائے کھڑا ہے اک فاصلے پہ، لیکن
نمازیوں کی صفوں میں شامل نہیں ہے۔ (۴)

ان مصرعوں میں سایۂ رحمت کا پرتو، ذرا سی بخشش، ذرا سا فیضان، عفو و درگذر معنیات کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں اور اس نعت میں شاعر کا حاصل کلام ہیں۔ آخری دو مصرعوں میں دست دعا اور نماز متوازی لفظی و معنوی استعارے لائے گئے ہیں جن کی مدد سے شاعر نے جسمانی طور پر صف میں نہ ہونے کے باوجود محسوساتی طور پر حاضری کا اقرار کرتے ہوئے دستِ دعا کو نماز کے عمل کے متوازی پیش کیا ہے۔

ایک اور نعت ''استغاثہ'' کے کچھ مصرعے ملاحظہ کیجئے، اس نعت میں ستہ پال آنند نے حضور اکرم، نبی محترم کے لیے نعت میں لفظ ''تو'' کے استعمال کو مناسب قرار نہیں دیا۔

لفظ ہی سب کچھ ہیں، متن میں لفظیات ہی معنیات کی تشکیل کا سبب بنتی ہے، اس لیے لفظوں کے استعمال میں احتیاط لازم ہے۔

اے سرورِ کونین...
میں خاکِ کفِ پا بھی نہیں آپ کی آقا
میں کیا ہوں، فقط اک کفِ خاشاک، خس و خاک
بے وقعت و ناکارہ و بے دانش و نافہم
اور آپ، حضور، اکمل و سرمد، مرے مالک
میں آپ کو ''تو'' کہہ کے پکاروں؟ مری جرأت؟
میں ''تو'' کہوں اس صلِ علیٰ، شمس الضحیٰ کو
جس کے لیے حسان کا لہجہ بھی کمتر؟
اس طرزِ تخاطب پہ زباں میری نہ کٹ جائے؟
اے صدر العلیٰ شہ....... (۵)

ان مصرعوں میں شاعر نے تقابل سے کام لیتے ہوئے سرورِ کونین کو دو جہاں کا مالک، اکمل و سرمد مانتے ہوئے خود کو کفِ خاشاک، خس و خاک، بے وقعت و ناکارہ و بے دانش و نافہم، خاکِ کفِ پا سے بھی کم تر قرار دیا ہے، یوں جو لفظیات تشکیل پاتی ہے اس مین کچھ لفظ اوپر کی طرف بڑھتے ہوئے اور کچھ نیچے کی جانب گرتے ہوئے۔

ایک طرف صلِ علیٰ، شمس الضحیٰ اور دوسری طرف ان کے لیے لفظ ''تو'' کا ستعمال،
اس طرزِ تخاطب پہ زباں میری نہ کٹ جائے؟

یہاں طرز، تخاطب اور زبان سے مل کر ایک لسانی یونٹ بنتا ہے۔ الفاظ اور معانی کے رشتے کے حوالے سے ستیہ پال آنند لکھتے ہیں:

> ''سٹینلے فِش پوچھتا ہے ''الفاظ جو کہ حروف کا مجموعہ ہیں، کیا کرتے ہیں؟'' اور پھر خود ہی جواب تجویز دیتا ہے کہ ''الفاظ معانی کو متشکل کرتے ہیں۔'' ایک ماہر لسانیات کا یہ فرمان یقیناً قابلِ قبول ہوگا کہ ''لفظ'' اور اس لفظ کا کسی بھی جملے میں پیوند ایک خاص کارکردگی کا جنم داتا ہے۔ لفظ اپنی آماجگاہ، یعنی جملے کے سیاق و سباق میں کیا کرتا ہے، اور اگر اس کی شکل و صورت بدل دی جائے یا زمانی اعتبار سے اس کا چلن مختلف ہو، تو کس طرح غلط فہمی کا احتمال ہے، اس

بات کا جواب بھی تخلیق کے خلق ہونے کے عمل میں ہے۔"(۶)

ستیہ پال آنند کی نعتیہ شاعری میں جو زبان، لب ولہجہ اور اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے، وہ ایک نئے انداز کی لفظیات کو ترتیب دیتا محسوس ہوتا ہے، جس سے ستیہ پال آنند کا نعتیہ اسلوب کھل کر سامنے آتا ہے جو کہ روایتی اسلوب سے مختلف ہے کیونکہ انھوں نے روایتی لفظ ومعانی کے نظام کی تشکیل سے گریز کیا ہے۔ ان کے الفاظ کی ترتیب وتشکیل معنیات کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قیصر نجفی، پروفیسر: ستیہ پال کی ایک نعتیہ نظم، مشمولہ نعت رنگ، کراچی، شمارہ ۲۲، ستمبر ۲۰۱۱، ص ۳۶۳، ۳۶۴

۲۔ ایضاً، ص ۳۶۳

۳۔ ایضاً، ص ۳۶۹

۴۔ انوار احمد زئی: پاکستان میں اردو نعت کا ادبی سفر... ایک مطالعہ، مشمولہ نعت رنگ، کراچی، شمارہ ۲۵، اگست ۲۰۱۵، ص ۷۶۹

۵۔ نعت رنگ کراچی، شمارہ ۲۵، اگست ۲۰۱۵، ص ۸۲۴

۶۔ اردو کا ایک البیلا ترک شاعر، مشمولہ ترک غمزہ زن، مرتبہ حمیدہ شاہین، لاہور، سانجھ، ۲۰۱۵، ص ۳۱

☆☆☆

شاہ اجمل فاروق ندوی، نئی دہلی

نعت میں ہندستانیت کا علم بردار : عنبر بہرائچی

ABSTRACT: Poetic skill of Amber Bahraichi has been evaluated in the light of his pen works for devotional expressions i.e. "LAM YAATE NAZIRUKA FI NAZARIN'' and "ROOP ANOOP''. The poetic work i.e. "LAM YAATE NAZIRUKA FI NAZARIN'', has been applauded by critics as an Epic. It is comprised of one thousand twenty four couplets under 13 topics, relating to sacred history of Islam. The second poetic work of Bahraichi i.e. 'Roop Anoop' comprising of Naatia poetry, Naatia lyrics and poems, contains poetic beauty of Indian linguistic and literary taste. This article is an introduction of poetic genius of Ambar Bahraichi.

عالمی ادب میں ہندستانیات کا اپنا مقام ہے۔ امیر خسرو دہلوی (۱۲۵۳-۱۳۲۵) کی ''خمسۂ خسروؔ'' اور ''اعجاز خسروی''، ملک محمد جائسی (۱۴۷۷-۱۵۴۲) کی ''پدماوت'' اور تلسی داس (۱۵۳۲-۱۶۲۳) کی ''رام چرتر مانس'' کی ادبی حیثیت کسے تسلیم نہیں؟ کبیر اور رحیم کے دوہوں کی اثر انگیزی اور ان جیسے متعدد اصحابِ ادب و حکمت نے اپنے ادبی کارناموں سے دنیا میں ادب و اخلاق کو بھی عام کیا اور عالمی پیمانے پر ہندستانیات کو ایک مستحکم اور مفید ادب کی حیثیت سے متعارف کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

ہندستانیات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل ہونے والا ادب گاؤں کے کسان اور چرواہے سے لے کر سربراہانِ مملکت تک کو متاثر کرتا ہے۔ اس بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ادب انسانی ادب ہے۔ انسانیت کی بات کرتا ہے اور آدمیت کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ اس کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، وہ چیزیں ہندستانی ادب نے پورے طور پر اختیار کی ہیں۔ یعنی بھائی چارہ، سادگی اور پرکاری، رواداری، ہم دردی، غم گساری اور ہر انسان سے محبت و مروت۔ عہد جدید میں ہندستان کے جن لوگوں نے ان صفات کو پورے طور پر اختیار کیا، وہ بھی ہندستانیات کے سیکڑوں سال پرانے ادبی قافلے میں شامل ہوگئے۔ اس ذیل میں میر و غالب، ٹیگور اور پریم چند کے نام

خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں۔ اول الذکر تینوں شاعروں کے ہاں وہ سادگی و پرکاری تو نہیں جو جائسی اور کبیر کے ہاں تھی۔ البتہ بات انسانیت ہی کی ہے۔ شاید سادگی اور عام فہمی کی کمی نے ہی ان تینوں شعراء کو اس عام مقبولیت تک نہیں پہنچنے دیا، جہاں تک خسرو، جائسی، تلسی داس اور کبیر و رحیم پہنچے۔ جن کا کلام کھیتوں میں ہل چلاتا ہوا کسان اور جنگل بیابان میں بکریاں چراتا چرواہا بھی گنگناتا تھا اور بادشاہِ وقت بھی اپنے دربار میں سن کر عش عش کرتا تھا۔

نعت ایک تو عام طور پر مسلمانوں نے کہی۔ دوسرے ہندستان میں زیادہ تر اردو میں کہی گئی۔ تیسرے مسلمانوں میں بھی ''روشن خیال'' ادباء نے اسے اونچی سطح پر مقبول اور عام نہ ہونے دینے کی پوری کوشش کی۔ ایسے میں نعت کو ہندستانیات سے جوڑ دینا اور قدیم ہندستانی ادب کے پیرائے میں نعت کہنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ لیکن نعت نے یہ معجزہ بھی دکھایا۔ کج فکروں کی ہزار بے اعتنائیوں کے باوجود گلی گلی اور گھر گھر میں پڑھی پڑھائی اور سنی سنائی جانے بھی لگی اور ہندستانی ادب کا قدیم لبادہ اوڑھ کر جدید دور میں سامنے بھی آئی۔ ہندو شعراء یا ہندی میں شاعری کرنے والے شعراء کو تو چھوڑ دیجیے، اردو زبان میں شاعری کرنے والے ایسے متعدد شعراء ہیں، جنھوں نے اردو نعتیہ شاعری کی اور ان ہیئتوں میں کی، جو ہندستانی ادب کی شناخت ہیں۔ ایسے شعراء میں ایک بہت اہم نام جناب محمد ادریس عنبر بہرائچی کا بھی ہے۔

عنبر بہرائچی (ولادت: ۵؍جولائی ۱۹۴۹) ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کے ایک بڑے خادم کی حیثیت سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ نثر و شاعری میں ان کی بارہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں دو کتابیں نعت کی ہیں۔ پہلی کتاب ''لم یات نظیرک فی نظر'' اور دوسری ''روپ انوپ''۔ لم یأت نظیرک ایک شعری مجموعہ نہیں، ایک بڑا ادبی کام ہے۔ کام نہیں کارنامہ۔ اسی لیے اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلا ۱۹۹۶ میں اور دوسرا ۲۰۰۱ میں۔ یہ ایک نظم مسلسل ہے، جو ۱۳؍عناوین اور ایک ہزار چوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں شاعر نے حراء سے لے کر فتح مکہ تک کے کچھ اہم واقعات کو نظم کیا ہے۔ سیرت مطہرہ میں سے شاعر نے اپنے ذوق کے مطابق اُن واقعات کو منتخب کیا، جن کو بیان کرنے سے تقریباً پوری سیرت سامنے آجاتی ہے۔ یوں کہہ لیں کہ اس نے سیرت نبوی کا نچوڑ اور عطر ایک نظم مسلسل کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے ۱۷۰ صفحات پر پھیلے ہوئے اس رزمیے کو جن عناوین میں تقسیم کیا ہے، وہ یہ ہیں: حراء، مطلع انوار، کوہ صفا، عام الحزن، اسراء، ہجرت، مواخات، یوم الفرقان، قران السعدین، احد، افک مبین، شہیدان وفا اور فتح مکہ۔ اس کے متعلق پروفیسر عتیق اللہ کی یہ رائے سو فی صد درست ہے:

''اتنے بڑے کینوس پر لکھی ہوئی نظم میں ارتکاز اور جامعیت کو قائم رکھنا نیز یہ

کہ ابتدا تا آخر ایک ہی فضا اور تاثیر کو برقرار رکھنا اتنا آسان نہ تھا۔ یہ کام اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، جب کہ نظم پابند ہیئت میں لکھی گئی ہو۔"

عنبر بہرائچی کے اس بے مثال رزمیے کی دو تین مثالیں دیکھیے۔ غار حرا میں اللہ کے رسول ﷺ کو نبوت ملنے اور اس وقت عرب کے حالات کو انھوں نے دس صفحات میں بیان کیا ہے۔ عرب کے حالات اور اس وقت کے انسانی مزاج کو بتا کر شاعر جب حرا تک پہنچتا ہے تو شعری گھن گرج بھی اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

وہ دیکھیے عرب میں ہیں صفات نور جلوہ گر
حرا کی خلوتوں میں عین ذات کی تجلیاں
تجلیاں کہ جن کی چھاؤں میں سکون کی رتیں
تجلیاں کہ جن کے دم سے رحمتوں کی بدلیاں
تجلیاں کہ ہیں جو باعثِ وجودِ این و آں
کہ جن سے چرخ اور زمین کی یہ خوش خرامیاں
تجلیاں اماوسوں کے طائفوں پہ چھا گئیں
ہر ایک سو گہر نواز چاندنی کی کھیتیاں
تجلیاں کہ جن کے دم سے نکہتوں کی بارشیں
الم کے پیکروں نے اوڑھ لی ہیں شادمانیاں
تجلیاں کہ وجہ کن، کرم شعار، لطف گر
انھیں کے قرب میں ہے دَم بہ دم عروجِ خاکیاں
تجلیاں کہ جن پہ خالقِ جہاں بھی ہے فدا
تجلیاں کہ جن سے عشق خلقتوں کی پونجیاں
تجلیاں کثافتوں کے دشت پر برس پڑیں
فرازِ ریگ زار پر ہوئی ہیں لالہ کاریاں
تجلیاں کہ جو ابوالبشر کے کام آگئیں
خلیل کے بدن پہ کر گئیں گلاب پاشیاں
تجلیاں جلال موسوی، جمال یوسفی
دعائے یونسی، مسیح کی خلوص کاریاں
تجلیاں کہ پیکرِ بشر میں نور بیز ہیں
کرم سے جن کے بنجروں پہ بھی بہار سازیاں
تجلیاں نگاہ ساز، دل فروز، جاں فزا
انیسِ بے کساں، پناہِ ازدحام عاصیاں

ان اشعار میں ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر پر ایک خاص کیفیت طاری ہے۔ وہ عرب کے ریگ زار میں ایک خوب صورت نخلستان دیکھ رہا ہے۔ گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں مینارۂ نور کا مشاہدہ کر رہا ہے اور بداعمالیوں وغلط کاریوں کی بدبو میں فردوسِ اعلیٰ کی خوش بوئیں محسوس کر رہا ہے۔ "تجلیاں" کی تکرار شاعر نے اپنا تاثر بھی پیش کیا ہے اور دنیا میں رسالت محمدی کے مقام پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لفظ تجلی کا استعمال بھی بڑا پر کیف ہے۔ اس میں رب ذوالجلال کی تجلیِ بے مثال بھی شامل ہے اور روح الامین حضرت جبرئیل علیہ السلام کے انوار بھی۔ اس میں آخری رسول کی بعثت پر عرش سے لے کر فرش تک اور زمین و سمندر کی گہرائیوں تک، تمام مخلوقات کی خوشی و مسرت کا عنصر بھی ہے اور کائنات کے مقدس ترین کلام کی آمد کا جلوۂ پر جلال بھی شامل ہے۔ تجلی باری تعالیٰ، نور قرآن مبین اور حضرت روحِ الامین کے ذریعے جو علوم و معارف ذات رسالت مآب ﷺ کے سینۂ مبارکہ میں القاء کیے گئے اور آپ کا عرش سے جو تعلق استوار ہوا، وہ نور بھی اس

لفظ کے اندر پوشیدہ ہے۔ یعنی لفظ تجلی کو آپ ان حدود میں سے جدھر چاہیں لے جائیں۔

پھر اس تجلی کے اثرات میں بھی بڑا تنوع ہے۔ شاعر نے تو بس کہہ دیا کہ حراء کی تجلی سے دنیا منور ہوئی۔ قاری اپنی وسعتِ ذہنی کے مطابق تجلی کی تشریح مذکورہ بالا عناصر میں سے جس شکل میں بھی چاہے کر لے۔ تجلی کو نورِ الٰہی سمجھے، علوم قرآنی کی روشنی سمجھے یا سرکارِ دو عالم ﷺ کے پیغام اور کردار کو مراد لے۔ یہ شاعر کا کمال ہے کہ اس نے حراء کے لیے ایسا گہرا اور وسیع المعنیٰ لفظ اختیار کیا ہے۔ اس کی جگہ دوسرے الفاظ بھی ہو سکتے تھے۔ مثلاً: روشنی، نور، خوش بو، چراغ، آفتاب اور ماہتاب۔ لیکن پھر وہ بات کہاں آتی جو تجلی سے آئی؟

غزوۂ احد کو عنبر بہرائچی نے ۱۳ ر صفحات میں بیان کیا ہے۔ احد کا واقعہ سیرت نبوی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس لیے شاعر نے بھی اس واقعے کو پوری اہمیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے، جب شاعر شہدائے اُحد کے ذکر تک پہنچتا ہے تو اس کا انداز دیکھیے:

سپردِ خاک ہر شہید کو کیا بہ چشم تر
مگر خوشی ہے، وہ رہِ خدا میں جان دے گئے
شہید مرتبے میں انبیاء سے ہے قریب تر
شہید ہے بلا کشانِ راستی کا راہ بر
شہید، جاں فروشیوں کی مملکت کا تاج ور
بغیر غسل اور کفن درونِ قبر عطر گر
شہید کے لہو سے رنگِ قصرِ دین پُر اثر
شہید کے لہو پہ ہے فدا بہار آبِ زر
شہید کی شجاعتیں، ارم بہ دوش، حق نگر
شہید کی دلیریاں برائے ربِّ بحر و بر
شہید قلزمِ حیاتِ جاوداں کا ہے گہر
شہید، باغِ جذبۂ جہاد کا حسیں ثمر

ان اشعار میں شاعر نے شہید کی اہمیت کے جتنے گوشے بیان کیے ہیں، وہ لائق توجہ ہیں۔ پھر وہی بات آجاتی ہے جو پروفیسر عتیق اللہ نے لکھی تھی کہ اتنی طویل نظم میں ارتکاز و جامعیت کے ساتھ ایک ہی فضا کو برقرار رکھنا سخت مشکل تھا۔ یہ اشعار گواہی دیتے ہیں کہ عنبر بہرائچی اس کٹھن رہ گزر سے کام یابی کے ساتھ گزرے ہیں۔

''لم یات نظیرک فی نظر'' بلاشبہ عنبر بہرائچی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن ان کا فکری و شعری تنوع ان کے دوسرے مجموعے ''روپ انوپ'' میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ عنبر بہرائچی کی نعتیہ شاعری کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے موجودہ دور میں نعت اور ہندستانیات کے درمیان ایک مضبوط ربط پیدا کر دیا ہے۔ اگرچہ اردو کے دورِ جدید میں دوسرے شعراء کے ہاں بھی یہ رویہ پایا جاتا ہے۔ شائق حیدرآبادی، شمس الدین امیر حمزہ، ممتاز جہاں گنگوہی اور عبدالقدیر صدیقی حسرت وغیرہ نے ہندی آمیز نعتیں، پوربی آمیز نعتیں، گیت اور ٹھمریاں کثرت سے کہی ہیں۔ لیکن موجودہ ترقی یافتہ اور ''قدیم بے زار دور'' میں عنبر بہرائچی نے اِس روش کو، جس خوبی اور شان کے ساتھ زندہ کیا ہے، وہ اُن ہی کا حصہ ہے۔ ''روپ انوپ'' سے ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس میں ۳۸ نعتیں

ہیں۔ جن میں آٹھ نعتیہ گیت، چار نعتیہ گیت (اودھی)، ایک نعتیہ گیت (اودھی بھوج پوری)، ایک نعتیہ گیت اودھی فارسی، کچھ آزاد اور کچھ پابند نظمیں اور کچھ قطعات اور دوہے شامل ہیں۔ سب کی مثالیں پیش کرنا تو مشکل ہے، البتہ دو تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے نعتیہ گیت (اودھی بھوج پوری) کا ایک بند دیکھیے:

مدنی کنور پیارے متوؔ ہمار
جھولیا ہمری بھرے
بگیا کے پھلوا گئے ہیں مرجھائے
کالی کویلیا، گئی ہے برجھائے
چندوا کی جوت گئی ہے کمہلائے
شرجو کے بھیرا گوا ہے بلبائے
کون چنتا ہرے
مدنی کنور پیارے متوؔ ہمار

ایک نعتیہ گیت کے دو بند ملاحظہ ہوں:

دھیرے دھیرے بدلنے لگا ہے چمن
نغمۂ دل میں عشق شہہ انس وجاں جذبۂ عشق میں ان کہی داستاں
داستاں میں چھپا کوہ آتش فشاں کتنے پیارے چرن، کتنی پیاری لگن
دھیرے دھیرے بدلنے لگا ہے چمن
جتنی دوری لبوں کی تکلم سے ہے جتنی دوری غزل کی ترنم سے ہے
جتنی دوری ہنسی کی تبسم سے ہے بس یوں ہی ہے خداؐ سے نبی کا ملن
دھیرے دھیرے بدلنے لگا ہے چمن

ایک اودھی نعتیہ گیت میں معراج کے واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

نوری نوشہ، نوری رہیاں، نوری براتی آئے
نور سنوارے نوری اٹریا نور ہی نور سہائے
چومیں جبریل نوری چرن واں، نبی آج دولہا بنے
نبی آج دولہا بنے
ہاتھ جورِ جبریل یہ بولے ہیں سدرہ سے آگے
اب تم جاؤ ہمرے آقا، آگے ہم جل جے بے

تمہری کرپا کے تاہی ٹھکنوا، نبی آج دولہا بنے ہیں
نبی آج دولہا بنے

ان چند مثالوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ عنبر بہرائچی نے نعت کو ان ہیئتوں میں برتا ہے، جن ہیئتوں کو کج فہموں نے ہندو مذہب کے مذہبی نغموں کے لیے خاص کر دیا یا کم از کم یہ تصور تو سب کے دماغ میں نہ جانے کہاں سے پیدا ہو گیا کہ گیت ایک خالص عوامی صنف ہے اور نعت مسجد و خانقاہ کے لیے خاص ہے۔ عنبر بہرائچی نے اس غلط تصور کی نہ صرف یہ کہ فکری طور پر نفی کی بلکہ عملی طور پر بھی اسے بالکل باطل قرار دے دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ رحمۃ للمسلمین نہیں، رحمۃ للعالمین ہیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا مصرع ''صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں'' تو سب جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں لیکن عملی طور پر اسے برتنے کی ہمت کسی میں نہیں۔ عنبر بہرائچی نے اکیسویں صدی میں نعت کو مدارس و خانقاہ اور عالمی کانفرنسوں اور جلسوں کے اسٹیج سے اٹھا کر کھیت کھلیان اور جنگل بیابان تک پہنچا دیا ہے۔ انھوں نے ان نعتیہ گیتوں کے ذریعے عام سے عام انسان کو نعت گنگنانے اور دل میں محبت رسول کی چنگاری بھڑکانے کا موقع فراہم کیا ہے۔ چلتے چلتے ان کے کچھ نعتیہ دوہے بھی دیکھتے چلیے:

طائف میں سرکار پر اینٹوں کی بوچھار بدلے میں سب کو ملا پھولوں کا اپہار
جھوم اٹھے ہیں حشر میں ہم جیسے کنگال کملی اوڑھے آگئے عبداللہ کے لال
راہوں میں سرکار کے اُگنے لگے ببول آپ ہنسے، کھلتے گئے قدم قدم پر پھول

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ گیت اور دوہے اصلی ہندستان یعنی گاؤں دیہات تک پہنچ جائیں تو اپنا اثر نہ دکھائیں گے؟ عنبر بہرائچی نے اپنی فن کاری دکھانے کے لیے صرف نئے نئے تجربے نہیں کیے، بل کہ ان کے اندر اپنی دلی کیفیات کو بھی اتار دیا ہے۔ ان کو گنگنانے والا کوئی بڑا سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہندستان کے عظیم ماہر تعلیم اور شاعر و ادیب سید حامد نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''آپ کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے، جو آپ کی کتاب ''لم یات نظیرک فی نظر'' سے مترشح ہو رہی ہے۔ لیکن وہ تو ایک ثانوی شئے ہے، اس عشق رسول کے مقابلے میں، جس کی گواہی آپ کا لفظ لفظ دے رہا ہے۔''

درحقیقت عنبر بہرائچی کا اصل کمال یہی ہے۔ نعت میں ہیئتی تجربے تو بہتوں نے کیے ہیں، لیکن ان کے اندر والہانہ پن بھر دینا اور ہیئت کے فنی تقاضوں کا لحاظ رکھنا عنبر بہرائچی کا کمال ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ عنبر بہرائچی نے بس نعت میں مختلف تجربے ہی کیے۔ ان کے ذخیرۂ نعت میں جو سادہ نعتیں ملتی ہیں، وہ بھی بڑا لطف دیتی ہیں۔ نعتیں آزاد بھی ہیں اور پابند بھی۔ جو بھی ہیں، خوب ہیں۔ ا

ن کی نعتوں میں ایک خاص وصف پایا جاتا ہے۔ اس کو آپ خوبی کہیں یا خامی۔ کمال سے تعبیر کریں یا نقص سے۔ دونوں پہلوؤں کی گنجائش ہے۔ ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق بات کہہ سکتا ہے اور اس کی دلیلیں دے سکتا ہے۔ بہ ہر حال یہ وصف عنبر کی نعتوں میں موجود ہے کہ ان کی عام نعتوں میں بھی ہندی، بھوج پوری اور اودھی الفاظ بہ کثرت ملتے ہیں۔ ہمارا احساس ہے کہ یہ ہندستانی ادب کو بلا تعصب اور بہ کثرت پڑھنے کا نتیجہ ہے۔ ان کی ایک نعت کے تین شعر دیکھے:

رضواں کے خوابوں نے پہنی آج لہکتی دھانی چونر
باغ جناں میں ہُن برسانے آج مرے سرکار گئے ہیں
ایک بشر نے اک لمحے میں پار کیے ہیں سارے عالم
انساں کی توقیر بڑھانے آج مرے سرکار گئے ہیں
سدرہ ہویا کوثر و طوبیٰ ، باغ ارم یا عرش معلیٰ
پگ پگ پر خوش بو لہرانے آج مرے سرکار گئے ہیں

ان اشعار میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ شاعر معراج کا واقعہ بیان کر رہا ہے اور اس کو مختلف انداز سے پیش کر رہا ہے۔ روانی بھی ہے اور چاشنی بھی۔ ساتھ ہی اس ہندستانی قدیم ادب کا لطف بھی، جس کے گہرے مطالعے سے شاعر گزر چکا ہے۔ ہم اس وصف کی اچھائی یا برائی کے حق میں کوئی دلیل پیش نہیں کریں گے۔ کیوں کہ یہ باہوش قاری کے ذوق کا معاملہ ہے۔ وہ شاعر کے اس شعری وصف کو اچھا سمجھے یا برا۔ البتہ آخری شعر کے پہلے مصرعے میں عرش معلیٰ کا تذکرہ نادرست ہے۔ عرش کا ذکر اس نعت کے مطلع کے پہلے مصرعے میں بھی ہے۔ وہاں عنبر نے کہا ہے۔

ع عرش بریں کے بھاگ جگانے آج مرے سرکار گئے ہیں

عرش رب ذوالجلال کے مستوی ہونے کی جگہ ہے۔ وہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کب سے ہے؟ اور کیوں ہے؟ یہ سب باتیں نہ انسان کو معلوم ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ عرش مقامِ خدا ہے۔ خالق سے وابستہ کسی شے کو کوئی مخلوق کیسے سنوار سکتی ہے؟ خالق خالق ہے اور مخلوق مخلوق۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنی تمام تر رفعتوں اور عظمتوں کے باوجود مخلوق ہیں۔ آپ کا ''عرش کے بھاگ جگانا'' یا ''عرش پر خوش بو لہرانا'' غیر معقول بات ہے، جو شاعر کے قلم سے فرط جذبات اور وفور عقیدت میں نکل گئی۔

عنبر بہرائچی کی نعتوں میں ایک اور ایسا وصف ہے، جس پر اچھے یا بُرے دونوں پہلوؤں سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ عنبر بہرائچی بیس بیس اشعار کی نعتیں کہہ جاتے ہیں، لیکن کسی ایک مقام پر بھی اللہ کے رسول ﷺ کا اسم مبارک، صفاتی اسماء یا آپ کے حالات و واقعات صاف صاف بیان نہیں کیے جاتے۔ نعت سمجھ کر پڑھا جائے تو ہر ہر لفظ عجیب لطف دیتا ہے اور غزل سمجھ کر پڑھیں، تو بھی ایک کیفیت

طاری ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایک نعت کے چند شعر دیکھیے:

جھلسا دینے والی گرمی، ریت کے ٹیلے، تند ہوا
دن بھر باطل پر یلغاریں، رات ہوئی تو سجدے ہیں
بوسیدہ کپڑوں میں ہر شب اشک فشاں رہتا ہے کوئی
کچھ نورانی پیکر اس کی پابوسی کر جاتے ہیں

چہرے کی ہیبت میں جانے کتنے سورج ڈوب گئے
چاہے قیصر ہوں یا کسریٰ سہمے سہمے رہتے ہیں

سناٹوں کی بانہوں میں بھی نور بھرے لہجے گونجے
سچے بول، سہانی بانی، بے خود ذرے ذرے ہیں

ان اشعار میں کسی ایک جگہ بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ شاعر نعت کہہ رہا ہے، کیوں کہ یہ انداز نعت کی عام روایت سے ہٹا ہوا ہے۔ آپ اسے صحیح سمجھیں یا غلط، ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ عنبر بہرائچی کا ایک انتہائی پرکشش اور دل فریب انداز ہے۔ یہ انداز نعت کے عام رویے سے ظاہری طور پر تو مختلف ہے، کیفیاتی اعتبار سے ہرگز مختلف نہیں۔ ہر شعر کو پڑھتے ہوئے ہم اُس مقدس معاشرے کے دن رات میں پہنچ جاتے ہیں، جس سے بہتر اور مقدس معاشرہ نہ پہلے کبھی وجود میں آیا اور نہ کبھی آ سکتا ہے۔ ہمیں اس احسانِ عظیم پر عنبر بہرائچی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ انداز نہایت فن کاری چاہتا ہے۔ ہر کس و ناکس اسے اختیار نہیں کر سکتا۔

مختصر یہ کہ عنبر بہرائچی ایک خالص ہندستانی نعت گو ہیں۔ ایسا نعت گو، جو ایک طرف ہندستانیوں کے قدیم ذخیرے کے مذاق و مزاج کو اپنے اندر سمو چکا ہے، تو دوسری طرف محبت رسول کے مقدس سمندر کا غواص بھی ہے۔ ان دونوں چیزوں کو اس نے ایک دوسرے کے ساتھ گھلا ملا کر اس انداز سے برتا ہے کہ دونوں کی ظاہری بے گانگی ختم ہوگئی ہے۔ یہی چیز عنبر بہرائچی کو نعت کے موجودہ منظر نامے پر ممتاز مقام دلاتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد علی اثر، حیدرآباد دکن

نعت گوئی میں راہی فدائی کی فنی بصیرت

ABSTRACT: Dr.Rahi Fidaee, is a prominent Islamic Scholar and Teacher besides a good poet. Artistic insight of composing devotional poetry by Dr. Rahi has been evaluated in the article placed hereunder. Reflections of textual shades of verses of Holy Quran such as Prophet (S.A.W) guides people like shining light, He (S.A.W) teaches them Scripture and wisdom, He (S.A.W) leads humanity from darkness to light, He(S.A.W) is a guide and blessing to true believers and He(S.A.W) is sent bearing good news for believers and giving warning to disbelievers, have impliedly seen in the couplets composed by Rahi .The Textual purity and Style of Naatia poetry, artistically composed by Dr. Rahi has applauded in the light of critical norms.

ڈاکٹر راہی فدائی کا شمار دور حاضر کے ان اہلِ قلم اور ارباب فکر و دانش میں ہوتا ہے جن کا خامہ بہ یک وقت تنقید، تحقیق، علوم اسلامیہ اور شاعری کے دوائر اربعہ میں یکساں تبحر، مہارت اور فنی بصیرت کے ساتھ ادبی جولانی دکھاتا ہے۔ نثر سے قطع نظر جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، راہی فدائی ایک خوش بیان، خوش فکر اور قادر الکلام شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری کی کلاسیکی روایات سے اپنا تخلیقی رشتہ استوار رکھتے ہوئے فکر کی ندرت لہجہ کی تازگی اور نئے طرز احساس کے ذریعہ عصر حاضر کے شعراء میں اپنی ایک منفرد شناخت بنائی ہے۔

نعت صرف ایک نورانی لفظ اور صنف سخن ہی نہیں بلکہ آفاقی اور اعلیٰ شاعری کے عناصر کا بہترین نمونہ بھی ہے۔ بقول ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ''نعت گوئی اپنے وجود کی سچائی کے ساتھ حضور کی خدمت عالیہ میں حاضری اور اس انتظار کا نام ہے جس کا پورا مفہوم معلوم نہیں۔ رحمت اور عطائے بیکراں کا انتظار''۔

نعت سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اظہار محبت کا نام ہے اور محمد کے معنی نعت کے ہیں جس طرح حمد سنت نبوی بھی ہے اور مخلوق کا پسندیدہ فعل بھی، اسی طرح نعت سنت خداوندی ہے جس میں ملائکہ اور مخلوق بھی شریک ہوتے ہیں۔

موجودہ عہد اور اکیسویں صدی نعت کی صدی ہے۔ ہر طرف مدحت آ قا کا غلغلہ ہے۔ طرحی نعتیہ مشاعرے بھی کثرت سے ہو رہے ہیں اور شعراء کو از خود نعت کہنے کی تحریک ہو رہی ہے۔ نعت کیلئے کوئی صنف سخن کا اختصاص ضروری نہیں۔ یہ کسی بھی ہیئت اور فارم میں لکھی جاسکتی ہے لیکن جس فارم یا پیکر کو اس صنف مقدس کے لیے سب سے زیادہ محبوبیت حاصل ہوئی وہ غزل ہے۔ ساجد لکھنوی کے بقول ''ابتدائے اردو شاعری سے اگر آپ بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو آپ کو 95 فیصد نعتیں غزل کے فارم میں ملیں گی''۔

ڈاکٹر راہی بنیادی طور پر غزل کے شیدائی و فدائی ہیں حال ہی میں ان کے دو کلیات غزل ''فبہا'' اور ''استیعاب'' کے نام سے منظر عام پر آئے ہیں۔ غزل ایک حرف شیریں اور اسعارۂ رقصاں ہے۔ وہ اس قدر کافر صنف ہے کہ کسی مصلحت کے در پر اپنے مزاج اور ناز و انداز کو قربان نہیں کرتی لیکن در خیر البشرؐ پر آ کر سجدۂ تعظیم بجالاتی ہے کہ اس درِ اقدس سے اس کی گل بدنی کو وہ معطر اور منور فضاء میسر آئی جس کے بغیر وہ ادھوری اور نامکمل تھی۔ غزل کی رمزیت اور ایمائیت اشارہ و کنایہ کے علاوہ اس کی دوسری خصوصیات بھی نعت میں در آئی ہیں۔ حضور اکرمؐ سے اظہار محبت اور آپ کی تعریف و توصیف کے سلسلے میں نعت پر غزل کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ نعت گوئی میں عقیدت اور عشق رسولؐ اساسی اہمیت رکھتے ہیں۔ جن میں جذبہ اطاعت، طلب شفاعت، حصول ثوب، استمد ادو استغاثہ بھی کچھ شامل ہیں۔

قرآن حکیم میں حضورؐ ختمی مرتبت کیلئے ایک طرف سراپا رحمت، سراپا ہدایت، صاحب کوثر، معلم کتاب وحکمت کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں تو دوسری طرف آپ کو اخلاق حسنہ کے اعلا درجے پر فائز، رحمتہ اللعالمینؐ ایمان والوں کی جان سے زیادہ عزیز اور آپؐ پر اللہ کے فضل عظیم کی تصدیق بھی کی گئی ہے۔ نیز آپؐ پر، صحابہؓ کرام پر، ازواج مطہرات اور اہل بیت پر درود وسلام بھیجنے کو مستقل عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔

راہی فدائی ایک جید عالم دین اور علوم اسلامیہ کے معتبر اسکالر اور استاذ رہے ہیں۔ انہیں جنوبی ہند کی مشہور زمانہ دینی دانش گاہ جامعہ باقیات الصالحات کے علماء اور اساتذہ سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا ہے، جہاں کی منور اور معنبر فضائیں ''قال اللہ تعالیٰ'' اور ''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کی دل کو چھو لینے والی صداؤں سے گونجتی رہتی ہیں۔ نعت گوئی کے سب سے بڑے ماخذات اور منابع قرآن وحدیث ہی ہیں۔

نعت گوئی کے دو اہم ستون ہیں ایک ''جوش عقیدت'' اور دوسرا ''شعری معیار'' اس لحاظ سے راہی صاحب کے نعتیہ کلام کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کا کلام پختہ اور عقیدت پختہ تر ہے۔ ان کی

شاعری محض رسمی یا رواداری کی شاعری نہیں بلکہ گہری عقیدت اور سچے جذبات کی شاعری ہے۔ رسول اکرم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کی قلبی وابستگی ان کے ایک ایک شعر سے مترشح ہے اور ان کی نعتوں میں ایک طرح کا والہانہ پن اور وارفتگی ہے۔ جو بغیر حب نبیؐ کے ممکن نہیں۔ درج ذیل اشعار میں راہی صاحب کے عشق نبیؐ، روضہ اطہر پر حاضری کی تمنا مدینہ منورہ پہنچنے کی آرزو اور تڑپ ملاحظہ کیجیے۔

صدق دل سے جس نے کی مدحت سرائی آپ کی
ہے وہی اعلیٰ سخنور یا محمد مصطفیٰؐ

اک ذرا اذن دیں، بے خطر سر کے بل
در پہ آئیں گے ہم خاتم المرسلیںؐ

درود پاک سجا کر زباں پہ بااخلاص
مرے قلم کے جیالو شہیر ہو جاؤ

بفضل حق منور ولولہ ہوں یا رسول اللہؐ
میں غم میں آپ کے پل پل جلا ہوں یا رسول اللہؐ

سعادت روضۂ اطہر کے بوسے کی جو مل جائے
مقدر رشک انجم ہو ہمارا یا رسول اللہؐ

تمنائے ہر دل، دیارِ مدینہ
ہے رشک ارم لالہ زار مدینہ

روضۂ مقدس کی حاضری کا یہ عالم
فرطِ شرم ساری سے سیلِ اشک جاری ہے

آپ پر قربان ہیں سب جان و مال و والدین
اصل ایماں ہے محبت سرورؐ کونین کی

راہی یہ یقیں جانئے فیضان نبیؐ سے
فکر رہ طیبہ میں ہیں اسفار ہمارے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پاک اسمائے گرامی اخلاق و کردار شمائل مبارک اور معجزات وغزوات کے بیان میں بھی راہی فدائی کی فکر رسا اور خامۂ جادو رقم نے اپنا کمال دکھایا ہے۔

طٰہٰ و نون آپ ہیں یٰسین آپ ہیں
خلاق کی کتاب مصوّر رسول پاکؐ

حیات پاک کا اعجاز سرمدی واللہ
ہے اسوۂ حسنہ مفلس و غنی کے لئے

آپؐ شمس الضحیٰ آپؐ بدرالدجیٰ
آپؐ نورالہدیٰ، خاتم الانبیاءؐ

اعجاز دیکھ! دست مقدس کے لمس سے
بے برگ و بار پیڑ ثمردار ہوگیا

بدرواحد کی جنگ ہو یا غزوۂ حنین
دست دعا کے ساتھ ہے تلوار بھی شریک

ڈاکٹر راہی کی شاعری اور خصوصاً غزلوں میں عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ اور تراکیب نظر آتی ہیں، اسی لئے ان کے کلام کو ادق کہا گیا اور شمس الرحمٰن فاروقی نے انہیں ''ٹیڑھی زمینوں اور اجنبی لہجے کا شاعر'' کہا ہے لیکن راہی کی نعتوں میں یہ بات بالکل نظر نہیں آتی۔ ان کی نعتیں سلیس و سادہ اور شستہ و شگفتہ ہیں۔ وہ شعر کہنے اور شائع کرنے میں جلد بازی اور رواروی سے کام نہیں لیتے۔ ان کی نعتوں میں ان کے لہجے کی انفرادیت کے باوجود بلا کی روانی اور نغمگی موجود ہے۔

یہاں سر کے بل چل کے آتے ہیں راہی
مقام ادب، رہگذارِ مدینہ

غزل میں پرواز تخیل کی پوری آزادی ہوتی ہے لیکن نعت میں اس کی گنجائش نہیں یہاں حد ادب کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

امی لقب حضور اقدسؐ اسلام کے پہلے مدرسے (صفہ) کے معلمِ اکرم ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ''سراجا منیرا'' (روشن چراغ)، ویعلمہ الکتاب والحکمۃ ۲:۱۲۹ (معلم کتاب و حکمت)، تخرج الناس من الظلمات الی النور (تاریکیوں سے نکالنے والے) وانہ الھدیٰ (سراپا ہدایت) ورحمۃ للمؤمنین (مؤمنین کے لئے رحمت) اور بشیراً اور نذیراً (خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا) کہا ہے۔

ان قرآنی آیتوں سے استفادہ کرتے ہوئے راہی فدائی نے بہت عمدہ شعر کہے ہیں۔

تصدیق کناں آج بھی یہ تشنہ لبی ہے
سرچشمۂ حکمت فقط امی لقبی ہے

بلاغت جان دیتی تھی ذرا سی جنبش لب پر
خموشی آپؐ کی امی لقب لبریز حکمت تھی

فصاحت، بلاغت سبھی اس پہ قرباں
بس اک گفتگو آپؐ کی گفتگو ہے

تکمیل دیں کا مژدہ ملا آپؐ کے طفیل
پایا نہ کوئی دین یہ اعزاز دیکھنا

درِ اقدس کہ جہاں بٹتی ہے دارین کی بھیک
جبہ سائی بھی وہاں زینت سر ہوتی ہے

آپ داتا سب سوالی منتظر ہے ہر کوئی
در پہ ہے راہی بھی مضطر یا محمد مصطفیٰؐ

حریمِ نورِ سراجِ منیر ہوجاؤ
نبی کا نام لو، روشن ضمیر ہوجاؤ

قول ہے مہرِ صداقت، فعل ہے ماہِ ہدیٰ
حکمت و ادراک سے تابندہ اسوہ آپؐ کا

راستی، روشن خیالی، راہ حق کی رہبری
آپ کی امت کے جوہر یا محمد مصطفیٰؐ

رہوگے نعت نسبت سے سرفراز ضرور
غلام آل بشیر و نذیر ہوجاؤ

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ بحیثیت نعت گو راہی کا مقام یقیناً بہت بلند ہے۔ تبحر علمی کے ساتھ ساتھ ان کے عقیدے اور عقیدت کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ مذہب سے گہرا تعلق رکھنے کی وجہ

سے اللہ اور رسول کے احکامات پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں جوش عقیدت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اطاعت خداوندی اور اتباع رسولؐ کی طرف راغب کرنے کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف اسمائے پاک کو ردیف بنا کر راہی فدائی نے جو نعتیں سپرد قرطاس کی ہیں۔ ان میں بلا کا سوز واثر اور دلکشی و رعنائی نظر آتی ہے۔ بعض اشعار تو سنتے ہی دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ اس قبیل کے اور اس کے علاوہ چند دیگر اشعار ملاحظہ کیجیے اور سر دھنیے۔

چلچلاتی دھوپ میں ہو جیسے ٹھنڈا سائباں
ہم پہ ہے رحمت کی چادر یا محمد مصطفیٰؐ

یہاں ہوتی ہے ہر دم حق و باطل کی صف آرائی
میں اپنی ذات میں اک کربلا ہوں یا رسول اللہؐ

فرشتوں نے جگایا قبر میں راہی فدائی کو
تو اس نے مضطرب ہو کر پکارا یا رسول اللہؐ

فیصلہ اجنبی و دوست کے حق میں یکساں
صلح و عدل آپؐ پہ نازاں ہیں رسول عربیؐ

جمال، مال و کمالات آپؐ کا صدقہ
یہ فکر و فن بھی یہ علم و ہنر بھی آپ کا ہے

خود زخم کے مرہم بھی، زخم آپؐ کے تن پر بھی
تاثیر بشر ہے اک، اک خاصۂ سرور ہے

درود پاک کا میں نے سفر کیا رب
مقام نور میں شب بھر بسر کیا ربی

شاہ دیں سرور کونین ہیں بے شک آقاؐ
کل بشر بندۂ بے دام و درم آپؐ کے ہیں

داعی بھی عین دعوت اللہ بھی ہے تو
کس کو بنائیں زیست کا عنواں ترے بغیر

خطاب رحمت عالم تمہیں کو زیب دیتا ہے
وہ اعداءً پر عنایت وہ محبت ختم ہے تم پر

آخر الذکر دو شعر ''سخن دریں است'' کے مصداق ''تو تم تمہیں اور تیرے'' کے ضمائر پر نظر رکتی ہے۔ ان ضمائر کا استعمال ذوق صحیح پر جو شریعت کا بھی رہین منت ہے۔ کسی قدر گراں گذرتا ہے۔ اگر چاہیں تو اس کی جگہ ضمیر غائب کے الفاظ ''وہ'' اور ''ان'' استعمال کئے جاسکتے تھے۔ اسی طرح واحد حاضر کے لئے ''آپ'' کا لفظ لایا جاسکتا تھا جو راہی کی نعتوں میں کثرت سے ملتا ہے۔

راہی فدائی کی نعتوں میں اس طرح کے ضمائر استعمال کئے ہیں لیکن نعت گوئی میں احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے وقت کوئی ایسا پیرایہ خطاب یا لفظ استعمال نہیں کیا جانا چاہئے جس میں منصب رسالت کا مکمل احترام ملحوظ نہ ہو۔ حکم خداوندی ہے ''رسول کی تعظیم و توقیر کرو'' خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں آپؐ سے خطاب کرتے ہوئے بہت کم مقامات پر آپ کا نام (محمدؐ یا احمدؐ) لیا ہے۔ صوفیائے کرام اور ناقدین نعت نے اس لازمۂ نعت کی اہمیت کا خصوصی تذکرہ کیا ہے جہاں خداوند قدوس نے رحمت عالم کو آپ کے اسمائے صفت سے یاد فرمایا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ڈاکٹر راہی نے بیشتر نعتیں طرحی مشاعروں کے لئے کہی ہیں جیسے

شریعت ختم ہے تم پر، طریقت ختم ہے تم پر
مقامِ قربِ رب کی ہر نہایت ختم ہے تم پر
عشق نبیؐ! حیات ہے زنداں ترے بغیر
کب ہوسکا ہے گھر یہ چراغاں ترے بغیر

ڈاکٹر راہی کی نعتیہ شاعری ان کے عشق رسول اور آقائے نامدار سے عقیدت اور محبت پر دال ہے۔ حضور پُرنورؐ سے ہماری نسبت اور وابستگی ایسی ہے کہ اگر ہمیں مواجہ شریف کے روبرو ہونے کی سعادت حاصل ہو (الحمدللہ راہی صاحب اور احقر کو روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری کا شرف نصیب ہوا ہے) تو آپؐ کے سامنے کھڑے ہونے کا تجربہ ہم پر لرزہ طاری کردیتا ہے۔ اور یہ لرزہ بھی میراث نبوتؐ ہے۔ جو ہمیں ختمی مرتبتؐ کی اس کیفیت اور حالت کو سمجھنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی اور اس کیفیت کو خاتم النبیین امام المتقین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قلب مطہر ہی برداشت کرسکتا تھا۔

کانپتا تھا وہ خوف عقبیٰ سے
دل دردوں سے ہے جری آقاؐ
با ادب آؤ در یار پہ، ہو نیچی نظر
رب نے تاکید سے فرمایا قضا سے پہلے

راقم الحروف کو اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کا پورا احساس ہے۔ اس لئے اللہ رب العزت سے دعا گو ہے کہ وہ احقر کی کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو سید المرسلین کے صدقے میں درگذر فرمائے اور راہی فدائی جیسے باصلاحیت اور باکمال نعت گو کی اس سعی وکاوش کو شرف قبولیت سے ہمکنار کرے اور ان کے عشق نبی رحمت میں فراوانی عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے خامہ ندرت رقم کو مدحت آقائے انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے وقت کردیں۔ (آمین)

☆☆☆

محمد شفیق اعوان، ضلع اٹک

اعجاز رحمانی کی نعتیہ شاعری

ABSTRACT: A brief study of Poetic work of Ajaz Rahmani has been done with reference to definition of devotional poetry and its history. Quotations of admiring remarks of critics and scholars like Dr. Abul Khair Kashfi, Dr. Farman Fatehpuri, Raees Amrohvi, Khawaja Razi Haider, have also cited here to denote vast applauding circle of Ajaz Rahmani. There are 17 treatises and books on credit of the poet containing general poetry including poems for children and devotional poetry along with two volumes of sestinas i.e. one Biography of Holy Prophet Muhammad (S.A.W.) and another biographies of four companions (Khulafa-e-Rashdeen,R.A.) of the Prophet (S.A.W.). The admiring remarks of Dr. Kashfi are enough to denote importance of the poet's creative works; he wrote "There is appearance of his self and his relations to his ancestors in the tune/echo of Ajaz Rahmani".

محسنِ انسانیت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی تعریف وتوصیف منظوم صورت میں بیان کرنے کو نعت کہتے ہیں، آنحضرت محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے قول وعمل، صورت وسیرت کو شعر میں بیان کرنے کو نعت رنعتیہ کلام کہتے ہیں۔

اہلِ علم وادب بیان کرتے ہیں کہ نعت کوئی بذاتِ خود کوئی صنفِ سخن نہیں ہے، نعت ہر صنفِ سخن مثلاً غزل، نظم، رباعی، قطعہ اور قصیدہ وغیرہ میں کہہ سکتے ہیں۔ نعت کی شناخت موضوعاتی ہے۔ بظاہر نعت کا موضوع محدود نظر آتا ہے، حقیقت میں یہ وسیع تر موضوع ہے۔ جو سیرتِ محسنِ انسانیت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ہر پہلو کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

شاعری اگر انسانیت کی معراج ہے تو معراجِ سخن حمد ونعت ہے۔ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق تحریر کرتے ہیں: ''اب اس امر میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ نعت عرفِ عام میں پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی مدح وستائش میں لکھی جانے والی تحریر کو کہتے ہیں۔ وہ بالعموم منظوم ہوتی ہے اور درا

صل ہدیہ تشکر ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے حد وحساب اور متنوع احسانات کا جو آپ کی وساطت سے عالمِ انسانی کو فیض یاب کر رہے ہیں۔''۱

الحاج فیروز الدینؒ اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں: نعت کے معنی ہیں ''مدح، ثنا، تعریف، توصیف۔ رسول اللہ آنحضور ﷺ کی شان میں مدحیہ اشعار''۲

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نعت کے مفہوم کو واضع کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''نعت وہ صنفِ نظم ہے، جس میں رسول ﷺ کی ذات، صفاتِ اخلاقی اور شخصی حالات وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔''۳

ڈاکٹر عاصی کرنالی نعت کے لغوی معنی و مطالب کو فارسی اور اُردو کی تیرہ (۱۳) مستند لغات کے ذریعے واضع کیا ہے وہ کہتے ہیں ''لغوی معانی و مفاہیم کے باوجود اصطلاحی طور پر نعت کا لفظ محمد ﷺ ہی کی ذات گرامی اور صفات حمیدہ وطیبہ ہی کے بیان کے لیے مخصوص ہے جبکہ دوسری ہستیوں کے لیے وصف، مدح، مدحت، منقبت، تعریف، توصیف کے الفاظ کا استعمال انہیں ممتاز و مختلف کرتا ہے''۴

(ڈاکٹر عاصی کرنالی آگے چل کر مذید کہتے ہیں ''حضرت محمد ﷺ کے اسمائے مبارک جن میں ہر اسم اپنی جامع معنویت کے سبب یک لفظی نعت کا مقام و منصب رکھتا ہے''۔ ۵

ڈاکٹر شہزاد احمد تحریر کرتے ہیں جو کہ حاصل مطالعہ ہے کہ:

''لفظ 'محمد' کے منتخب ہوتے ہی 'نعت' کا آغاز ہو چکا تھا۔ کیونکہ لفظ 'محمد' کے معنی (بہت زیادہ تعریف کیا گیا نہایت سراہا گیا) جبکہ 'نعت' کے معنی بھی تعریف و توصیف کے ہیں''۶

نعت لکھنا، نعت پڑھنا، نعت سننا بہت بڑی سعادت ہے اور اس کام پر بہت بڑا اجر و ثواب ہے، خوش قسمت ہیں وہ انسان جو یہ کام کرتے ہیں اور اپنے لیے زادِ راہ اکھٹی کرتے ہیں۔ نعت کہنے والے کو نعت گو اور نعت پڑھنے والے کو نعت خواں کہتے ہیں جو ایک اعزاز کی بات ہے۔ پروفیسر محمد اکرم رضا تحریر کرتے ہیں:

''مولانا احمد رضا خان فاضل بریلویؒ نے نعتِ رسول کے سلسلے میں ادب و احتیاط کو عشقِ رسول کی منزل اوّلین قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں: ''حقیقتاً نعت شریف لکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں۔ اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے۔ البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے۔ جتنا چاہے آگے بڑھ سکتا ہے۔ غرض ایک جانب اصلاً کوئی حد نہیں اور نعت شریف میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے''۷

نعت لکھنے میں بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی صفات، اور مقام و

مرتبہ کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ جناب مجید امجد اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

''جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں ذرا سی لغزش نعت کو حدودِ کفر میں داخل کرسکتی ہے۔ ذرا سی کوتاہی مدح کو قدح میں بدل سکتی ہے۔ ذرا سا شاعرانہ غلو ضلالت کے زمرے میں آسکتا ہے۔ ذرا سا عجزِ بیان اہانت کا باعث ہوسکتا ہے۔ فنِ شعر کے لحاظ سے اس کام کے لیے کمالِ سخنوری اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے اس کے لیے کمال آگہی درکار ہے اور پھر ان دونوں چیزوں کو جلا جس چیز سے ملتی ہے وہ عشق کا سرمدی جذبہ ہے، جو لفظوں کو تجلیات سے بھر دیتا ہے اور معانی میں وسعتیں سمو دیتا ہے۔ یوں نعت ایک مقدس آزمائش ہے۔ بیانِ عقیدت کی روح سے جو ہر ایمان کی آزمائش اور غایتِ غایات کی جستجو کے ضمن میں قوت و ادراک کا امتحان'' ۸

ملّتِ اسلامیہ کے لیے محبتِ رسولِ رحمت ﷺ ایمان کی بنیاد ہے اور حرمتِ رسولِ اکرم ﷺ پر کٹ مرنا ایمان کا تقاضا ہے، حفاظتِ ناموسِ رسالت فرض عین ہے جس سے مفر ناممکن ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ خلاقیت و ربوبیت اور کمالِ قدرت کی سب سے بڑی روشن دلیل آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ برکاتِ گرامی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت بلاشبہ خلاصۂ انسانیت ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں انسانِ کامل ایک ہی ہستی ہے اور وہ حبیبِ کبریا احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اللہ خالق و مالک اور رب و رزاق ہے وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں کسی بھی حوالے سے، حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کی مخلوقات میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

مفہوم ''کہہ دیجیے (اے نبی) کہ درحقیقت میں بھی ایک بشر ہوں تم ہی جیسا، وحی کی جاتی ہے میری طرف'' ۹

مخلوقات میں وہ سب سے اعلیٰ ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ختم ہوئی، اب کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دین اسلام مکمل ہوا، اب قیامت تک کے لیے ہدایت، رہنمائی اور علم و روشنی کا واحد سرچشمہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کے بعد، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل ہی کامیابی و کامرانی کی ضمانت ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے، جس کا مفہوم یہ ہے:

ترجمہ: ''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے''۔ ۱۰

ترجمہ: ''اے نبی! لوگوں سے کہہ دو کہ ''اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی

اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے''۔ [۱۱]

اُردو زبان میں نعت گوئی کے آثار بہت پرانے ہیں، اُردو کے آغاز سے ہی حمد و نعت کے شواہد ملتے ہیں۔ اس حوالے سے محقق حضرات نے تحقیقی مقالات لکھے ہیں۔ جن میں اس بات کی گواہی موجود ہے۔

نعت گوئی کے اثرات اتنے گہرے ہیں کہ ہندو اور سکھ شعراء نے بھی نعتیں لکھی ہیں حتیٰ کہ خدا بے زار اور مذہب بے زار شعراء، جو اپنے آپ کو روشن خیال، لبرل، سیکولر اور ترقی پسند کہتے ہیں، وہ حمد و نعت کو دقیانوسی عمل گردانتے ہیں! انہوں نے مسلمانوں کے اندر اثر و نفوذ کرنے کے لیے نعتیں لکھی ہیں کیونکہ ان کے مجموعۂ کلام، نعت کے بغیر ادھورے تصور کیے جاتے ہیں۔

نعتیہ ادب ابتدا میں میلاد نامہ، معراج نامہ اور معجزات نامہ یا صورت نامہ تک محدود تھا۔ ایسی ہی شاعری کو پسند کیا جاتا تھا جو یقیناً کارِ ثواب کام تھا۔ بعد میں دیگر موضوعات بھی شامل ہوتے گئے مثلاً روضۂ اطہر پر حاضری کی آرزو، گنبدِ خضریٰ کا دیدار کرنے کی خواہش، روضہ مبارک کی جالی کو دیکھنے، ہاتھ لگانے اور چومنے کی خواہش، مدینہ کی گلیوں اور قبرستان کا نظارہ کرنے کی آرزو، نم دیدہ مسافرت، مدینہ کی زمین میں دفن ہونے کی تمنا، شفاعت کی آرزو، احساسِ عصیاں، استغاثہ، فریاد، ندامت، احساس تہی دامن، سیدالانبیاء ﷺ کی سراپا نگاری، شکل و صورت اور شمائل نبوی ﷺ بیان کرنا، اپنی بخشش کے لیے فریاد کرنا اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا، ایسے موضوعات پر شعر کہے گئے۔ یہ کام باعث سعادت اور ثواب کا کام ہے لیکن ان ہی کو نعت کے لیے مختص کر لینا، نعت گوئی کے اصلی اور حقیقی مقصد کو، اپنی نالائقی اور لاعلمی کی وجہ سے پسِ پشت ڈال دینے کے مترادف ہے۔

نعت گوئی یا سیرت ﷺ کا بیان اس بات کا تقاضہ کرتا ہے۔ کہ ہم نبی مہربان حضرت محمد ﷺ کی مکمل سیرت بیان کریں، سیرت ﷺ کا کوئی پہلو نہ چھوڑیں، آپ ﷺ کی ذات والا صفات سے مکمل وابستگی اختیار کریں، غلامیِ رسول اور عشقِ نبی میں فنا ہو جائیں، عقیدت و محبت کے ساتھ پیروی اختیار کریں، اسوہ حسنہ ﷺ سے ہی ہر معاملے میں رہنمائی لیں، اسی خواہش و آرزو کو پالتے رہیں۔

ملّتِ کفر تو چاہتی ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا نام لینے والا اور ذکر کرنے والا کوئی بھی نہ ہو۔ ان کافروں کی خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کا ذکر بلند کرنے کا اعلان قرآن مجید میں فرما دیا ہے:

ترجمہ: ''اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا'' [۱۲]

سیرت ﷺ کی اشاعت و ترویج کے لیے منظوم و منثور دونوں ذرائع اختیار کرنا ہی ادیب اور

شعراء کا کام ہے۔ اسی میں ہی ہم سب کی فلاح ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے بعد کے ادوار میں سیرت ﷺ کے دیگر پہلوؤں پر لکھا جانے لگا، بعض شعرا نے مکمل منظوم سیرت کی کتب بھی لکھیں ہیں۔ منصور ملتانی تحریر کرتے ہیں۔

''مربوط اور باقاعدہ منظوم سیرت/حیاتِ طیبہ ﷺ کے حوالے سے جب اُردو ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو مندرجہ ذیل کوشش اہم ہونے کے س ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرا دیتی ہے، ۱۔ روضۃ الانوار مثنوی، ۱۱۵۹ھ، از ولی دہلوی۔ ۲۔ اعجازِ احمدی مثنوی، ۱۱۸۶ھ، از نوازش علی شیدا۔ ۳۔ ہفت قصائد، قبل از ۱۲۵۲ھ، از سید علی حیدر نظم طباطبائی۔ ۴۔ شاہنامۂ اسلام، مثنوی چار ضخیم جلدیں، (۱۳۴۶ھ تا ۱۳۶۵ھ) ، از ابوالاثر حفیظ جالندھریؒ (۱۹۰۰ء۔ ۱۹۸۲ء)۔ ۵۔ شہنشاہ نامہ، مثنوی، قبل از ۱۳۶۱ھ، صوفی محمد شریف غیرت قادری۔ ۶۔ فخرِ کونین ﷺ، مسدس، تین جلدیں، ۱۳۸۰ھ، از محشر رسول نگریؒ (۱۹۱۶ء۔ ۱۹۸۳ء)۔ ۷۔ اوّل بھی آپ ﷺ آخر بھی آپ ﷺ، ترجیع بند، ۱۴۷۵ھ، از ید زائر حسین زائر زیدی ۔ ۸۔ چراغِ حرا، مثنوی، ۱۴۱۷ھ، از قیصر الجعفری۔ ۹۔ غزواتِ رحمۃ للعالمین، غزلیہ نظم، ۱۴۱۷ھ، از لالہ صحرائی۔ ۱۰۔ سید البشر سانیٹ از منصور ملتانی۔ ۔ڈاکٹر ریاض مجید نے ''ریاض السیر از غلام محمد حسرت'' اور ''مختار التفاسیر از سید امیر الدین حسین'' کا تذکرہ کیا ہے۔ جب کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے غیر طباعت شدہ ''شانہ ہندی از محمد ابراہیم ہندی فتح پوری''، ''جنگ نامہ اسلام (منظوم) جلد اوّل تا سوم از ملک منظور حسین منظور'' اور تاریخِ اسلام از سید منیر علی جعفری کا ذکر کیا ہے''۔[۱۳]

شاہنامۂ اسلام جدید (منظوم) از عامر عثمانیؒ، سلامتی کا سفر (منظوم ایک ضخیم جلد) از اعجاز رحمانی، سیرتِ رسول ﷺ (منظوم) از گہر اعظمی اور دیگر شعراء نے بھی کام کیا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

نعتیہ ادب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہت زیادہ تخلیق ہو رہا ہے لیکن اس میں زیادہ تر سرورِ عالم ﷺ سے عقیدت و محبت کا اظہار اور اپنی آرزو و خواہش تک محدود ہے یہ نعتیہ ادب قابلِ تعریف ہے، جو زبان و بیان اور فنی محاسن کا ایک خزانہ ہے۔ شانِ رسالت کے ساتھ ساتھ احکاماتِ رسالت کو بیان کرنا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس طرف بھی توجہ دی جانی چاہیے۔

رسولِ رحمت ﷺ کی سراپا نگاری اور آپ ﷺ کے جسمِ اطہر کے محاسن کا بیان کو بھی نعت ہی شمار کیا جانا چاہیے، البتہ نبی رحمت ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآنِ مجید اور آحادیثِ نبوی ﷺ جو بیان ہوا ہے اُس اسوہ حسنہ ﷺ کو بیان کرنا ہر دور کی ضرورت ہے، جو انسانیت کے لیے کامیابی و کامرانی کا واحد دستور ہے۔

میرے علم کے مطابق مولانا الطاف حسین حالیؒ (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۱۴ء) نے مُسدس مد و جزرِ

اسلام ۱۲۹۶ھ میں شائع کی۔ مولاناؒ نے اُردو زبان میں مُسدس لکھ کر نعت گوئی میں انقلابی قدم اُٹھایا اور شعراء حضرات کو نعت گوئی کے حقیقی مقاصد کی طرف توجہ دلائی۔ پروفیسر محمد اکرم رضا صاحب بیان کرتے ہیں:

''الطاف حسین حالیؔ کی مسدس حالی نے اُردو نعت کو فی الواقع نئے اسالیب سے آشنا کیا ہے ۔۔۔ حالیؔ کے کلام میں شعرائے عرب کے کلام کی سی روانی اور زورِ بیان ہے۔ حالیؔ کی انفرادیت ہے کہ انھوں نے قدیم طرز کے نعت و سلام اور قصائد سے ہٹ کر حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر کیا۔ اُردو نعتیہ شاعری میں یہ ایک نئی چیز تھی۔'' ۱۴

رسولِ اکرم ﷺ کی انقلاب انگیز شخصیت نعت میں جلوہ گر ہوئی۔ نبیِ محترم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ شعری روپ میں سامنے آئی۔ جس کو پڑھ کر یا سن کر آپ ﷺ سے والہانہ محبت کرنے اور عقیدت رکھنے کا داعیہ پیدا ہوا، آپ ﷺ کی پیروی کرنے کو دِل آمادہ ہوا اور اسلام کو غالب کرنے کا جذبہ بیدار ہوا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی تحریر کرتے ہیں:

''اُردو میں جدید نعت گوئی کا اوّلین سنگِ بنیاد حالیؔ نے 'مدو جزرِ اسلام' کی شکل میں رکھا اور پہلی بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انقلاب انگیز شخصیت شعری روپ میں ہمارے سامنے آئی کہ اس سے والہانہ محبت کرنے کو جی چاہا۔۔۔ اس کو اپنا لینے اور اس میں ڈوب جانے کی آرزو جاگی''۔ ۱۵

اللہ کی طرف سے ایک لاکھ چوبیس ہزار کم و بیش نبی اور رسول دنیا میں آئے، سب سے آخر میں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائے۔ نبی اور رسول اُمت کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے بھیجے جاتے تھے، اس لیے جب بھی کوئی نبی یا رسول آیا تو اس نے یہی کہا، اللہ کی عبادت کرو اور میری پیروی کرو، اسی بات کو بنیاد بنا کر مولانا حالیؔ نے مُسدس لکھی اور نعت گوئی اور نعت خوانی کا حق ادا کرنے کی طرف متوجہ کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔

مولانا حالیؒ کے کام کو علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے آگے بڑھایا اور اسے نصب العین کے طور پر اپنایا، ملّتِ اسلامیہ کو جگانے اور متحرک کرنے کے لیے سیرتِ مطہرہ ﷺ کے مختلف گوشوں کو شعری روپ دیا۔ علامہ اقبالؒ کے اشعار میں جتنا کرب اور گداز پایا جاتا ہے شاید ہی کسی اور شاعر کے کلام میں موجود ہو یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ کی آواز پوری دُنیا میں گونجی ہے اور مسلمانوں کی یہ دِل کی آواز بن گئی۔ پروفیسر محمد اکرم رضا تحریر کرتے ہیں:

''حالیؔ نے شاعری کے ایوانِ عالی میں مقصدیت کی شمع روشن کی اور اقبالؒ نے شاعری کے اس ایوان میں فکر و فن کے وہ لاتعداد آئینے سجا دیے کہ جن کی بدولت اس شمع کی جھلملاہٹیں ہر پہلو دل و نگاہ کو خیرہ کرنے لگیں۔۔۔ اقبال نے نعتیہ شاعری کو تکنیک کے اعتبار سے بہت وسیع کر دیا۔'' ۱۶

اقبالؒ کے کلام نے مسلمانوں کے اندر بیداری کی لہر دوڑا دی، جو ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی ہے، جو ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کی تحریک بن چکی ہے، اسی تحریک کی وجہ سے دنیا کے نقشے میں اسلامی جمہوریہ پاکستان اُبھر کر سامنے آیا۔ یہ فیض اور کرامت اقبالؒ کی نعت گوئی کا ثمر ہے۔ جس تحریر میں درد و گداز نہ ہو وہ تحریر بے اثر ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کو یہ وصف قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ،آپ کی تحریر میں درد بھی ہے اور گداز بھی اور نعت گوئی کی دولت وافر مقدار میں اپنے رب کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ ایسا درد ہے کہ ہر ایک پڑھنے اور سننے والا اس کرب کو محسوس کرتا ہے گویا کہ یہ اس کے دِل کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اقبالؒ کو شہرت، عزت اور عظمت سے نوازا کہ پوری دنیا میں علامہ اقبالؒ کے کلام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔

نعت کے حوالے سے علامہ محمد اقبالؒ کے کلیاتِ اُردو اور فارسی کے ساتھ ساتھ علامہ شبلی نعمانیؒ کی کلیاتِ شبلی اُردو، مولانا ظفر علی خانؒ کی کتب بہارستان، چمنستان، نگارستان، نعیم صدیقیؒ کی کتاب نور کی ندیاں رواں اور دیگر غیر مطبوعہ کلام، ماہر القادریؒ کی کتاب ذکرِ جمیل قابلِ ذکر ہیں،

نعت کے حوالے سے بے شمار نام ہیں جن کا تذکرہ کرنا مشکل ہے۔ ان میں نصر اللہ خان عزیزؔ، حافظ مظہر الدینؒ، احسان دانشؒ، حافظ لدھیانویؒ، رحمان کیانیؒ، عبدالعزیز خالدؒ، عاصی ضیائیؒ، عاصی کرنالیؒ ،حفیظ تائبؒ، عبدالکریم ثمرؒ، خالد بزمیؒ، مظفر وارثیؒ، مسرور کیفیؒ، ریاض حسین چودھریؒ، اعجاز رحمانی، صبیح رحمانی، گہر اعظمی اور بہت سارے نامی گرامی شعراء نے مثالی کام کیا ہے۔

اس دور میں بعض فاسقانہ شاعری کرنے والے اپنے آپ کو اسلامی شعراء کے ساتھ جوڑتے ہیں جب کہ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے، کیونکہ ایک ملّتِ کفر کے ترجمان ہیں اور دوسرے ملّتِ اسلامیہ کے ترجمان۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے جس کا مفہوم درج ذیل ہے:

''اے پیغمبر ﷺ! ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہر حال یکساں نہیں ہیں خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو، اے لوگو! جو عقل رکھتے ہو، اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو، امید ہے کہ تمہیں فلاح ہوگی۔'' [۱۷]

سیّدِ انسانیت محسنِ اعظم ﷺ نے جس انقلاب کی بنیاد رکھی تھی وہ ایک ہمہ گیر انقلاب تھا جس سے تاریکیاں ختم ہوئیں، جہالت کے اندھیرے کافور ہوئے اور ہر طرف علم و نور کا پھریرہ لہرانے لگا۔

نعت کہنے کے لیے ضروری ہے کہ رسولِ رحمت ﷺ کی ذات بابرکات سے والہانہ محبت و شیفتگی اور شدید جذباتی وابستگی پائی جائے۔ پیرویِ رسول ﷺ میں جان و مال کا نقصان برداشت کرنا، رائے اور آزادی کا ایثار کرنے پر آمادہ ہو۔ حقیقی نعت وہی ہے جس کے پڑھنے سننے سے رسولِ رحمت ﷺ کی

حیاتِ طیبہ اپنی تمام تر آب و تاب اور خصوصیات کے ساتھ سامنے آجائے، آپ ﷺ کی سیرت مبارک کے تمام پہلو اور اخلاقِ حسنہ متحرک صورت میں جلوہ گر ہوں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی تحریر کرتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ جب تک حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذاتِ بابرکات سے والہانہ شیفتگی اور شدید جذباتی وابستگی نہ پائی جاتی ہو، کامیاب نعت کہنا ناممکن ہے اور ظاہر ہے کامیاب نعت وہی ہے جس کے پڑھنے سے حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی متحرک حیاتِ طیبہ اپنی تمام تر آب و تاب اور اپنے تمام محاسنِ جمیلہ اور اخلاقِ حسنہ کے ساتھ جلوہ گر ہو کر دامنِ دل کھینچنے لگے'' ۱۸

موجودہ دور میں نعت کے اندر سیرت کے تمام پہلو شامل نظر آتے ہیں۔ آج کی جدید نعت پر حالیؒ، اقبالؒ اور مولانا ظفر علیخانؒ کا انقلابی اقدام اثر انداز ہوا ہے۔ جس میں نبیِ اکرم ﷺ کی معرفت اللہ سے استمداد کی پُرسوز التجا سے عبارت ہے۔

اُردو زبان میں نعت تقریباً ہر صنف سخن کی ہیت میں کہی گئی ہے۔ پروفیسر محمد اکرم رضا تحریر کرتے ہیں:

''نعت کہنے کے لیے شاعری کی کوئی خاص ہیئت مخصوص نہیں ہے۔ نعت کہنے کے لیے صرف موضوع کی پابندی ہوتی ہے۔ ہیئت کی نہیں۔ شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ، مسدس، مخمس وغیرہ میں سے کسی بھی ہیئت میں نعت رسولِ مقبول کہی جاسکتی ہے لیکن نعت کے موضوع سے انحراف یا تجاوز نہیں کیا جاسکتا'' ۱۹

مسلمان کی پستی کی ایک ہی وجہ ہے کہ اِس نے اپنے نبی ﷺ اور رسول ﷺ کے دیے ہوئے طریقۂ زندگی کو چھوڑ دیا، غیر کا نظامِ قانون اپنا لیا ہے۔ جس کی وجہ سے ذلت اور رسوائی قدم بہ قدم مل رہی ہے۔ اس زبوں حالی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے، ایک ہی فلاح کا راستہ ہے اور وہ عروج کا راستہ اسوہ حسنہ ﷺ ہے، سیرتِ مطہرہ ﷺ پر عمل کر کے کامیاب کامران ہو سکتے ہیں۔ شاعر اپنے اندر یہی ایک کرب اور گداز محسوس کرتا ہے اور اسے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔

جن سے ہو روشنی زمانے میں ان چراغوں کا اہتمام کریں
حکم جس کا دیا ہے خالق نے مل کے نافذ وہی نظام کریں
جو لبادے میں ہوں شریعت کے ایسی قدروں کا احترام کریں ۲۰

ادب کے نام پر کمیونسٹوں، ملحدوں اور نام نہاد ترقی پسندوں نے (جواب لبرل، سیکولر اور روشن خیال) اسلامی نظامِ حیات کے خلاف شب و روز زہر اُگلتے رہتے ہیں، شکوک و شبہات پیدا کر کے لوگوں کو مذہب بے زار اور خدا بے زار ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس بات کی گواہی ان کا پیش کیا ہوا ادب (منظوم و منثور) دیتا ہے، یہ ادب نہیں بے ادبی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ سے اسلام، مسلمان، پاکستان اور

اخلاق و پاکیزگی کے خلاف مہم چلا رکھی ہے۔ یہ طبقہ پاکستان میں منافرت اور انتشار کا پرچار کرنے، اکھنڈ بھارت کی راہ ہموار کرنے، الحاد اور سرمایہ داری کا پروپیگنڈہ کرنے، طبقاتی کشمکش کو ہوا دینے، اسلامی قوانین کی توہین کرنے میں مصروف نظر آتا ہے اور فحاشی وعریانی اور بے حیائی کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا، بداخلاقی اور بدتمیزی کا ڈنکے کی چوٹ پر مظاہرہ کرنا، ان کا روزمرہ کا مشغلہ ہے، اس بات کی شہادت وہ تمام ذرائع (الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا) دیتے ہیں جو ان کی دسترس میں ہیں، طبقاتی منافرت اور کشمکش کو ہوا دینے اور حقوق اور ادب کے نام پر انتشار پیدا کرنے کے لیے ہزاروں این جی اوز بنا رکھی ہیں، ان این جی اوز کے ذریعے پاکستان، اسلام اور مسلمان کو بدنام کرتے ہیں، قومی زبان اُردو کی ترویج اور اشاعت میں بھی رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ادب کے نام پر بے ادبی پھیلا رہے ہیں لیکن اب یہ بھی مجبور ہو گئے ہیں کہ ان کے رسائل اور کتب نعت کے بغیر ادھورے ہیں، انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ نعت کے بغیر یہ مسلمانوں کے اندر اثر ونفوذ نہیں کر سکتے۔ یہ سکولر اور لبرل طبقہ یہ بات بار بار دہراتے ہیں کہ ادیب اور شاعر کا کوئی مذہب نہیں ہوتا حالانکہ ان کا مذہب یا ازم ڈارون، فرائڈ، مارکس، لینن، اسٹالن، ماؤ اور ان جیسے دیگر لوگوں کے افکار ونظریات ہیں۔ سادہ لوح لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں خود اسلام کے مقابلے میں پورا دین بنا رکھا ہے اور اس کے نفاذ کے لیے دن رات مصروف نظر آتے ہیں۔

اندھے ہیں روشنی کی تردید کر رہے ہیں ۔۔۔ ہیں کتنے بے بصیرت اسلام کے یہ منکر ۲۱
دور ہیں جو آپؐ کی سرکار سے ۔۔۔ سرخ سورج کو وہ کرتے ہیں سلام
جن کو نسبت ہے شہہِ ابرارؐ سے ۔۔۔ ماؤ، لینن سے انہیں کیا واسطہ ۲۲

شاعر میں جوش و ہوش کے ساتھ تپش اور گرمی پوری طرح نمایاں ہو اور اس کے کلام میں لطف انگیز اضطراب ملتا ہو۔ جو شخص زبان و بیان پر قدرت نہیں رکھتا اور جسے الفاظ کو برتنے کا طریقہ وسلیقہ نہیں آتا، وہ ادیب اور شاعر کیسا!۔ ادب وہی ہے جس میں فکر وخیال کے ساتھ ساتھ اظہار و بیان کا فطرت، حسن اور زبان و روزمرہ کی خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ جس ادیب اور شاعر کی قوتِ بیان و اظہار کمزور ہے وہ پست درجہ کا ادیب رشاعر ہے۔ بڑا ادیب و شاعر زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہے اور الفاظ کے استعمال کو جانتا ہے۔ اس کی تحریر میں تقریباً تمام فنی محاسن اور خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے اعجاز رحمانی میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔ خواجہ رضی حیدر بیان کرتے ہیں:

''اعجاز رحمانی کے یہاں جذب دروں کے ساتھ پختہ گوئی اور بالغ نظری موجود ہے جس کی بنا پر نہ تو کہیں ابہام پیدا ہوتا ہے اور نہ کہیں لغزشِ بیان و خیال کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری کے

مطالعہ سے ایک اور بات نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے رسول اللہ (ﷺ) کی سیرت طیبہ کا بالاستعیاب مطالعہ کیا ہے جس کی بنا پر ان کی نعت گوئی میں سیرتِ رسولِ مقبول ﷺ کے مختلف پہلو موثر طور پر ظاہر ہوئے ہیں۔۔۔ اعجاز رحمانی کے ہاں تخیل اور فکر کی بلندی بھی ہے، سلاستِ بیان بھی ہے اور وہ معنوی تہ داری بھی جو کسی بھی قسم کی بڑی شاعری کے لیے ضروری ہوتی ہے۔''[۲۳]

جناب ڈاکٹر ابوالخیر کشفی بیان کرتے ہیں:

''اعجاز رحمانی کی نعتیہ لے میں اُن کی ذات اور اسلاف سے نسبت دونوں کی نمود ہے''[۲۴]

اعجاز رحمانی پاکستان کے معروف و مشہور شاعر ہیں۔ اُردو کے بلند پایہ ادبی مجلوں اور رسالو ں میں اُن کا کلام شائع ہو رہا ہے۔ ان کی شاعری میں غم دوراں، عقیدت جاوداں پہلو بہ پہلو ملتے ہیں۔ آپ کا کلام زبان و بیان اور علمِ عروض پر پورا اُترتا ہے۔ وطن سے محبت اور دین اسلام سے وابستگی کی وجہ سے اسلامی ادب و ثقافت کا رنگ، ان کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ یہی خوشبو اور روشنی پھیلانے میں شب و روز مصروف رہتے ہیں۔ خواجہ رضی حیدر تحریر کرتے ہیں:

''کراچی سے جن شعراء نے نعت گوئی کے حوالے سے قومی سطح پر تعارف حاصل کیا ان میں اعجاز رحمانی کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہوں نے فکری اور فنی سطح پر نہ صرف نعت گوئی کے تقاضے پورے کیے ہیں بلکہ اپنی مترنم آواز سے بھی نعت کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا''۔[۲۵]

جناب رئیس امروہوی تحریر کرتے ہیں:

اعجاز رحمانی نے اپنی روح کی تمام نغمگی اور اپنے وجود کا تمام ترنم الفاظ میں منتقل کر کے کلام کو نغمۂ سرمدی کی حیثیت دے دی ہے''[۲۶]

اعجاز رحمانی نے غزل کی ہیت میں حمد و نعت کا سرمایہ مہیا کیا، اس کے ساتھ ساتھ آپ نے منظومات میں بھی بہت کام کیا، مسدس کی ہیئت میں طویل نظمیں لکھیں جن میں سے سلامتی کا سفر، عظمتوں کے مینار قابلِ ذکر ہیں۔

آپ کے کلام میں حقیت نگاری، مترنم اور سادگی پائی جاتی ہے اور ایک صفت یہ ہے کہ وہ عام فہم لکھتے ہیں۔ جس سے عام قاری بھی مستفید ہو سکتا ہے۔ سادہ اور منفرد انداز میں لکھی ہوئی نعتیں پڑھنے اور سننے سے حُبِ رسول ﷺ پیدا ہوتی ہے اور ایمان کو جلا بخشتیں ہیں۔

شاعر اور ادیب کی کہی ہوئی بات منظوم ہو کہ منثور اُس میں سادگی ہو، برجستگی ہو، حقیقت کا اظہار ہو، سچائی کا بیان ہو، سلیس اور عام فہم زبان میں اپنے خیالات و احساسات کا اظہار ہو، تو یہ سادہ اور بمعنی منفرد اسلوب پہچان بن جاتا ہے۔ جب کوئی اس ہنر و رمز اور فن سے واقف ہو تو کیا کہنے! دِل کی بات

نظم میں کہی جائے یا نثر میں، دونوں صورتوں میں پہچان اُس وقت بنتی ہیں جب پڑھنے اور سننے والے یہ سمجھیں کہ یہ بات تو میرے دِل کی ہے۔ سیّد اعجاز رحمانی کے کلام میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ ان کا کلام پڑھنے اور سننے سے مایوسی نہیں ہوتی، ۔قاری کے اندر ایک تحریک اُٹھتی ہے، آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے، محنت اور لگن کی طرف دھیان جاتا ہے اور اُمیدِ سحر پیدا ہوتی ہے۔

اعجاز رحمانی اُردو زبان وادب کے مایۂ ناز شاعر ہیں۔آپ اپنے کلامِ فصاحت کے پیشِ نظر جس ادبی شہرت کے مستحق ہیں اس سے تا حال ابھی تک محروم ہیں۔ مفلسی اور ناداری کی بنا اپنا بیشتر کلام کتابی صورت میں شائع نہیں کروا سکے۔البتہ رسائل واخبارات میں اُن کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ایسے شاعر کی شخصیت اور اُس کے فن سے اربابِ ذوق سے روشناس کرانا ادب کی اعلیٰ خدمت سمجھی جائے گی۔ کاش کوئی اہلِ خیر اس طرف متوجہ ہو جائے۔، تا کہ اُن کا جو کلام خصوصاً نعتیہ کلام ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے وہ منظرِ عام پر آجائے۔

اس سے بیشتر کہ آپ کے کلام کی چاشنی سے قارئین کے ذوق کی تواضع کی جائے۔شاعر کی زندگی کے مختصر حالات پیش کیے جاتے ہیں۔

آپ کا نام سیّد اعجاز علی رحمانی اور والد کا نام سیّد ایوب علی رحمانی ہے۔آپ ۱۲رفروری ۱۹۳۶ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد آٹو موبائل کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے۔آپ کی عمر نو ۹ سال کی ہوئی تو والدہ دنیا سے رخصت ہوگئیں اور گیارہ سال کی عمر میں والد نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔دادی اماں نے ان بہن بھائیوں کی پرورش کی۔گھر کے مالی حالات اچھے نہیں تھے اس لیے اعجاز رحمانی نے جُز وقتی الیکٹرک نکل پلیٹینگ کے شعبے میں کام کرنے لگے۔ ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رہی، دینی تعلیم کے لیے مدرسہ شبینیہ جامع مسجد علی گڑھ میں مغرب کے بعد تعلیم حاصل کرتے۔۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا۔تو پاکستان دیکھنے کے لیے پاکستان آگئے۔ پہلے میر پور خاص میں اپنے خالو کے ہاں قیام کیا، پھر کراچی میں اپنے عزیز سیّد صادق علی کے پاس آگئے اور کراچی میں ابراہیم میٹل انڈسٹری میں کام کرنے لگے۔۱۹۸۵ء میں شادی ہوئی۔شاعری کی ابتدا گیارہ سال کی عمر میں ہوئی۔آپ علامہ محمد اقبالؒ کا کلام پڑھتے تھے اور ان ہی سے متاثر ہیں۔شاعری میں اقبال ہی کی پیروی کی۔شاعری میں ان کے اُستاد مشہور معروف شاعر اُستاد سیّد محمد حسین قمر جلالوی (پ ۱۸۸۷ء۔م ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۸ء) تھے۔آپ نے پاکستان میں بڑے بڑے مشاعروں میں اپنا کلام سنایا اور بیرونِ ملک میں بھی مشاعروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔

آپ کے کلام کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مجموعات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعت کے حوالے

سے شاید ہی اس ضخامت کے مجموعے، ایک شاعر کے شائع ہوئے ہوں گے۔ لیکن ایک ضخیم منظوم سوانح حیات خلفائے راشدینؓ ''عظمتوں کے مینار'' اور امت کی مائیں پر منظوم کام پوری صدی میں نہیں ہوا۔

آپ کے کلام کو جو بھی پڑھے گا وہ محسوس کرے گا کہ ان کے قلب و نگاہ، ظاہر و باطن تک محبتِ رسول ﷺ جلوہ گر ہوگی۔ شاداب، مسرور اور مطمئن ہوتا جائے گا اور اس کے ایمان کو جلا ملے گی، حبِ رسول ﷺ میں اضافہ ہوگا جو اُسے اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی پر آمادہ کرے گا جو ایمان کا تقاضا ہے۔

اُردو زبان و ادب کے شعرا، ادبا، محققین، تذکرہ نگار اور تنقید نگاروں سے بہت بڑا سہو ہوا ہے کہ اعجاز رحمانی جیسے قومی و ملی شاعر کو وہ اہمیت نہیں دی جس کا وہ حق دار تھا۔ آپ نے جتنا کام (حمد و نعت اور منقبت، قومی و ملی نظمیں، غزلیات وقطعات) کیا ہے، وہ ایک ادارے کے کام کے برابر ہے جو معیار اور مقدار کے حوالے سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ آیئے! آپ کے کام پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ نعتیہ مجموعہ کلام [اعجاز مصطفیٰ (تعداد۔ حمد و نعت ۱۲۵)، پہلی کرن آخری روشنی (تعداد۔ حمد و نعت ۶۹، قطعات ۱۴، رباعی ۳۸)، چراغِ مدحت (تعداد۔ حمد و نعت ۱۰۲، قطعات ۲۲)، آسمانِ رحمت (حمد و نعت ۱۲۳)، آبشارِ رحمت (حمد و نعت اور سلام تعداد۔ ۵۴)] نوٹ یہ پانچ کتب اب کلیاتِ نعت (اعجازِ مصطفیٰ سے آبشارِ رحمت تک) صفحات ۱۱۹۶ کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔

۲۔ غزلوں کا مجموعہ [کاغذ کے سفینے (غزلوں اور نظموں کی تعداد ۸۸) اشاعت ۱۹۷۷ء، غبارِ انا (غزل ۱۵۰) اشاعت ۱۹۹۰ء، لہو کی آبشار (کشمیر پر نظموں کا مجموعہ تعداد ۴۴) اشاعت ۱۹۹۳ء، جذبوں کی زبان (غزلوں کا مجموعہ تعداد ۱۵۷) اشاعت ۱۹۹۹ء، لباسِ غزل (تعداد ۱۸۱) اشاعت ۲۰۰۹ء] نوٹ ان مجموعۂ کلام کے ساتھ مذید اضافہ (غزلوں اور نظموں تعداد ۲۲) کر کے کلیاتِ غزل (صفحات ۱۱۶۸) جولائی ۲۰۱۳ء، شائع کیا گیا ہے۔

۳۔ لمحوں کی زنجیر صفحات ۲۷۰ (نظموں کا مجموعہ تعداد ۱۰۴) اشاعت اکتوبر ۱۹۹۴ء، افکار کی خوشبو صفحات ۲۵۶ (احادیث کا منظوم مجموعہ تعداد ۲۵۰) اشاعت مئی ۱۹۸۷ء، کلیاں پھول ستارے صفحات ۲۴۰ (بچوں کی نظمیں تعداد ۱۴۱) اشاعت جولائی ۲۰۱۶ء، سلامتی کا سفر صفحات ۸۴۹ (مسدس رحمانی منظوم سیرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، پیدائش سے سفرِ آخر) نوٹ منظوم سیرت پہلے دو جلدوں ۱۹۹۹ء میں شائع کی گئی تھی اب ۲۰۱۱ء سے ایک ضخیم جلد میں شائع ہوئی ہے۔

۴۔ مسدس [رفیقِ رسولؐ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) صفحات ۲۷۶، دُعائے رسولؐ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) صفحات ۲۴۰، ضیائے رسولؐ (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ) صفحات ۲۷۴، برادرِ رسولؐ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) صفحات ۲۶۱] نوٹ۔ اب ان چار مجموعوں کو ''عظمتوں کے

مینار'' (منظوم سوانح حیات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین) صفحات ۱۰۵۶ کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

۶۔ غیر مطبوعہ کلام میں ثناء (مجموعۂ حمد)، کلیاتِ حمد و نعت، کلیاتِ غزل دوم تعداد ۵۵۵، کلیاتِ قطعات تعداد تین ہزار، کلیاتِ نظم، سیاسی نظمیں، زیرِ طبع ہیں۔ اُمت کی مائیں (منظوم سوانح حیات اُمہات المومنینؓ) پر کام جاری ہے۔

آپ کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس لیے اپنا کلام شائع نہیں کروا سکے جس کا انہیں دُکھ ہے اور قارئین بھی اچھے، معیاری شاعری سے محروم ہیں۔ وہ ہر حال میں خوش، قناعت کا دامن تھامے ادبی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں، صابر و شاکر ہیں، خلوص اُن کی طبیعت کا خاصہ، ضبط و تحمل ان کا شیوہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی توفیق سے یہ کام ہوا ہے اللہ چاہے گا تو شائع بھی ہو جائے گا۔

شاعر کے ساتھ شام منانا، اُن کے اعزاز میں محفلیں منعقد کرانا اور اُن کی وفات پر تعزیتی جلسے کرنا اُنہیں خراجِ تحسین پیش کرنا اور یاد کرنا اچھا عمل ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اہل سخن اور اُن کے قدر دانوں کو چاہیے کہ اُس شاعر کا غیر مطبوعہ کلام کتابی صورت میں لانے کا انتظام کریں، شاعر کی قدر شناسی اور اُس کی ذات سے محبت و عقیدت کا، یہ بھی عملی اظہار ہے۔

آپ کی شاعری میں اور شخصیت میں دورنگی اور منافقت نہیں ہے، یک رنگی ہے۔ وہ اسلامی ادب کے کارکن ہیں۔ وہ ایک مسلمان شاعر ہیں اور پاکستانی ادب کے معمار ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب بیان کرتے ہیں:

''اعجاز رحمانی منجھے ہوئے پختہ گو شاعر ہیں بڑے بڑے جلسوں میں ان کے اشعار اہلِ جلسہ میں نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ وہ بیک وقت غزل بھی اچھی کہتے ہیں اور مختصر طویل نظمیں بھی اور یہ سب پُر اثر ہوتی ہے'' ۲۷

جناب پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری تحریر کرتے ہیں:

اعجاز رحانی ایک سادہ طبیعت، نیک نفس اور خوش مزاج آدمی ہیں اور اُن کے کردار کے اوصاف کا پرتو اُن کی شاعری میں صاف نظر آتا ہے۔'' ۲۸

آپ کی شاعری پڑھتے ہوئے ایک نئے آہنگ کا احساس پیدا ہوتا ہے آپ نے اچھوتے انداز میں سماج کی عکاسی کی ہے۔ آپ نے ملّتِ اسلامیہ کے اندر بیداری پیدا کرنے کے لیے نعت کو وسیلہ بنایا جو اصلی اور حقیقی وسیلہ ہے۔ خواجہ رضی حیدر تحریر کرتے ہیں:

''اعجاز رحمانی بنیادی طور پر معاشرے میں اسلامی انقلاب کے داعی ہیں لہٰذا دعوت و اصلاح کی

اہمیت و ضرورت سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی نعت گوئی میں جہاں رسول ﷺ سے اظہارِ عقیدت کا وفور موجود ہے وہاں دعوت و اصلاح کا شعور بھی واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ غلامی مصطفیٰ ﷺ کی گواہی ان کا ایک ایک لفظ دیتا ہے لیکن اس اہتمام کے ساتھ جہاں ایک طرف ان کی ذاتی جذبات و احساسات کا اظہار ہو وہاں عام مسلمانوں کے لیے بھی اس میں کوئی ایسا معنوی پہلو موجود ہو جو ان کے دلوں میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی مشعل کو روشن کردے''۔۲۹

اعجاز رحمانی کے کلام میں سادگی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی پائی جاتی ہے، سیدھی سچی باتیں، کسی قسم کا کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے غلطیوں اور کوتاہیوں پر قابو پایا جاسکتا ہے بشرطیکہ ناقدین عدل و انصاف سے کام لے کر تنقید کریں، شاعر کی شخصیت اور نام کو چھوڑ کر اس کی تحریر کو سامنے رکھتے ہوئے زبان و بیان اور مفہوم و خیال کی کمزوریوں کی نشاندہی کی جائے۔ غلطی پر قائم رہنا ابلیسی عمل ہے، غلطی کی اصلاح کرنا اللہ کے بندے کی نشانی ہے اور اسی میں کامیابی و کامرانی کا راز چھپا ہوا ہے۔

اعجاز رحمانی نے پابند شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا اور بہ قید قافیہ و ردیف کے ساتھ شعر کہے۔ آپ نے شاعری کے فنی محاسن اور علمِ عروض کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا، اپنی قوت و صلاحیت کو شاعری کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ نعتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تقریباً ہر صنفِ سخن کے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ پروفیسر حفیظ الرحمٰن احسن صاحب تحریر کرتے ہیں:

''تغزل کے پیرائے میں نعت گوئی کا آغاز مولانا الطاف حسین حالیؒ، علامہ محمد اقبالؒ، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، اصغر گونڈوی اور مولانا ظفر علی خانؒ جیسے شعرائے عظام سے ہوا''۔۳۰

تغزل ہی کے پیرائے میں اعجاز رحمانی نے دو ضخیم مجموعۂ نعت کلیاتِ نعت اور کلیاتِ حمد و نعت تخلیق کیے۔ اور ایک مجموعۂ سیرت ﷺ بعنوان سلامتی کا سفر (مسدس رحمانی) تحریر کیا۔ جناب رحمٰن کیانی تحریر کرتے ہیں:

''کسی اہلِ قلم کا اپنی شعری صلاحیتوں کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے تعلق سے استعمال کرنا اپنی جگہ خود ایک بڑی سعادت ہے''۔۳۱

جناب منظر ایوبی بیان کرتے ہیں:

''نعت گوئی کی سابق تاریخ سے قطعِ نظر عصرِ حاضر میں جن شاعروں نے نبی کریم ﷺ کے اوصاف حمیدہ اور سیرت و کردار کو مرکزِ خیال بنایا ہے اُن میں ممتاز نام اعجاز رحمانی کا ہے''۔۳۲

ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہے۔ اُردو، فارسی اور عربی کا مزاجِ شاعری میں قافیہ، ردیف اور بحرو

وزن بڑی اہمیت اور مناسبت رکھتے ہیں ان کے بغیر شاعری نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے ہر شاعر کو اپنی زبان کا مزاج شناس ہونا چاہیے۔ مذہب میں، شعروادب میں، اخلاق میں اور معاشرے میں جائز پابندیوں سے گریز کی راہیں تلاش نہیں کرنی چاہیے۔ ان پابندیوں میں ہی سیرت و کردار، دل و دماغ جلا پاتے ہیں اور فن کے جوہر کُھلتے ہیں۔

درج ذیل اشعار میں الفاظ کا دروبست دیکھئے جیسے تسبیح کے دانے پروئے ہوئے ہوں، زبان و بیان کا کس قدر لطف پایا جاتا ہے اور کس خوبصورتی کے ساتھ سیرتِ رسول ﷺ کے مختلف پہلو اُجاگر کیے گئے ہیں۔

آپ کی نعت میں توحید ورسالت، مقام نبوت ورسالت پر دل نشین تبصرہ ہے۔ آپ کے اشعار میں اخلاص اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جھلکتی ہے:

ہر ایک عہد تمہارا ہی عہد ہے آقاؐ　　تمہاری ذاتِ گرامی ہے ہر زماں کے لیے
جو نام کلمۂ طیّب میں ہے اذان میں ہے　　وہ نام باعثِ راحت ہے قلب و جاں کیلئے ۳۳
تعلیمِ مصطفیٰؐ سے جو ذہن ہیں منور　　روشن وہی چراغِ توحید کر رہے ہیں ۳۴

حضور اکرم ﷺ سے والہانہ محبت کا ایک نہایت شدید دھارا، شاعر کو اپنے ساتھ بہا لیے جاتا ہے۔ حرمِ مدینہ میں حاضر ہونے کے لیے کتنے بے تاب ہیں۔

جس کو ایمان لوگ کہتے ہیں　　الفتِ مصطفیٰؐ سے ملتا ہے ۳۵
ہر بھلائی کا راستا ہم کو　　آپؐ کے نقشِ پا سے ملتا ہے ۳۶
اس بات سے رضوان کو بھی انکار نہیں ہے　　جنت جسے کہتے ہیں مدینے کی زمیں ہے ۳۷

مدینے کا ذکر کرتے ہوئے اپنی آرزو کا اظہار کرتے ہیں کتنے خوبصورت اشعار کہے ہیں:

مرے حضورؐ اجازت اگر ہو طیبہ میں　　زمین چاہیے تھوڑی سی اک مکاں کے لیے ۳۸
جب بھی کوئے رسولؐ سے گزرے　　ذرّہ ذرّہ چراغِ طور ملا ۳۹
ہے منبعِ الطاف و کرم روضۂ اقدس　　میرے لیے ہر چیز دو عالم کی یہیں ہے ۴۰

معراجِ نبی ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ انسان کی عظمت کا پہلا قدم ہے　　جہاں ختم روح الامیں کا سفر ہو ۴۱
ہم کو معراجِ مصطفیٰؐ کا پتا　　سدرۃ المنتہیٰ سے ملتا ہے
مصطفیٰؐ نے یہ کر دیا ثابت　　آدمی بھی خدا سے ملتا ہے ۴۲

حضور پُرنور ﷺ کی آمد نے دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کی بنیاد رکھی، جس میں ہر قسم کے اندھیر

ے دُور ہوئے۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی اور انسانیت نے سکھ کا سانس لیا، آج کی دُکھی انسانیت کے لیے چین اور سکون صرف سیرت مطہرہ ﷺ پر عمل کرنے میں ہے۔ دینِ حق کی راہ میں دُکھ اور آزمائشیں آتی ہیں، اس پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا مسلمان کا شیوہ ہے، مشکلوں کا حل اسوہ نبی ﷺ میں ہے۔ اس کا اظہار کتنے خوبصورت انداز سے کیا ہے۔

غلامی پر ہے ان کی ناز جس کو — اسی انسان کو انسان کہیے
عمل ہے شرطِ حکمِ مصطفیٰؐ پر — نہو مشکل اگر آسان کہیے ۴۳

کتنا شہِ ابرارؐ کی سیرت پہ عمل ہے — یہ بات ذرا اپنے ہی ایمان سے پوچھو ۴۴

مصطفیٰؐ سے وہ حوصلہ پایا — مشکلوں پر ہمیں عبور ملا ۴۵

حبِ رسول ﷺ سے سرشار ہو کر جب انسان سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی کرتا ہے تو جور رنج و الم اس راہ میں ملتے ہیں اُن پر صبر کرتا ہے تو اس کے لیے نبی رحمت ﷺ کی بشارت ہے۔

ہیں فدا تاجدار آپؐ کے نام پر — ہم تو خادم ہیں شاہ ہدیٰ آپؐ کے ۴۶

شرمساری سے بچا لیجیے محشر کی ہمیں — آج ہم آپؐ کے در پر ہیں رسولِ عربیؐ ۴۷

حضور ﷺ کی سراپا نگاری اور معجز کاری کا بیان پر کتنے خوبصورت اشعار ہیں۔

خورشید و قمر نقشِ کفِ پا ہیں اسی کے — جو ذات ہے مجموعۂ انوار دو عالم ۴۸

معجزہ اخلاق کا ایسا دکھایا آپؐ نے — دشمنوں کو پیار کے قابل بنایا آپؐ نے ۴۹

نبی رحمت ﷺ کی سیرت نگاری بڑی بلیغ صورت میں سامنے لا رہے ہیں:

سوائے سرورِ عالمؐ یہ سیرت اور کس کی ہے — زمانہ سنگ برسائے مگر پر دُعا آئے
کوئی بھی ان کی عظمت کا احاطہ کر نہیں سکتا — زمانہ محوِ حیرت ہے سمجھ میں کس کی کیا آئے ۵۰

شاعر اپنی انفرادی دُکھ اور پریشانی کا ذکر کرتا ہے۔ ان نعتوں میں شاعرانہ تخیل کس بلندی پر ہے ان میں کرب و گداز اور سوز و درد شاعر کا ذاتی نہیں بلکہ پوری ملّت کا درد بن کر سامنے آتا ہے۔ یہ انفرادی نہیں اجتماعی محسوس ہوتا ہے:

کوئی اچھا عمل زیبِ داماں نہیں اپنی بخشش کا کوئی بھی امکاں نہیں
حشر کا دن ہے اور کوئی پرساں نہیں اب ضمانت ہمیں آپؐ کی چاہیے ۵۱

یہ لڑائی یہ جھگڑے ہیں کس کام کے اس سے دشمن مٹیں گے نہ اسلام کے
کاٹ دیتی ہے جو دشمنوں کا جگر سیرتِ مصطفیٰؐ ایسی تلوار ہے ۵۲

جس روحانی اور تہذیبی کرب و گداز نے جنم لیا ہے اس کی گونج درج ذیل شعروں میں پائی جاتی ہے۔

نعت رنگ ۲۸

یہ عالم ہوا چھوڑ کر ان کا دامن | کوئی اِس کا شاکی ، کوئی اُس کا شاکی
جو ہے گامزن جادۂ مصطفیؐ پر | ضرورت اسے کیا کسی رہنما کی ۵۳؎

شاعر نعت میں اپنی حالتِ زار بیان کرتا ہے اور آرزو کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اب مجھ کو چھوڑ بھی دے زمانہ تو غم نہیں | سرکارؐ دو جہاں سے مرا رابطہ تو ہے
سرکارؐ کے کرم کی نہیں کوئی انتہا | میری برائیوں کی مگر انتہا تو ہے ۵۴؎

انسانیت کو ظلمت کے اندھیروں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔

دنیا کے کسی ازم سے ظلمت نہ چھٹے گی | اسلام ہمارے لیے ہر شب کی سحر ہے
تعلیمِ محمدؐ کا نتیجہ ہے یقیناً | اب تک جو زمانے میں صداقت کا اثر ہے ۵۵؎

ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی وجہ بیان کرتے لکھتے ہیں:

جب سے ہم نے ہاتھ سے چھوڑا ہے دامانِ رسولؐ
چل رہی ہے راہِ ہستی میں قیامت ساتھ ساتھ

یقیناً ہے ذوقِ عمل ہی میں خامی | غلامِ نبیؐ اور یوں دربدر ہو ۵۶؎

نہ تھا کوئی انساں کی عظمت سے واقف | بتایا محمدؐ نے انسان کیا ہے
ذرا حال سے اپنے ماضی کو دیکھو | مسلمان کیا تھا مسلمان کیا ہے
جسے دیکھ کر یاد آئے خدا کی | مسلمان کی اور پہچان کیا ہے ۵۷؎

اُمتِ مسلمہ کی کم ہمتی ، بے بسی کو دیکھ کر شاعر پکار اُٹھتا ہے کہ آؤ اپنا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد کریں جس کے ذریعے ہم اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکیں۔ وہ سبق یہ ہے کہ اپنے مسلمان ہونے کے تقاضے پورے کریں۔

ہر شخص اپنا سیرت و کردار دیکھ لے | آئینہ بن کے سب کے مقابل حضورؐ ہیں
ہم تک پہنچ سکے گا نہ سیلاب کفر کا | بن کر پناہ راہ میں حائل حضورؐ ہیں ۵۸؎

کتنی خوبصورتی کے ساتھ پوری ملت کا درد بیان کیا ہے۔ انفرادی کرب اور گداز کے مقابلے میں ایک اجتماعی کرب وگداز کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ کہ آج اُمتِ مسلم کفر کے لیے تر نوالہ بنی ہوئی ہے۔

پیرویٔ سیّدِ ابرارؐ ہونا چاہیے | لب پہ قرآں ہاتھ میں تلوار ہونا چاہیے
درس دیتا ہے یہ اخلاقِ محمد مصطفیؐ | ٹکڑے ٹکڑے ظلم کی تلوار ہونا چاہیے
آخری سورج نبوّت کا ہے کب سے جلوہ گر | آدمی کو خواب سے بیدار ہونا چاہیے ۵۹؎

ملت کے اجتماعی مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ اس کا حل سیرت ﷺ کی روشنی میں بتایا ہے۔

نقشِ پائے نبیؐ جلوہ گر ہوں جہاں
اہلِ ایماں کو وہ رہ گزر چاہیے ۶۰؎

اعجاز رحمانی کی نعت نگاری میں یہ خوبی ہے کہ سیرت نگاری کے روشن چراغ، تمام نعتوں میں جگمگ جگمگ کرتے دکھائی دیتے ہیں جن کی مثالیں اُن کے مجموعۂ کلام میں موجود ہیں۔ قدرتِ بیان دیکھیے، کس سلیقہ اور حسن و خوبی کے ساتھ مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔ کسی قسم کا الجھاؤ اور ابہام نہیں، شعر پڑھنے میں کوئی دقت نہیں۔ اشعار پڑھنے میں وجدان کے ساتھ نطق بھی لذت یاب ہوتا ہے! خیال و اظہار کس درجہ مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ، اُن کے اشعار فن عروض پر بھی پوری اترتے ہیں۔ جناب محسن بھوپالی اظہارِ خیال کرتے ہیں:

اعجاز رحمانی نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا جس پر وہ آج تک قائم ہیں لیکن غزل گوئی کے ساتھ ساتھ انہوں نے ملکی سیاست اور اس کی نیرنگی کو اپنے مخصوص نظریے کے تحت تجزیہ کرتے ہوئے شاعری کا موضوع بھی بنایا ہے اور وہ اس رنگِ سخن میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ صفات اور تعلیمات کو بھی نعت اور نظموں کی صورت میں پیش کیا ہے اور اہلِ صدوصفا اور اربابِ سخن سے یکساں طور پر بھرپور دادِ سخن حاصل کی۔ ''سلامتی کا سفر'' میں شروع سے ہی انہوں نے شوکتِ الفاظ، زورِ بیاں، سلاست اور روانی کو قابلِ رشک انداز میں اختیار کرتے ہوئے مصرعے بہم پہنچائے ہیں'' ۶۱؎

اعجاز رحمانی کے نعتیہ اشعار پڑھ کر اور سن کر اہلِ نظر اور اربابِ ذوق جھوم اُٹھتے ہیں کہ معراجِ سخن پر طبع آزمائی خدا کی دَین ہے یہ دولت محترم اعجاز رحمانی کو رب کی طرف سے وافر مقدار میں ملی ہے۔ ایسے لوگ ہی خوش قسمت ہوا کرتے ہیں۔ آپ کی زبان ستھری، نکھری ہوئی اور بامحاورہ ہے اور اشعار اثر انگیز ہیں۔ کیفیت اور کمیت ہر دو اعتبار سے آپ کا کلام سبقت لے گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی صاحب تحریر کرتے ہیں:

''اعجاز رحمانی پاکستان کے ایک قادرالکلام، صحیح الفکر اور روشن دماغ شاعر ہیں، شاعری کو انہوں نے پیغمبری کی صفات کا ترجمان بنایا ہے۔ ان کی شخصیت اور فن میں جو توازن، رکھ رکھاؤ اور نظریاتی بالیدگی و جذباتی گہرائی ہے وہاں نہیں ان بے فکر و منتشر الخیال شعرا سے ممتاز کرتی ہے جو فکر و خیال کی وادی میں سرگرداں رہتے ہیں۔'' ۶۲؎

ابلیسی جال نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے انسانیت تڑپتی، سسکتی اور مرتی نظر آرہی ہے۔ مسلمان بھی اس سنہری جال میں پھنستے جارہے ہیں، ناخدا شیطان کے چیلوں کے اشاروں پر ناچ

رہے ہیں، اور سامنے آندھی اور طوفان آرہے ہیں، ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہے، حرص و ہوس کے بندے درندوں کی طرح انسانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں، سامراج کی پیدا کردہ معاشی لوٹ مار اور تہذیبی ڈاکہ زنی کا درد ہے جو اپنے جلو میں اندھیر لیے ہوئے ہے۔ رات اندھیری ہے اور اس پر بادِ مخالف نے بھی اپنا وزن ڈال دیا ہے، بحر طوفان خیز اور ناؤ کا لنگر غائب ہے، ناخدا نشے میں ہے ایسے میں شاعر اپنے خالق و مالک سے فریاد کرتا ہے۔

معرکۂ نُور و ظلمت میں ہدایت و روشنی صرف سیرتِ رسول ﷺ میں ہے۔ جسمانی غلامی کے مقابلے میں ذہنی غلامی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ کل کے مقابلے میں آج ملّتِ اسلامیہ شدید عذاب میں مبتلا ہے۔ ملّتِ کفر کی ریشہ دوانیاں ہیں، سازشیں ہیں، ہر طرف مکاریوں اور چالاکیوں کے جال تنے ہوئے ہیں، تہذیبِ مُسلم پر تہذیبِ کفر کی یلغار ہے۔

ملّت! کل بھی لرزاں، ترساں تھی اور آج بھی حالت دگرگوں ہے بلکہ پہلے سے بھی حالت زیادہ خراب ہے۔ سامراج آج زوروں پر ہیں شاعر کی فریاد سینے بھی اسلام پسند شعرا کی دہائی ہے۔

جب کسی کے ہاتھ دُعا کے لیے اٹھے ظلمت میں تو نے کر دیے روشن وہیں چراغ ۶۳

مشکل کو حل کرنے والا کوئی نہیں ہے تیرے سوا پربت کر دے رائی کو مجبور کو تو مختار کرے ۶۴

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو زبان میں نعت گوئی کی تحریک عروج کی طرف رواں دواں ہے۔ سیرتِ رسول ﷺ اور نعت نگاری کا دورِ عروج ضیاالحق کا دورِ حکومت ہے۔ جس میں سیرت نگاروں اور نعت گو حضرات کی تالیفِ قلب کی گئی اور کتب کی اشاعت میں سرکاری طور پر تعاون کیا گیا۔ جس تیزی کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کیے ہیں۔ اُردو زبان میں شاعری کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے لیکن اس سے زیادہ حیرت و پریشانی کی بات یہ کہ تنقید نگاروں نے اس اہم واقعہ کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، ناقدین نے عروجِ سخن کو زبان و بیان، فنی محاسن اور علمِ عروض کے معیار پر نہیں پرکھا۔ اگر کسی نے نوٹس لیا بھی ہے تو سرسری انداز سے، جس طرح اس کا حق بنتا تھا یا یوں کہیے کہ جس طرح دیگر اصنافِ سخن مثلاً غزل پر بحث و مباحثہ اور تذکرہ و تبصرہ کیا گیا ہے نعت کو اُتنی اہمیت نہیں دی۔

دورِ حاضر میں نعت پر تنقیدی کام ہوا ہے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے منظرِ عام پر آئے ہیں اور مزید تحقیقی مقالے بھی لکھے جا رہے ہیں، شائع ہو رہے ہیں اور اتنی ہی اشاعت کے انتظار میں پڑے ہیں۔ بہت سے رسالے اور مجلّے جو حمد و نعت کے حوالے سے شائع ہو رہے ہیں مثلاً سہ ماہی فروغِ نعت اٹک، ششماہی نعت رنگ کراچی، ماہنامہ ارمغانِ حمد کراچی، کتابی سلسلہ جہانِ نعت کراچی، کتابی سلسلہ جہانِ حمد کراچی اور دیگر ماہنامے، مجلّے، کتابی سلسلے بھی مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ نعتیہ کلام پر مشتمل بے

شمار کتب شائع ہو چکی ہیں اور لاتعداد اشاعت کے انتظار میں پڑی ہیں۔ اب یہ ایک کاروان نعت ہے۔ جس کا سفر جاری ہے اور جس کا زادِ سفر سیرت سرورِ عالم ﷺ ہے۔

ہر ادیب اور شاعر کی تخلیقات ایک جیسی نہیں ہوتی، ان میں کوئی بہتر، بہترین اور اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں، ان کی کاوشیں قابلِ قدر ہیں۔ اب تو بیشتر نعت گو حضرات نے حالؔی، اقبالؔ اور مولانا ظفرؔ کی پیروی میں نعتیں کہتے ہیں جن کو پڑھنے اور سننے سے ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے خصوصاً نوجوانوں میں بیداری کی ایک لہر سی پیدا ہو رہی ہے کہ وہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے متحرک نظر آتے ہیں۔

اعجازؔ رحمانی میں ایک سچے مسلمان اور عاشقِ رسول ﷺ ہیں۔ نعت ان کی پہچان اور تعارف بن چکا ہے۔ جناب سرشارؔ صدیقی تحریر کرتے ہیں:

''اعجاز رحمانی کی بنیادی شناخت مدحتِ خیر البشر ﷺ ہے۔ یہ اسلام کے نام پر سیاسی نعرہ بازی کے دور سے پہلے ہی اپنے جذبوں کے تقاضوں کے شعری اظہار کے لیے نعت کا اسلوب منتخب کر چکے تھے اور اب اس حوالے سے اپنی ایک حیثیت رکھتے ہیں'' ۶۵

جو شاعر قول و عمل میں یکسانیت رکھتا ہے اس کا کلام پُر اثر ہوتا ہے اس کی نعتیں شیریں اور پُر تاثیر ۔ وہ اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں وہ ایسا اثر کرتی ہیں کہ ہم اس کے دھارے میں بہ جاتے ہیں۔ ایسے ہی نعت گو شاعر اعجازؔ رحمانی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں روحانی اور جسمانی صحت عطا فرمائے۔ آمین

یہ بھی ہے اعجاز اعجازِ ثنائے مصطفےٰ
بے ادب دنیا میں گنجائش ادب کی ہو گئی ۶۶

حواشی و حوالہ جات

۱:۔ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ماہرؔ القادری حیات و اور ادبی خدمات، ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور، اپریل ۲۰۰۲ء، صفحہ ۵۵۔ ۲:۔ الحاج مولوی فیروز الدین ؒ، فیروزُ اللُّغات اُردو جامع فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، ۲۰۱۰ء، صفحہ ۱۳۶۶۔ ۳:۔ رفیع الدین ہاشمی ڈاکٹر، اصنافِ ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۶۔ ۴:۔ ڈاکٹر شہزد احمد، نعت گوئی تحقیق و تجزیاتی مطالعہ، سہ ماہی فروغ نعت اٹک شمارہ نمبر ۴، اپریل مئی جون ۲۰۱۴، مدیر سید شاکر القادری چشتی نظامی صفحہ ۶۵۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی اُردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر، صفحہ ۶۲، ۶۳۔ ۵:۔ ڈاکٹر شہزد احمد، نعت گوئی تحقیق و تجزیاتی مطالعہ، سہ ماہی فروغ نعت اٹک شمارہ نمبر ۴، اپریل مئی جون ۲۰۱۴، مدیر سید شاکر القادری چشتی نظامی، صفحہ ۶۵۔ ڈاکٹر عاصی کرنالی اُردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر، صفحہ ۴۷۔ ۶:۔ ڈاکٹر شہزد احمد، نعت گوئی تحقیق و تجزیاتی مطالعہ، سہ ماہی فروغ نعت اٹک شمارہ نمبر ۴، اپریل مئی جون ۲۰۱۴، مدیر سید شاکر القادری چشتی نظامی، صفحہ ۶۸۔ ۷:۔ پروفیسر محمد اکرم رضا، کاروانِ نعت کا شوقِ منزل آشنائی، نعت رنگ کراچی، نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ نمبر ۱۵، مرتب صبیح الدین صبیح رحمانی، صفحہ ۵۸۔ ۸:۔ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ماہر القادری حیات و اور ادبی خدمات، ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور، صفحہ ۵۸۔ بحوالہ دیباچہ 'مخزنِ نعت' (مجموعۂ نعت) مرتبہ پروفیسر محمد اقبال جاوید، علمی کتاب خانہ لاہور: مارچ ۱۹۷۹ء، صفحہ ۳۸۔ ۹:۔ ڈاکٹر

عزیز احسن، مقالہ نعتیہ ادب میں تنقید کی اہمیت، سہ ماہی فروغ نعت اٹک، شمارہ اوّل (جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۱۳ء)، مدیر سید شاکر القادری چشتی نظامی، صفحہ ۹۵۔ ۱۰:۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۲۱، ترجمۂ قرآن مجید، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، صفحہ نمبر ۱۰۶۳۔ ۱۱:۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترجمۂ قرآن مجید سورہ ال عمران آیت نمبر ۳۱، ادارہ ترجمان القرآن لاہور، فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ نمبر ۱۵۳۔ ۱۲:۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترجمۂ قرآن مجید سورۂ الم نشرح آیت نمبر ۴ ادارہ ترجمان القرآن لاہور، فروری ۱۹۹۵ء، صفحہ نمبر ۱۵۵۷۔ ۱۳:۔ منصور ملتانی، اردو میں منظوم سیرت نگاری۔۔۔ ایک جائزہ، صبیح الدین صبیحؔ رحمانی نعت رنگ کراچی، نعتیہ ادب کا کتابی سلسہ نمبر ۱۵، صفحہ ۱۶۳۔ ۱۴:۔ پروفیسر محمد اکرم رضا، کاروانِ نعت کا شوقِ منزلِ آشنائی، صبیح الدین صبیحؔ رحمانی، نعت رنگ کراچی، نعتیہ ادب کا کتابی سلسہ نمبر ۱۵، صفحہ ۷۲۔ ۱۵:۔ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ماہر القادری حیات اور ادبی خدمات، ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور، صفحہ ۶۲۔ ماہنامہ شام وسحر لاہور، نعت نمبر جلد ۲ صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷۔ ۱۶:۔ پروفیسر محمد اکرم رضا، کاروانِ نعت کا شوقِ منزل آشنائی، نعت رنگ کراچی، مرتب صبیح الدین صبیحؔ رحمانی نعتیہ ادب کا کتابی سلسہ نمبر ۱۵، صفحہ ۷۷۔ ۱۷:۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، سورہ المآ ئدۃ آیت نمبر ۱۰۰، تفہیم القرآن جلد اوّل، ادارہ ترجمان القرآن لاہور صفحہ نمبر ۵۰۶، ۵۰۷۔ ۱۸:۔ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ماہر القادری حیات داور ادبی خدمات، ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور، صفحہ ۵۸، ماہنامہ شام وسحر لاہور، نعت نمبر جلد ۲ صفحہ ۱۰۸۔ ۱۹:۔ نعت رنگ کراچی، نعتیہ ادب کا کتابی سلسہ نمبر ۱۵، صفحہ ۵۷، مرتب صبیح الدین صبیحؔ رحمانی، مقالہ: کاروانِ نعت کا شوقِ منزل آشنائی از پروفیسر محمد اکرم رضا۔ ۲۰:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۴۲، ۴۳، اعجازؔ رحمانی، مکان نمبر اے۔ ۴۴، سیکٹر ایم۔ ۵، نارتھ کراچی۔ ۲۱:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۴۔ ۲۲:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۷۔ ۲۳:۔ کلیاتِ نعت صفحہ نمبر ۳۹، ۷۔ ۲۴:۔ اعجازؔ رحمانی، افکار کی خُوشبُو، اشاعت اوّل۔۔ ۱۹۸۷ء، بار دوم۔۔ ۱۹۸۹ء، زیرِ اہتمام: بزمِ قرطاس وقلم پاکستان (رجسٹرڈ) ایوانِ ادب بی۔ ۱۶۰، بلاک نمبر ۱۰، گلشنِ اقبال کراچی، صفحہ بیک ٹائٹل۔ ۲۵:۔ کلیاتِ نعت صفحہ نمبر ۳۶، ۷۔ ۲۶:۔ اعجازؔ رحمانی، افکار کی خوشبو، صفحہ بیک ٹائٹل۔ ۲۷:۔ اعجازؔ رحمانی، سلامتی کا سفر، صفحہ بیک ٹائٹل، ناشر بزمِ احباب کراچی، اعجاز رحمانی، مکان نمبر اے۔ ۴۴، سیکٹر ایم۔ ۵، نارتھ کراچی۔ ۲۸:۔ اعجازؔ رحمانی، افکار کی خوشبُو، صفحہ بیک ٹائٹل۔ ۲۹:۔ کلیاتِ نعت صفحہ نمبر ۳۶، ۷۔ ۳۰:۔ ماہرؔ القادری، ذِکرِ جمیل، طبع جدید مرتبہ طالب ہاشمی، بزمِ فاران لاہور، صفحہ ۱۳۔ ۳۱:۔ اعجاز رحمانی، افکار کی خُوشبُو، صفحہ بیک ٹائٹل۔ ۳۲:۔ اعجازؔ رحمانی، افکار کی خُوشبُو، صفحہ بیک ٹائٹل۔ ۳۳:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۴۵۔ ۳۴:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۴۔ ۳۵:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۲۔ ۳۶:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۳۔ ۳۷:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۰۔ ۳۸:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۸۲۹۔ ۳۹:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۹۔ ۴۰:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۱۔ ۴۱:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۴۰۔ ۴۲:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۳۔ ۴۳:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۴۷۔ ۴۴:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۴۹۔ ۴۵:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۹۔ ۴۶:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۵۹۸۔ ۴۷:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۶۰۰۔ ۴۸:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۶۵۲۔ ۴۹:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۶۵۳۔ ۵۰:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۶۴۸۔ ۵۱:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۱۰۹۳۔ ۵۲:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۱۰۹۸۔ ۵۳:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۴۵۱۔ ۵۴:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۴۵۵۔ ۵۵:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۳۵۔ ۵۶:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۴۱۔ ۵۷:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۳۸۹، ۳۹۰۔ ۵۸:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۳۹۔ ۵۹:۔ کلیاتِ نعت۔ ۶۰:۔ کلیاتِ نعت صفحہ ۳۳۔ ۶۱:۔ سلامتی کا سفر، صفحہ ۷، ۸۔ ۶۲:۔ کلیاتِ نعت، صفحہ نمبر ۴۹۱ صفحہ ۴۳۹، ۴۴۰۔ ۶۳:۔ کلیاتِ نعت، صفحہ ۴۱، ۷۔ ۶۴:۔ کلیاتِ نعت، صفحہ ۴۰۷، ۱۔ ۶۵:۔ افکار کی خُوشبُو از اعجازؔ رحمانی، صفحہ بیک ٹائٹل۔ ۶۶:۔ کلیاتِ نعت، صفحہ ۱۸۲۔

مآخذ:

۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترجمۂ قرآن مجید، ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔

۲۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن جلد اوّل، ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔

۳۔ کلیاتِ نعت، اعجاز رحمانی، مکان نمبر اے۔۴۴، سیکٹر ایم۔۵، نارتھ کراچی۔

۴۔ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ماہر القادری حیات واور ادبی خدمات، ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور، اپریل ۲۰۰۲ء۔

۵۔ الحاج مولوی فیروز الدینؒ، فیروز اللغات اُردو جامع فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔

۶۔ رفیع الدین ہاشمی ڈاکٹر، اصنافِ ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

۷:۔ سہ ماہی فروغِ نعت اٹک، شمارہ اوّل (جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۱۳ء)، شمارہ نمبر ۴، اپریل مئی جون ۲۰۱۴، مدیر سید شاکر القادری چشتی نظامی۔

۸۔ نعت رنگ کراچی، نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ نمبر ۱۵، مرتب صبیح الدین صبیح رحمانی۔

۹۔ اعجاز رحمانی، افکار کی خوشبو، اشاعت اوّل۔۔۱۹۸۷ء، باردوم۔۔۱۹۸۹ء، زیرِ اہتمام: بزمِ قرطاس وقلم پاکستان (رجسٹرڈ) ایوانِ ادب بی۔۱۶۰، بلاک نمبر ۱۰، گلشنِ اقبال کراچی۔

۱۰:۔ اعجاز رحمانی، سلامتی کا سفر، ناشر بزمِ احباب کراچی۔

۱۱۔ ماہر القادری، ذکرِ جمیل، طبع جدید مرتبہ طالب ہاشمی، بزم فاران لاہور۔

☆ محمد شفیق اعوان، محلہ منشیاں، گاؤں وڈاک خانہ شمس آباد، تحصیل حضرو، ضلع اٹک، پوسٹ کوڈ نمبر ۴۳۴۹۰، موبائل نمبر ۰۳۰۸۵۰۴۰۰۲۴، ۰۳۰۳۲۶۵۹۴۳۶

☆☆☆

تنویر اعظم، گوجرانوالہ

پروفیسر محمد اکرم رضا کی خدماتِ نعت

Abstract: Allama Professor Muhammad Akram Raza was an eminant and well konown Urdu poet and prose writer particularly Urdu Naat poet and Naat Research Scholar of his age.By his name I feel shelters of his sweet and fragrant memories in myself.He was born on 15 January 1946 in Kotli Nawab Saad Ullah Khan a village of Thesil Kamonki District Gujranwala. His editorial journey starts from the magazine of Govt. Islamia College Gujranwala.He also worked for the "Mehak" literary magazine of Govt. College Gujranwala with his colleague Professor Muhammad Iqbal Javed a research scholar of naat and writer of several books. They published some particular numbers of "Mehak" such as "Seerat Number", "Golden Jubili Number" and "Gujranwala Number".

ضلع گوجرانوالا میں ہر صنفِ ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے اللہ رب العزت نے ایسی ایسی نابغہء روزگار ہستیاں بھیجی ہیں، جو اپنے میدان میں یکتا و لاثانی ہیں۔ اگر صحافت کے میدان پر نظر ڈالیں تو مولانا ظفر علی خاں کے جوڑ کا صحافی صحافت کے میدان میں نظر نہیں آتا۔ آپ کو بابائے صحافت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پنجابی ادب پر نظر دوڑائیں تو ڈاکٹر فقیر محمد فقیر بابائے پنجابی کا نام سامنے آتا ہے۔ رنگِ غزل میں عبد الحمید عدم کی ذات پر نظر پڑتی ہے۔ نعت گوئی میں حفیظ تائب نہ صرف گوجرانوالا بلکہ پورے پاکستان میں ایک جانا پہچانا نام تھے۔ نعت گوئی کی اشاعت اور فروغ میں محمد اقبال نجمی ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر تنقیدِ نعت کے حوالے سے دیکھیں تو پروفیسر محمد اکرم رضا کے علاوہ اتنا معتبر اور کوئی نام نظر نہیں آتا۔ پروفیسر محمد اکرم رضا اگر چہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں، لیکن آپ کا مرغوب اور محبوب میدان ''تنقیدِ نعت'' ہے۔

پروفیسر محمد اکرم رضا ایک صاحبِ اسلوب نعت گو شاعر ہیں۔ آپ نے کالج کے زمانے سے لے کر آج تک نعت کے چمنستان کی آب یاری کی ہے۔ کالج کے زمانے میں آپ اسلامیہ کالج گوجرانوالا کے ادبی مجلّہ کے مدیر رہے ہیں اور اپنے علمی و ادبی سفر کو جاری رکھتے ہوئے خاص طور پر نعت گوئی کے

میدان کے فاتح قرار پائے۔ آپ نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان اصناف میں ادبی نظریہ ''ادب برائے زندگی'' کے قائل ہیں اور یہ نظریہ آپ کے کلام سے عیاں ہے۔ غزل کو محبوبِ مجازی سے چھیڑ چھاڑ یا عشوہ و غمزہ نہیں بننے دیا بلکہ غمِ دوراں آپ کی غزل پر حاوی ہے۔ آپ کا یہی ذہنی رجحان آپ کو غزل سے نعت کی طرف موڑ لے گیا اور اس کے بعد نعت گوئی اور تنقیدِ نعت آپ کی زندگی کا نصب العین قرار پائیں۔ آپ نے تنقیدِ نعت کے لیے اس وقت قدم اُٹھایا، جب ادبی رسائل کے مدیران نعت کو رسائل میں شائع کرنے سے گریزاں تھے۔

> ''پروفیسر محمد اکرم رضا تنقیدِ نعت کے حوالے سے بڑا نام رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو بالواسطہ اور براہِ راست پرکھتا رہتا ہوں، مجھے یہ جان کر خوشبو رہی ہے کہ جنابِ رضا نے محدث بریلوی کی نعت گوئی کے حوالے سے مختلف گوشوں پر قلم اُٹھایا ہے۔ جنابِ رضا کا قلم نقد و نظر کے تقاضوں سے باخبر ہے۔ تاریخ اور تحقیق و جستجو پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی نثر پر بھی شعریت کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی نثری دل آویزی انھیں تحقیق و تنقید کے جادہ سے بھٹکنے نہیں دیتی۔'' (1)

آپ کے نعت پر تنقیدی مضامین کی طرف رجحان کی وجہ سے عرصہ دراز سے نعت کہنے کے باوصف آپ کا کوئی نعتیہ مجموعہ تاحال منظرِ عام پر نہیں آیا۔ حالاں کہ اگر آپ کے نعت کے مسودے کو شائع کیا جائے تو کم از کم چار کے لگ بھگ نعتیہ مجموعے بن سکتے ہیں۔ حفیظ تائب آپ کی نعت شناسی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''پروفیسر محمد اکرم رضا بہ یک وقت ممتاز نقادِ نعت بھی ہیں اور معروف شاعرِ رسالت مآب ﷺ بھی۔ اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو دونوں میدانوں میں ان کا لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ تنقید سنجیدگی، تحقیق اور ذوقِ جستجو سے عبارت ہے، جب کہ نعت گوئی وفورِ عشق، عشق کے والہانہ پن اور جذباتِ عقیدت کی ہر آن اُڑان کا نام ہے۔ محمد اکرم رضا اس لحاظ سے خوش بخت ہیں کہ تنقید اور نعت دونوں سے انصاف کر گئے۔ انھوں نے تنقید رقم کرتے ہوئے حضور نبی کریم ﷺ کے پُر تقدس جلوؤں کو مدِ نظر رکھا اور جب نعت لکھی تو ممدوحِ نعت ﷺ کے تصورات میں گم رہے۔ تحقیق و تنقید اور نعت و مدحت کی دنیاؤں میں ایک ہی وقت میں سرخروئی سے ہم کنار ہونے کا سبب یہ ہے کہ پروفیسر رضا بنیادی

طور پر نعت گو شاعر ہیں۔ ایسا نعت گو ثنائے حبیب ﷺ میں کھوئے رہنے ہی کو حاصلِ حیات سمجھتا ہے۔" (2)

پچھلے ساٹھ سال سے آپ فکرِ نعت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ نعت گوئی سے لے کر تنقیدِ نعت کو آپ حاصلِ حیات سمجھتے ہوئے اس طرح قلم کی روشنی بکھیر رہے ہیں جیسے طلوعِ آفتاب کا منظر نظر میں ہو۔ ایک محبِ نعت حافظ منور حسین سرمد آپ کے نعت کے فکری پہلوؤں کو اس طرح اُجاگر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

"عصرِ حاضر کے ان خوش بخت نعت گو شعرا میں جنھوں نے ایک طویل عرصہ سے نعت گوئی کو حاصلِ زندگی بنا رکھا ہے، ایک اہم اور معتبر نام معروف نعت گو شاعر پروفیسر محمد اکرم رضا کا ہے۔ آپ کا شمار ان انتہائی بلند قسمت شعرا میں ہوتا ہے، جن کو ربِ کریم نے نعتِ حضور اکرم ﷺ کے صدقے میں بہت سے ادبی و لسانی اور فکری و فنی خصائص سے نواز رکھا ہے۔ آپ محض نعت گو شاعر ہی نہیں بلکہ ممتاز نقادِ نعت بھی ہیں۔ نعتیہ نقد و نظر کے حوالے سے ان کے نعتیہ تنقیدی مضامین وقت سے وطنِ عزیز کے معروف رسائل و جراید کی زینت بن رہے ہیں، جب آج کے کئی اصحابِ نقد و نظر اس جانب متوجہ بھی نہیں ہوئے تھے۔ ماہ نامہ "شام و سحر" لاہور کے تمام ضخیم نمبر آپ کی نعتیہ فکری تگ و تاز کے امین ہیں۔" (3)

اگر یہ کہا جائے کہ ہر دور نعت کا دور ہے تو اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کیوں کہ خالقِ اکبر خود سرورِ کون و مکاں ﷺ کا مدحت نگار ہے اور وہ ہر دور میں زندہ و قائم ہے اور اللہ رب العزت کا یہ وعدہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر بلند رکھا جائے گا۔ اس لیے اس نے ہر دور میں نعت گوئی کے حوالے سے ایسی ہستیوں کا انتخاب کیا جو پیکرِ نعت کو اپنے لیے باعثِ رحمت و برکت سمجھتی ہیں۔ ہر دور کے لیے ایک نہ ایک نمائندہ ہوتا ہے جو اپنے علاقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ پروفیسر محمد اکرم رضا نعت گوئی اور نقدِ نعت کے ایسے ہی نمائندہ ہیں جو اپنے دور اور اپنے شہر کے لیے فکرِ نعت کے لیے ایک قابلِ صد احترام مقام کے حامل ہیں۔

پروفیسر محمد اکرم رضا 1946ء کوٹلی نواب سعد اللہ خاں میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمری سے شعر و ادب سے منسلک رہے ہیں۔ مختلف کالجوں میں ملازمت کے دوران آپ ادبی مجلسوں کے مدیر رہے۔ محکمہ تعلیم گوجرانوالا کے رسالہ "تحریک" کے مدیر اور اخبار "قومی دلیر" کے ادارتی عملے میں شامل رہے۔ شعری ذوق فطری ہے اور وہ اس ذوق کو عطائے خداوندی گردانتے ہوئے اسے نعتِ رسولِ مقبول ﷺ کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں۔ آپ نے اگرچہ ابتدا میں غزل میں طبع آزمائی کی اور غزل بھی اپنے اندر

مقصدیت کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کے باوجود آپ کے والدِ محترم نے آپ کو غزل کی کج راہوں میں بھٹکنے سے منع کیا، جس سے آپ کا رجحان مکمل طور پر نعت کی طرف ہوگیا۔ 1993ء میں ''سلام بہ حضور سید الانام ﷺ'' کے عنوان سے 32 صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ شائع ہوا، جو حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آپ کا سلام ہے اور اس کو مثنوی کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ اس کی بحر حفیظ جالندھری کے سلام جیسی ہے۔ یہ سلام 203 اشعار پر مشتمل ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید اس کے بارے میں یوں رائے زنی کرتے ہیں:

''پروفیسر محمد اکرم رضا کو اللہ تعالیٰ نے سوزِ دل کے ساتھ سازِ نوا بھی عطا کیا ہے۔ ان کی تحریر و تقریر میں مفہوم کی وسعت کے پہلو بہ پہلو الفاظ کی شوکت بھی نمایاں ہوتی ہے۔ ترصیع کی نادرہ کاریاں اور بدیع کی فسوں سازیاں، ان کے قلم کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ مگر ان کا یہ سلام پڑھ کر مجھے ایک خوش گوار حیرت ہوئی ہے کہ اس میں نہ تراکیب و تشبیہات کی مشکل پسند پیچیدگیاں ہیں اور نہ تلمیحات و استعارات کی مجاز آفرینیاں، بلکہ دردِ دل کا وہ بے ساختہ اظہار ہے جو پلکوں پر لرزنے والے آنسوؤں میں ہوتا ہے۔ یہ سلام جمالِ رسالت ﷺ اور کمالِ سیرت کا ایک ایسا مترنم اظہار ہے کہ روانی، سلاست اور سادگی اس کا حسن ہے۔ میں اظہار کی اسی بے ساختگی کو اس کی اہم خصوصیت سمجھتا ہوں۔'' (4)

آپ کے لکھے گئے سلام میں سے نمونہ کے لیے کچھ اشعار پیش ہیں:

سلام اس پر جو بن کر دہر میں جانِ بہار آیا
وہ آیا تو یکایک بے قراروں کو قرار آیا
سلام اس پر کہ جو حق و صداقت کا پیامی ہے
محمد مصطفیٰ جس ذات کا اسمِ گرامی ہے
سلام اس پر کہ جس نے سادگی کا راز بتلایا
سلام اس پر کہ جس نے پرچمِ ایمان لہرایا
سلام اس پر کہ جس کا فقر ہے اعزازِ سلطانی
ہے جس کی ذات وآل مظہرِ انوارِ یزدانی (ص:8)
سلام اس پر جہاں کو جس نے ذلت سے نکالا ہے
جہالت سے بچا کر علم کے رستے پہ ڈالا ہے
سلام اس پر کہ انسانوں کو انساں کر دیا جس نے
غلاموں کو زمانے بھر کا سلطاں کر دیا جس نے
سلام اس پر سکونِ بزمِ عالم جس کا روضہ ہے
وہ جس کی ہر جھلک حسنِ نظر جانِ تمنا ہے
(ص:20)

سلام اس پر درود اس پر جو مقصودِ زمانہ ہے
سلام اس پر درود اس پر جو محمودِ یگانہ ہے
سلام اس پر کہ جس کا معجزہ قرآنِ ربی ہے
سلام اس پر کہ جس کی ہر ادا فرمانِ ربی ہے
سلام اس پر کہ جس پر مٹنے والے مر نہیں سکتے
ادا حق جس کی رحمت کا کبھی ہم کر نہیں سکتے

سلام اس پر جو ہے مصداقِ اتمامِ نبوت کا
سلام اس کو رضا پہنچے مرے حسنِ عقیدت کا
(ص:32)

پروفیسر محمد اکرم رضا کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے شائع ہونے والی یہی تصنیف ہے۔ اگرچہ آپ نے نعتیں بہت زیادہ لکھی ہیں، لیکن تنقیدی مصروفیات کی وجہ سے آپ کوئی اور نعتیہ مجموعہ شائع نہ کروا سکے۔ اگر آپ کے نعتیہ کلام کے مسودات کو شائع کروایا جائے تو اس سے کئی نعتیہ مجموعے بن سکتے ہیں۔ آپ کی نعتیہ شاعری میں جذب و شوق کی انتہا ہے۔ آپ کی نعت میں سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرت اور خلقِ عظیم کی جھلک بڑی واضح نظر آتی ہے اور شاعر اہلِ ایمان کو بھی آپ ﷺ کی سیرت سیکھنے کا درس دیتے ہیں، اس طرح اگر غور کیا جائے تو نعت کا پیغام ہی سرورِ دو جہاں ﷺ کی تعلیمات کا درس دینا ہے۔ پروفیسر محمد اکرم رضا جیسے بلند فکر شاعر کا اسلوبِ بیاں اتنا پُر تاثیر ہے کہ آپ کی نعت گوئی میں براہِ راست واعظانہ پن نہیں بلکہ آپ اسوۂ حسنہ کی پیروی کی ہدایت کرتے ہیں تو بھی ایسے لگتا ہے کہ خلقِ عظیم کو دل و جاں میں بسانے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ کا اسلوبِ نعت ملاحظہ ہو:

خلقِ احمدؐ یوں دل و جاں میں بسایا جائے
دشمنِ جاں کو بھی سینے سے لگایا جائے
قلبِ مومن میں ہو پھر عشقِ محمدؐ کا وفور
نغمۂ شوق زمانے کو سنایا جائے
پھر شبِ تار سے ایماں کے اُجالے پھوٹیں
یوں چراغ آپؐ کی سیرت کا جلایا جائے (5)
دہر کو سیرتِ سرکارؐ سکھا دی جائے
سنگ باری جو کرے کوئی دعا دی جائے
جو ہیں محرومِ ثنا خوانیِ شاہِ بطحا
یا خدا ان کو بھی توفیقِ ثنا دی جائے
آپؐ کے حکم سے بڑھ کر کوئی منشور نہیں
یہ حقیقت بھی زمانے کو بتا دی جائے
روشنی سیرتِ سلطانِ حرم سے لے کر
قلب کو حلم، نگاہوں کو حیا دی جائے

(بیاض: پروفیسر اکرم رضا)

پروفیسر محمد اکرم رضا کی نعت گوئی اپنا ایک الگ رنگ اپنائے ہوئے ہے اور آپ کا منشا کہ عشقِ رسول ﷺ کو دلوں میں جگہ دے کر پورے عالمِ اسلام کو اسلامی رنگ میں مکمل طور پر رنگ جانا چاہیے اور مکمل طور پر دینِ اسلام کی تعلیمات کو مشعلِ راہ بنا کر کفر کے اندھیروں کو ختم کرنا چاہیے۔ آپ اپنے نعت کے فن کو رحمتِ خداوندی گردانتے ہیں اور اس طرح رقم طراز ہیں:

''میں نے نعت شناسی میں فکر و فن کے تقاضوں کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا ہے۔ یہ عرض کرنا تحدیثِ نعمت ہے کہ فیاضیِ قدرت سے شاعری، نثر اور تقریر کا جذبہ خوب خوب عطا ہوا۔ اگرچہ میں نے نظم و نثر کو ایک میدان تک محدود نہیں رکھا مگر نعت کے سیلِ نور نے بالخصوص مجھے اپنے بہاؤ میں لے لیا۔ نعت تو بے تحاشا لکھی جا رہی تھی مگر تنقیدِ نعت کا تصور اس وقت نا پید تھا۔ جب وقت نے ادھر رُخ

موڑا تو تنقیداتِ نعت کے لحاظ سے بھی بے تحاشا لکھا گیا، مضامین، مقالات، شخصی مضامین، ہمہ گیر تحریریں، دیباچے اور تقاریظ وغیرہ۔ میں نے بارہا سوچا ہے کہ یہ میری فکر یا قلم کا کمال نہیں بلکہ یہ تو عین عطائے خداوندی ہے کہ ہر لحظہ و ہر آن مجھے نوکِ قلم سے فکرِ نعت کے گل و لالہ لٹانے کے مواقع مہیا کرتی رہی۔ گزرتی ہوئی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک ایک لمحے میں مَیں نے نعت شناسی کو فراموش نہیں کیا اور بھرپور کاوش کی ہے کہ میرا قلم اور میرا شعور آنے والے ادوار کو نعتِ رسولِ مقبول ﷺ حقیقی حسن سے بہرہ ور کر سکیں۔" (6)

آپ کی نعت گوئی کے بارے میں معروف نعت گو ریاض حسین چودھری کی رائے ملاحظہ کریں:

"ہر بڑے شاعر کی طرح ان کی لفظیات کی اپنی ایک الگ دنیا آباد ہے۔ محمد اکرم رضا اس عطیہ خداوندی کو سلیقے اور قرینے سے برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ خود سپردگی کی ایک عجیب سی کیفیت شاعر کے روحانی رتجگوں کی عطا ہے۔ ان کا دامنِ شعر سیرتِ اطہر کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔ یقینِ کامل سے ان کا احساسِ آرزو مزین اور مرقع ہے۔ قلم فرطِ عقیدت کے گہرے پانیوں میں ڈوب ڈوب جاتا ہے، لیکن ہوش کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ نہیں پاتا۔ آپ وارفتگی کے عالم میں بھی کائناتی سچائیوں اور زمینی حقائق کے شعور کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔" (7)

پروفیسر محمد اکرم رضا کم و بیش ایک سو پچاسی دیباچے لکھ چکے ہیں، جن میں سے ایک سو بیس دیباچے تو صرف نعتیہ کتابوں پر لکھے گئے ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی تقاریظ کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے، اس کے علاوہ فلیپ بھی آپ نے بیس کے لگ بھگ لکھے ہیں۔ نعت کے حوالے سے اتنا بڑا ادبی سرمایہ شاید ہی کسی دوسری شخصیت کے پاس ہو۔ آپ کا ایک ایک مضمون ہی پوری کتاب کی ضخامت رکھتا ہے، اس کی مثال نعت رنگ کے شمارہ 21 میں آپ کا تحقیقی مقالہ "نعتیہ ادب کے تنقیدی نقوش" ایک سو بتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں آپ نے تنقیدِ نعت پر شائع ہونے والی کتب کا تذکرہ بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے اور اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس مضمون کو بعد میں نعت ریسرچ سنٹر نے بڑے خوب صورت انداز میں کتابی شکل دی ہے جو پروفیسر اکرم رضا کی نعت شناسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ نعت کی طرف آپ کا رجحان بچپن سے ہی تھا، اس کی بڑی وجہ آپ ایک انٹرویو کے دوران اس طرح بتاتے ہیں:

"ہمارے خاندان کا سب سے بڑا سرمایہ وہ علمی، مذہبی اور نظریاتی ورثہ ہے، جو والدِ محترم

کی تربیت سے عطا ہوا۔ چوں کہ والدِ محترم گاؤں میں رہتے ہوئے بھی ملک بھر کی سیاسی اور نظریاتی تحاریک سے تعلق رکھتے تھے۔ ادھر میرا ننھیال مکملطور پر ادبی، شعری اور روحانی تشخص کے حوالے سے غیر معمولی شہرت رکھتا تھا۔ اس لیے ہوش سنبھالتے ہی گھر میں ہندو پاک کے معروف رسائل و جراید دیکھے۔ جن میں مذہبی، دینی اور صوفیانہ مضامین ہوتے یا پھر ایسے جراید جن کے مضامین تحریکِ پاکستان کے ولولہ انگیز ادوار کی یادتازہ کرتے تھے۔ ان میں سے دینی رسائل میں حمد و نعت، منقبت اور قومی منظومات بطورِ خاص نظر آئیں۔ یہ گویا فطرت کی جانب سے لالے کی حنا بندی کا اہتمام تھا۔ گھر میں ایسی مجالس کا انعقاد کیا جاتا، جن میں نعت خواں بطورِ خاص بلائے جاتے اور کافی دیر تک مدحتِ رسولِ مقبول ﷺ کے نغمات قدس گونجتے رہتے۔ اس طرح لاشعوری طور پر ایک ایسی فضا اور ماحول کا حصہ بن گیا، جس میں نعتِ مصطفیٰ ﷺ اور حبِ رسول ﷺ کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میری زندگی کے ماہ و سال اور نعت گوئی کا جذبہ ایک ساتھ پروان چڑھتے ہوئے مستقبل کی جانب گام زن ہوگئے۔'' (8)

پروفیسر محمد اکرم رضا ایک ہمہ پہلو شخصیت ہیں، غزل، نظم اور نعت سے لے کر فنِ تقریر تک ہر موضوع پر آپ نے قلم اُٹھایا۔ آپ کی شائع ہونے والی تصانیف کے نام یہ ہیں:

☆ روحِ تکلم (تقریریں)	☆ حسن تکلم (تقریریں)
☆ جمالِ فقر	☆ کاروانِ نعت حدی خواں
☆ تجلیاتِ مخدوم	☆ حیاتِ شیخ الاسلام
☆ شہریارِ خطابت	☆ سلام بہ حضور سید الانام ﷺ
☆ انوارِ میاں میر	☆ تاریخِ گوجرانوالا (بہ اشتراک پروفیسر محمد اقبال جاوید)
☆ فیضانِ اکبری	☆ میلادِ مصطفیٰ ﷺ قرآن وسنت کی روشنی میں
☆ رہنمائے عمرہ	☆ مرکزِ تجلیات
☆ قافلۂ شوق کے مسافر	☆ ضربِ تکلم
☆ تاجدارِ ملکِ سخن (مولانا احمد رضا بریلوی کی نعت گوئی)	
☆ انعام یافتہ ہستیاں	☆ مہرِ جہاں تاب

ان تصانیف کے علاوہ جو مضامین نعت گوئی کے حوالے سے مختلف ادبی رسائل میں شامل ہوتے رہتے ہیں اور دیباچے، مقدمے، تقاریظ اور فلیپ وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ اس سے آپ کی علمی و ادبی

کاوشوں کا کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی نثر لکھنے کا انداز بہت خوب صورت ہے، ایسے لگتا ہے کہ الفاظ وتراکیب آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہیں اور آپ ان کو ایسی ترتیب میں پرو رہے ہیں جیسے تسبیح کے موتیوں کو پرویا جاتا ہے۔ آپ کی نثری نگارشات بھی ایسے لگتی ہیں، جیسے کہ شاعری کی گئی ہے۔ اتنے شگفتہ الفاظ اور تراکیب واستعارات آپ کی نثر میں سموئے ہوئے ملتے ہیں کہ دیکھ کر لگتا ہے جیسے یہ بنے ہی اسی موقع ومحل کے لیے ہوں۔ آپ کی نعتیہ تنقید پر شائع ہونے والی کتب ''کاروانِ نعت کے حدی خواں'' اور ''قافلہ شوق کے مسافر'' تنقیدِ نعت کے حوالے سے بہت بلند مقام کی حامل ہیں۔ جب کاروانِ نعت کے حدی خواں اشاعت پذیر ہوئی، اس وقت نعت کی تنقید کی بنیاد بھی نہیں رکھی گئی تھی۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ نعتیہ تنقید کے بانیوں میں آپ کا نام بھی ایک خاص مقام رکھتا ہے، بلکہ یہ کہا جائے کہ آپ تنقیدِ نعت کے ہراول دستے کا حصہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، فلیپ (تنقیدی رائے)، تاجدارِ ملکِ سخن (تحقیق وتنقید)، مصنف: پروفیسر محمد اکرم رضا، لاہور، 2008ء

۲۔ حفیظ تائب، پیشوائی (تنقیدی رائے)، قافلہ شوق کے مسافر (تحقیق وتنقید)، مصنف: پروفیسر محمد اکرم رضا، فروغِ ادب اکادمی گوجرانولا، 2007، ص:12

۳۔ حافظ منور حسین سرمد، پروفیسر محمد اکرم رضا۔۔۔ تجلیاتِ نعت کے ایوان میں (تنقیدی مضمون) مشمولہ نعت رنگ نمبر 19، ص:425

۴۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید، تحسینِ حسن (تنقیدی رائے)، سلام (نعتیہ کلام)، شاعر: پروفیسر محمد اکرم رضا، گوجرانوالا، عباسی پبلی کیشنز، 1993ء، ص:3

۵۔ کاروانِ نعت (نعتیہ مجلّہ)، مدیرِ اعلیٰ: ابرار حنیف مغل، لاہور، المدینہ دارالاشاعت، جولائی 2006ء، ص:12

۶۔ حفیظ تائب، تجلّی (دیباچہ)، قافلہ شوق کے مسافر (تحقیق وتنقید) محولہ بالا، ص:9

۷۔ ماہ نامہ: عرفات، لاہور، محمد اکرم رضا کا ذوقِ نعت (تنقیدی مضمون)، جنوری 1992ء، ص:34

۸۔ انٹرویو از محمد اکرم رضا برائے کاروانِ نعت، لاہور، فروری، مارچ 2007ء، ص:14-213

☆☆☆

ڈاکٹر عزیز احسن، کراچی

رفیع الدین ذکیؔ قریشی کی نعت گوئی

ABSTRACT: Rafi-uddin-Zaki Qureshi's three books of devotional poetry i.e. Tosha, Darman- dil-e-Muztar and Inayaat ki Kalyaan, came into discussion in order to find out uniqueness of poetic voice. Emphasis put upon showing similar themes and similarity of poetic treatment of thought content with some comparative study of traditional poetry. Contemporary sensibility also found in some couplets and brought into discussion for the sake of showing awareness of the poet with his atmosphere and his dissensions towards synchronously secular trends.

میری آنکھ کا آپریشن ہوا ہے اس لیے آج کل لکھنے پڑھنے کا عمل بڑا ست ہے۔ لیکن ہفتہ ۲۸ رصفر ۱۴۳۹ھ مطابق: ۱۸ رنومبر ۲۰۱۷ء کو ڈاک سے کتابوں کا ایک ارمغاں موصول ہوا جس میں حضرت رفیع الدین ذکیؔ قریشی کی تین کتابیں تھیں۔ توشہ، درمانِ دلِ مضطر اور عنایات کی کلیاں۔ میں نے کتابوں پر طائرانہ نظر ڈالی اور رکھ دیا۔ کتابوں کے ہمراہ شاعر موصوف کا ایک خط بھی تھا جس میں مجھ سے ان کتب پر کچھ لکھنے کی فرمائش بھی کی گئی تھی۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس حکم کی تعمیل کیسے کی جائے کہ حضرت حسان نعت بک بینک کے صدر و مہتمم جناب غوث میاں کا بھی فون آ گیا۔ ان کی ہدایت تھی کہ موصولہ کتب پر جلد ہی کچھ لکھ دیں۔ پھر میں نے لاہور میں، شاعرِ موصوف سے فون پر رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت بھی ناساز ہے اور وہ عمر کی اسّی سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ چناں چہ ان سے بات کر کے میں نے کتب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ چند اوراق دیکھے تو محسوس ہوا کہ شاعر کا روحانی اثر مجھے جلد از جلد کچھ لکھنے پر آمادہ کر رہا ہے۔ چناں چہ اب جناب ذکیؔ قریشی کی نعتیہ شاعری پر کچھ معروضات پیشِ خدمت ہیں۔

آج کل میں نعتیہ شاعری کو اِس زاویے سے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ شعراء کے تخلیقی عمل میں فکری وحدت کے باعث مضامین کی یکسانیت کہاں کہاں ہے اور کس شاعر نے روایتی مضامین کو اظہار کی نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے۔ ساختیاتی فکر کی روشنی میں مجھے رولاں بارتھ کی اس بات سے کلی طور پر

اتفاق ہے کہ ''[ہر مصنف] پہلے سے موجود لسانی اور ادبی خزانوں کو کھنگالتا ہے، اخذ و قبول کرتا ہے، اور چلی آ رہی روایت کو نئی شکل دیتا ہے''۔ اخذِ مضامین اور تکرار و توارد کا یہ سلسلہ شعری دنیا میں بہت پرانا ہے۔ لیکن پہلے زمانے کے ناقدین، مضامین کی یکسانیت پر سرقے کا الزام لگا دیتے تھے۔ جبکہ یہ سرقہ نہیں بلکہ ایک متن (Text) کو نئے زاویے سے تخلیقی سطح پر برتنے کا معاملہ تھا۔ رولاں بارتھ نے ادب پر یہ احسان کیا کہ اُس کی تحریک پر متون کی ہم رشتگی (Inter Textuality) کو قبولیت اور تحسینی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی راہ ہموار ہوئی۔

نعتیہ دنیا میں وحدتِ مضامین و خیالات کی اصل وجہ ''ممدوح ﷺ'' کا ایک اور یکتا ہونا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں مضامین تو بیشتر روایتی رہتے ہیں لیکن بیان کے نئے نئے اسالیب سے ہر مضمون نیا نیا سا لگتا ہے۔ ذکی قریشی صاحب کی نعتیہ شاعری پر، میں نے بین المتنیت (Inter Textuality) کے زاویے ہی سے غور کیا ہے۔

حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم ہے ''کُنتُ نَبِیًّا وَّ آدَمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ o'' میں تھا جبکہ آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے''۔ اس حدیث کی رو سے آپ ﷺ کی ذاتِ والا صفات کُل موجودات سے اسبق (سبقت لے جانے والی) ہے، حضورِ اکرم ﷺ کی ذات ہی خلقت میں اول ہے اس لیے آپ کی نبوت بھی اول ہے۔ قرآنِ کریم کی سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۴۰ کی رو سے آپ ہی سلسلۂ نبوت کی تکمیل کرنے والے یعنی ''خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ'' ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء نے آپ ﷺ کے حوالے سے ایسے متون بُنے ہیں کہ آپ ﷺ ہی اول ہیں اور آپ ﷺ ہی آخر ہیں۔ جیسے اقبال نے کہا:

ع نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر

حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کا یہ پہلو اس قدر روشن ہے کہ تقریباً ۹۹ فیصد نعت نگار شعراء نے اس حقیقت کو اپنے اشعار کا متن بنانے کی کوشش کی ہے۔ نعتیہ شاعری میں اس نکتے پر شعراء کی فکری وحدت کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ حضرت رفیع الدین ذکی قریشی نے بھی اس مضمون کو شعری جامہ پہنایا ہے:

آپ کی ہے رسالت ازل تا ابد
اولیں آپ ہیں آخریں آپ ہیں

حضورِ اکرم ﷺ کے حیات النبی ہونے کا نظریہ صرف نظریہ نہیں بلکہ محسوساتی حقیقت ہے جسے ہر آدمی تو نہیں، تاہم بعض اہلِ نظر دیکھتے رہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے تو باقاعدہ اپنا عقیدہ ظاہر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا تھا:

''میرا عقیدہ ہے کہ نبیء کریمؐ زندہ ہیں اور اِس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اسی طرح

مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے۔لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔اس واسطے خاموش رہتا ہوں"۔

حضورِ اکرم ﷺ کی کسی محفل میں آمد کا روحانی احوال اتنی کثرت سے بیان میں آیا ہے کہ اس حقیقت کو جھٹلانا ممکن نہیں۔یہ اور بات کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام نبی ہو کر خضر علیہ السلام کے تکوینی معاملات کو سمجھنے سے قاصر رہے تھے اسی طرح قیامت تک اہلِ قال اُن احوال کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے جو اہلِ حال پر وارد ہوتے ہیں۔ مجھے حضرت رفیع الدین ذکی قریشی کے درج ذیل اشعار ان کے حال کا آئینہ لگتے ہیں:

میری آنکھوں میں بھی نقش ہے آپ کا　　خانہء دل میں بھی جاگزیں آپ ہیں
محفلِ نعت ہو یا ہو بزمِ درود　　اہلِ بینش نے دیکھا وہیں آپ ہیں

غالب کی زمینوں میں بعض شعراء نے نعتیں لکھی ہیں۔لیکن ہر شاعر نہ تو غالب کے آہنگ کا اثر پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی نعت کے مضامین کی درخشندگی کا حق ادا کر سکتا ہے۔تاہم لوگوں کی کوششیں جاری ہیں۔ذکی قریشی صاحب نے غالب کی مشہور غزل

ع　سب کہاں ، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں

......کی زمین میں آٹھ نعتیں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں۔یہ آٹھ نعتیں ایک ہی مجموعے "عنایات کی کلیاں" میں شامل ہیں۔

غالب نے غزل کے اندر نمایاں، پنہاں، نسیاں، عریاں، زنداں، کنعاں، فروزاں، واں، پریشاں، دبستاں، مژگاں، گریباں، درباں، جاں، ایماں، آساں اور ویراں کے قوافی استعمال کیے تھے۔لیکن ذکی قریشی صاحب نے نعت کے مزاج سے ہم آہنگ چند قوافی کی تکرار کی ہے مثلاً آساں، نمایاں، پنہاں، پریشاں وغیرہ وغیرہ۔

غالب نے آساں کا قافیہ غزل کی مناسبت سے زندگی کی مشکلات کو سامنے رکھ کر باندھا تھا:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

لیکن ذکی قریشی صاحب نے "آساں" کا قافیہ خالص نعتیہ زاویوں سے برتا ہے۔

زندگی کی راہ میں جتنی بھی آئیں مشکلیں
رب کو ان کا واسطہ دیتے ہی آساں ہوگئیں

(عنایات کی کلیاں......ص۱۹)

میں نے جب بھی کیں دعائیں دیدِ روضہ کے لیے
مشکلیں در پیش تھیں جتنی وہ آساں ہوگئیں

(ایضاً ص ۴۵)

میں نے ان پر جب درودِ پاک کثرت سے پڑھا
مشکلیں در پیش تھیں جتنی وہ آساں ہوگئیں

(ایضاً ص ۱۱۰)

غالب کا مطلع تھا:

سب کہاں، کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

لیکن ذکی قریشی صاحب نے ''نمایاں'' کا قافیہ کئی زاویوں سے برتا ہے اور ہر موقع پر نعتیہ آہنگ برقرار رکھا ہے۔

مشکلیں میری نبی پر جب نمایاں ہوگئیں — اُن کے لطفِ خاص سے پل بھر میں آساں ہوگئیں
میری آنکھوں میں نمی کا زائرِ طیبہ نہ پوچھ — اس نمی سے حسرتیں دل کی نمایاں ہوگئیں
پردہ پوشی میری فرمائی مرے سرکار نے — میری بد اعمالیاں جس دم نمایاں ہوگئیں
ذکرِ خلدِ طیبہ سن کر جب بھی میں رویا ذکی — حسرتیں سب میری مژگاں پر نمایاں ہوگئیں

غالب کے ہاں، پریشاں کا قافیہ غزل کے بھرپور رنگ لیے ہوئے ہے:

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

جبکہ ذکی قریشی صاحب نے اسے توفیقِ نعت گوئی کے فیضان کے تناظر میں باندھا ہے۔

رقص کرتی آرہی تھیں میری جانب مشکلیں
مجھ کو محوِ نعت دیکھا تو پریشاں ہوگئیں

غالب کے ایک مصرع پر ذکی قریشی صاحب نے دو طرح گرہیں بھی لگائی ہیں اور دونوں گرہیں خالص نعتیہ آہنگ کی حامل ہیں۔

میں نے ہجرِ خلدِ طیبہ میں بھریں آہیں جونہی — ''میری آہیں بخیہء چاکِ گریباں ہوگئیں''
ہجرِ طیبہ میں جو ابھریں میرے سینے سے ذکی — ''میری آہیں بخیہء چاکِ گریباں ہوگئیں''

ان نعتوں کی خوبی یہ ہے کہ سہلِ ممتنع میں ہیں اور اشعار میں فصاحت کا رنگ بھی جھلک رہا

ہے۔ چندوہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں جو ایسے قوافی پر مشتمل ہیں جو غالب نے نہیں برتے تھے:

آمدِ آقا سے پہلے تھا جو صحرائے عرب — آج اس کی بستیاں رشکِ گلستاں ہوگئیں
زندگی کا دائرہ جب تنگ سا ہونے لگا — رحمتیں آقائے رحمت کی فراواں ہوگئیں

اِن چند نعتوں کی خواندگی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاعرِ نعت حضرت ذکی قریشی نے کس کس پہلو سے قوافی کا استعمال کیا ہے اور فکری، تخلیقی اور احساساتی ستاروں سے نعتیہ شعری آسمان کو روشن کرنے کی سعی کی ہے۔

نعتیہ شاعری میں عصری حسیت کا شامل ہونا کسی شاعر کے احساساتی ہالے کے دائرے کے وسیع ہونے کا اشاریہ ہے۔ زمانے کے تیور سے آشنا ہو کر اُصلح روایات سے منسلک رہنے کی آرزوؤں کے اظہار پر منتج ہونے والے خیالات سے نعتیہ شاعری کے آفاق میں زندگی کی وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں نعتیہ لے میں استغاثے کا آہنگ شامل ہو جاتا ہے۔ شعراء کی یہ روش نمایاں طور پر حالی سے چلی تھی جو کہہ رہے تھے:

اے خاصہء خاصانِ رُسُل وقتِ دعا ہے

پھر اس کے بعد تو زمینی حقائق سے آشنا ہو کر دل برداشتہ، ہر شاعر نے استغاثے کی راہ اپنالی۔ ذکی قریشی صاحب نے بھی یہ راہ اپنائی ہے جو کہتے ہیں:

ہر طرف سے یورشِ الحاد ہے آقا حضور!
چشمِ رحمت امتِ عاصی و غافل کی طرف

اسی استغاثے کی لے اُس وقت بدل جاتی ہے جب نعتیہ شاعری کرنے کی توفیقات سے شاعر کا وجدان اُسے امید کے ساحل کی نشانیاں دکھاتا ہے:

بحرِ غم، گرداب، طوفاں اور شکستہ بادباں
نعت کہتا آرہا ہوں پھر بھی ساحل کی طرف

اور پھر سیرتِ رسول ﷺ کا فیضان بھی تخلیقی وفور میں شامل ہو جاتا ہے تو ایک آئینہء حقیقت روشن ہو جاتا ہے:

نورِ حق سے جن کے روشن ہوگئے ہوں چشم و دل
کس طرح دیکھیں گے وہ ظلماتِ باطل کی طرف
جب بھی رستے سے بھٹک جاؤں تو سیرت آپ کی
رُخ بدل دیتی ہے میرا، میری منزل کی طرف

(توشہ، ص 107)

شاعرِ نعت کو نعتیہ اشعار کا اثاثہ اس کی قلبی کیفیات کے تغیرات اور احساسِ فراق سے ملتا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے:

ہجرِ طیبہ کے سبب آنکھ جو نَم ہوتی ہے — تب کہیں جا کے حسیں نعت رقم ہوتی ہے
نعت ہو جائے تو ہوتا ہے یہ احساس مجھے — نعت ہی باعثِ تخفیفِ اَلَم ہوتی ہے
ذکر بھی اُن کا ہے خوشنودیءِ رب کا باعث — یاد بھی اُن کی ذکیؔ! وجہِ کرم ہوتی ہے

شاعرِ موصوف کی تیس 30 تصانیف کی فہرست میرے سامنے ہے۔ ابھی مجھے صرف تین کتب کا جستہ جستہ مطالعہ کرنے کی سعادت نصیب ہو سکی ہے۔ اگر تمام تخلیقی سرمائے پر نظر ہو تو بات کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی تو کبھی تفصیلی مطالعہ بھی پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ فی الحال اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

پیر: یکم ربیع الاول ۱۴۳۹ھ...... مطابق: ۲۰/نومبر ۲۰۱۷ء

☆☆☆

انٹرویو

دنیا مثالِ طور غریب نظر نہ ہو
سرکار اس خیال سے پیکر میں آئے ہیں

(قیصر بارھوی)

سوال نامہ

۱۔ اردو کی شعری روایت میں نعت بحیثیت صنفِ سخن کیا درجہ رکھتی ہے؟

۲۔ اردو کے شعری لہجے کی ساخت میں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ نعت بھی شامل رہی ہے؟

۳۔ کہا گیا ہے کہ ہماری تہذیبی بنیادوں کی تشکیل اور قومی شعور کی تعمیر میں نعت نے اہم کردار ادا کیا ہے، اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

۴۔ برِصغیر میں اجتماعی طرزِ احساس کی تعمیر میں نعت کے تخلیقی رجحانات نے کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟

۵۔ لوک ادب اور صوفیانہ روایت میں عاشق کا جو نسائی لہجہ ہمیں ملتا ہے، وہ بعض جگہ اردو نعت میں بھی جھلکتا ہے، اسی طرح آقا اور غلام کی نسبت کو بھی اسلوبِ اظہار کے طور پر برتا جاتا ہے۔ نعت کے ان لہجوں یا رویوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۶۔ بیس ویں صدی کے دوسرے نصف سے پہلے ہماری تنقید نے نعت کو خاطر خواہ توجہ نہیں دی، آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ رہی؟

۷۔ گزشتہ چھ دہائیوں میں بالعموم اور تین عشروں میں بالخصوص نعت کے جو تنقیدی اور تجزیاتی مطالعات سامنے آئے ہیں، انھیں آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

۸۔ عصرِ حاضر میں ہماری تنقید جن نظریات اور تھیوریز کو استعمال کرتی ہے، کیا نعتیہ افکار کی تفہیم و تعبیر میں وہ مؤثر ہو سکتے ہیں؟

۹۔ فکری اور اسلوبیاتی سطح پر آپ اردو نعت کے ارتقائی سفر کے بارے میں کیا کہیں گے؟

۱۰۔ عہدِ جدید میں اردو نعت کے تخلیقی نقوش اُس کی جداگانہ شناخت کا حوالہ بنتے ہیں یا محض وہ مخصوص شعری روایت کا تسلسل نظر آتے ہیں؟

۱۱۔ نعتیہ ادب کے فروغ کے سلسلے میں آپ کی رائے میں آج کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

۱۲۔ اکیس ویں صدی کے افتراق و انتشار کے اس منظر نامے میں ہماری اجتماعیت اور یک جہتی کے لیے نعت کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی

نعت سے متعلق سوالنامہ کا جواب

۱۔ اردو کی شعری روایت میں نعت کی صنف کو بالخصوص کوئی نمایاں حیثیت تو نہیں حاصل ہوئی مگر بیش تر شعری اصناف میں نعتیہ اشعار کی شمولیت کی روایت زمانۂ قدیم سے لے کر ماضی قریب تک برقرار رہی۔ اس نوع کے اشعار کہیں بھی غیر ضروری نہیں سمجھے گئے اور نہ صرف اپنی اپنی عقیدت کو ظاہر کرنے کے لیے شعرا نے نعتیہ اشعار کا سہارا لیا۔ اگر فارسی اور اردو میں قصیدے کی صنف پر ایک طائرانہ نگاہ بھی ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ قصیدے کی تشبیب میں چونکہ حمدیہ، نعتیہ، منقبتی یا بہاریہ موضوعات پر اظہار خیال کی گنجائش ہمیشہ سے موجود رہی اسی سہولت کے پیش نظر اکثر اعلیٰ درجے کے نعتیہ اشعار قصیدے تشبیب میں شامل کیے گئے۔ اہم بات یہ ہے کہ نعتیہ تشبیب کو نعت کی صنف میں کبھی بھی شمار نہیں کیا گیا۔ مگر نعتیہ تشبیبوں کے باعث نعت گوئی کی روایت کو ایک سنجیدہ اور پروقار طریق اظہار کی حیثیت حاصل رہی۔ اسی طرح مثنوی کی صنف میں نعتیہ اشعار کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ البتہ کربلائی مرثیوں میں رسول کریم ﷺ کی حیات وصفات کا پس منظر ہر جگہ موجود ہونے کے باوجود اصطلاحی معنوں میں نعتیہ اشعار برائے نام ہی ملتے ہیں۔

۲۔ جہاں تک اردو کی شعری روایت میں بحیثیت صنف سخن کے، نعت کی قدر ومنزلت کا سوال ہے تو افسوس کی بات یہ ہے کہ ابھی چند دہے قبل تک ادبی، فنی، تخلیقی اور جمالیاتی اعتبار سے نعت کو برتنے اور اس کے معیار کو فنی بنیادوں پر بلند کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ نعت کو مسلمان شعرا نے اس انتہا پسندی کے ساتھ عقیدت کے اظہار اور وصول ثواب کی نیت کے ساتھ گلے سے لگائے رکھا کہ بہ ظاہر نعت کی فنی اور جمالیاتی خوبیوں پر بحث وتمحیص تو در کنار، درخور اعتنا بھی نہیں سمجھا گیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خصوصی طور پر نعت گو شعرا کو اعلیٰ تو کیا اوسط درجے کے شعرا میں شمار بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ عربی زبان تک میں رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ میں یا اس کے بعد قرون اولیٰ کے مسلم شعرا تک کے کلام میں عقیدت ومحبت اور وارفتگی کی فراوانی تو بے پناہ ہے مگر فنی خصوصیات برائے نام ہی ملتی ہیں۔

دراصل صورتِ حال یہ رہی کہ قرونِ اولیٰ میں قرآن کریم یا احادیث رسول میں مجموعی طور پر شاعری کے لیے تحسینی الفاظ نہیں ملتے۔ اس لیے حسان بن ثابتؓ جیسے عاشقانِ رسول شعرا کا معاملہ ہو یا بصیری اور دوسرے قصیدہ گو شعراء کے نعتیہ قصائد کا، ان سب میں عقیدت، محبت، وارفتگی اور از خود رفتگی کی فراوانی تو ضرور ملتی ہے مگر اس زمانے کے بیش تر شعری نمونوں میں فنی تدابیر اور اعلیٰ ادبی معیار کی تلاش میں ہمیں ناکامی ہوتی ہے۔

۳۔ یہ سوال قدرے غیر واضح ہے۔ یوں تو اردو شاعری کی روایت میں مذہبی یا روحانی رجحان بہت نمایاں رہا ہے خواہ وہ محض تصوف کی شعری روایت کی وجہ سے ہو، اسی لیے عشق و محبت کے سارے اسالیب کا سرچشمہ روحانی نغمات تو ضرور رہے ہیں مگر انھیں ہم پوری طرف نعت یا نعتیہ رجحان کا نام مشکل سے ہی دے سکتے ہیں۔

۴۔ جہاں تک قومی شعور کی تعمیر کا سوال ہے تو اس کے تلازمے ہندوستان میں الگ ہیں اور پاکستان میں الگ، اس لیے قومی شعور کی تعمیر میں نعت کے کردار کا کوئی جواب دینا آسان نہیں مگر ہماری تہذیبی بنیادوں کی تشکیل میں عشق رسول کا رول غیر معمولی ہے۔ اس لیے کہ ہم مسلمانوں کی مذہبی اور روحانی زندگی کے سارے سرچشمے، یہیں سے پھوٹتے ہیں۔

۵۔ لوک ادب اور صوفیانہ روایت میں عاشق کے نسائی لہجے کا معاملہ بہت زیادہ الجھا ہوا ہے۔ دراصل یہ رویے بھگتی تحریک کی دین ہیں۔ کرشن کے لیے رادھا کی دیوانگی اور میرا بائی سے لے کر کبیر داس تک جو خود سپردگی کا انداز عام ہے اسے بھگتی تحریک کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ دور کیوں جایئے، جب محی الدین ابن عربی کے تصورِ وحدۃ الوجود میں ہندوؤں کے مایا، بھرم اور دنیا کے التباس ہونے کا تصور شامل ہے تو عاشق کے نسائی لہجے کا سارا راز خود فاش ہو جاتا ہے اور کم از کم نعت گوئی کے حوالے سے اس خیال کی کوئی خوش آئند تصویر نہیں بنتی۔

۶۔ آپ کی یہ بات درست اور معنی خیز ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اول تک اردو تنقید نے نعت گوئی کو عموماً موضوع بحث نہیں بنایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو تنقید میں عالمی ادب کے بعض شاہکاروں مثلاً کالی داس کی شکنتلا، دانتے کی طربیہ خداوندی یا ملٹن کی فردوس گم شدہ اور گوئٹے کی فاوسٹ وغیرہ کے حوالے سے اعلیٰ ادبی اظہار کے موضوع پر بار بار گفتگو کی گئی اور اردو یا بحیثیت مجموعی مشرقی روایت میں شامل مذہبی شعری نمونوں کے حوالے کم سے کم زیر بحث آئے اور نعت کی اصطلاح استعمال کیے بغیر دوسری اصناف میں جو نعتیہ اشعار کہے گئے ان تک کی ادبی اور فنی قدر و قیمت کو برائے نام ہی زیر بحث لایا گیا۔

۷۔ اس سوال کے مضمرات میں یہ بات شاید مخفی ہے کہ رسالہ ''نعت رنگ'' نے اس صنفِ سخن کے

فروغ اوراس پر تنقیدی مکالمہ قائم کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اس پر واضح طور پر اظہار خیال کیا جائے۔ مگر راقم الحروف کو اس تخصیص کے ساتھ اپنی رائے دینے میں قدرے تکلف ہے۔ اس لیے عرض یہ ہے کہ نعت گوئی اور اس صنف کی معیار بندی کی جو کوششیں روبہ عمل آئی ہیں وہ بہر حال قابل ستائش ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسالہ ''نعت رنگ'' کے مدیر جناب صبیح رحمانی کے انداز فکر کو جب سے عملی طور پر کچھ کر دکھانے موقع ملا ہے تو وہ اپنی تحریروں، مضامین کے انتخاب اور نعت رنگ کے ذریعے اس ضمن میں بعض نہایت بامعنی اور ثمر آور مباحث اور تخلیقی پیش کش کی سبیلیں نکال کر نعت کی صنف کو ایک ایسی شیرازہ بندی میں تبدیل کر رہے ہیں کہ اب وہ دن دور نہیں کہ جب صرف نعت ہی کی صنف نہیں بلکہ پوری مذہبی شاعری کو بیانیہ، اس کی توانا روایت، استعاراتی اظہار اور تہہ دار معنویت کے اعتبار سے ادبی اور جمالیاتی طور پر اعتبار و استناد حاصل ہو سکے گا۔

گذشتہ برسوں میں نعت کی صنف پر جس معنی خیز گفتگو کا آغاز ہوا ہے یا جس طرح بہت سی نعتوں پر جو عملی تنقید کی گئی ہے اور اشعار کی جمالیاتی قدر و قیمت اور فنی محاسن پر جس نوع کی تحریریں سامنے آئی ہیں ان سے یہ یقین پختہ ہونے لگا ہے کہ شاید یہ صنف سخن آئندہ بھی تنقیدی مباحث کی توجہ کا مرکز بنی رہے گی۔ شاید اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس سلسلے میں آپ کی اور آپ کے رسالے ''نعت رنگ'' کی ادبی اور تحسینی خدمات کو عرصہ تک نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

۸۔ عصر حاضر میں آپ جن تنقیدی نظریات اور تھیوریز کے استعمال کی بات کر رہے ہیں ان کا استعمال ہنوز، عام ادبی شہ پاروں پر بھی بدرجہ کمال اور تمام امکانات کے ساتھ نہیں ہو پا رہا ہے، اس لیے نعت کی صنف پر ان کے اطلاق کی گفتگو ابھی قبل از وقت معلوم ہوتی ہے۔ دراصل ہوا یہ ہے کہ نئی ادبی تھیوریز میں ساختیات اور مابعد ساختیات سے متعلق جن نظریات پر بحث و مباحثہ کا بازار ادھر تین چار دہائیوں میں گرم رہا ہے ان میں علم شرح و تعبیر کو نعت کی صنف سے ایک خاص علاقہ ہو سکتا ہے، باقی تانیثیت، مابعد تاریخیت اور بین المتونیت جیسے تصورات کو نعت کے لیے استعمال کیے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ مزید برآں یہ کہ نئے ادبی نظریات کے بارے میں علی العموم یہ تاثر غلط نہیں ہے کہ یہ نظریات شعر و ادب کی تخلیق اور زبان کے استعمال کی نوعیت کا تعین کرتے ہیں، ادب پارے کی فنی اور فکری قدر و قیمت کا تعین نہیں کرتے، اس لیے ان نظریات کے وسیلے سے میں نعت پر مبنی گفتگو کے زیادہ کارآمد ہونے کی توقع نہیں ہے۔

۹۔ نعت کے ارتقائی سفر کے لیے میرے یا آپ کے کہنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ البتہ امید کی

جا سکتی ہے کہ گذشتہ دنوں جس طرح نعت کے موضوع پر فکری اور فنی حوالوں سے گفتگو کا ماحول بنا ہے اس کے زیرِ اثر موجودہ نعت گو اور تخلیقی صلاحیت رکھنے والے ایسے اردو کے شعراء جو عقیدت کے اظہار میں اپنے مرکز سے دور ہیں وہ بھی نعت اور حمد کی طرف خاص توجہ دیں گے اور نعت اور حمد کی اصناف کو فکری دبازت اور فنی محاسن کا ایسا عمدہ نمونہ بنانے پر توجہ مبذول کریں گے کہ اس موضوع کا والہانہ اور تخلیقی انداز ان کی تخلیقی اپج کا بہترین اظہار بن جائے۔

۱۰۔ نعت کی صنف کی جدگانہ شناخت کا مسئلہ ہنوز مشتبہ ہے، اس لیے اسے ہمیں کچھ دنوں تک اپنی مخصوص شعری روایت کا تسلسل سمجھنے میں ہی عافیت ہے۔

۱۱۔ نعتیہ ادب کے فروغ کے سلسلے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس صنف میں جس قدر بھی انتہا پسندی سے کام لیا جائے مگر وحدانیت کی مرکزیت سے اسے دور نہ ہونے دیا جائے، شرک کے عناصر سے اسے پاک رکھا جائے اور خدائے عزوجل کی عظمت اور محوریت سے الگ کوئی معیار متعین نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے بعد موضوع کی اہمیت یا ہمہ گیری کے ساتھ تہہ دار اظہار اور نت نئے اسالیب اور شعری ہیئتوں کے استعمال کا امکان پیدا کیا جائے۔

۱۲۔ اکیسویں صدی سے افتراق وانتشار کو مخصوص کرنا زیادہ درست نہیں۔ یہ انتشار تو بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہی روز افزوں فروغ پانے والی انفورمیشن ٹکنالوجی اور قدرے بعد میں پوری دنیا کے سمٹ کر ایک گلوبل گاؤں میں منقلب ہوجانے کے ساتھ روبہ عمل آنے لگا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کوئی بھی شعری صنف سماجی اور تہذیبی مسائل کو حل کرنے میں کیا کردار ادا کرسکتی ہے؟ تو راقم الحروف اس ضمن میں سوائے تاسف کے اظہار کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ کوئی مخصوص شعری صنف تو کیا، بحیثیت مجموعی شاعری باوجود اپنی تمام تر شفا بخشی اور وجدانی تسکین میں معاون ہونے کے، کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتی۔ بلکہ یہ بھی عرض کیا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ شاعری ہی کیا تمام تر ادبی اظہار بھی سماجی مسائل کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے۔ زیرِ بحث سوال میں ''ہماری اجتماعیت اور یک جہتی کے لیے نعت کیا کردار ادا کرسکتی ہے'' ہماری اجتماعیت سے آپ کا مدعا کیا ہے؟ کیا مسلمانوں کی اجتماعیت، یا انسان کی اجتماعیت بحیثیت بنی نوع انسان کے یا پھر ان لوگوں کی اجتماعیت یا یک جہتی کی بات کی جارہی ہے جو نعت گوئی کو تمام افراط وتفریط کے ساتھ نہ صرف یہ کہ قبول کرتے ہیں بلکہ اپنے ہم مشرب لوگوں کے درمیان اپنی ایک الگ شناخت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی کثرت تعبیر کے امکان کی موجودگی میں نعت گوئی غیر ضروری وضاحتوں سے احتراز ہی قرین مصلحت ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اسلم انصاری

سوال ۱: اُردو کی شعری روایت میں نعت بحیثیت صنفِ سخن کیا درجہ رکھتی ہے؟

جواب: عقیدت کے اعتبار سے تو نعت کا درجہ بہت بلند ہے، لیکن تنقیدی نقطہ نظر سے یہ صنف سخن غزل، نظم اور رُباعی کے بعد خاص اہمیت کی حامل ہے۔

سوال ۲: اُردو کے شعری لہجے کی ساخت میں، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ نعت بھی شامل رہی ہے؟

جواب: اُردو کے شعری لہجے کی تشکیل گونا گوں عناصر سے ہوئی ہے۔ ''اُردو کا شعری لہجہ'' بھی کسی ایک حقیقت کا نام نہیں، اُردو کے تمام بڑے اور قابل ذکر شعرا منفرد اسالیب اور لہجوں کے حامل رہے ہیں۔ البتہ نعت کو ہماری شعری روایت میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ فارسی میں، جو اُردو کی شعری روایت کا اصل سرچشمہ ہے، حمد و مناجات کے بعد نعت کا مقام ہے۔ فردوسی ہو یا نظام گنجوی، امیر خسرو ہوں یا مولانا حالیؔ، نعتیہ نظم نگاری کو سب نے اپنے لیے سرمایہ افتخار جانا ہے۔ نظامی گنجوی کے ہاں تو (خمسہ نظامی کے حوالے سے) نعت کا ایک ناگزیر جزو معراج نامہ بھی ہے۔ یہ صورت دکنی مثنویوں میں بھی برقرار رہی، لیکن شمالی ہند کی شاعری میں نعت وہ جوش و خروش دکھائی نہیں دیتا جو فارسی کے مثنوی نگاروں کے ہاں ملتا ہے۔ اس کے باوجود متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے ہاں نعت سے قلبی وابستگی دکھائی دیتی ہے۔ اُردو کی غزلیہ شاعری میں آپ کو بعض ایسے اشعار بھی مل جائیں گے جنھیں سوائے نعت کے کسی اور مجازی حقیقت سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً مرزا غالب کا ایک شعر:

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

نور، تجلی اور ظہور۔ ایسی اصطلاحات ہیں جو بنیادی طور پر مذہبی مابعد الطبیعیات سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں تک شعر کے مضمون کا تعلق ہے، اُسے سوائے نعت کے کسی اور حقیقت پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ بظاہر یہ کہنا بھی غلط نظر نہیں آتا کہ نعت نے اپنا بنیادی لحن غزلیہ شاعری سے اخذ کیا۔ یوں نعت اور غزل کی شاعری ہمیشہ قریب قریب ہی رہیں۔

سوال ۳: کہا گیا ہے کہ ہماری تہذیبی بنیادوں کی تشکیل اور قومی شعور کی تعمیر میں نعت نے اہم کردار ادا کیا ہے، اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: ہماری تہذیبی بنیادوں کی تشکیل میں گونا گوں عناصر اور عوامل نے حصہ لیا۔ اس کے باوجود کہ

اُردو شاعری کے عمومی لحن پر گنگا جمنی تہذیب کی چھاپ ہر عہد میں نمایاں رہی ۔ یہ گنگا جمنی تہذیب دو بڑے تہذیبی دھاروں کے قریبی بہاؤ کی آئینہ دار تھی۔ اس کے باوجود اُردو شاعری کی اساس اسلامی مابعد الطبیعات پر ہی قائم رہی۔ اس مابعد الطبیعیات کی قبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ غیر مسلم (مراد ہے ہندو) شعرا نے بھی اس مابعد الطبیعیات کی پیروی کی۔ ذرا ''گلزارِ نسیم'' کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں میں جو حرف زن ہے یعنی کہ مطیع پنج تن ہے

اس طرح چکبستؔ کی نظم ''رامائن کا یک سِیل'' یاد کیجیے:

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزل اوّل ہوئی تمام

اگر چہ چکبستؔ نے آگے چل کر ہند تمدن اور عقائد کو بے حد قرینے سے بیان کیا ہے تاہم یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ اس نظم کے تار پود میں بہت سے اجزا نمایاں طور پر اسلامی تمدن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر میر انیسؔ کی شاعری وجود میں نہ آئی ہوتی تو چکبستؔ کی یہ نظم کہیں وجود میں نہ آتی۔ غرض اُردو شاعری Predominininantly اسلامی تمدن کی شاعری تھی، اس لیے مسلمان شعراء کو الگ سے اپنے تہذیبی تشخص کو assert کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی اور تحت الشعوری طور پر مسلمان شعرا نعت کے بنیادی تصورات سے خود کو الگ محسوس نہیں کرتے تھے۔

سوال ۴: برِصغیر میں اجتماعی طرزِ احساس کی تعمیر میں نعت کے تخلیقی رجحانات نے کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟

جواب: سوال یقیناً مسلمانوں کے اجتماعی طرزِ احساس کے حوالے سے ہے۔ جہاں تک نعت کے تخلیقی رجحانات کا تعلق ہے، وہ زیادہ تر بیسویں صدی کے اواسط ہی میں بروئے کار آئے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں اجتماعیت کے احساس کی اوّلیں نمود بیسویں صدی کے عشرۂ ثانی اور ثالث میں تحریک خلافت کی صورت میں ہوئی۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں کی اجتماعی طاقت جس کا ظہور تحریک خلافت کی صورت میں ہوا تھا بہت جلد ''نصیب دشمناں'' ہو گئی۔ گاندھی کی شاطرانہ چالوں نے اس قوت کو کانگریس کی جھولی میں سمیٹ لیا۔ اس اجتماعیت میں نعت گوئی کی زیادہ کارفرمائی نظر نہیں آتی۔ لیکن بہت جلد علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کی نعتیہ شاعری برصغیر کے اُفق پر طلوع ہوئی اور مسلمانوں کے احساسات میں ایک نیا تموج اور نیا

ارتعاش پیدا ہوا۔ جب اقبالؔ نے کہا:

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے وجود میں حباب

یا جب مولانا ظفر علی خان کی للکار سنائی دی:

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی حرمت پر
خدا شاہد ہے کامل مرا ایماں ہو نہیں سکتا

تو برصغیر کے مسلمانوں کا اجتماعی لاشعور اپنے حقیقی مرکز و عشق رسول اکرم ﷺ کی طرف متوجہ ہوا۔ میری ناچیز رائے میں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مدت میں اقبال اور ظفر علی خان کی نعتیہ شاعری اور تخلیقی رجحانات کی حامل نعتیہ شاعری نے مسلمانوں کے اجتماعی طرزِ احساس کو ایک خاص صورت عطا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

سوال ۵: لوک ادب اور صوفیانہ روایت میں عاشق کا جو نسائی لہجہ ہمیں ملتا ہے، وہ بعض جگہ اردو نعت میں بھی جھلکتا ہے، اسی طرح آقا اور غلام کی نسبت کو بھی اسلوبِ اظہار کے طور پر برتا جاتا ہے۔ نعت کے ان لہجوں یا رویوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: یہ تمام لہجے اور رویے بیرونی اثرات اور گوناگوں محرکات کے نتیجے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ علما نے ان میں سے کسی پر اعتراض نہیں کیا۔ البتہ شاعری کے معیار کا سوال الگ گفتگو کا متقاضی ہے۔ غلام اور آقا کی نسبت، نعت کا ایک مستقل مضمون ہے۔ اسی طرح بیمار اور مسیحا، عاشق اور محبوب کی نسبتیں بھی مقبول و معروف رہی ہیں۔ مضمون (Content) کے اعتبار سے خلوص اور شدتِ احساس اور اظہار کے اعتبار سے فنی پختگی، دو ہی معیار ہیں جن پر ایسی شاعری کو پرکھا جاسکتا ہے۔ نسائی لہجہ زیادہ تر پنجابی اور سرائیکی شاعری میں اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ یہ لہجہ کسی نہ کسی صورت میں اب بھی نمود کا منتظر رہتا ہے۔ اگرچہ حضرت مہر علی شاہ گولڑویؒ کی معروف نعت ''اج سِک متراں دی ودھیری ہے'' میں صیغہ واحد متکلم میں کہیں بھی تانیث کی نمود نہیں (اس وقت پوری نعت سامنے نہیں، ہوسکتا ہے کہیں واحد متکلم کی توضیح ہو) اس کے باوجود اس کی اٹھان اور اس کا عمومی لہجہ روحِ نسائیت کے قریب نظر آتا ہے۔

سوال ۶: بیسویں صدی کے دوسرے نصف سے پہلے ہماری تنقید نے نعت کو خاطر خواہ توجہ نہیں دی، آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ رہی؟

جواب: اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ نعت کو کبھی بھی (Main Stream) شاعری کا حصہ نہیں سمجھا

گیا۔ دوسری وجہ تنقیدی نظریات کی بھرمار نے (مثلاً ترقی پسند تحریک اور بعد ازاں جدیدیت نے) ہر اس چیز سے نظریں پھیر لیں جس پر مذہب یا اس کے اثر کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ دوسری وجہ موضوع کی نزاکت ہے، جس سے فنی تنقید کو زیادہ Space نہیں ملتی رہی۔

سوال ۷: عصرِ حاضر میں ہماری تنقید جن نظریات اور تھیوریز کو استعمال کرتی ہے، کیا نعتیہ افکار کی تفہیم و تعبیر میں وہ مؤثر ہو سکتے ہیں؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ مغرب کے نئے نظریات اور تھیوریز اُردو تنقید میں استعمال تو ہوئیں لیکن اُردو تنقید کا حصہ نہیں بن سکیں۔ دوسری بات یہ کہ یہ خاص نظریات جن کا تعلق زیادہ تر زبان کی ساخت کے نظریات سے ہے اور تخلیقی ادب کی تفہیم سے ہے، اپنی اصل میں خالص مغربی ہیں، اور مغرب کے سیکولر طرزِ احساس کی پیداوار ہیں۔ ان نظریات کے ذریعے ایسی شعری تخلیقات کو (میرے خیال میں) نہیں سمجھا جا سکتا جن کی نوعیت مذہبی اور جن سے ایک خاص قسم کا تقدس وابستہ ہو۔ اس کے باوجود اس اسلوبیاتی مطالعات کا امکان بہرحال موجود ہے، لیکن اس سلسلے میں دشواری یہ ہے کہ اسلوبیات (جو لسانیات کی ایک اہم شاخ ہے) انفرادی مطالعات میں کام آسکتی ہے۔ کسی صنف کا بہ حیثیت مجموعی احاطہ نہیں کر سکتی اس کے باوجود کوشش کی جا سکتی ہے۔ مطالعہ اور فکر و نظر کی پختگی شرط ہے۔

سوال ۸: فکری اور اسلوبیاتی سطح پر آپ اردو نعت کے ارتقائی سفر کے بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: جدید نعتیہ شاعری میں فکر کی سطح خاص بلند نظر آتی ہے، کہیں کہیں تاریخی شعور کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں، اسلوبی اعتبار سے بھی نئے رجحانات کا سراغ ملتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ سفر خاصا باثمر دکھائی دیتا ہے۔

سوال ۹: عہدِ جدید میں اردو نعت کے تخلیقی نقوش اُس کی جداگانہ شناخت کا حوالہ بنتے ہیں یا محض وہ مخصوص شعری روایت کا تسلسل نظر آتے ہیں؟

جواب: تخلیقی فنون میں اسلوب کا معاملہ قطعی طور پر انفرادی ہوتا ہے۔ کسی صنف اور عہد کا عمومی مطالعہ اگر چہ عام تنقیدی روش کا حصہ رہا ہے، لیکن ایسے عمومی مطالعات میں بہت سے مغالطے کارفرما ہو جاتے ہیں۔ قدیم نعت گوئی کی طرح جدید نعت گوئی بھی انفرادی میلانات کے نتیجے میں وجود میں آرہی ہے۔ نیز اس کی حیثیت کسی تحریک کی بھی نہیں جس کے بنیادی اصول طے کر دیئے گئے ہوں۔ نعت کا تعلق عقیدت اور محبت کے ایک خاص رُخ سے ہے۔ جس میں خلوص اور شدت احساس کو خاص مقام حاصل ہوتا ہے۔ اس سب کے باوجود جدید نعت بعض

قابل شناخت اختصاصات کی حامل ضرور ہے۔ لیکن اس حوالے سے کیے گئے مطالعات زیادہ گہرائی کے حامل دکھائی نہیں دیتے (عمومی طور پر) الا ماشاء اللہ۔ جدید نعت کی تنقید میں کلیشے کا استعمال کثرت سے ہوا ہے لیکن اکثر حالات میں کلیشے سے مفر بھی نہیں ہے۔ یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ بعض صورتوں میں جدید نعت بھی مخصوص شعری روایت کا حصہ نظر آتی ہے۔

سوال ۱۰: نعتیہ ادب کے فروغ کے سلسلے میں آپ کی رائے میں آج کن اقدامات کی ضرورت ہے؟

جواب: نعتیہ ادب کے فروغ کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس دور میں ہر علمی اور ادبی مجلّے کا ابتدائی صفحہ حمد و نعت پر ہی مشتمل ہوتا ہے۔ اگر ہر مجلّہ نہیں تو اکثر ادبی مجلّے حمد، نعت اور سلام سے شمارے کا آغاز کرتے ہیں۔ مزید اقدامات کے حوالے سے 'نعت رنگ' میں تجاویز اور مشورے شائع ہوتے رہتے ہیں، ان کو کسی وقت Consolidate کر کے دیکھا چاہیے۔ ویسے اس سوال کا جواب اصل میں تو آپ خود ہی دے سکتے ہیں کیونکہ آپ فروغِ نعت کی کاوشوں میں رہنما اور ناخدا کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

سوال ۱۱: اکیس ویں صدی کے افتراق و انتشار کے اس منظر نامے میں ہماری اجتماعیت اور یک جہتی کے لیے نعت کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟

جواب: وہی کردار ادا کر سکتی ہے جو دینی جذبہ ادا کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ نعت اپنی اصل میں دینی جذبے ہی کا ایک شعبہ ہے۔

☆☆☆

ایوانِ مدحت

کتنا احسان ہے انسان پہ تیرا کہ اسے
اپنی گفتار کو کردار بنانا آیا

(احمد ندیم قاسمی)

صدہا ملک نہ بیش ز جان محمدؐ است
علم الیقین کم ز گمان محمدؐ است

یک گوشۂ ولایت او دشت کائنات
بر ہر ورق کہ ہست نشان محمدؐ است

ایں سرخ و سبز بحر و بر و دشت و کوہسار
زیر نگین ہیچ کسان محمدؐ است

آں علم و فن کہ ارض و فلک را کند شکار
یک تیر بے خیال کمان محمدؐ است

دارم زبان لال و کنم مدح پادشاہ
ایں ہم دلیل ناطق شان محمدؐ است

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

شمس الرحمٰن فاروقی، بھارت

صلی اللہ علیہ وسلم

صدیوں کے فاصلوں پہ بھی کون بُھلا سکا تجھے
تڑپے ترے لئے حرا یاد کرے منیٰ تجھے

عقدہ کشانِ دہر کی حد سے بڑھے جو بے بسی
بہرِ جوابِ آخری کرتے ہیں رہنما تجھے

ارض و سما میں کون ہے جو تری ہمسری کرے
عظمتِ کبریا کے بعد سب نے کہا بڑا تجھے

اپنی مصیبتوں میں بھی تیری وہ دردمندیاں
آئے جب ابتلا کوئی دیتے ہیں دل صدا تجھے

تیرا خلوص با وضو روح عبادتوں کی تُو
آیتیں خود پڑھیں تجھے سجدے کریں ادا تجھے

منصب خاص کے لئے وصف وہ پاس تھے ترے
رنج ہوئے رجا تجھے درد ہوئے دوا تجھے

عزمِ عظیم تر ترا ایسا اثر نواز تھا
جیشِ عدو بکھر گیا مل گئے ہمنوا تجھے

دونوں جہاں ملے اُسے تیری ولا جو جی گیا
اپنی نظر سے بھی گیا جس نے بھلا دیا تجھے

اتنا کسے لکھا گیا اتنا کسے پڑھا گیا
جتنا لکھا گیا تجھے جتنا پڑھا گیا تجھے

جلیل عالی، اسلام آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

بہت حیران ہو ہو کر زمانہ دیکھتا ہے
محمدؐ سے محبت کا یہ کیسا سلسلہ ہے

کسی مجہول محور کے طواف اندر نہیں دل
خدا جو مصطفٰی کا ہے وہی اپنا خدا ہے

خدائے دو جہاں کے بعد کس کی بادشاہی
سرِ کون و مکاں اک اسمِ احمدؐ گونجتا ہے

اُسیؐ کے دَم سے قائم ہے رَم و رفتارِ ہستی
اُسیؐ کے نم سے باغِ دہر کی نشو و نما ہے

زمانے سن! امیرِ بدر کے ہم لشکری ہیں
ہمارے حوصلوں کی لَو رضائے کبریا ہے

شعورِ خیر و شر سے دُور ہو سکتا نہیں دل
سرِ دیوارِ جاں آئینۂ سیرت سجا ہے

کسی لمحے قضا ہوتی نہیں ہے یاد اُس کی
وہ رگ رگ میں سمایا ہے وہ سانسوں میں بسا ہے

طلب کرتے ہیں اُس چشمِ کرم سے نورِ رحمت
کہ اپنا چاند تارا اِن دنوں گہنا رہا ہے

ہم اُس کوچے سے نسبت کی خوشی کیسے سنبھالیں
ہمارا نام اُس کے خار و خس میں آگیا ہے

جلیل عالی، اسلام آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

نعت لکھیں تو وہ احوال و اثر بنتے ہیں
حرف در حرف عجب شوق سفر بنتے ہیں

اُس کی سیرت ہو نگاہوں میں تو دیکھے دنیا
کس طرح راہ کے پتھر بھی گہر بنتے ہیں

اُس کی جانب ہو سفر تو خس و خاشاکِ قبا
دیکھتے دیکھتے سُرخاب کے پر بنتے ہیں

اُس کے سرمست کو کب روک سکا ہے کوئی
وہ نکلتا ہے تو دریا میں بھی دَر بنتے ہیں

اُس کے فیضان سے ہر خیمۂ ہستی قائم
اُس کے فرمان سے فردوس میں گھر بنتے ہیں

نام لیں اُس کا تو وہ بادِ نمو چلتی ہے
بانجھ احساس کی شاخوں پہ ثمر بنتے ہیں

ہم کو دیتا ہے وہی اسم پناہیں عالی
ورنہ اِس بحرِ گماں میں جو بھنور بنتے ہیں

دل شاد ہیں ہر درد کی شدّت سے زیادہ
کیا چاہئے اور اُس کی محبت سے زیادہ

بے سود بھٹکتی ہے سرابوں میں یہ دنیا
کیا آبِ بقا چشمۂ رحمت سے زیادہ

اک صورتِ تعمیر کہ جھلکی سرِ قرآں
روشن ہوئی مینارۂ سیرت سے زیادہ

یہ سچ ہے کہ ہم اُس کی پرستش نہیں کرتے
رہتا ہے مگر دل میں عبادت سے زیادہ

جب فرطِ ندامت سے نہ ہو تابِ دعا بھی
کیا کوئی سبیل اُس کی شفاعت سے زیادہ

یہ نعت کا اعجاز ہے لکھتے ہیں تو خود ہی
بنتی ہے کوئی بات عبارت سے زیادہ

جلیل عالی، اسلام آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

بنے جس کے لئے یہ ثابت و سیّار سارے
اُسی درگاہ کے دریوزہ گر دربار سارے

خدا نے اُس کو سونپی دو جہاں کی بادشاہی
اور اُس کے دل پہ آئینہ کئے اسرار سارے

اُسی صورت سے نکلیں حسن کی ساری شبیہیں
اُسی سیرت سے ابھرے خیر کے معیار سارے

اُسی اوجِ اخوت کا ثمر ہر غمگساری
اُسی موجِ محبت کی عطا ایثار سارے

اُسی کے شہر میں بخیہ گری ہوتی ہے دل کی
اُسی کی لہر سے لگتے ہیں بیڑے پار سارے

ابو بکرؓ و عمرؓ ہوں یا کہ عثمانؓ و علیؓ ہوں
اُسی بزمِ شعور و شوق کے شہ کار سارے

بس اک اسمِ محمدؐ مصطفٰے اکسیرِ عالم
کرے جو دُور جسم و روح کے آزار سارے

وہی کرتا ہے سب خستہ تنوں کی دست گیری
اُسی کی سمت دیکھیں بے کس و لاچار سارے

نکلتا ہے زمانہ جب بھی اس کی پیروی میں
تو کر دیتی ہے قدرت راستے ہموار سارے

وہ رکھے سایۂ رحمت میں ارضِ جاں ہماری
رہیں آباد اپنے کوچہ و بازار سارے

وہ جس کا شوق سوچوں میں ستارے ٹانکتا ہے
اُسی کے نام ہیں عالی مرے اظہار سارے

جلیل عالی، اسلام آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا کیا تسخیرے مجھ کو
شوق ترا تعمیرے مجھ کو

تیرے دھیان کے اپنے موسم
کیسے وقت اسیرے مجھ کو

تیرے نگر کی سمت رواں ہوں
کنکر پتھر ہیرے مجھ کو

اک تاریک مکاں دل میرا
یاد تری تنویرے مجھ کو

ٹک ٹک مَیل گناہوں والی
ذکر ترا تطہیرے مجھ کو

مَیں بے وصفا، مَیں بے ہُنرا
نام ترا توقیرے مجھ کو

تیری محبت بھید سُجھائے
کیا کیا دھیرے دھیرے مجھ کو

قطرے سے ہو کیا مدحتِ دریا مرے آقا
مقصود ہے بس عرضِ تمنّا مرے آقا

مَیں محوِ سفر ہوں تری یادوں کے جلو میں
تُو ہی مری منزل مرا رستہ مرے آقا

آباد ہے اک سرمدی احساس کنارے
سینے میں ترا شوق مدینہ مرے آقا

بے ربطیِ افکار میں تالیف کی صورت
بس اک تری سیرت کا حوالہ مرے آقا

رکھ سایۂ رحمت میں کہ منسوب ہیں تجھ سے
مَیں اور مرا چاند ستارہ مرے آقا

اشکوں کی روانی میں یہی وردِ زباں ہے
آقا مرے آقاؐ مرے آقا مرے آقا

جلیل عالی، اسلام آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

کیا آنکھ میں ٹھہرے کوئی دنیا کی بڑائی
اِس دل کو میسّر ہے ترے در کی گدائی

ہر دشتِ بلا سے تری چاہت نے نکالا
ہر آگ اِسی ابرِ تسلّی نے بجھائی

تنویر خیالوں کی ترے ذکر کا موسم
تفسیر اجالوں کی تری مدح سرائی

چَھٹتے ہیں ترے نام سے ذہنوں کے اندھیرے
ملتی ہے تری یاد سے سینوں کو صفائی

زندہ ہے زمانوں میں وہ تحریک کی صورت
تُو نے جو ضمیروں کو مساوات سکھائی

گر تیرے نشاناتِ سفر یاد نہیں ہیں
بیکار ہے تدبیر کی سب آبلہ پائی

جلیل عالی، اسلام آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

تصور غیر ممکن رفعت و شان محمدؐ کا
عبث ہے ڈھونڈنا جس طرح آدم کے اب و جد کا

سکھائے صبح 'کن'، اللہ نے اسما جب آدم کو
سکھایا سب سے پہلے اسم آدم کو محمدؐ کا

قیامت تک کے اسرارِ رسالت اس کو سمجھائے
بتایا بھید اُسے ختمِ رُسُل کے قامت و قد کا

کوئی گن ہی نہیں سکتا، کوئی لکھ بھی نہیں سکتا
بھرم کھولا ترے اوصاف نے اعداد و ابجد کا

غلام اُس کے کروڑوں ہر زمیں پر، ہر زمانے میں
نہیں موجود و امکاں میں کوئی ثانی محمدؐ کا

علامت ہے یہ تیرے آستاں بوسی کی خواہش کی
تری چوکھٹ کو جھک جھک دیکھنا چرخِ زبرجد کا

ہزاروں سال کی دُوری کی خندق پاٹ جاتا ہے
نبیؐ کے لمس لب کا قرب اور بوسہ اسود کا

نہیں ہے بال بھر نظمِ دو عالم میں خلا کوئی
مکاں ہو یا زماں صدقہ ہے اک میم مشدّد کا

جو کچھ بھی ہے، جہاں پر بھی ہے موجودات و امکاں میں
تشکر مست تیری رحمت بے حصر و بے حد کا

نبوت طے ازل سے تھی، تری مابعدِ محشر بھی
کوئی کس طرح ہو سکتا ہے وارث تیری مسند کا

کشش آورد خیال ان کا ہے ایسے نعت گوئی میں
گماں ہر کوشش آورد پر ہوتا ہے آمد کا

طلوعِ نعت کا آغاز اس سدرہ سے ہوتا ہے
جہاں ہے خاتمہ امکانِ فن کی آخری حد کا

پیالہ با پیالہ متصل قوسین سا املا۔۔۔!
زمیں سے عرش تک رحمت نما ہے میم کی شد کا

ریاض مجید، فیصل آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

کس نے دیکھی ہے انتہائے نعت
نعت ہی نعت ہے، ورائے نعت

طرزِ اظہار ' خواہ کیسا ہو؟
رُو بہ سیرت رہے فضائے نعت

پورے جذب و حواس و ہوش سے دیکھ
جاگتی آنکھوں خواب نائے نعت

رُوبرو رہ مواجہ کے —— اپنے
تخلیے کو رکھ آشنائے نعت

کہیں ماقبل 'کُن' کے نقشے میں تھی
یا ہوئی 'کُن' سے ابتدائے نعت

ریاض مجید، فیصل آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

انتہائے جذب میں اے طبع! مشتاقانہ تر
لب کشا ہو نعت کے سدرہ پہ آزادانہ تر

اے دلِ تکریم اسلوب! اے دلِ آداب خُو
'با خدا فرزانہ باش و با نبیؐ فرزانہ تر'

لَے رہے ہشیار تر، محتاط تر اظہار کی
لاکھ ہو ذوقِ ثنا، چالاک تر، طرزانہ تر

پل صراطِ حشر سے گزریں گے رب کے اذن سے
امتی خاص اُن کے ۔۔۔ بے باکانہ تر دزانہ تر

ہو گئے جو خاک تیرے آستانِ قدس کی
زندگی کرتے ہیں وہ سائل بسر، شاہانہ تر

نعت کے موضوع کو ہر صنف کرتی ہے قبول
آگے بڑھ کر ایک سے ایک آپ دلدارانہ تر

سیرتِ سرورؐ سے جو ناآشنا ہے وہ ریاض
دہر سے بیگانہ ہے مابعد سے بیگانہ تر

ریاض مجید، فیصل آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

کرتا ہے میرے گھر کو سرافراز نعت سے
ہونا طلوعِ فجر کا ' آغازِ نعت سے

حبّ و ولا گر اس کی اطاعت نژاد ہو
خاکی ملائکہ کا ہم آواز نعت سے

خود مجھ کو بھی خبر نہیں— الفاظ و لحن میں
جن حیرتوں کا ہوتا ہے دَر باز نعت سے

خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا' جس طرح
جذبے ہوئے ہیں معجزہ انداز نعت سے

اک نسبت عظیم ہے رہبر قدم قدم
جوہر مرا ہوا ہے ثنا ساز نعت سے

اللہ کا کرم ہے یہ سرکارؐ کی عطا
جو بھی ریاض کو ملا اعزاز نعت سے

٭ ریاض مجید، فیصل آباد

نظر کے سامنے اُن کا حرم ہے
مرے مولا! ترا کتنا کرم ہے؟

وہاں کی حاضری بھی ہے حضوری
مدینے کا ہر اک پل محترم ہے

تُو ماں سے بڑھ کے شفقت کرنے والا
مری جنت ترے زیرِ قدم ہے

تیری اُمت سے ہوں، ہے ناز اس پہ
تیری رحمت ہے یہ تیرا کرم ہے

سلام اُن کے لئے لب پہ ہمیشہ
درود پاک دل میں دم بہ دم ہے

دعا مقبول ہونے کی نشانی
مبارک ہو تجھے جو آنکھ نم ہے

ملا ہے نعت گوئی کا جو منصب
ریاض اپنا یہ کیا اعزاز کم ہے؟

ریاض مجید، فیصل فیصل آباد

ﷺ

لکھا ہُوا ہوُ ہر اک اہل نعت کا مقبول
رسولنا! ہو یہ مقبول، ربنا! مقبول

کسی بھی رُخ سے نہ رَد ہو کبھی یہ خیر کا وِرد
دُرود ایسی عبادت ' جو ہو سدا مقبول

کسی بھی نعت کا اک شعر ' کوئی اک مصرع
نبیؐ کے صدقے کرے رب مرا لکھا مقبول

ہماری نقل کو دے خاص اصل کا درجہ
ہماری لکنتِ لہجہ کو کر شہا! مقبول

ترا ہی اذن و عطا ہے ہنر عقیدت کا
تو اپنا اذن پذیرا ' تُو کر عطا مقبول

ہے تیرا خاص کرم ہم پہ ' ہم جو لکھتے ہیں
رحیم! رحم! نہ ہو اِن میں کچھ بھی نا مقبول

گواہ پندرہ سو سالوں کے راز یاب اس پر
درود پڑھ کے جو مانگو ہو وہ دعا مقبول

خیال میں ' جو مواجہ کے سامنے کی ہے
وہ عرضداشت ہو پوری، ہو وہ دعا مقبول

ملے نوید کسی شب یہ خوابِ طیبہ میں
خوشا نصیب! ہوئی ہے تری ثنا مقبول

نفوسِ قدسیہ تھے برگزیدہ جن کا ریاضؔ
سنا گیا ' جو کہا ___ جو کہا، ہُوا مقبول

ریاض مجید، فیصل آباد

فواکہات، نہ حُور و قصور میں جنت
ہے اہلِ حب کی رضائے غفور میں جنت

طلب ہے آدمِ خاکی کی وہ ہی گم گشتہ
جھلکتی ہے جو کبھی لا شعور میں جنت

قریب آتی ہوئی، غیب میں سمٹتی ہوئی
ہے جاں کے جو کہیں نزدیک و دُور میں جنت

ورائے سدرہ رضایاب کامگاروں کی
ہے منتظر کہیں راہِ ظہور میں جنت

وہ دفن ہوتے ہیں جو نفسِ مطمئنہ کے ساتھ
دکھائی جاتی ہے اُن کو قبور میں جنت

ریاضِ جنۃ میں بیٹھے ہوئے یہ سوچتا ہوں
ریاض کی قدمینِ حضورؐ میں جنت

ریاض مجید، فیصل آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

بابِ مدحت جو کُھلا، دل کی نوا لے آئی
لکھ کے اشکوں سے کوئی تازہ دعا لے آئی

حرف مانگے تو کوئی ساعتِ الہام مجھے
تھام کر ہاتھ، سوئے غارِ حرا لے آئی

گھر سے نکلی تو اندھیرا نہ اُجالا دیکھا
میں تصور میں وہ نقشِ کفِ پا لے آئی

اب کے طیبہ کا سفر خواب کے عالم میں کیا
یوں لگا جیسے ہوا خود ہی اُڑا لے آئی

زیرِ دیوارِ حرم بیٹھی رہی دیر تلک
اور اُٹھی تو وہی چھاؤں اُٹھا لے آئی

کتنی حیراں ہے یہ دنیا کہ کہاں جا کر میں
ہر خوشی سارے زمانے سے سوا لے آئی

شاہدہ حسن، ٹورانٹو (کینیڈا)

اُمّتِ مُسلمہ پہ آئی کٹھن گھڑی میں اک مناجات بہ حضور سرورِ دوعالم

آگہی مانگتی ہوں، حُسنِ بیاں مانگتی ہوں
اپنے احساس سے اک اور جہاں مانگتی ہوں

اُن کی مدحت کو میں گویائی کہاں مانگتی ہوں؟
میں تو آنکھوں سے فقط اشکِ رواں مانگتی ہوں

شاید آجائے تکلّم کا سلیقہ اک دن
اس لئے صحبتِ صاحب نظراں مانگتی ہوں

دل سُلگ اٹھتا ہے جب اہلِ مناجات کے ساتھ
جو دعا مانگتی ہوں، اشک فشاں مانگتی ہوں

اُن کی نصرت کا یقیں، خوف سے دیتا ہے نجات
ہر نفس دل کے لئے زدِ گُماں مانگتی ہوں

سانحے کرگئے بے حال مرے لوگوں کو
عافیت مانگتی ہوں، بخشش جاں مانگتی ہوں

موت ہی موت کے منظر ہیں مری آنکھوں میں
رحم ہی رحم شہِ کون و مکاں مانگتی ہوں

خاک کے ڈھیر پہ بیٹھی ہوئی امت کے لئے
سائباں چاہتی ہوں، کُنجِ اماں مانگتی ہوں

سب کے زخموں کے لئے چارہ گری، چارہ گری
آپ ہی سے تو مسیحائے جہاں مانگتی ہوں

میری آواز تو مدفون ہے ان شہروں میں
آپ سُن لیجئے وہاں جو بھی یہاں مانگتی ہوں

اب کبھی آئے نہ بستی پہ مری کوئی عذاب
رحمتِ خاص کو ہر پل نگراں مانگتی ہوں

یہ زمیں تنگ ہوئی جاتی ہے انسانوں پر
قدمِ پاکِ محمد کے نشاں مانگتی ہوں

مجھ کو کافی ہے جو اُس نور سے پُر نور ہے دل
کب میں اِن بجھتے چراغوں کا دُھواں مانگتی ہوں

شاہدہ حسن، ٹورانٹو (کینیڈا)

صلی اللہ علیہ وسلم

ہوا میں محسوس کی جو بوئے رسول میں نے
لہو میں کھینچی وہ مشک بوئے رسول میں نے

پہنچ کے خدمت میں اذن مانگا تھا مجھ سے پہلے
روانہ دل کو کیا تھا سوئے رسول میں نے

میں عالم خواب میں بھی جلووں سے تھی منوّر
کہ جیسے دیکھا تھا نورِ روئے رسول میں نے

بُلا لیا ہے جو بارگاہِ اماں میں یک دم
سُنائے تھے اپنے دُکھ بروئے رسول میں نے

مدینۃُ العلم کے بتائے تھے ماں نے رُتبے
تو کی تھی بچپن سے آرزوئے رسول میں نے

گئے زمانوں کی مہرباں رُت ہوئی ہے زندہ
سُنی فضاؤں سے گفتگوئے رسول میں نے

طیور کی چہچہاہٹیں ہیں حرم میں ہر سو
سُنی پرندوں سے مدحِ خوئے رسول میں نے

صحیفہ نور کی تلاوت ہے اور میں ہوں
یہیں چکھی ہے مئے سبوئے رسول میں نے

شاہدہ حسن، ٹورانٹو (کینیڈا)

روضۂ اقدس پر گزاری اک شام کی کیفیت

یوں جو انوار کی بارش میں نہائی ہوئی ہوں
خود نہیں آئی یہاں، اُن کی بلائی ہوئی ہوں

باغِ دل اور ہرا، اور ہرا ہوگا ابھی
کیسے مُرجھاؤں گی میں، اُن کی بسائی ہوئی ہوں

جانتی ہوں میں مزہ روح کی بیداری کا
میں کہ اک نیند کے عالم سے جگائی ہوئی ہوں

تھام کر ہاتھ وہ لے آئے ہیں در پر اپنے
میں کہ ہر غیر کی چوکھٹ سے اٹھائی ہوئی ہوں

خاک ملبوس ہے لیکن ہے بہاراں ملبوس
کسی خوشبو کی طرح خود میں سمائی ہوئی ہوں

میں تو پہلے ہی سے ہوں خاکِ مدینہ میں نہاں
ہو کے مٹّی اسی مٹی میں ملائی ہوئی ہوں

لب پہ آتا ہے یہی نام ہر اک مُشکل میں
اُن کی توصیف کے سب اسم سکھائی ہوئی ہوں

شاہدہ حسن، ٹورانٹو (کینیڈا)

نعت میں وہ فضا بنے

نعت میں وہ فضا بنے
لفظ بہ لفظ ہر صدا
منصفِ خیر و شر رہے
لوحِ جہاں کا آئنہ
صرف مرے حضور ﷺ کے
رنگ سے خیرہ سر رہے
بس یوں ہی معتبر رہے
لفظ و بیان پر سدا
خیر ہی کا اثر رہے
نعت میں وہ فضا بنے
جس کے طفیل زیست بھی
نور کی راہ پر رہے
تا بہ ابد جہان میں
صدق و یقیں کی رہ گزر
نور سے معتبر رہے
حُسنِ معاملت یہاں
خیر سے پُر اثر رہے
نعت میں وہ فضا بنے
لفظ ہر ایک درد میں
قلب کا چارہ گر رہے
خیر کا سائباں سدا
لفظ و بیان پر رہے

نعت میں وہ فضا بنے
گام بہ گام زندگی
شمع بدست شب بہ شب
فکر و تخیلات کی
راہِ بلاغ پر رہے
دشتِ ظُلم میں ہر طرف
خُلقِ حَسَن کی ہی کرن
حرف میں جلوہ گر رہے
نعت میں وہ فضا بنے
جس کی تجلیات میں
جھلکے مثالِ آئنہ
اُسوۂ سرورِ اُمم ﷺ
نعت پڑھیں تو دور ہوں
زنگ خیال و فکر کے
شہرِ سخن میں نعت ہی
سکۂ معتبر رہے
حرفِ سخن کے فرق پر
تاجِ ہنر سجا رہے
شعر ہر ایک نعت کا
صوت و صدا کے شہر میں
تازہ گلاب کی طرح
تا بہ ابد کھلا رہے
نعت میں وہ فضا بنے!!!

عزیز احسن، کراچی

صلی اللہ علیہ وسلم

وہ رنگ ہے ترے کردار کا رسولوں میں
مہک گلاب کی جیسے تمام پھولوں میں

سنور گئے ترے قدموں سے ریگ زار تمام
سلیقہ آگیا صحراؤں کے بگولوں میں

وہ پیار دے دیا لڑتے ہوئے قبیلوں کو
سہیلیوں کی رفاقت ہو جیسے جھولوں میں

زمانہ اپنی ترقی سے ہو کے خود زخمی
پناہ ڈھونڈ رہا ہے ترے اُصولوں میں

مَیں تیرا ہو کے ترا اُمتی نہیں لگتا
اَٹا ہوا ہوں گناہوں کی اتنی دھولوں میں

اُنھیں کا رنگ خدا دے ہماری کلیوں کو
مہک اُنھیں کی ہو اظہرؔ ہمارے پھولوں میں

اظہر عنایتی

ﷺ

مشعلِ حرف و نوا ہے کہ ہے سیرت تیری
حق بیانی کی ادا ہے کہ ہے سیرت تیری

کس نے ماحول میں روشن کیا اللہ کا نام
یہ اذانوں کی ضیا ہے کہ ہے سیرت تیری

ایک عالم ہے کہ سیراب ہوا جاتا ہے
کوئی ساون کی گھٹا ہے کہ ہے سیرت تیری

اتنی سچائی تو جذبوں میں نہیں تھی پہلے
ماں کے ہونٹوں کی دُعا ہے کہ ہے سیرت تیری

کتنے معصوم ہیں محتاج روی کے انداز
ہجرتِ بادِ صبا ہے کہ ہے سیرت تیری

بندگی کے ہمیں آداب سکھائے تو نے
طرزِ تسلیم و رضا ہے کہ ہے سیرت تیری

ایک ہی رنگ ہے افکار سے کردار تلک
اب یہ قرآن کھُلا ہے کہ ہے سیرت تیری

اظہر عنایتی

ترجمہ مثنوی "ابرِ گوہر بار" (غالبؔ)

وہ حمد و ثنا، آبروے بیاں	وہ حمد و ثنا، عیشِ نطق و زباں
وہ حمد و ثنا، ابتداے کلام	(کلامِ ہُوَ الاوّل و لا یَنام)
وہ حمد و ثنا، نغمۂ جاں فزا	ملے روح کو جس سے راحت سوا
وہ حمد و ثنا، وہ ازل روشنی	فرشتوں کی تسبیح و تہلیل بھی
جسے سن کے شوریدگانِ الست	"بلیٰ ربّنا" میں ہوئے جذب و مست
وہ حمد و ثنا، موج جس کی اٹھے	اگر دل سے تو راہ دل میں کرے
وہ حمد و ثنا (لمعۂ نور ہو)	یقیں میں گماں جس سے مستور ہو
ہے اس خالقِ کل کے شایانِ شاں	میں جس کی عطا سے ہُوا حمد خواں
وہ کیسا ہے اور اس کا کیا نام ہے	مجھے اس کی تمہید سے کام ہے
نگینے پہ دل کے، رقم اس کا نام	وہ ہر شے کی شہ رگ میں دھڑکے مدام
نہ ہوتا اگر عام اس کا کرم	مرے لب کو ملتا نہ یاہُو کا دم
مرے دل کو اس کی عطا دردِ عشق	مرے رُخ کو اس کی عطا گردِ عشق
سب اس کے سوالی، وہ سب کی پناہ	چہ موروچہ مردُم، چہ مہر و چہ ماہ
وہ دلبر ہے دلدادگاں کے لیے	نہیں اس کا سودازیاں کے لیے
عطا اس کی بے پر کو، پرواز بھی	وہ کھینچے ہے افتادوں کے ناز بھی
نگہ سے نوازا مری آنکھ کو	بہار و خزاں سے شناسا ہے جو
کیا دل کا تابع مرے بات کو	اسیرِ اَمَل کر دیا ذات کو
رکھا عقل اور روح میں سلسلہ	سبب ہے جو پیداءِ نطق کا
یہ ربط و سبب بھی ہے پردہ مگر	پرے دیکھ پائے نہ جس کے نظر
ہے روشن اگر منظرِ کائنات	ہم آہنگ ہیں صورتیں اور صفات
تو سوچو، یہ شمس و قمر کس کے ہیں	فلک کس کا ہے، بحر و بر کس کے ہیں
یہ پردہ ہے کس کا، یہ کس کا ہے ساز	نہاں بھی، عیاں بھی، یہ کیسا ہے راز
یہ بازی گہِ وقت بھی دیکھنا	جہاں موسموں کا ہے میلہ لگا
بہار و خزاں کے جدا اپنے رنگ	کبھی ریت دریا، کبھی آب سنگ
کبھی پیڑ رنگوں میں ڈوبے ہوئے	کبھی شاخ تا شاخ ننگے ہوئے

کبھی دامنِ دشت ہے لالہ زار
کبھی باغ میں الوؤں کی پکار

ذرا سوچو، موسم بدلتے ہیں کیوں
یہ رنگوں کے طوفان چلتے ہیں کیوں

حقیقت کو ان کی، نہ پائے کوئی
یہ سب کیا ہے، کیوں ہے، بتائے کوئی

فلک، بحر، بر، چھان مارے مگر
نہ پایا کسی نے حقیقت گہر

فراست سے دھوئے جہالت کے داغ
جلایا ہے ظلمت میں کس نے چراغ

خرد جو رکھے کل جہاں کی خبر
نہیں ہے مگر اس کو اپنی خبر

اگر کوئی دیکھے بچشمِ شعور
نظر آئے اک خالقِ کل ضرور

جو ہے واقفِ رازِ کون و مکاں
جو ہے حاکمِ وسعتِ دو جہاں

جو ہے خالقِ فرش و عرش و فلک
چلے حکم جس کا سما تا سمک

اشارے پہ جس کے چلیں مہر و ماہ
جو ہے مالکِ ہر سفید و سیاہ

جو ہے صانعِ پیکرِ آب و گل
اسی سے صدف میں گہر، تن میں دل

اسی سے ہیں اورنگ و تاجِ شہی
کرے گمرہی میں عطا آگہی

اسی سے فن و فہم و فرزانگی
یہ محویّت و جذب و دیوانگی

وہ اسرارِ اطراف میں رہنما
وہ ظلمات پردوں میں روشن دیا

اسی سے ہے قلب و جگر میں لہو
شمارِ نفس کو وہی حرفِ ہُو

اسی کے نشے میں ہے بیخود شراب
وہ مضراب و نغمہ، وہ ساز و حجاب

دلِ زار میں جوش بھرتا ہے وہ
غم و خوف آسان کرتا ہے وہ

اسی کے لیے ہے نفس نالہ خیز
جگر اس کے سودا میں ہے ریز ریز

اسی کے لیے ابر ہے اشک بار
اسی کے لیے برق ہے بے قرار

خموشی بھی گویا اسی کے لیے
وہ واقف ہے سب وہم و وسواس سے

بیانِ طرب، داستانِ الم
اسی سے ہے جنبش میں میرا قلم

سماتا نہیں عقل میں، وہ ہے کیا
وہ عرفان و وجداں سے ہے ماورا

نہیں اس کے آگے دوئی کا گزر
مگر اس کے در پر خودی داد گر

وہ ناز و تکبر، غرور و ادا
اسے زیب دیتے ہیں سب برملا

جہانِ عدم اس میں غرقاب ہے
کہ وہ عینِ ہستی کا گرداب ہے

بہت ایک سورج سے ٹوٹے شہاب
بہت ایک مینا سے برسی شراب

بہت ایک دریا سے موجیں اٹھیں
بہت ایک بربط رہا نغمگیں

وہی ہستیِ محض و عینِ وجود
وہی اوّل و آخر و ہست و بود

اسیری میں بھی خوش ہیں اس کے اسیر
فقیری پہ نازاں ہیں اس کے فقیر

کہ اس کی اسیری ہے آزادگی
کہ اس کی فقیری ہے شاہنشہی

مغنی ہو گر زخمہ زن تیز تر
تو جلتا ہے خوں سے بدن تیز تر

شہیدوں کو اس کے، ہے حاصل طرب
انھیں چھوتے ہیں کب یہ رنج و تعب

ہے خلوت میں شور آہِ شبگیر سے
تو ہنگامۂ بزم تقریر سے

کوئی تشنگی میں ہے دریا طلب
کسی کو ہے اک موجِ ساغر غضب

وہیں ڈھونڈے ہیں سارے کافر پناہ
جو ہے مومنوں کے لیے سجدہ گاہ

تلاشی کوئی، ہے ہُوالحق سرا
کوئی تلخ گو ہے انا الحق نوا

نہیں اس کی بخشش فقط اک خوشی
کہ دیتا ہے وہ غم کی سوغات بھی

کسی کو دیے زندگی کے مزے
کوئی گھونٹ پیتا رہے خون کے

غرض دونوں اس کی عطا کے ہیں ڈھنگ
کبھی نا امیدی، کبھی ہے امنگ

ہر آئین کی ابتدا اس کا نام
ہر آئین میں ہے وہ محوِ کلام

ہر آئین کا اپنا اسلوب ہے
ہر آئین اپنی جگہ خوب ہے

بصد پردہ نازل ہُوا ہے کلام
مگر سارے پردوں میں ہے ایک نام

وہی نام ہر شے پہ ہے دائرہ
وہی ابتدا ہے وہی انتہا

وہی آتش و باد میں، سنگ میں
وہ اشعار و اصنام و ارژنگ میں

کوئی اس کو ڈھونڈے تہِ ذات میں
کوئی ڈال میں، پھول میں، پات میں

کسی کو ہے شمس و قمر سے کشش
کسی کو غمِ بحر و بر سے کشش

مظاہر میں جو ڈھونڈتے ہیں اسے
حقیقت سے ان کے بھی ہیں سلسلے

مسافر بہت، راستے ہیں بہت
سراغ ایک ہی ذات کے ہیں بہت

سبھی ایک مرکز کی جانب رواں
فریبِ خیال و یقین و گماں

ہے اک آئینہ خانۂ آگہی
دکھاتا ہے جو عکسِ وجہُ الٰہی

جہاں سارے اطراف ہیں لا طرف
جہاں ختم ہیں معنیِ نشر و لف

نظر آئے بس ایک صورت جہاں
جو دیکھے اسے، ہے وہی بے گماں

جو ہے وہ ہے، جو کچھ ہے سب اس سے ہے
ہر اک سازِ معدوم میں اس کی لے

مری حمد میں سوز و ساز اس کا ہے
قلم میرا نغمہ طراز اس کا

صریرِ قلم مثلِ بالِ سروش
قلم، نعت نغمہ سرا، گل فروش

قلم دل کی گہرائی میں غوطہ زن
قلم عرش افراز میں پر فگن

قلم آبِ گوہر سے سیراب ہے — قلم نعت کہنے کو بے تاب ہے
نگوں سر ہو اور پیشتر لکھ درود — بنامِ نبیؐ، فخرِ بود و نمود
محمدؐ خدا کا جو ہیں آئینہ — میں سمجھوں انھیں کیوں خدا سے جدا
کہ جو ہے خدا کے، وہی ان کے رنگ — خودی تو فقط آئینہ کا ہے زنگ
تھی روزِ ازل آرزوے ظہور — کیا خلق پہلے محمدؐ کا نور
خدا نے جہاں کو جو دکھلا دیا — ہے ذاتِ محمدؐ بھی اک معجزہ
قدم رنجہ ہو سانس سے پیشتر — کلام ان کا ایسے کرے دل میں گھر
نقوشِ قدم ہیں کہ گل کھل اُٹھے — ہوئے سنگ نرم ان کے پیروں تلے
بہارِ نقوشِ قدم دیکھ کر — زمیں ان پہ قربان ہے سر بسر
بدستِ محمدؐ قلم نارسا — قلم تک بھی تابِ رقم نارسا
زیاں کار ان سے لگائے ہیں آس — جہاں دیدگاں بھی ہیں محوِ سپاس
سب ان کی نظر کے طلبگار ہیں — وہ ساقی ہیں، سب ان کے میخوار ہیں
خرام ان کا صحرا کو گلشن کرے — کلام ان کا، کافر کا دل موڑ دے
ہوئے دوست سب ان کے، غیر و عدو — وہ ان کی حلاوت بھری گفتگو
قد و قامت ان کا فرازِ حرم — جبیں وہ کہ سجدہ ہوا محترم
ملی ان کے رخ سے یمن کو ضیا — خمِ زلف سے ہے ختن پُر فضا
وہ لائے زمانے میں دینِ عظیم — ہوئیں محو گمراہیاں سب قدیم
دکھائی زمانے کو راہِ حرم — بتوں کی خدائی کا توڑا بھرم
وہ خود راز، خود پردۂ راز ہیں — قریبِ خدا وہ سرفراز ہیں
کرے کشفِ اسرار ان پر سروش — مگر واقفِ ہر صدا ان کے گوش
ملی ایک شب ان کو مثلِ آفتاب — ہوئے نورِ حق سے وہ جب وصل یاب
یہاں قصۂ لن ترانی گہن — نہیں درمیاں ربِّ ارنی سخن
کہ خود آرزوے ملاقات ہو — خدا کو، تو کیوں پہلوے گو مگو
جو اس در پہ ہے سائلوں کا ہجوم — کہ ہو جس طرح میکشوں کا ہجوم
کوئی جامِ کوثر کا امیدوار — کوئی دید منظر کا امیدوار
کسی کو نگاہِ کرم کی طلب — کوئی حرفِ حق کے لیے مضطرب
وجود ان کا روحانیوں کو جمال — نہ پہنچے جسے فلسفی کا خیال
نفس عرشِ بالا سے ان کا بلند — وہ سارے خلائق میں ہیں دل پسند

وہی آلِ آدم کی ہیں قبلہ گاہ   ہوئے سارے پیغمبر ان کے گواہ
مثال آپ اپنی ہے اِس راہ کی   ہے ختم ان پہ زنجیرِ پیغمبری
وہ دنیا میں ہیں دین کی روشنی   اور عقبیٰ میں شافع بھی ہوں گے وہی
وہ ہم عاصیوں کا سہارا ہوئے   کہ فخر ان سے نسبت ہمارے لیے
خدایا، عطا کی ہے تو نے زباں   ہیں بخشش تری، فہم و نطق و بیاں
مگر کیا ہے یہ ربطِ حرف و صدا   نوا کیسے نغمہ ہوئی، کیا پتا
اگر دل ہے معنیِ مے کا سبو   تو دل کیا ہے، بس ایک قطرہ لہو
اگر عقل سے ہے اجاگر خیال   تو خود عقل کی ماہیت ہے محال
پسِ الفاظ و اظہار، سب تجھ سے ہے   یہ سر رشتۂ نطق و لب تجھ سے ہے
جو ظاہر ہے تو ہے، جو مخفی، ہے تو   ظہور و خفی، بیچ پردہ ہے تو
بہت تو نے پردے رکھے درمیاں   اگر تو یقیں ہے تو پھر کیوں گماں
نہیں کوئی عالم میں تیرے سوا   تو پھر تو نے کس سے یہ پردہ کیا
اگرچہ ہے ان سے بری تیری ذات   ہُوا مجتمع تجھ میں حسنِ صفات
اسی حُسن سے تجھ کو حاصل کمال   اسی حسن میں ہے ترا سب جلال
اسی سے ہیں سارے سیاہ و سفید   بلندی و پستی و بیم و امید
اسی سے معطر مشامِ رواں   اسی سے منوّر زمیں آسماں
اسی سے نظر کو ملی روشنی   اسی سے نفس کو ملی نغمگی
اسی سے ہے پیدا، رنگ و نور   شفق موج، خوں موج، موجِ سرور
یہی دامنِ نفع میں ہے گہر   یہی کشت و خرمن میں مثلِ شرر
اسی سے ہے انکار و اقرارِ دیں   اسی سے گماں اور اسی سے یقیں
اسی سے نجوم و قمر میں چمک   ہے دریا میں موج اور گہر میں دمک
صفیرِ طیور و رَمِ آہواں   نوائے سرور و دَمِ نغمہ خواں
بہارِ چمن، سیلِ رنگِ خزاں   خمِ زلف و ابرو، غمِ دوستاں
غرض، ہے جو بازی گہِ ہست و بود   صفاتِ خدا کی ہے اس میں نمود
مگر کیوں یہ سب عالم آرائیاں   ملیں جن سے بس تجھ کو تنہائیاں
تو وہ ہے کہ ہے تیری راہِ خرام   تری ذات کے دائرے میں مدام
اگر اپنا جلوہ تو دیکھے کبھی   تو ہو آئینہ تجھ کو اپنی خودی
عجب شانِ فرماں روائی تری   کہ حاکم ہے خود اپنا محکوم بھی

نہیں تجھ سے باہر ظہورِ صفات — خود آئینہ، خود عکس ہے تیری ذات
نہاں ہو کہ پردے میں، جلوہ ہوا — عیاں ہو کے جلوے میں، پردہ ہوا
ہے جس پردے سے رنگ جو آشکار — اسی پر کھلے پردگی کی بہار
مسبّب ہے اک تو ہی اسباب کا — تو مُبدا ہے ہر خواہش و خواب کا
قضا نے کیا جس کی خاطر جو طے — پہنچتی ہے اس تک وہ مرقوم شے
فراز و فن و فکر و فقر و فسوں — نشاط و غم و عزم و جذب و جنوں
نشہ مے کو، پرکار کو گھومنا — ہواؤں کو رفتار، نے کو نوا
دیے تو نے عاشق کو آہ و بکا — تو معشوق کو دلبری کی ادا
کسی مست کو تو نے ساغر دیا — جو دیوانہ ہے، اس کو پتھر دیا
ہمیں رندی و لاف و تر دامنی — غم و سخت جانی و دیوانگی
نہیں کوئی فصل و فضا سازگار — ہوئے ہر طرح ہم ذلیل اور خوار
ملی ہم کو محفل میں بھی ایسی جا — جہاں کچھ نہ ہاتھ آئے، گردش سوا
زباں پر سدا حرفِ ناگفتنی — کیا جس نے اپنے لیے لعنتی
نہ ہے پیچ سودا، نہ ہے سیدھی راہ — نہ آنکھوں میں آنسو، نہ سینے میں آہ
نہیں واقفِ شاہ و میر و وزیر — نہیں رکھتے کچھ ربطِ پیر و فقیر
دبے ہیں گناہوں کی کثرت تلے — ہم اپنی ہی آتش میں ہیں خود جلے
اس آتش میں اک داغ تیرا بھی ہے — (شب تار میں کچھ اجالا بھی ہے)
زمانے میں گر خوار و رسوا ہیں ہم — تو کیا غم کہ تجھ سے ہی پیدا ہیں ہم
اُجاگر ہے ہم سے ترا سوز و تاب — ترا غیظ و غصّہ، ترا التہاب
یہی اپنے زخمِ جگر کی نمی — ترا یہ کرم، ہے ہماری خوشی
ہمیں گمرہی نے نئی راہ دی — ہے طرزِ حریفاں سے نام آوری
اگر فردِ اعمال ہو اپنی پیش — گناہوں سے، ہوں حسرتیں اس میں بیش
پس ایمان و قرآن و حبِّ نبیؐ — کے صدقے میں فرما دے ہم کو بری

خدایا، گدائے معافی ہیں ہم
گدائے عطائے تلافی ہیں ہم

سلیم شہزاد، بھارت

یاد جب اُن کو کیا دل میں ستارے جاگے
اور پھر سوئے ہوئے بخت ہمارے جاگے

وہ جو بولے ہیں تو آواز کو اعزاز ملا
اور نظر کو جو اٹھایا تو نظارے جاگے

سب کے سب رحمتِ ابرار نے گلزار کیے
اُن کی راہوں میں جو فتنوں کے شرارے جاگے

موج در موج ہلاکت کا سماں تھا ہر سُو
بس پھر اک لہر اٹھی اور کنارے جاگے

مل گئی آکے یہاں سرحدِ آلام و طرب
یہ وہی در ہے جہاں درد کے مارے جاگے

کیسے خوابوں سے اک آواز جگاتی ہے مجھے
اٹھ بھی جا اب کہ مقدر کے اشارے جاگے

مبین مرزا، کراچی

مکۃ المکرمہ کی سوغات

جھکا کے سر درِ کعبہ پہ اعترافِ کیا
دلِ حزیں نے سنا ، ''جا تجھے معاف کیا''

بہت کثیف تھیں آنکھیں انہیں مطاف کیا
بھگویا اشک میں ، پلکوں سے ان کو صاف کیا

یہ عقدہ مجھ پہ کھلا جب ترا طواف کیا
زمیں کی چال سے قدموں نے انحراف کیا

ترا کرم مجھے ہر دم نگاہ میں رکھا
اگرچہ میں نے بہت کچھ ترے خلاف کیا

جھلستی دھوپ میں پگھلا تو سرفراز ہوا
پسینہ مشک کیا ، عفو کو لحاف کیا

کہ جیسے نعمتیں پاتے ہیں طفل نامولود
مقامِ کعبہ کو تونے زمیں کی ناف کیا

وہ سنگریزوں کی شب ، بادشاہِ وقت تھا میں
زمیں کو تختِ شہی ، آسماں لحاف کیا

درود و ذکر میں بٹتا رہا ستاروں کو
وہ نور بار تھی شب ، خود کو نور باف کیا

وہ پہلے پہل تو انجم سے کچھ خفا سا تھا
پھر ایک رنگ سے احرام کو غلاف کیا

اشفاق انجمؔ، مالیگاؤں، بھارت

پہلو سیرت کے اگر ہوں ہمیں پیارے سارے
کیسے دکھ درد نہ ہوں دور ہمارے سارے

فلکِ رشد کا خورشیدِ منیر، آپ کی ذات
اور اصحاب، ہدایت کے ستارے سارے

صبر و شکر آپ کا شیوہ رہا، ہر صورت میں
آہنی عزم سے آلام سہارے سارے

رفتہ رفتہ ہوئی جیت آپ کو پوری حاصل
ایک اک کر کے، عدو آپ کے ہارے سارے

بے شک اللہ نے کی دین کی تکمیل ان پر
ضابطے ان پہ شریعت کے اتارے سارے

ایک بس رب پہ توکل کا دیا آپ نے درس
اور فرمایا کہ باطل ہیں سہارے سارے

خیر کا منبع و مخزن تھی نعیم ان کی حیات
ان کے دم ہی سے بجھے، شر کے شرارے سارے

ضیاء الدین نعیم، اسلام آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

جہانِ بے قرینہ میں قرینہ چاہتے ہیں
یہ ہم یثرب مکیں اسمِ مدینہ چاہتے ہیں

سرِ حلقوم اٹکی ہیں اجل آثار سانسیں
مرے عیسیٰ نفس! ہم لوگ جینا چاہتے ہیں

ہم اپنی تشنگی ظاہر کریں کس طور تجھ پر
تہی ساغر پڑے ہیں اور مینا چاہتے ہیں

مبادا ہم کنار ساحل مرگ فنا ہوں
کوئی گرداب ہم اہلِ سفینہ چاہتے ہیں

منور خاتمِ جاں کو جو کر دیتا ہے طارق
اسی کردار کا روشن نگینہ چاہتے ہیں

طارق ہاشمی، فیصل آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

علم و فضل مصطفیٰ ہے یوں خدائی شان لکھ
پہلے الرحمٰن لکھ پھر علّم القرآن لکھ

کوئی شعبہ ، کوئی گوشہ، سب ہے ممنونِ کرم
زندگی لکھ ، بندگی لکھ ، دین لکھ، ایمان لکھ

آپ کی انگلی کے تابع چاند ، سورج اور پہاڑ
اور اسی سے پھوٹتا ہے چشمۂ حیوان لکھ

لکھ کہ بادل دھوپ میں ہے سائبانی کے لیے
کنکری مشتِ عدو میں تابعِ فرمان لکھ

حاصلِ لوح و قلم ہے ذکرِ محبوبِ خدا
نعت لکھ جی جان سے بلکہ اسی کو جان لکھ

حق ادا ہو ان کی مدحت کا نہیں ممکن مگر
جب بھی لکھ، کوشش رہے کہ شان کے شایان لکھ

جب نبی کے گھر کی عظمت تجھ کو لکھنا ہو نظیر
اس درِ دولت کے ہیں جبریل بھی دربان لکھ

واحد نظیر، بھارت

صلی اللہ علیہ وسلم

شبِ فراقِ نبیؐ میں جو شعلہ جاں ہوتے
غُبارِ راہ سے تنویرِ لامکاں ہوتے

جہان والوں پہ کھلتا جو رازِ مصطفویؐ
لرزتے رہتے جلالت سے بے زُباں ہوتے

کچھ اور ہی نظر آتا وجودِ پاک اُنؐ کا
مقطعات کے اسرار اگر عیاں ہوتے

دیارِ طیبہ میں ہوتے پرند کی صورت
جوارِ گنبدِ خضریٰ میں آشیاں ہوتے

محیطِ نورِ نبیؐ میں یہ چند جاں ریزے
فنا میں جو ہوتے تو دریائے بیکراں ہوتے

مکرر آتی جو صبحِ ازل تو پیشِ خدا
پھر ایک بار وہی نعت کے بیاں ہوتے

ملا نہ ہوتا اگر ان کو لمسِ لولاکی
تو کائنات، سماء و سمک کہاں ہوتے

وفا چشتی، اسلام آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

کہنے کو نعت محمدؐ کی ، ہے شرطِ محبت کم نہ پڑے
ہر لفظ ہو خوشبو کا پیکر ، ہر شعر میں نکہت کم نہ پڑے

ہو طرزِ بیاں بھی کچھ ایسا آقا کے جو دل کو بھا جائے
مضمون سراپا دلکش ہو، انداز میں ندرت کم نہ پڑے

ہر نعت پہنچتی ہے اُن تک، سنتے ہیں حضورؐ پاک اسے
مصرعوں میں فصاحت بھر دینا، شعروں میں بلاغت کم نہ پڑے

سیرت کا بیاں کرنا ہو اگر، اس بات کا تم کو دھیان رہے
دل اُن کی ثنا میں ڈوبا ہو ہونٹوں پہ یہ مدحت کم نہ پڑے

تم شاہِ اُمم کو رب کے سوا جو کچھ بھی کہو سب جائز ہے
جب ذکر ہو اُن کے منصب کا، اظہار میں عظمت کم نہ پڑے

طٰہٰ بھی وہیؐ یٰس بھی وہیؐ رحمت بھی وہیؐ شافع بھی وہی
اللہ بھی چاہے اُنؐ کے لئے القاب کی دولت کم نہ پڑے

تاکید فلک سے آئی ہے یہ بات ہو ذہنوں میں ہر دم
تعظیم ہو اُن کی دل میں سدا سوچوں میں عقیدت کم نہ پڑے

ہر لمحہ درودوں کی خوشبو ہر آن انہی کا ہی ذکرِ جمیل
محشر میں کھلے دفتر جو مرا سرکار سے نسبت کم نہ پڑے

تم یونہی نعتیں کہتے رہو توصیفِ شہِ بطحاؐ میں خمارؔ
چاہت کے سوتے خشک نہ ہوں اور عشق کی شدت کم نہ پڑے

سلیمان خمار، بھارت

نعت بر زمین غالب

"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ" (غالبؔ)

ہم رُتبۂ نکہت ، نہ کوئی ہم نفسِ رنگ
چھاتا ہے فقط اُن کا گدا پیش و پسِ رنگ

مجھ کو یہ یقیں ہے نظر آئیں گے شہِ دیں
دل دیکھے سرِ نور ، یا سر سوچے پسِ رنگ

لکھتا نہیں طیبہ کو میں زندانِ بہاراں
کہتا نہیں گلیوں کو میں اُس کی قفسِ رنگ

طیبہ میں پھرا کرتی نہیں خوشبوئیں بد مست
غرّاتا نہیں شہرِ نبی میں نفسِ رنگ

ممکن نہیں آدابِ مدینہ سے ہو غافل
تخریبِ دھنک ، کبرِ گلستاں ، ہوسِ رنگ

اُنہی کے حسیں خوابوں میں گُش ہوگی ، اگر ہے
شہنائی کی بلقیس ، شمیمِ جرسِ رنگ

چلتے ہیں کھجوروں کے شجر حکم سے اُن کے
وہ چاہیں تو خیرات میں دیدیں نفسِ رنگ

تکتے جو رہیں گنبدِ خضرا کو مسلسل
در در کے بھکاری نہ بنیں خار و خسِ رنگ

آقا کا مدینہ ہے یہ ، خوشبو کی طرح چل
سُم دُھول اُڑائیں نہ ترے ، اے فرسِ رنگ

منظرؔ! کوئی انسان تو کیا ، شہر میں اُن کے
حد توڑ نہیں سکتی ادب کی ، مگسِ رنگ

منظرؔ عارفی ، کراچی

صلی اللہ علیہ وسلم

زندگی مشکل تھی لیکن آج آساں ہے بہت
یادِ آقا میں مرے ہر دکھ کا درماں ہے بہت

ورد کرتا ہوں درودِ پاک کا میں ہر گھڑی
اس عمل میں بالیقیں تسکیں کا ساماں ہے بہت

قحطِ کردارو عمل کی ترگی تھی ہر طرف
آپ کی آمد سے ، دنیا نور افشاں ہے بہت

آپ کا ہراک عمل ، آئینہء خلق عظیم
آپ ہی کی پیروی میں رنگِ رحماں ہے بہت

علم بھی ملتا ہے اس سے، عظمتِ کردار بھی
رہنمائی کے لیے تعلیمِ قرآں ہے بہت

حاضری سے قبل آقا! میں بڑی ظلمت میں تھا
کوکبِ تقدیر لیکن اب درخشاں ہے بہت

جب سے بیت اللہ سے باہر ہوئے جھوٹے خدا
نورِ حق کی شمع ہر جانب فروزاں ہے بہت

نورؔ اپنی خوش نصیبی پر بہت نازاں ہے اب
انہماکِ نعت گوئی نور ساماں ہے بہت

حافظ نور احمد قادری نورؔ، اسلام آباد

صلی اللہ علیہ وسلم

تصورات کی جنت میں کھو گئیں آنکھیں
مدینہ اور مدینے کی ہو گئیں آنکھیں

وہ خواب دیکھ رہی تھیں تو خاک طیبہ کا
سمجھ رہا تھا زمانہ کے سو گئیں آنکھیں

تلاش کرتے ہوئے خوب لُطف آیا مجھے
گلی گلی میں مدینے کی کھو گئیں آنکھیں

درود پڑھتے ہوئے بارگاہِ اقدس میں
نہ جانے کتنے ہی موتی پرو گئیں آنکھیں

زہے نصیب کہ میں دامن احد میں ہوں
خیال آیا تو دامن بھگو گئیں آنکھیں

وہ جس سے روح میں پاکیزگی نظر آئے
وہ صبحِ نُورِ مدینہ سمو گئیں آنکھیں

ہمیشہ اشکِ ندامت سے باوضو اطہر
خدا کا شُکر مدینے کی ہو گئیں آنکھیں

اطہر عباسی، مدینہ منورہ

صلی اللہ علیہ وسلم

نظر میں ہے درِ خیر الوریٰ بحمداللہ
قبول ہو گئی میری دعا بحمداللہ

چلی ہے ان کے کرم کی ہوا بحمداللہ
ہر ایک سانس ہے محوِ ثناء بحمداللہ

درِ حضور پہ جب بھی دعا کو لب کھولے
ملا ہے مجھ کو طلب سے سوا بحمداللہ

یہی ہے میرا اثاثہ، یہی مری پونجی
نبی کی نعت ہے سب کچھ مرا، بحمداللہ

بسی ہوئی ہے وہاں آج بھی مہک ان کی
میں دیکھ آیا ہوں غارِ حرا، بحمداللہ

ہم اہلِ نعت کا شام و سحر یہی معمول
کبھی ثناء کبھی حمدِ خدا، بحمداللہ

نبی کی نعت کا موسم ہے شاخِ ہستی پہ
گلِ خیال ہے مہکا ہوا، بحمداللہ

میں اس کرم کے تصدق، میں اس عطا پہ نثار
میرا نصیب ہے مدح و ثناء بحمداللہ

فضائے فکر کو رکھتا ہے مشکبو سرور
خیالِ نعت ہے مثلِ صباء بحمداللہ

سرور حسین نقشبندی، لاہور

صلی اللہ علیہ وسلم

درود و ذکر کا موسم، خدا نصیب کرے
ثنائے خواجہء عالم ، خدا نصیب کرے

انہی کی یاد کا روغن، انہی کی دید کی لو
دل و نگاہ کو پیہم، خدا نصیب کرے

نفس کے ساز پہ ہو نغمہء درود رواں
اسی خیال کی سرگم، خدا نصیب کرے

دوام پائے میری زندگی بوقتِ نزع
نبی کی نعت جو اس دم، خدا نصیب کرے

یہ آرزو ہے کہ ان کی ثناء سے پہلے مجھے
شعور عظمتِ آدم، خدا نصیب کرے

انہی کے نام پہ تازہ رہیں میری آنکھیں
انہی کے ذکر کی شبنم ، خدا نصیب کرے

نبیؐ کے ذکر کی محفل یونہی رہے آباد
یہ ہمدمی ہمیں دم دم، خدا نصیب کرے

میں چاہتا ہوں کہ لاہور میں مجھے سرور
نبی کے شہر کا موسم، خدا نصیب کرے

سرور حسین نقشبندی، لاہور

مطالعاتِ نعت

صحرا نشیں و عرش معلیٰ نورد تھا
اللہ ایک فرد دو عالم میں فرد تھا

(ایاز صدیقی)

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

''سیدنا محمدؐ'' پر چند باتیں — ساختیاتی زاویے

ABSTRACT: A literary Text, in the new literary theory, is not considered an individually created isolated work of art. Rather it is considered a collective sign of artistic expression under Cultural system. Poetics has to be judged through expressions, norms and circumstantial situations. Every religious poetic experience conceives meaning within the codes and norms, controlled by linguistics of religiosity based cultural system. Sacred travelogue of poet to Holy City of Madinah, poetically expressed in 'Siyyidina Muhammad [S.A.W]' has been evaluated in this article, under structural norms of exploring artistic worth and meanings of the same.

بیسویں صدی کے پہلے نصف تک عالمی تنقید میں یہ نظریہ راسخ تھا کہ تخلیقی تجربہ انفرادی اور شخصی ہوتا ہے۔ تخلیق کار کی منفرد اور جداگانہ شخصیت ہی تجربے کی جہت اور معنیاتی حدود کا تعین کرتی ہے۔ چنانچہ کسی متن کا مطالعہ، متن کے خالق کی ذہنی سوانح کے طور پر کیا جاتا تھا۔ مگر بیسویں صدی کے دوسرے نصف کے ابتدائی سالوں میں ہی اس نظریے کو ایک دوسرے نظریے نے رڈ اور بے دخل کر دیا۔ نیا نظریہ ادبی متن کو مصنف کا انفرادی کارنامہ قرار دینے کے بجائے اسے ''اجتماعی نشانیاتی / ثقافتی نظام'' کا زائیدہ گردانتا ہے۔ یہ نیا نظریہ ساختیات کی دین تھا۔ ساختیات ہر معنی خیز عمل بشمول تخلیقی تجربے کو ایک لاشخصی تجریدی نظام کے اندر اور تحت دیکھتی ہے۔ یہ نظام کسی ثقافت کے ان ضابطوں، کوڈز، رسومیاتی اعمال سے عبارت ہے، جو ہمیں اشیا کو ایک خاص نہج سے، مخصوص زاویوں سے اور مخصوص حدود کے اندر دیکھنے اور ان کا تجربہ کرنے اور ان کے معانی طے کرنے کا پابند بناتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے تجربات اور معنی یابی کے اعمال حقیقی طور پر انفرادی نہیں ایک لاشخصی ثقافتی نشانیاتی نظام کا حصہ ہوتے ہیں اور اسی نظام کی رُو سے تجربات مخصوص بُو باس اختیار کرتے ہیں۔ یہ اُصول نعت کی صنف پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

ہر چند نعت ایک مخصوص آدمی سے سرزد ہوتی ہے، مگر نعت کی مزاج بندی اس مخصوص آدمی کے

انفرادی فعل کی محتاج نہیں، بلکہ ہمارے اس ثقافتی سسٹم کا تفاعل ہے، جس کی بُنیاد میں بعض مذہبی لسانی ضابطے کام کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نعت میں پیش ہونے والے تمام مضامین، کیفیات، اظہارات اور تجربات ہمارے "مذہب اساس ثقافتی لسانی نظام" کی طے کردہ (مگر لچکدار) حدود کے اندر واقع ہوتے اور معنی حاصل کرتے ہیں۔ ہر نعتیہ تجربہ دراصل مذکورہ نظام کے کوڈز اور ضابطوں سے صورت پذیر اور کنٹرول ہوتا ہے۔

پُرانی تنقیدی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر صنف میں کچھ کلیدی استعارے ہوتے ہیں، جو اپنے علتی، تلازماتی اور مماثلتی رشتوں سے متعدد دوسرے استعاروں کی تخلیق کرتے ہیں اور یہ سب باہمی نظم و ارتباط کے ذریعے اس صنف کی شعریات مرتب کرتے ہیں۔ صنفِ نعت کا ایک کلیدی استعارہ سفر ہے۔ آیئے ڈاکٹر ریاض مجید کے نعتیہ دیوان "سیّدنا محمدؐ" سے اس استعارے (یا کوڈ) کی کارفرمائی کی چند صورتیں دریافت کریں اور دیکھیں کہ کس طرح نعت کے متعدد اور متنوع مضامین اس 'کوڈ' / استعارے کی عمل آرائی سے وجود پذیر ہوئے اور نعت کے صنفی مزاج اور شعریات کے نقوش ابھارتے چلے جاتے ہیں۔

اس مختصر تجزیے کی ابتدا ایک شعر سے:

ہو سفر ریاضؔ کا، پھر سے جانبِ حرم
راستے میں ذکر ہو، گام گام آپؐ کا

نعت میں سفر کی ابتدائی معنویت "جغرافیائی" اور لغوی ہے۔ مُسلمان دُنیا کے مختلف جغرافیائی خطوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حرم پاک اور روضۂ رسولؐ پر حاضری کے لیے انہیں بہت دور سے آنا ہوتا ہے۔ یعنی عاشقِ رسولؐ اور روضۂ رسولؐ کے تعلق میں "سفر" ایک بدیہی حقیقت ہے۔ سو ابتداً نعت میں لفظ "سفر" اپنے لغوی مفہوم روانگی اور کوچ میں برتا جاتا ہے۔ مگر چونکہ یہ عام سفر نہیں، اس کا محرّک ایک عظیم مذہبی وژن ہے۔ اس لیے جب سفرِ مدینہ اختیار کیا جاتا ہے تو یہ وژن سفر کی معنویت کو تہ در تہ بناتا چلا جاتا ہے۔ نہ صرف خارجی سفر ایک داخلی سفر کو تحریک دیتا اور زائر سوئے طیبہ کے ساتھ ساتھ سوئے باطن بھی سفر پیما ہوتا ہے بلکہ یہ سفر اجتماعی اور ملّی معانی کا استعارہ بھی بن جاتا ہے۔

ے زائرِ مدینہ دیکھ! پاؤں کس زمیں پر ہیں
دل بہشت پیا ہے آسمان کے اوپر

ے روشن روشن دیکھ نظر کے آثار
پھر طیبہ کی سمت سفر کے آثار

ڈوبتی سانسوں کا نہیں اعتبار ہم سفرو! اور ذرا اور تیز!

ریاض سوئے مدینہ خود کو سفر میں رکھنا نشان ، اقلیم روشنی کا نظر میں رکھنا
ہے ایک ہی طیبہ ، ساحلِ شوق گرداب جدائی کا بھرا دہر
قافلہ سالار ! خبردار! ے
نُور کی منزل نہ رہے دُور

سفر کی لغوی، علّتی ، تلازماتی ، استعاراتی ، دلالتی سے متعلق ڈاکٹر ریاض مجید کی نعتوں میں درجنوں اشعار موجود ہیں۔ یہ چند اشعار یہ بات ظاہر کرنے کی خاطر منتخب کے گئے ہیں کہ کس طرح سفر کا کوڈ نعت کی شعریات کو مرتب اور اُجاگر کرتا ہے۔

باہر اور اندر کے سفر میں ایک علّتی (اور منطقی) رشتہ ہے، جو دراصل مذہبی اور عقیدتی وژن کی تحریک پر وجود میں آتا ہے۔ زائر جب طیبہ کی سمت جارہا ہوتا ہے تو وہ جسمانی سطح پر ہی متحرک نہیں ہوتا، تخیلی اور روحانی سطحوں پر بھی فعال ہوتا ہے، اُس کے پاؤں زمین پر مگر دل آسمان پر بہشت پیا ہوتا ہے۔ وہ اوّلین طور پر سرشاری پاتا، اپنی دیرینہ آرزو کی متوقع تکمیل سے حظ اندوز ہوتا ہے۔ وہ 'محبوب' سے جدائی کے کرب سے رفتہ رفتہ آزاد ہوکر وصل کے نشاط کی کیفیت سے گزرتا ہے۔ مگر اس سفر کی محض یہی دین نہیں، وہ جب متخیلہ میں مرتبہ رسول کو لاتا ہے تو ایک پورا استعاراتی نظام اس کے اندر روشن ہو جاتا ہے، وہ اقلیمِ روشنی کے تصوّر سے رُوحانی تجربے، تقلیبِ باطن اور کشف سے گزرتا ہے۔ وہ باطنی سطح پر آلائشوں سے خود کو پاک محسوس کرنے لگتا، ارتفاع کی کیفیت سے فیض یاب ہوتا اور اپنی ہستی کی معنویت اور شناخت کا عرفان پاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں دراصل سفر کے تلازمے اور تماثل سے پیدا ہوتی ہیں۔

زائرِ مدینہ جب اقلیمِ روشنی میں آکر اپنی ہستی کی شناخت کے عمل سے گزرتا ہے تو اس پر یہ کشف ہوتا ہے کہ اس کا ہونا ایک نسبت کے تحت ہے، وہ اس نسبت سے الگ، معدوم یا بے معنی ہے۔ یعنی زائرِ طیبہ اوّلاً اپنی انفرادی ہستی کا اثبات کرتا اور بعد میں اپنے ملّی وجود کا ادراک کرتا ہے۔ سو وہ خود کو ہی نہیں پورے کاروانِ ملّت کو سفر میں محسوس کرتا ہے۔ نتیجتاً نعت میں محض نعت گو کی دلی کیفیات کا ہی بیان نہیں ہوتا بلکہ پوری امت محمدیہ کے لیے درخواست وُدعا ہوتی ہے، چونکہ ملّتِ اسلامیہ گزشتہ کئی صدیوں سے غلامی، ادبار، پستی، زوال، بے توقیری اور کم مائیگی کا شکار چلی آرہی ہے، اس لیے اس عرصے میں لکھی جانے والی نعت میں دعا و درخواست کے مضامین کثرت سے آئے ہیں۔ (یوں نعت نے اجتماعی ملی مسائل پر توجہ کرنے کی تحریک مسلمانوں کو مُسلسل دی ہے) ریاض مجید کے نعتیہ دیوان میں یہ تمام مضامین بکثرت پیش ہوئے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر انوار احمد زئی (کراچی)

کلیات عزیز احسن پر ایک نظر

ABSTRACT: The article presented hereunder sheds light on the horizon that created through art and intellect in the creative world of Kulliyaat-e-Aziz Ahsan which seems unique in the realm of Metaphysics. Naatia poetry is a symbol of joining little Physical world with the vast world of Metaphysics through faith. Critical genius of Dr. Aziz Ahsan and the compiler of Kulliyaat-Aziz Ahsan , Syed Sabih Rahmani has also come into discussion. Critical views have also been expressed about analytical essays of different critics that have been made part and partial of Kulliyaat-e-Aziz Ahsan. Efforts of Naat Research Centre, to promote Devotional Poetry, have also been applauded.

اپنی ادا اور انداز کے نرالے دانشور و نقاد سراج منیر کے ایک مضمون پر مستند ناقد اور استادِ ادب ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا تھا کہ ''آج کے نوائے وقت میں آپ کا ایک مقالہ ''ایمانیات اور مابعد الطبیعات کی بحث'' پڑھا۔ پورا مضمون ضیافتِ طبع کا سامان ثابت ہوا......اور پڑھنے کی کوشش اس لیے ہوئی کہ شاید ہمارے عصری ادب میں ایک ادیب کی زبان یا قلم سے ایمانیات کی اصطلاح پہلی مرتبہ صادر ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ یہاں بھی دنیا بدلنے والی ہے اور طبیعات اپنی آخری منزل پر پہنچ کر اپنی صدہا کامیابیوں کے ساتھ محرومی اور تشنگی کا ذائقہ بھی لے آئی ہے......آپ کے مضمون سے مجھے ایک نئے عہد کی خوشبو آئی ہے۔ یہ خوشبو یورپ اور امریکا میں بھی پھیل چکی ہے اس نگہت کا گلستان Existentialism کا سرمایۂ ادب ہے۔ یہ مکالمہ Dialogue کی تحریک میں موجود ہے لیکن ہمارے لوگ اس سے مانوس نہ تھے اب یہاں بھی دھوپ کھلنے لگی ہے۔''

اس مختصر سی تحریر کے پیچھے اردو ادب کی جس عسرت کا ذکر موجود ہے اسے فکری گم شدہ کڑی یا نا آسودہ آدرش کی لڑی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آج ڈاکٹر سید عبداللہ ہم میں موجود نہیں ہیں تاہم جس دردِ پنہاں کا تذکرہ انہوں نے کیا تھا اس کا علاج اور مداوا وہ دیکھ سکتے تو ایمانیات اور مابعد الطبیعات کی بحث'

کو آج بہت آگے کی منزلوں میں پاتے اور خود ثنا خوانِ تقدیس مشرق کے نمائندے بن کر اس عہد کی آسودگی پر مسکراتے جب ان کی نظروں سے دو کام ایک ساتھ گزرتے...... ایک نعت رنگ کی تحریک کے ذریعے ایمانیات اور مابعد الطبیعات کی بحث کا غلغلہ اور دوسرے صبیح رحمانی کے مرتب کردہ عزیز احسن کی کلیات کا غوغا۔

سراج منیر نے جس موضوع کو اپنا بیانیہ بنایا تھا اس میں گم شدہ کڑی کی بازیابی کی خبر کم اور ہماری اجتماعی بے حسی کا نوحہ زیادہ تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹر سید عبداللہ کی حیرت زا تحریر کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ متذکرہ مقالے سے پہلے ایمانیات یا مابعد الطبیعات کے خزینے ہمارے ادب میں موجود ہی نہ تھے۔ سچ یہ ہے کہ فارسی ادب کی زرخیزی اور گہرائی سے قطع نظر اردو ادب کے گنجینے میں بھی اس کی گیرائی کا پتہ ملتا ہے۔ تاہم ان کا اشارہ تخلیقی ذخیرے سے زیادہ انتقادی وسیلے کی جانب رہا تھا اور اسی لیے وہ اس جانب توجہ دلانے کو خوشبو کے اِستعارے سے تعبیر کر رہے تھے۔ ہم جب آج کے انتقادی ادب اور ایمانیات کی فضا کا مطالعہ کرتے ہیں تو مسرت بخش حیرت ہوتی ہے کہ کل تک فلسفۂ وحدت الوجود اور فلسفۂ وحدت الشہود کے مباحث سے ماورا ایمانیات کی شرح اور مابعد الطبیعاتی رخ کی شیرازہ بندی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ شریعت و طریقت کے مباحث کے ذیل میں تصوف و تحرک کے پڑاؤ آجاتے تھے اور بس...... ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور محی الدین ابنِ عربی کی فتوحات مکیہ کے درمیان منصور حلاج کی طواسین کو بھی شامل کرلیں تو انہیں ایمانیات کے غیر انتقادی اشارے کہا جاسکتا ہے۔ مگر جب وقت نے کروٹ لی تو جیسے دبستاں کھل گیا اور اس سمت میں جاری رہنے والا سفر تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ آج ہمارے سامنے ایمانیات اور مابعد الطبیعات کے موضوعات پر تخلیق کی جانے والی بے شمار کتب ہیں جنہیں ہم فخر کے ساتھ مغرب کے ایمانیات اور مابعد الطبیعات کے ذیل میں آنے والی تحریروں کے جواب میں رکھ سکتے بلکہ یہاں اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ حقیقت میں دیکھا جائے تو اطالوی ادب کی تخلیق بے بدل ''الوہی طربیہ'' Divine Commedy جو دانتے کا شاہکار ہے وہ دراصل فتوحات مکیہ سے کشید کیا گیا ہے یہ وہ انداز ہے جس پر آگے چل کر نشاۃ الثانیہ کا محرک شہ پارہ یعنی جارج ملٹن کی جنت گم گشتہ Paradise Lost ہے۔ سو یوں بھی اس زاویے سے مشرق کی ایمانیات اور مابعد الطبیعاتی فکر نے مغرب کو آگاہی عطا کی ہے۔ لیکن اس وقت اس تقابلی جائزے کی بات نہیں ہے۔ بات اردو ادب میں تیزی کے ساتھ ایمانیات اور خصوصاً نعت نگاری کے ذریعے عقائد کے اظہار کی ہو رہی ہے۔ جس میں نعت رنگ کے ساتھ اس تحریک سے وابستہ لکھنے والوں کو شمار کیا جاسکتا ہے اور اس کارواں میں ''عَلَم'' (جھنڈا) اور عِلم (فکر) دونوں چیزیں جس کے پاس ہیں ان کا نام ڈاکٹر عزیز احسن ہے۔ جن کی کلیات

نے ایمانیات اور مابعد الطبیعات کے موضوعات کو نئے سرے سے مطالعہ کی ''دعوت'' بھی بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر عزیز احسن آج نعتیہ ادب کے ایسے شناور ہیں جنہیں ''مثالیہ'' کہا جائے۔ مگر اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ عزیز احسن نعتیہ ادب کے نقاد بھی اسی طمطراق کے ہیں کہ انہیں ''بے مثالیہ'' کہا جائے۔ بلکہ ہوا یہ کہ ان کے انتقادی انداز کے سحر میں ان کا تخلیقی جوہر اس طرح چھپ گیا ہے جیسے ابر آلود فضا میں خورشید...... انہوں نے حرمین شریفین میں دعا مانگی تھی کہ تخلیق وہ کریں اور اس کے چھاپنے کا اہتمام کارِ دیگراں بن جائے تو دعا قبول ہوئی اور یہ بے شمار لکھ رہے ہیں اور ان کے احباب ''بے حساب'' چھاپ رہے ہیں۔ ان کی ''اب تک'' کی کلیات کو ادب کا ''سب رنگ'' مجھیے اس لیے کہ اس خزانے میں حمد، نعت، مناقب، سلام اور مناجات سب کچھ ہیں اور وہ بھی مختلف اصنافِ سخن میں مگر اس بہانے جو تنقیدی مضامین اس ادب خزانے کا حصہ بن گئے ہیں وہ بجائے خود انتقادی اسالیب کی سبد گل ہے۔ اس میں جو رنگ ہائے فکر و فن ہیں ان کے ذریعے اردو ادب میں ایمانیات اور مابعد الطبیعات کے مطالعے کے بے شمار در کھل گئے ہیں، اس لیے جی چاہتا ہے کہ کہیں سے ڈاکٹر سید عبداللہ کو لایا جائے اور پھر پوچھا جائے کہ آپ نے جو اردو زبان و ادب کے آنگن میں دھوپ کھلی دیکھی تھی وہ اب نصف النہار کا استعارہ بن گئی ہے۔

کلیات میں جو عزیز احسن کا منشور ہے اس کے ساتھ ہی ان پر اور ان کے فن پر لکھے گئے مضامین کا اسلوب و اصول بھی دعوتِ مطالعہ دے رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نعت گوئی کی دنیا میں نقد و نظر کے کتنے چراغ جل رہے ہیں اور ان کے اجالوں میں صنفِ نعت اپنے بقعۂ نور ہونے کی دلیل بنی ہوئی ہے۔ تاہم مجھے یہاں آگے بڑھتے ہوئے ایک منزل پر پڑاؤ یاد آ رہا ہے۔ پاکستان آرٹس کونسل کے سالانہ عالمی ادبی ''میلے'' میں نعت کے لیے کسی نشست کی کمی محسوس کی جارہی تھی جس کے لیے ہم نے کاوش کی اور ارباب آرٹس کونسل نے ادب سے زیادہ ہم سر پھروں کو مطمئن کرنے کے لیے ایک روایتی نشست کا اہتمام کر ڈالا جو خانہ پری سے زیادہ تاثیر نہ چھوڑ سکی، اس محفل میں یاد رہ جانے والی واحد چیز جو تھی وہ برادرم صبیح رحمانی کا معصومانہ اطمینان تھا جس کا اظہار انہوں نے برملا، برسرِ محفل ہی کر ڈالا، ان کا امتنان اس بات پر تھا کہ اس محفل میں اردو کے ان کے بقول ''جید'' ناقدین جلوہ افروز تھے جو ان کے بقول نعت کی محفلوں میں عموماً نہیں ہوتے۔ حالاں کہ وہ ''بے چارے'' دوسری نشست میں اپنی ''دانش'' کی جگالی کرنے کے لیے مجبوراً وقت گزار رہے تھے تاہم ہمارے سادہ دل بلکہ ''خوش عقیدہ'' ممدوح حضرت صبیح رحمانی کا خیال تھا کہ ان سکہ بند ناقدین کی موجودگی میں صنف نعت پر ہونے والی بات ان کو ثروت مند کر دے گی اور یہ اپنے نکے بندھے تنقیدی سانچوں میں سے کسی ایک میں بڑھوتری یا کٹوتی کر

کے کبھی نہ کبھی ایک آدھ جملہ ایمانیات و مابعد الطبیعات کے موضوع کے لیے بھی فکر کی زکوٰۃ نکالنے کی غرض سے تخلیق فرمالیں گے۔ ظاہر ہے کہ صبیح رحمانی کی زندگی کا مقصد فروغ صنفِ نعت ہے اور ان کی مسرتوں کا محور اسی خواب کی تعبیر ہے اس لیے وہ سرشار ہوا کیے اور میں ملول...... میرے ملال کا سبب یہ تھا اور آج بھی ہے کہ ہم اس میدان کے لیے ان نقادوں کے خوشہ چین بنا کیوں چاہتے ہیں جبکہ اب خدا کے فضل وکرم سے اس میدان کے ناقد اور پارکھ پیدا ہو چکے ہیں اور ان میں ایک نمایاں نام ڈاکٹر عزیز احسن کا ہے اور ان کے ساتھ ان کی کلیات میں شریکِ سفر صاحبانِ فکروفن بھی تو ہیں اور نعت رنگ کے ہر شمارے میں موجود بے شمار وہ نام جو اپنی تحقیق اور تخلیق سے ایمانیات کے شعبے کو ایقان کی منازل سے گزار رہے ہیں۔ اس لیے میرا ناقص اور عاجزانہ مشورہ یہ ہے کہ ان نقادوں کو اپنی دنیا میں گم رہنے دیں اس لیے کہ انہیں اس پانچویں کھونٹ کا پتہ ہی نہیں وہ اطراف کو چار ہی سمجھتے ہیں اور مابعد الطبیعات کی منزل کو محض ایں خیال است ومحال است وجنوں، سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے خول میں بند لوگ ہیں جو خود کو ہر حد سے آزاد سمجھتے ہیں جبکہ حقیقت میں طبیعات کے دائرے میں رہتے ہوئے آزاد نہیں ہیں۔ انسانوں کی طرح ادب کے آفاقی یا مقامی رشتے بھی آزاد فضا میں پروان چڑھتے ہیں لیکن اس آزادی کا جواب کے لیے ضروری ہے ایک مبہم سا تصور قائم کرنے کے لیے پہلے ڈی ایچ لارنس کی ایک بات سن لیجیے، وہ کہتا ہے:

> ''لوگ آزاد ہوتے ہیں جب وہ ایک زندہ وطن میں رہتے ہوں، اس وقت نہیں جب وہ کرب سے ٹوٹ رہے ہوں اور بکھر رہے ہوں۔ لوگ آزاد ہوتے ہیں جب وہ کسی گہرے مذہبی ایقان کی گہری باطنی آواز کی اطاعت کر رہے ہوں اور یہ اطاعت وہ اپنے باطن سے کر رہے ہوں، لوگ آزاد اس وقت ہوتے ہیں جب ان کا تعلق کسی زندہ، نامیاتی اور باعقیدہ گروہ سے ہو اور وہ مصروف ہوں کسی غیر تکمیل شدہ بلکہ غیر شعوری مقصد کی تکمیل میں۔''

عزیز احسن کی کلیات نے دراصل ایک ''تحرک'' کا پتہ دیا ہے۔ ان کی چار کتابوں کی ''یکجائی'' نے عالم شکیبائی بھی تخلیق کیا ہے اور عالمی ادب کے مطالعے کے لیے مہمیز کا کام بھی کیا ہے۔ اس خیال کے اعادے کو دعوت بھی دی ہے کہ عالمی ادب کے رشتوں کا منظر نامہ باہمی اثر وتاثر، تحریکوں کے عمل اور ردعمل، تہذیبوں کے ارتباط وتصادم اور مزاجوں کے اتفاق واختلاف کے وسیع میدان میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں موجود روابط کے پیچیدہ نظام کو سمجھنے کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی بنیادی تقسیم کرنی پڑے گی۔ ہم یہ تقسیم طرزِ احساس کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ روایت اور غیر روایت، یعنی ایک وہ طرزِ احساس جو کائنات کی

روحانی تعبیر کو یا مابعد الطبیعات کو اپنا مصدر مانتا ہے اور دوسرا وہ جس کا اصلی اور اساسی اظہار مغربِ جدید کے تہذیبی پیٹرن میں ہوا ہے۔ یہ دو کائناتیں ہیں ایک دوسرے سے فرسنگوں کے فاصلے پر واقع اور ان کے درمیان مکالمے کا رشتہ فیصلہ کن طور پر منقطع ہو چکا ہے۔ ان کے اصولِ حیات اور اصولِ مرگ تک الگ ہیں۔ اس بارے میں فرتھ جون شوآن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ

''زوال تمام تہذیبوں میں آیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مغرب کا زوال مختلف صورتوں میں آیا ہے۔ مشرق کا زوال انفعالی ہے اور مغرب کا حرکی۔ زوال کے اس عمل میں مشرق کا قصور یہ ہے کہ اس نے سوچنا ترک کر دیا ہے اور زوال آمادہ مغرب بہت سوچتا ہے اور غلط سوچتا ہے۔ مشرق سچائیوں پر سو رہا ہے اور مغرب اپنی گم راہیوں میں زندہ ہے۔''

مشرق کی سچائیوں پر سونا ہی دراصل کلیاتِ عزیز احسن کی ''چاندی'' ہے اور یہ نعرہ بھی کہ

چند خوانی حکمتِ یونانیاں
حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں

اس کلیات کے متون میں ایک مخفی پیغام اور ہے جس کے بہ نظرِ غائر مطالعے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ

دررہِ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرمِ راز
ہر کسے ہر حسبِ فہم گمانے دارد

کلیاتِ عزیز احسن دراصل اندرون سے بیرون کا سفر ہے جسے آلودگی سے آسودگی کی طرف مراجعت بھی کہہ لیجیے۔ اس تخلیق کے انتساب ہی سے ایمانیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ طویل منظوم انتساب سے صرف دو اشعار:

دربارِ ذی وقار میں اندوختہ مرا کرنے کو پیش، آج یہاں لے کے آگیا
بے شک یہ اک گدا کی متاعِ قلیل ہے تاہم یہ سعیٔ مدح کی ادنیٰ دلیل ہے

اور یوں عزیز احسن کے چار مجموعوں کی یکجائی ہے۔ کرم و نجات کا سلسلہ، شہپرِ توفیق، امیدِ طیبہ رسی اور سیلِ حبِ رسولؐ...... اقبال کی کتابوں کے عنوانات میں سمجھنے والے ترتیب و تنظیم تلاش کر لیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بانگِ درا، قافلے کو پھر سے جمع کرنے کا استعارہ ہے تو بالِ جبریل قافلے کے لیے نصاب اور ضربِ کلیم نظریے سے عمل کی طرف اور تھیوری سے پریکٹیکل کی جانب سفر ہے۔ اگر یہ صحیح ہے یا قابلِ توجہ خیال تو مجھے بھی عزیز احسن کے مجموعوں کے سرناموں میں ایک ترتیب کا پتہ مل رہا ہے۔ گویا، کرم و نجات کا سلسلہ ہوا تو شہپرِ توفیق کا سرا ملا اور تب ہی امیدِ طیبہ رسی جاگی اور پھر جو سیلِ حبِ

رسول ﷺ کی سرشاری نصیب میں آئی تو چاروں اور اجالا ہو گیا۔

برادرِ محترم و مکرم صبیح رحمانی کے کمالات بے شمار ہیں، ان کمالات کا دوسرا نام نعت رنگ اور نعت ریسرچ سینٹر ہے۔ یہ مجلّہ نہیں تحریک ہے۔ یہ ایمانیات کے ادب کا ایسا اشاریہ ہے کہ اسے سرسید کے زمانے میں نکالا جاتا تو شاید وہ اپنی نجات کے واحد استعارے مسدس حالی کے ساتھ نعت رنگ کو بھی شامل کر لیتے۔ مگر بعض لوگ شاید پسند نہ کرتے، اسی امتیاز نے ہمیں مار کے رکھا ہے۔ تاہم صبیح رحمانی کے کمالات میں ایک اضافہ عزیز احسن کی کلیات ہے جسے صبیح رحمانی نے اپنی روایات کے عین مطابق شائستگی اور صناعی سے آراستہ کیا ہے اور عزیز احسن کی مقبول دعا میں پھر سے ''شریک'' بن گئے ہیں تو یوں موصوف نے اس کلیے کی ترتیب دی ہے کہ پہلے حصے میں مجموعی تاثر سے ہم رشتہ اور کلیات کی تشکیل سے ہم آہنگ مضامین کو طبع کیا ہے جس میں موصوف کا ابتدائیہ ہی اس کاوش کا تکملہ لگتا ہے۔ اس کے بعد ہر مجموعے کی نسبت سے پہلے جس طرح ان کی اشاعت ہوئی، اسی رنگ میں مضامین سے لے کر تخلیقات تک کا سفر فراہم ''کیا'' اور اسی اندازِ دلبرائی میں عزیز احسن کا ذہنی، فکری، وجدانی اور تخلیقی کے ساتھ ایمانی ارتقا کا منظر نامہ بھی اسی کیف و مستی کے رنگ میں سامنے آ گیا جس کا تقاضہ ان کاوشوں کا حوالہ ہو سکتا تھا۔ اور پھر ان کی ذیلی ترتیب کردی گئی کہ حمدیں، نعتیں، مناجات و دعائیں الگ الگ عنوانات کے ساتھ سامنے آتی جائیں۔ مناقب اور متفرقات سے عبارت تمام نگارشات ہر مجموعے کے آخر میں آ گئی ہیں۔ اس حسن ترتیب کی شاید انتہا یہ ہے کہ صبیح رحمانی نے ہر صفحے کے شمار کو بھی دو قطاروں میں رکھ دیا ہے۔ ہر صفحے کے اوپر کے حصے میں متعلقہ مجموعے کا صفحہ شمار ہے اور نیچے کلیات کی اجتماعی ترتیب کا نمبر ہے۔ یہ کمال دو صاحبانِ کمال کا حسن و جمال ہی تو ہے۔

شہپرِ توفیق میں عزیز احسن کا ایک شعر ہے:

وہاں سے مرغِ تخیل کو رزقِ فن ہو عطا
جہاں کسی کا کبھی بھی کوئی گماں نہیں جائے

تو مجھے خیال آیا کہ ترکیب ''رزقِ فن'' دراصل تصوف کی اصطلاح کی طرف رجحان کا درس ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ اس نصِ قرآنی کی تفاسیر بے شمار تاہم تفاہیم میں ایک رنگ یہ بھی ہے جو عزیز احسن نے اپنے شعر میں باندھا ہے۔ اس طبقۂ فکر کا خیال ہے کہ خداوند قدوس کی ہر عطا انسان کے لیے رزق ہی تو ہے۔ وہ دانہ جو معدے کا نصیب ہوتا ہے وہی رزق نہیں ہے، دراصل وہ رزق کا جزو ہے کُل نہیں ہے۔ اسی طرح انسان کو دیا گیا حسن و جمال، قد و قامت، فکر و خیال، مرتبہ و مقام، اقتدار و اختیار، شہرت و کمال، خلاقی و انشا پردازی یہ سب رزق کے عناصر ہیں اور

خداوندِ عالم اس حوالے سے جسے چاہتا ہے بے شمار رزق عطا کرتا ہے۔ کسی کو حسنِ بے پناہ دیا تو کسی کو زر و جواہر و مال و متاع...... اور پھر ان درجوں میں انسان کا سلسلۂ احتساب و امتحان شروع ہوا۔ تاہم سمجھنا یہ ہے کہ یہ رزق اس کی عطا ہے، مگر اس رزق کا امتحان اس متاع سے دوسروں کو متمتع کرنا ہے جو توفیق سے عبارت ہے۔ انسان کو توفیق نصیب ہو تو وہ اپنی اس دولت میں دوسروں کو شریک کرتا ہے اور یوں اپنا احتساب خود اپنے لیے آسان بنا لیتا ہے۔ اس حوالے سے عزیز احسن کو جو دولتِ فکر عطا ہوئی وہ ان کا رزقِ فن ہے اور وہ جو اپنے مجموعہ ہائے کیف و کمال سے انہیں ارزاں کر رہے ہیں اور یہی ان کی توفیق کی تصویریں ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ

ہماری فکرِ سخن کا عقاب جب بھی اُڑے
فضائے طیبہ میں پہنچے، یہاں وہاں نہیں جائے

یہ سفر جب تسلسل سے جاری رہتا ہے تو ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے جہاں پہنچتا ہے اس کی بھی تصویر عزیز احسن کے ''اوراقِ مصور'' میں ہے۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں:

جس قلب پہ کھلتے ہیں بصیرت کے دریچے
بس جاتے ہیں، اس قلب میں آقائے مدینہ

یہاں بے طرح جو شعر یاد آ رہا ہے وہ بیان کرنا اچھا لگے گا کہ یہی وہ منزل و مقام ہے جہاں پہنچ کر نعت کا سچا شاعر سرشاری سے گزر کر سرشتہ شعاری کی منزل تک پہنچتا ہے جو عزیز احسن کا بھی نقشۂ سفر ہے یعنی

بیا جاناں تماشا کن کہ درانبوہ جاں بازاں
بصد سامانِ رسوائی سربازار می رقصم!!

صبیح رحمانی نے عزیز احسن کے لیے جو رائے قائم کی ہے وہ تو یہ ہے کہ:

''عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو تخلیق کار تنقید کے میدان میں اترتے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیتے ہیں ان کی یہی جہات نمایاں ہو جاتی ہیں اور لوگ اس کو فوقیت دینے اور اس کا اصل کام سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی سلسلہ عزیز احسن کو بھی پیش آیا۔ ان کے تنقیدی کام کی وسعت، فکری گہرائی اور عالمانہ بصیرت کی وجہ سے ان کے تنقیدی کام کی گونج ادبی حلقوں میں زیادہ ہوئی اور ان کی شعر گوئی خصوصاً نعت نگاری پس منظر میں چلی گئی'' ......

اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ حضرت صبیح رحمانی کی جناب میں یہ بھی عرض کیا

جائے کہ ''کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر''؟...... اس لیے عزیز احسن کی تنقیدی کاوشوں اور نثری نگارشات تو دراصل پھول پتیاں ہیں اور ان کی نعتیں، حمدیہ اور ایمانیات کی شاعری ہی ''اکبر'' ہے جو پھول پتوں میں چھپ نہیں سکتی۔ اس کی دوسری اور بہترین مثال خود صبیح رحمانی کے نثری شذرے، اداریے، تنقیدی زاویے اور فکری اشارے ہیں جو وہ نعت رنگ سے لے کر دیگر جگہوں پر پیش فرماتے رہے ہیں مگر جب ان کی نعتیں اور حمدیہ اشعار سامنے آتے ہیں تو بے قرار ہو کر دل سے نکلتا ہے کہ...... ''اللہ اکبر...... اللہ اکبر''......

حقیقت یہ ہے اور اسے صبیح رحمانی سے زیادہ کون تسلیم کرے گا کہ نعتیہ ادب کے تخلیق کاروں میں ایسے تنقید نگاروں کی بھی ضرورت ہے جو ایک طرف ایمانیات سے مملو اور متعلق ادب کی نصاب سازی کریں اور دوسری طرف کہے جانے والے کلام کا استحسان اور احتساب دونوں کام بیک وقت کر سکیں۔ اس کمی کو اب شاید کمی نہ کہا جا سکے اس لیے کہ عزیز احسن اور ان کے دیگر رفقاء نے اس جہت میں یہ سفر شروع کر دیا ہے۔

کہتے ہیں کہ بگڑا شاعر نقاد ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے زمانہ ہوا کہ یہ خیال خود تازیانہ ہوا مگر ابھی تک اس کی بازگشت موجود ہے، سو اگر ایسا ہے تو اس کا دوسرا رخ سمجھنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ جو شاعر ہوتا ہے اس پر انتقاد کے زاویے خود بخود وا ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے، اصل تخلیق کار پہلے ناقد ہوتا ہے پھر خالق...... اس حوالے سے عزیز احسن کی تنقیدی دولت میں سچائی کے جواہر ہی موجود ہیں ان میں کسی عہد سے سمجھوتے کی گواہی نہیں ملتی۔ اسی لیے عزیز احسن کے لیے ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں کہ ''علم، شعور، آگہی، تفہیم کائنات، رنگ، خوشبو، منزل یہ سب ذاتِ رسول اقدس ﷺ کے استعارے ہیں۔ ان استعاروں میں عزیز احسن کو سرکار والا صفات کی نسبت سے روشنی کا استعارہ بے حد پسند ہے۔ روشنی علم بھی ہے اور عرفان بھی اور آگہی بھی۔ روشنی سے اپنی ذات کے پردے بھی اٹھتے ہیں اور کائنات کے اسرار و رموز بھی بے نقاب ہوتے ہیں۔'' گویا کشفی صاحب کے نزدیک عزیز احسن کا جو فن ہے اس کو آلودگی سے آسودگی کا سفر کہا جا سکتا ہے۔

چوں کہ اس کلیات میں محترم ڈاکٹر عبدالکریم، مکرم کاشف عرفان، محتشم قمر رعینی کے فکر انگیز اور خیال افروز مضامین شامل ہیں اور پھر ہر مجموعے میں خود عزیز احسن کی انتقادی تحریریں بھی موجود ہیں جن میں جوازِ شعرِ عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے اس لیے میں اس ''کلیات'' کو ایک طرف ایمانیات کی شعری لذتوں کا اشارہ سمجھتا ہوں، وہیں نعت نگاری کے لیے نصاب کا استعارہ بھی...... میں یہ بات کہنے کی جرأت اس لیے کر رہا ہوں کہ ڈاکٹر عبدالکریم نے اپنے مضمون میں جو سوالات اٹھائے ہیں اور اپنی توفیق

ایمانی کی روشنی میں جن متنازع موضوعات کی جانب کہیں خفی کہیں جلی اشارات کیے ہیں ان پر ''مکالمہ'' ہونا چاہیے تاکہ یہی مکالمہ ہمیں ''ما قبلہ راست کردیم برسمت کج کلاہے'' کی منزل سمجھا سکے۔ ڈاکٹر عبدالکریم کے عمیق مطالعے اور ان کے تبحرِ علمی کے تناظر میں بعض اشارے خوبی کے ساتھ سمجھے جاسکتے ہیں مگر بعض کی مزید توجیح اور تفہیم کے لیے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ موصوف نے فرمایا ہے کہ

''اس طرح جناب عزیز احسن تحریر کرتے ہیں کہ درود پاک پہ ختم ہو مری بات کا سلسلہ...... لیکن اسوۂ صحابہ یہ نہیں تھا اور آج کے دور میں ایک اور المیہ یہ ہے کہ لوگ اب نماز کی نہیں درود کی بات کرتے ہیں۔ قرآن نہیں پڑھتے دستی کیلکولیٹر ایجاد ہو چکے، درود پڑھنے کے اور وہ بھی مسنون نہیں...... کچھ کے نزدیک درود ہی اصل ایمان ہے۔ بہرحال یہ تصور اسلام کی روح سے متصادم ہے اور اس پر ضرب اگر نہیں لگائی جاسکتی تو اس سے مجتنب تو رہا جاسکتا ہے۔''

عزیز احسن نے کہا ہے کہ

عزیز احسن، یقیناً بعد رب ہیں
میرے آقا ہی سب سے برگزیدہ

اس بارے میں بھی ڈاکٹر عبدالکریم صاحب کا خیال ہے کہ ''آپؐ نے کبھی ایسا نہیں فرمایا اور نہ ہی قرآن میں ایسا بیان ہوا۔ اسی طرح نور جن کا ہے اولین تخلیق۔ اس کی بھی کوئی مستند حیثیت نہیں۔ انہوں نے پیغمبروں میں مراتب اور اس میں حضورؐ کے مرتبے کے امتیازات کے حوالے سے بھی ارشاداتِ گرامی فرمائے ہیں۔ اس طرح ''بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر''...... پر بھی بات ہونی چاہیے اور اس شعر پر بھی کہ

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اسی لیے میں نے عرض کیا کہ کلیات کے ذریعے بہت سے ''کلیے'' اور ''کلیشے'' زیرِ بحث لائے جاسکتے ہیں۔ یہ بھی عزیز احسن کے حوالے سے ہونے والے کاموں میں بڑا کام ہوگا۔

اسی طرح محترم کاشف عرفان کا قابلِ قدر مضمون نہ صرف عزیز احسن کی شعری منزلت پر بحث کرتا ہے بلکہ اس حوالے سے انہوں نے عالمی ادب اور خصوصاً برعظیم کے مقامی اردو اور فارسی رنگِ ادب سے جو پھول چنے ہیں ان کی داد دینا ضروری ہے اس لیے کہ انہوں نے عزیز احسن کی شاعری پر اپنی رائے دیتے ہوئے استناد بھی دینا ضروری سمجھا ہے۔ مثلاً جب وہ عزیز احسن کی شاعری کے لیے یہ

کہتے ہیں کہ ''عزیز احسن کے ہاں نعت عربی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ روایت میں کہیں کہیں جدید الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ جدید الفاظ کی اصطلاح خاصی مبہم ہے۔ ہر لفظ جدید ہوتا ہے۔ یہاں جدید لفظ سے مراد وہ الفاظ ہیں جو عام طور پر نعت میں استعمال نہیں کیے جاتے اس لیے اس سے پہلے کہ عزیز احسن کی شاعری میں روایت کی اساس تلاش کی جائے یہ دیکھنا چاہیے کہ روایت کیا ہے؟...... اور پھر جناب کاشف عرفان اپنے دعوے کی دلیل میں ٹی ایس ایلیٹ سے سند لائے ہیں۔ ایلیٹ کہتا ہے کہ

''کوئی شاعر کوئی فنکار خواہ وہ کسی بھی فن سے تعلق رکھتا ہو تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت اور بڑائی اس میں مضمر ہے کہ پچھلے شعرا اور فنکاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اسے ان سے الگ رکھ کر اس کی اہمیت متعین نہیں کی جا سکتی۔ اسے پچھلے شعراء اور فنکاروں کے درمیان رکھ کر تقابل و تفاوت کرنا ہوگا۔''

جناب کاشف عرفان کے تجزیاتی ہنر میں یہی حسن ہے کہ وہ اجمالی بات سے قبل یا اس کے دوران اسلوب کے پیمانے اور زاویے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے عزیز احسن کے فن کو پرکھتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ سے رجوع کیا تو وہ خود کروشے کو اس پرکھ کا پیمانہ یا کسوٹی بنائے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اشاراتِ تنقید میں یہ حوالہ جس طرح دیا وہی کاشف عرفان نے دہرا دیا ہے کہ

''کروشے کے نزدیک فن وجدان یا تاثرات کے اظہار کے سوا کچھ بھی نہیں۔ وجدان اس وقت فن بنتا ہے جب روح اس میں غرق رہتی ہے تا کہ مکمل اظہار معرضِ وجود میں آ سکے۔ اس عالمِ وجدان میں جھوٹ اور سچ کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ حسن کا احساس ضروری ہوتا ہے۔''

اس تعلق سے خود عزیز احسن کا منشور کیا ہے اسے بھی دیکھتے چلیے تا کہ جرس کارواں بردار سے پہلے منزل کا نشان تو سمجھ لیں پتہ تو پھر پوچھ لیں گے۔ وہ اس بارے میں کہتے ہیں کہ

''انسانوں کے اذہان کو سمندر سے تشبیہ دی جائے تو تخلیقی یا معلوماتی ادب اور اصلاحی تحریروں کے تاثرات کا جائزہ لینا آسان نہیں رہتا ہے۔ سمندروں میں دنیا بھر کے دریا، ندی، نالے جا کر گرتے ہیں اور سمندر کے پانی میں اضافہ یا سمندر کی اپنی خصوصیات کا تبدیل ہونا محسوس نہیں ہوتا، اسی طرح خیر کی دعوت دینے والی تحریریں کچھ نہ کچھ اثر دکھاتی ہیں لیکن معاشرتی سطح پر فضا کی تبدیلی کے اثرات ظاہر نہیں ہوتے تاہم کچھ نہ کچھ ہوتے ضرور ہیں۔''

ڈاکٹر عزیز احسن اپنے اس خیالی مثالیے میں خود کو واضح نہیں کر سکے ہیں۔ سمندر میں گرنے یا ملنے والے ندی نالے اس کی ''سمائی'' میں کیا اضافہ کریں گے اس لیے اگر ہم ایمانیات کے ادب کو بجائے خود سمندر سمجھیں تو پھر دیگر معاشرتی اور انسانی جذبوں سے ہم کنار ندی نالے خود کو مصفا کرنے کے لیے

سمندر آشنا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میں ان کی کاوشوں کو اسی رنگ میں دیکھتا ہوں اور تسلیم کرتا ہوں کہ عزیز احسن کم از کم دو محاذوں پر کام کر رہے ہیں۔ ایک ان کا ذاتی محاذ ہے، شعری آبشار سے متصف، اندر سے پھوٹنے والے سوتے سے ہم رشتہ اور دوسرا محاذ فروغِ ادب ایمانیات ہے جو ان سے پرکھ کے نئے زاویوں کی ایجاد سے لے کر برتنے کے قرینے تک چاہتا ہے سو وہ اسی دھن میں مگن ہیں اور دنیا سے کٹ کر اپنی دنیا خود بنائے اور بسائے بیٹھے ہیں اور دعا گو ہیں۔

رب کریم اب مجھے مدح کا کچھ ہنر بھی دے — دامنِ حمد و نعت کو تازہ گلوں سے بھر بھی دے
سوز و گداز سے تہی حرفِ ثنا کبھی نہ ہو — فکر و عمل کے شہر کو رونقِ بام و در بھی دے
نعت لکھوں تو قلب و جاں نور سے جگمگا اٹھیں — حمد کے لفظ لفظ کو جذب و اثر سے بھر بھی دے

بات ایمانیات اور مابعد الطبیعات کی بحث سے شروع ہوئی تھی اس لیے تمتع بھی اسی نکتے پر ہونا چاہیے اس ضمن میں سراج منیر کا خیال ہے کہ ''وہ مابعد الطبیعات جو بحیثیت مجموعی ایک پورے گروہ کے شعور کی بنیاد نہ ہو، میرے نزدیک اس تعریف میں داخل نہیں ہے بلکہ اسے اس تعریف سے ممیز کرنے اور اسے اپنے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ اس کے لیے ایمانیات کی اصطلاح استعمال کی جائے اور ایمانیات میرے نزدیک نہ تو ''نظام'' کا نام ہے کہ اسے خارج سے نافذ کیا جا سکے اور نہ ہی یہ چند باطنی تجربات سے عبارت ہے کہ ہر آدمی کا محض ذاتی مسئلہ بن سکے بلکہ اس کی حیثیت ایک اولین وجودی انتخاب کی ہے جس کے بعد انسان کے تمام عامل اور تمام فکری، جمالیاتی، فنی، معاشرتی، سیاسی شعبے اس کے تابع ہو جاتے ہیں اور یہ بنیادی انتخاب ایک سطح پر افراد سے تعلق رکھتا ہے اور دوسری سطح پر کسی گروہ کی کلی موضوعیت سے۔ چناں چہ اسی لیے جب ہم روایت کا ذکر کرتے ہیں تو ہم بنیادی طور پر اسے ایک ایمانیات کے تابع مانتے ہیں اور اس روایت کی ذیلی شاخیں چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہوں اس کی بنیاد اسی پر ہوتی ہے۔

ان تمام مباحث کی روشنی میں اور کلیاتِ عزیز احسن کے مطالعے کے تناظر میں جو بات شدت سے ذہن و قلب پر وارد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت علوم کے مختلف شعبوں کی خود مختاری کی وجہ سے ہمارے ہاں جو ایک اصولی تفریق پیدا ہوتی ہے وہ دین اور دنیا کی تفریق ہے...... جبکہ یہ صرف دراصل قرآنی تعلیم سے ناواقفیت یا دوری کی وجہ سے ہے۔ عملاً یہ تفریق زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہے لیکن یہ اصل میں علوم کے درمیان پیدا ہونے والی ثنویت اور دوئی کا منطقی نتیجہ ہے۔ چناں چہ اس صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ضمنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان شعبہ ہائے علم کی نظریاتی تدوین بھی ممکن ہے جنہیں ہم علوم دنیا کے کھاتے میں ڈالتے ہیں اور اگر ہے تو اس کی ضرورت کیوں ہے اور اس کا جواز کیا

ہے؟اس طرح ہمارا ایک بنیادی سوال کئی عملی مسائل اور سوالات سے براہ راست متعلق ہو جاتا ہے اور اس کا جواز نہیں جواب تلاش کرنا ہمارا اجتماعی کام ہے۔ میں اس تناظر میں کلیاتِ عزیز احسن کو بہت اہم جگہ پر دیکھتا ہوں جس میں آدرش بھی ہے اور درس بھی...... جہاں اس کلیات میں عزیز احسن کے خلاقی کے جواہر ہیں وہیں ان کے انتقادی اوصاف کے گواہر بھی موجود ہیں اور پھر ان کے سہارے یا وسیلے سے ان اکابرین کے خیالاتِ جلیلہ جو ہمارے ادب کو مختلف زاویوں سے پرکھنے کے بعد ایمانیات اور مابعد الطبیعات کے رخ کی طرف خود بھی مڑتے ہیں اور ہم بھی ان کے ذریعے اپنے ٹوٹے ہوئے افکار کو پھر سے جوڑتے اور اشکال سے منہ موڑتے ہیں۔ اور اسی باعث ہم عزیز احسن کے نصاب کو کھولتے ہیں:

اعلانِ حُبِّ سید کونینؐ خوب ہے
اے کاش اتباع کا جذبہ نصیب ہو
یا رب یہ آرزو ہے کہ امت کا فرد فرد
صورت میں اور عمل میں نبیؐ کے قریب ہو

☆☆☆

ڈاکٹر عزیز احسن، کراچی

''القاء'' کی القائی تقدیسی جہت — ایک مطالعہ

ABSTRACT: Dr. Aftab Muztar's poetic work comprising of devotional poetry i.e. Hamd, Naat and Manaqib, ready for publication, has been introduced in this article. The literary beauty of poetry in different forms of poetic expressions has been highlighted with examples of couplets. Classical approach of the poet, blending with modern sensibility is worth applauding. Aftab Muztar has done a marvelous job by presenting his research work on the topic of 'Urdu Prosodic System and its cotemporary requirements [a critical study], for which PhD degree was conferred by University of Karachi.

آفتاب مضطر، میرے استاد بھائی ہیں۔ میں نے حضرت فدؔا خالدی کی ادب گاہ میں ۱۹۷۱ء میں قدم رکھا تھا۔ آفتاب نے بعد میں تلمذ اختیار کیا۔ جن دنوں یہ استاد سے فیض حاصل کر رہے تھے، میں پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے اسلام آباد میں تھا۔ معلوم ہوا کہ آفتاب مضطر نے استاد فدا خالدی سے ان کا وہ فن حاصل کرلیا ہے جو کسی اور شاگرد کا نصیب نہیں ہوسکتا تھا۔ جی ہاں، استاد کے بیشتر شاگردوں کو علمِ عَرُوض کی ہوا بھی نہیں لگی، لیکن استاد مرحوم نے آفتاب کو وہ علم گھول کر پلا دیا۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انھیں اسی علم کی صورت میں اعلیٰ علمی سند بھی مل گئی۔ وہ ''اردو کا عَروضی نظام اور عصری تقاضے'' کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D) کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

آفتاب مضطر نے جب اپنا مجموعہء نعت ''القاء'' مجھے دکھایا اور اس پر کچھ لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے سوچا کہ استاد بھائی (استاد بھائی کو خواجہ تاش بھی کہتے ہیں، لیکن میں اس لفظ کو عوام کے لیے مشکل جانتا ہوں اس لیے استعمال کرنے سے گریزاں ہوں) کے کلام کی ''تحسین (Appreciation)'' کا عمل کہیں میری ناقدانہ روش پر مروّت کا سایہ نہ ڈال دے۔ چناں چہ میں نے ان کا کلام بہت اچھی طرح دیکھا بھالا اور اب اس پر چند سطور لکھنے کا عزم کر کے لکھنے بیٹھا ہوں۔

آفتاب مضطر کا مزاج، اردو کی شعری وادبی روایت سے پیوستہ ہے۔ عروض سے دلچسپی اس بات کا اشاریہ ہے کہ وہ پوری فن آگاہی کے ساتھ روایت سے وابستہ رہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ چناں

چہ ان کی شاعری میں روایت اور جدت کے ملے جلے آثار ہیں۔

نعتیہ شاعری میں ''کیسے کہا گیا'' کا سوال ''کیا کہا گیا'' سے مشروط ہوتا ہے۔ یعنی عام شاعری میں ''کیسے کہا گیا'' پر زور ہوتا ہے یعنی بات چاہے کیسی ہی لچر کیوں نہ ہو اگر اسلوب (Style) شاعرانہ ہے تو ہر سطح پر سراہی جاتی ہے۔ لیکن نعت میں اسلوب سے پہلے ''متن'' (Text)، ''مافیہ'' (Content) یا ''مضمون'' دیکھا جاتا ہے۔ اگر روایت، دِرایت اور اسلامی اقدار سے مملو متن ہو تو اسلوب کی دلکشی قابلِ تحسین، ورنہ نعتیہ شاعری میں، خالی اسلوب کی دلکشی کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آفتاب مضطر نے جہاں اسلوب کی کلاسیکی سطح پر نگہداشت کا دھیان رکھا ہے وہیں ''متن'' کی روایت پیوستگی کا بھی اہتمام کیا ہے۔

''القاء'' کی ابتداء جس حمدیہ نظم سے ہوئی ہے وہ ایک حمد ہی اس کتاب میں شامل تمام حمدوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس کی بحر بڑی مترنم ہے۔ علامہ اقبال نے مسجدِ قرطبہ والی نظم [ع ..... سلسلہء روز و شب، نقش گرِ حادثات] میں جو بحر استعمال کی تھی وہی بحر اور جو قوافی اس نظم کے پہلے بند میں برتے تھے ویسے ہی قوافی اس حمد میں آفتاب مضطر نے رکھے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

'کن' سے ہویدا کیا تُو نے ہر اِک ذی حیات
تیری ہی قدرت میں ہے سب کی حیات و ممات
اِک تری آواز ہے نطق و زباں کا فروغ
ایک ترے لفظ میں لوح و قلم کا ثبات
تیری ہی قدرت سے ہیں نور فشاں رات دن
مہر کے ہونے سے دن، چاند ستاروں سے رات
پاتے ہیں نشو و نما تیرے کرم کے طفیل
خار و گل و برگ و بار، نخل و جماد و نبات
ششدر و حیران ہیں نکتہ ور و فلسفی
کب سے ترا ہے وجود، کتنی تری ہیں صفات
دیکھتے ہیں جا بہ جا خوب تجھے اہلِ دل
ہو رہی ہے روز و شب عقل کے پتلوں کو مات
تیرا پتا تیرا گھر، ڈھونڈنے نکلیں اگر
عقل پٹکتی ہے سر، فہم کو ہوتی ہے مات

یہ چند اشعار، اس بات کے غماز ہیں کہ شاعر کو ذات وحدہٗ لاشریک کی عظمتوں اور رفعتوں کا ادراک ہے اور وہ اپنے جذبات واحساسات کی زبان میں اللہ تعالیٰ کی حمد بھرپور فنی خلوص اور شعری اسلوب میں کر رہا ہے۔ یہاں شعری مافیہ بھی خوب ہے اور شعری بنت بھی حُسن آفریں ہے۔

"القاء" کے نعتیہ شعری متون میں ویسے تو قرآن و احادیث اور روایت کے بہت سارے مضامین کا عکس ملتا ہے۔ لیکن میں نے صرف چند مضامین کی شعری بنت پر اپنی توجہ مرکوز رکھ کر بات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

پئے ختمِ نبوت تھا جو آخر مرحلہ باقی
محمدؐ کے لیے رکھی گئی آخر میں جا، باقی

اس شعر میں آفتاب مضطر نے ایک حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا:

"میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاءؑ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہارِ حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں [یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لیے کوئی آئے] (بخاری شریف، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین)

آفتاب مضطر کا ایمان بڑا پختہ ہے۔ وہ موقع بہ موقع اپنے شعری متن میں ختمِ نبوت کا حوالہ نظم کرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے عہد میں مسلم دنیا کو سب سے بڑا نقصان کاذب نبیوں کے پیروکاروں کے شیطانی روّیوں کی شکل میں ہو رہا ہے۔ اسی لیے دشمنانِ اسلام کی سازشوں سے آشنا، ہر صاحبِ ایمان اپنے اپنے طور پر اس فتنے سے نمٹنے کے لیے کوشاں ہے۔

مجھے اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دن میں، سلیم احمد مرحوم سے ملنے گیا۔ ان کے گھر میں اکثر علمی مباحث ہوتے رہتے تھے۔ میں ان مباحث میں کبھی شامل نہیں ہوا تھا لیکن ان مجالس کا احوال اخبارات میں دیکھ لیا کرتا تھا۔ ان کی خدمت میں حاضری سے کچھ روز قبل ان کے گھر کی محافل اجڑ چکی تھیں۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آج کل آپ کے ہاں علمی نشستیں نہیں ہو رہی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟؟؟ انھوں نے وہی جواب دیا جس کی مجھے توقع تھی۔ کہنے لگے......

"ایک صاحب ہیں عبیداللہ علیم، انھوں نے میرے گھر پر ہونے والی علمی

نشست میں ایک مقالہ پڑھا جس میں ذریعہء علم کے طور پر "وحی" کے تسلسل کے اشارے تھے۔ چناں چہ ان کے مضمون پر گرما گرم بحث ہوئی اور کچھ تلخیاں بڑھ گئیں۔ایسی صورت میں علمی مجالس کا انعقاد ممکن نہیں رہا"

........میں اس معاملے کی روداد پہلے بھی کہیں پڑھ چکا تھا لیکن خود سلیم احمد صاحب سے یہ بات سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ عبید اللہ علیم نے ضرور "ختمِ نبوت" کے محکم عقیدے کے خلاف اپنے جھوٹے نبی کی نبوت کا تسلسل ظاہر کرنے کی کوشش کی ہوگی......بعد میں مجھے قمر بھائی (قمر جمیل) نے بھی بتایا کہ عبید اللہ علیم کے مضمون پر اس قدر لے دے ہوئی کہ "سجاد میر نے سلیم احمد سے یہ تک کہہ دیا کہ اس مضمون کو آپ کی محفل میں سنانے کی اجازت دینے پر میں حضورِ اکرم ﷺ کی جناب میں آپ (سلیم احمد) کی شکایت کروں گا"۔

یہ واقعہ مجھے اس لیے یاد آیا کہ آفتاب مضطر نے ایک شعر میں عبید اللہ علیم کو براہِ راست مخاطب کرکے کہا ہے:

علیم ہو کے بھی منکر ہو جو محمدؐ کا
تو اس کے علم سے ٹپکیں جہالتیں کیسی

آفتاب مضطر نے یہ نعت عبید اللہ علیم ہی کے ایک مصرع پر کہی تھی......یعنی

ع "جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی"

اس مصرع پر آفتاب مضطر نے جو گرہ لگائی ہے وہ کمال ہے۔اس پیش مصرع میں عبید اللہ علیم کے مسلک اور ختمِ نبوّت سے عبید اللہ علیم کے بُغض کی روداد رقم ہوگئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آفتاب مضطر نے مصرع کیا لگایا ہے تاریخ ادب میں عبید اللہ علیم کے مسلک کی تردید کا تأثر اور اپنے احساسات کا اتنا گہرا عکس اتارا ہے کہ مصرع پڑھتے ہوئے یا سنتے ہوئے کوئی بھی صاحبِ ذوق اور حاملِ ایمان، داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا...... راقم الحروف کے غریب خانے پر کبھی کبھی نعتیہ نشستیں ہوتی ہیں۔اس میں میرے ایک بزرگ کرم فرما سلمان خان لکھنوی بھی تشریف لاتے تھے۔وہ شاعر تو نہیں تھے لیکن لکھنوی ہونے کی وجہ سے صاحبِ ذوق تھے۔ میں ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ایک مشاعرے میں جب آفتاب مضطر نے یہ شعر پڑھا:

ہوائے ختم نبوت کے سامنے گئے کیوں
'جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی'

تو داد کے شور نے چھتیں اڑا دیں۔سلمان خان صاحب مرحوم پر تو جیسے وجد طاری ہوگیا۔بار بار

یہ مصرع پڑھ کر پورا شعر مکرر، سہ کرر پڑھنے کی فرمائش ہوتی رہی اور آفتاب مضطر یہ شعر پڑھتے رہے۔
پھر اس کے بعد جب جب غریب خانے پر نعتیہ نشست ہوئی آفتاب مضطر سے سلمان خان صاحب کی فرمائش پر یہ نعت ضرور سنی گئی۔

ختمِ نبوت کا مضمون، آفتاب مضطر کو بہت عزیز ہے۔ اس لیے وہ اسے ہر پیرائے میں شعری متن کا جزو بناتے ہیں۔ دیکھیے ہائیکو میں کس انداز سے یہ مضمون باندھا ہے:

اُس پہ وحی اتمام
ختمِ نبوت ہے وہ ذات
جس کا محمدؐ نام

جیسا کہ میں نے ابتداء میں عرض کیا آفتاب مضطر کا مزاج کلاسیکی ہے۔ وہ ادب کے کلاسیکی معیارات کو سامنے رکھتے ہیں اور عروضی در وبست کے لیے خاصی محنت کرتے ہیں۔ کلاسیکی مزاج کا عکس ان کے ایسے اشعار میں زیادہ جھلکتا ہے جو کسی طرحی مصرع پر گرہ لگانے کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے ذوقؔ کے معروف مصرع پر ایسا مصرع لگایا ہے کہ اگر یہ مصرع خود ذوقؔ کے سامنے پڑھا جاتا تو شاید وہ بھی کہہ دیتے کہ شاعر نے مجھ سے یہ مصرع چھین لیا ہے۔ ذوقؔ کا مصرع تھا:

ع "چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

نعت کے مزاج کو سامنے رکھ کر اب آفتاب مضطر کا پیش مصرع دیکھیے:

کہہ کہہ کے نعت، جان غزل سے چھڑاؤں گا
"چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی"

یہاں غزل کی عشوہ طرازی اور شعراء کا اس کی طرف میلان بھی ظاہر ہو گیا اور شاعر نے غزل گوئی سے جان چھڑانے کا عندیہ بھی دے دیا۔ سب سے اہم بات یہ کہ غزل کے اس مصرعے کی کھپت کی گنجائش، نعت جیسی تقدیسی صنفِ سخن میں بھی نکل آئی۔

اسی طرح مضطرؔ نے بہادر شاہ ظفر کے کئی مصرعوں پر بھی گرہ لگا کر اسے نعتیہ آہنگ دے دیا ہے:

دلِ مضطرؔ جو تڑپ آج ہے طیبہ کے لیے
"بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی"

ہر قسم کی شاعری میں شکایتِ زمانہ کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ ایسی شاعری میں شعراء کی اپنے عہد کے نظامِ زندگی اور معاشرتی طور طریقوں کی طرف سے عدم اطمینان، معاشرے کی ناہمواری، ظلم و بربریت کے مناظر دیکھ کر اپنی طرف سے کوئی مُداوا نہ کرسکنے کی کڑھن اور معاشرے کو اپنے آدرش کے

مطابق ڈھالنے کا جذبہ ،شاعر کی تخلیقی دانش کا حصہ بنتا ہے۔ایسا گہرا جذبہ اور احساس جب شعری پیکر میں ڈھلتا ہے تو شہر آشوب کا متن ظہور میں آتا ہے۔

نعت کہنے والا ہر سچا مسلمان ، زندگی گزارنے کے ان معیارات کو سامنے رکھتا ہے جو رسول اکرم ﷺ نے معاشرتی اقدار کی شکل میں انسانوں کے افکار و اعمال و کردار کا جزو بنا دیے تھے۔ ہر عہد میں پچھلے عہد کے مقابلے میں انسانی کردار و اعمال اور ایمانیات کی سطح پر کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نبیء کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بھی اپنے عہد کو خیر القرون فرمایا تھا اور اپنے عہد کے بعد صرف دو قرنوں کا ذکر فرما کر بات مکمل کردی تھی...... نیز اپنے اور اپنے بعد کے دو قرنوں کے لوگوں کو سب سے اچھے لوگ قرار دیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

> ''خَیرُ اُمَّتِی قَرنِی ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُم ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُم...... خَیرُ النَّاسِ قَرنِی ، ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُم ثُمَّ الَّذِینَ یَلُونَھُم. ''میری امت میں بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد ہیں [یعنی تابعین] پھر ان لوگوں کا جو ان کے بعد ہیں [اتباعِ تابعین]...... ''میرے زمانے کے لوگ سب سے اچھے ہیں پھر جو ان کے بعد پھر جو ان کے بعد'' (بخاری جلد دوم، حدیث ۸۵۰، نیز ۸۵۱، پارہ نمبر ۱۴، کتاب المناقب، بخاری جلد دوم، صفحہ نمبر ۴۲۲)۔

ان احادیث کے متن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے غیب کا علم جاننے والے رسولِ کریم ﷺ کو بعد کے ادوار میں زوال اور انحطاط پیدا ہونے کا مکمل ادراک تھا۔ چناں چہ وہی ہوا، بعد کے تمام ادوار میں ایمانی کمزوری، اعمال کی کھوٹ اور کرداری ناہمواریاں نمایاں ہوتی گئیں اور اسلامی معاشرہ اس نہج پر پہنچ گیا کہ آج پوری دنیا میں تُھڑی تُھڑی ہو رہی ہے۔اس صورتِ حال کا عکس، عصری حسیت کی شکل میں، شعراء و ادباء کی تحریروں پر پڑتا ہے۔ آفتاب مضطر نے بھی اپنے ذہنی و قلبی اضطراب کا احوال قلم بند کر کے ایک سچے مسلمان اور حقیقی ہوا خواہِ ملت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ نعتیہ شاعری میں شہر آشوب، زیادہ تر استغاثے کی شکل میں شعری عمل کا حصہ بنتا ہے۔ آفتاب مضطر نے بھی ''نعتیہ شہر آشوبی استغاثہ'' لکھا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بڑے طوفان کا ہے ڈر، کرم فرمایئے آقاؐ
توجہ کیجیے ہم پر، کرم فرمایئے آقاؐ
ہماری گھات میں اِک عمر سے اغیار ہیں کیا کیا
مخالف ہے بڑا لشکر، کرم فرمایئے آقاؐ

عجب افتاد ہے ہم پر، ہمارے دیس میں اکثر
اُجڑ جاتے ہیں گھر کے گھر، کرم فرمائیے آقاؐ
زباں پر قفلِ دہشت ہے، عجب وحشت ہی وحشت ہے
ستم کا کیا لکھوں دفتر۔ کرم فرمائیے آقاؐ
بنا ہے شہر وہ مقتل کہ جینا ہو گیا دوبھر
کرم فرمائیے سرورؐ، کرم فرمائیے آقاؐ

اس شہر آشوب میں آفتاب مضطر نے مسلمانوں کے خلاف بین الاقوامی سطح پر ہونے والے ظلم کی داستان بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے وطن میں انسانیت کی تذلیل اور گھروں کے اجڑنے کا احوال بڑے کرب کے ساتھ رقم کر دیا ہے۔

آفتاب مضطر کے اس استغاثہ نما شہر آشوب کا متن، غالبؔ کے اس قطعے سے ملا کر پڑھیے جو انھوں نے دلّی کے حالات کی عدم موافقت کے حوالے سے، نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ کو ایک خط میں لکھ کر بھیجا تھا۔

دونوں زمانوں کے شہر آشوب پڑھ کر کمزوروں کی ناکامی و نامرادی اور طاقت وروں کی طرف سے ظلم و بربریت کے تسلسل کا شدید احساس ہونے لگتا ہے۔ غالب نے کہا تھا:

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہء خاک تشنہء خوں ہے، ہر مسلماں کا

(نوائے سروش، ص ۹۸۰)

ان اشعار میں غالب نے 1857ء کی خونیں داستان رقم کی ہے...... آفتاب مضطر، پاکستان کے شہر کراچی میں بیٹھ کر ویسا ہی درد اور کرب محسوس کر رہے ہیں جیسا غالب نے محسوس کیا تھا۔ مسلمانانِ عالم کی بدبختی دیکھیے کہ انیسویں صدی سے اکیسویں صدی تک ایک ہی موسم ٹھہرا ہوا ہے۔

آفتاب مضطر اپنے کسی شعر میں Impressionistic vision بنا کر تأثراتی اور محاکاتی انداز میں شعری نقش پیش کرتے ہوئے یہ پیغام بھی دے دیتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ کی عظمت کے سامنے بڑے بڑے فصحاء آپ کے دربار میں اب بھی زبان کھولنے کی جسارت کرنے سے معذور ہیں:

جو حرفِ شعلہ بیانی میں طاق تھے کیا کیا
وہ کیسے گنگ کھڑے ہیں حضورؐ کے در پر

یہ حضورِ انور ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضری کا منظر ہے جسے دیکھنے والے تو ہزاروں ہوتے ہیں لیکن شعر کے پردے پر احساس کے رنگ برنگ طیلسان بنانا کسی کسی شاعر کے نصیب میں ہوتا ہے۔

آفتاب مضطر کے کلام میں نعتیہ غزلیں وافر تعداد میں ہیں۔ بلاشبہ ان کی طبیعت غزل کے لیے بہت موزوں ہے۔ اس لیے ان کے تغزل آمیز نعتیہ متن کی بھی ایک جھلک دیکھتے چلیے:

کشش طیبہ نگر کی اللہ اللہ　　کھنچا جائے زمانے کا زمانہ
غزالِ دل مرا رَم خوردگی میں　　بڑھے طیبہ کی جانب والہانہ
ابھی پھوٹی ہے کونپل حاضری کی　　ابھی سے دل کا موسم ہے سہانا

یہ سادہ سے اشعار غزل کے مزاج کے بھرپور عکاس ہیں۔

مدینہ منورہ میں چلنے پھرنے اور جنتِ ارضی دیکھنے کا حیرت زا تجربہ آفتاب مضطر کو ایک خیالِ مسلسل کے ساتھ شعری قرینہ عطا کر گیا چناں چہ بڑی روانی سے انھوں نے اپنے اس تجربے کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہاں سے رخصت ہونے اور وطن واپس آنے کے بعد کی قلبی کیفیات بھی اس طور رقم کر دی ہیں کہ قاری کے دل میں اتر جائیں۔

آ کے طیبہ میں یوں لگا جیسے　　مجھ میں دریا اُتر گیا جیسے
ایسے دُنیا اُتر گئی دل سے　　جینا طیبہ میں آ گیا جیسے
ایسا لگتا ہے، شہرِ عرشِ بریں　　شہرِ طیبہ میں آ بسا جیسے
یوں لگا طیبہ سے دمِ رُخصت　　گویا رہ کر، نہیں رہا جیسے
یوں چلا طیبوی زمین پہ مَیں　　آسماں پر چلا پھرا جیسے
آج بھی ڈھونڈتا ہوں مضطرؔ دل　　وہیں، طیبہ میں رہ گیا جیسے

میں نے اکثر لکھا ہے کہ فارسی گو شعراء کی تقلید میں اردو کے بڑے بڑے شعراء نے لفظ "کبریا" کو اللہ تعالیٰ کے نام کے طور پر استعمال کیا ہے جو عربی قاعدے سے غلط بھی ہے اور معنوی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے۔ ایک مدت بعد مجھے آفتاب مضطر کے ہاں اس لفظ کا صحیح استعمال نظر آیا تو بڑی مسرت ہوئی۔ اس لفظ کا صحیح استعمال اردو دنیا میں غالباً سب سے نمایاں طور پر میر تقی میرؔ نے کیا تھا اور میری محدود معلومات کی حد تک شاید اب یہ سعادت مضطر کے حصے میں آئی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں:

میرؔ ناچیز مشتِ خاک اللہ!
ان نے یہ کبریا کہاں پائی

اب مضطر کا شعر ملاحظہ ہو:

حضورؐ ہیں ایسی شان والے خطاب سردارِ انبیاء ہے
وہی شفیع الامم ہیں بے شک اُنھیں کو حاصل یہ کبریا ہے

کبریا کے معنی ہیں......شان وشوکت، عظمت، جاہ وجلال، قدرت، فضیلت، بزرگی، بڑائی۔ یہ اسمِ صفت ہے، اسم نہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ دو مقامات پر آیا ہے......سورۂ یونس اور الجاثیہ میں:

۱۔ وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْأَرْضِ ط......

اور حاصل ہو جائے تم دونوں کو سرداری اس ملک میں۔ (سورۂ یونس ۱۰: آیت ۷۸)

۲۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ص......

اور اسی کو سزاوار ہے بڑائی آسمانوں اور زمین میں۔ (سورۂ الجاثیہ ۴۵: آیت ۳۷)

قرآن کریم کی درج بالا آیات سے صاف ظاہر ہے کہ کبریا بڑائی کو کہتے ہیں "بڑے" کو نہیں۔ اللہ کے لیے "اکبر" بھی اسمِ ذات (اللہ) کے ساتھ بولا اور لکھا جاتا ہے۔

یہی کیفیت لفظ "مُوَاجَهَه" کی ہے۔ یہ لفظ بھی زیادہ تر "مُوَاجَه" لکھ دیا جاتا ہے۔ لیکن اصل لفظ "مُوَاجَهَه" ہی ہے۔ "مُوَاجَهَه" کے عام معنی تو، روبرو ہونا، آمنے سامنے ہونا، مقابل میں، وغیرہ ہیں، لیکن مدینہ شریف میں آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے روضے کی جالی، جہاں کھڑے ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے روبرو ہو جاتے ہیں......وہ مقام "مُوَاجَهَه" کہلاتا ہے۔ اردو شعراء نے اس لفظ کو مواجہہ اور مواجہ، دونوں طرح باندھا ہے۔ نعت گو شعراء نے اپنی سہولت کے لیے زیادہ تر "مواجہ" باندھا ہے جس پر اہلِ علم، بالخصوص عربی اسکالرز نے اعتراضات کیے ہیں۔ آفتاب مضطر نے یہ لفظ دونوں طرح استعمال کر کے اپنی لغت شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ میر تقی میر نے "مواجہہ" باندھا تھا:

آرسی اس کے سامنے دھر لو
کب ہے ویسی "مُوَاجَهَه" کر لو

اب آفتاب مضطر کے اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ نطق، گویائی کا قرینہ بھلا چکا تھا مواجہہ پر
مگر نظر سے کلام بن کر ٹپک رہا تھا مواجہہ پر
نہ پوچھیے کیا بتایا جائے کہ حال کیا تھا مواجہہ پر
رواں رواں بول اُٹھا تھا لیکن، سکوت زا تھا مواجہہ پر
میں سر بہ سر آنکھ بن گیا تھا اور آنکھ پر تھا وہ کیف طاری
کہ آنکھ میں دل دھڑک رہا تھا، میں چپ کھڑا تھا مواجہہ پر

مواجہہ کے وہ سیدھی جانب جو دو ستارے چمک رہے تھے
مَیں انؐ ستاروں کی ضَو میں پورا نہا گیا تھا مواجہہ پر

یا

خوشا نصیبی کہ آج مَیں بھی کھڑا ہُوا ہُوں مواجہہ پر
نظر یہاں کام آ رہی ہے، زبان کا دم اٹک رہا ہے

''مواجہہ'' کے استعمال سے ظاہر ہوا کہ آفتاب مضطر، الفاظ کے اصل، درست اور کلاسیکی تلفظ کو شعری زبان دینے کے قائل ہیں۔ جبکہ آج کل زیادہ تر شعراء، زبان کی نزاکتوں اور بیان کی صباحتوں کا اتنا خیال نہیں رکھتے ۔ لفظ کے درست استعمال کی بات اپنی جگہ، مذکورہ اشعار میں جو کیفیت سمودی گئی ہے اور جس منظر کی عکس بندی کردی گئی ہے وہ بھی شاعر کی ہنر مندی (Craftsmanship) کی آئینہ دار ہے۔

نعتیہ شاعری کا ایک مقصد تو حضورِ اکرم ﷺ کو خراجِ عقیدت پیش کرنا اور آپ ﷺ کی محبت کی جوت اپنے دل میں پیدا کر کے دوسروں کے دل میں بھی اجالا کرنا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام کی طرف توجہ مبذول کرواکے عمل کی راہیں متعین کرنے کی طرف دھیان دلانا بھی مقاصدِ نعت میں شامل ہے۔ آفتاب مضطر نے درجِ ذیل شعر میں ''کتاب'' کی حقانیت اور ''حسنِ عمل'' کی سند کے لیے صرف ایک ذات، ذاتِ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کی ذات سے ہٹ کر تو دنیا میں صرف بوالہی رہ جاتی ہے:

کلام رب کا وہی ہے بے شک، وہی ہے حسنِ عمل، عمل تک
حضورؐ نے جو بتا دیا ہے، حضورؐ نے جو عمل کیا ہے

اسلام نے سب سے اہم نکتہ یہ سمجھایا ہے کہ ''حق'' کی خاطر جان دینا ''زندگی'' ہے اور ''حق'' سے دور رہ کر دنیاوی زندگی بسر کرنا موت بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ موت اور زندگی کا یہ اسلامی نظریہ پیش کرنے اور اس نظریئے کے مطابق عملی زندگی بسر کر کے دکھانے والی ذات صرف اور صرف نبیء کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس لیے مضطر نے یہ نکتہ اخذ کیا کہ موت وحیات کا شعور ہمیں نبی ﷺ کی نسبت کے طفیل حاصل ہوا ہے:

اُنؐ کی نسبت نے دے دیا یہ شعور
کسے کہتے ہیں موت، کیا ہے حیات

اس نسبت کا یقینی فائدہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب انسان آپ ﷺ کی ذاتِ پاک کی خاطر

زندگی بسر کرتا اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین پر چلتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیتا ہے، درجِ ذیل اشعار میں مرگ و حیات کے فلسفے کا عکس اتار لیا گیا ہے:

حقیقتہً ہے حیات ان کی، حیات سمجھو، ممات ان کی
وہی جیے، انؐ کے جو ہوئے ہیں، وہ جی اٹھے، انؐ پہ جو مرے ہیں
کہ نامِ آقاؐ پہ مرمٹیں جو، نہ راہِ حق سے کبھی ہٹیں جو
عیارِ حبِ نبیؐ پہ بے شک، وہ عشق والے کھرے کھرے ہیں

حبِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تقاضا ہے کہ مسلمان کا دل مدینے میں اٹکا رہے۔ اگر وہ وہاں پہنچ سکے تو اس کے مناظر دل کی آنکھ میں محفوظ کر کے واپس آئے اور زندگی بھر، لحہ بہ لحہ ان مناظر کی تصوراتی دید میں محو رہے...... اور اگر جا نہ سکے تو وہاں جانے کی تمنا اسے چین نہ لینے دے۔ کیفیات کی یہ دھنک اس دل میں سما جاتی ہے جس کے دل میں حضورِ اکرم ﷺ کی محبت اپنا گھر کر لیتی ہے۔ آفتاب مضطر کی شاعری میں ہجر و وصال کی تمام کیفیات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شعری متن میں ڈھلی ہیں۔ ہجر کی تڑپ کے لیے ایک نظم "ایک زائرِ دوست سے گفتگو کے بعد" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

خوشا! اے زائرِ و ظاہر میں کیا کیا دیکھ آئے تم
وہ کعبہ دیکھ آئے وہ مدینہ دیکھ آئے تم
جو گلیاں ہم نے دیکھیں خواب یا چشمِ تصور میں
کھلی آنکھوں سے وہ گلیاں وہ رستہ دیکھ آئے تم
فدا ہم ایسی آنکھوں پر تصدق ان نظاروں پر
کہ جن آنکھوں سے جنت کا نظارا دیکھ آئے تم
وہاں کے ایک اِک ذرّے کو آتی ہے مسیحائی
سنا کرتے تھے جو کارِ مسیحا دیکھ آئے تم
خدا لگتی کہو، کیا ہو گئی سیری نگاہوں کو
اگرچہ دیکھنے کو یوں تو کیا کیا دیکھ آئے تم
وہاں دل آنکھ بن کر، آنکھ دل بن کر دھڑکتی ہے تو
یعنی آنکھ میں دل کو دھڑکتا دیکھ آئے تم
دُعا ہے، دیکھ آؤں اور لکھوں آ کر حقیقت میں
حقیقت میں عرب کا ذرہ جو نقشا دیکھ آئے تم

لکھوں وہ ساری تفصیلات جو دل پر گذر جائیں
لکھوں اس کی حقیقت جو فسانا دیکھ آئے تم

نعت اگر جذبہ واحساس کی شاعری ہے تو واقعتاً آفتاب مضطر نے اپنے جذبے اور احساس کی تجسیم کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔اس نظم میں داستانِ ہجر و رشک بڑی خوبصورتی سے بیان ہوئی ہے۔ اپنی محرومی کے احساس کا تاثر ......ہجر...... اور دوست کی خوش بختی پر رشک۔ ''خدا لگتی کہو'' کے استعمال سے محاورہ بندی کا اسلوب بھی روایت پیوستگی کی دلیل بن کر سامنے آجاتا ہے۔

شعری متون کے ہزار ہا زاویے اور بنت کے لامتناہی انداز ہیں۔ آفتاب مضطر کی شاعری میں غمِ دوراں کا اظہار، عصری شعور کا ملفوظی عکس اور عشقِ نبوی ﷺ کے تخلیقی شعری نقوش بہت ہیں۔ لیکن ہر ہر زاویے کی نشاندہی کرنا اور تمام متون کے لونی عکس (Shades) پیش کر کے ان کی فنی خوبیاں گنوانا ممکن نہیں ہے تام چند نکات کی نشاندہی مزید کرنی ضروری سمجھتا ہوں۔ مثلاً......

فی زمانہ نعتیہ شاعری کی طرف رجوعِ عام کا یہ عالم ہے کہ ہر وہ شخص جو ذرا سا موزوں طبع ہے، نعت کہنے کے لیے بے تاب نظر آتا ہے اور اگر اس کا لحن بھی اچھا ہے تو اس کی لکھی ہوئی نعت، محض لحن سے پڑھنے کے باعث عوام میں مشہور بھی ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے عوامی سطح پر جس شاعری کو قبولیت حاصل ہوتی اس کا ہر اعتبار سے معیاری ہونا ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی دنیا میں نعتیہ شاعری کی تحسینی فضا بننے میں بڑی تاخیر ہوئی۔ بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نعتیہ ادب میں تنقیدی رجحان کا تسلسل ،نعت رنگ کے اجراء (اپریل 1995ء) کے بعد سے دیکھنے میں آیا ہے، جبکہ نعتیہ شاعری، اردو کی ابتدائی شعری تخلیقات کا بھی حصہ رہی ہے۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری نے ملا داؤد کی مثنوی چندائن (زمانۂ تصنیف ۱۳۷۹ء بعہدِ فیروز شاہ تغلق) میں نعتیہ اشعار دیکھ کر انھیں پہلا نعت گو قرار دیا ہے۔ اس تحقیق کو تسلیم کر لیا جائے تو نعتیہ ادب میں تنقیدی رجحانات کے فروغ کا زمانہ ۶۱۶ سال بعد کا بنتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اب تک نعتیہ شاعری میں احتیاط پسندی کا رجحان بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر صاحبِ ہوش اور دانندۂ فن، اپنے اشعار میں، نعتیہ متن کی اہمیت اور اس شعری آبگینے کی نزاکت کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ یہ تمہید میں نے اس لیے باندھی ہے کہ مجھے آفتاب مضطر کے چند اشعار ایسے پیش کرنے ہیں جن میں انتقادی متن جلوہ آراء ہے۔ وہ کہتے ہیں:

راہِ مدحت پہ جب قدم رکھیے　　ہوش اور جوش کو بہم رکھیے
نعت لکھیے اس احتیاط کے ساتھ　　قلمِ دل کو خود میں خم رکھیے
نعت رستے پہ چلنا ایسا ہے　　جیسے شمشیر پر قدم رکھیے

ہمہ دم رہے فکرِ مدحت میں   جیب دل میں کُھلا قلم رکھیے

یہ اشعار جو شخص کہہ رہا ہے، ظاہر ہے اس کا اپنا کلام تو احتیاط پسندی کا آئینہ ہی ہوگا۔ آفتاب مضطر نے روایت شناسی کا ثبوت ''صنعتِ عاطلہ'' (غیر منقوط) میں نعت لکھ کر بھی دیا ہے۔ اس نعت کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمایئے:

ہر دو عالم کو علم ہُوا، سرکارؐ کی آمد آمد ہے
ہر دو عالم سے آئی صدا، سرکارؐ کی آمد آمد ہے
ہر دل کی صدا ہے صلِ علیٰ، سرکارؐ کی آمد آمد ہے
سرکارؐ کی آمد واہ رے وا! سرکارؐ کی آمد آمد ہے
در در اِک مہکی آہٹ ہے، ہر سو مہکی مہکاہٹ ہے
گھر گھر مہکے اِک مہکی ہُوا، سرکارؐ کی آمد آمد ہے
اِک دَور دُرودوں والا ہو، اِک وِرد سلاموں والا ہو
اِک صلِ علیٰ کی آئے صدا، سرکارؐ کی آمد آمد ہے
وہ ہادیٔ عالم، ہادیٔ کُل، ہے اس کی مہک سے مہکا گل
مہکا مہکا عالم سارا، سرکارؐ کی آمد آمد ہے

قافیہ ردیف کی پابندی کے ساتھ عام شاعری ہی کونسی آسان ہے جو شاعر اپنے اوپر خود ہی غیر منقوط الفاظ کے استعمال کی پابندی عائد کر کے شاعری کے ہفت خواں کو طے کرنے کی ٹھان لے۔ لیکن فن پر اعتماد اور زبان و بیان پر گرفت مضبوط ہو تو اس گھاٹی سے بھی بآسانی گزرا جاسکتا ہے۔ غیر منقوط نعت کی رواں دواں اور مترنم بحر اپنی جگہ، زبان کی فصاحت بھی شاعر کی قادر الکلامی کی بیّن دلیل ہے۔

آفتاب مضطر نے اپنی شاعری میں جہاں نبیٔ کریم ﷺ کی مدحت کا قرینہ پیشِ نظر رکھا ہے وہیں اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ آپ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد دین کی روح کو جسدِ ملت میں جاری و ساری رکھنے والی ہستیوں یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا بھی ذکرِ خیر کیا جائے۔ کیوں کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کا طبقہ ہی ایسا طبقہ ہے جس کے توسط سے، دین کے عملی نفاذ کے نمونے، قیامت تک آنے والے غیر معصوم افراد تک پہنچے ہیں اور پہنچتے رہیں گے۔ یہی وہ مقدس گروہ ہے جس نے غیر معصوم ہونے کے باوجود، اللہ کی زمین پر حکومتِ الٰہیہ کا نفاذ، علیٰ منہاج النبوۃ، قائم کر کے دکھایا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے زریں عہد کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ ختمِ نبوت کا مقصد ان مقدس حضرات کے اعمال و کردار و افکار کی روشنی میں واضح ہو جائے۔ علامہ اقبال نے سچ فرمایا ہے کہ:

''اسلام کی آفرینش، عقلِ استقرائی کی آفرینش ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچی ہے کیوں کہ اس نے اپنے ہی خاتمے کی ضرورت کو محسوس کرلیا ہے۔ اس میں یہ ادراک گہرے طور پر موجود ہے کہ زندگی کو ہمیشہ بیساکھیوں کے سہارے پر نہیں رکھا جاسکتا اور یہ کہ ایک مکمل خودشعوری حاصل کرنے کے لیے انسان کو بالآخر اس کے اپنے وسائل کی طرف موڑ دینا چاہیے''۔

(تجدیدِ فکریات، ترجمہ: تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، اقبال، ڈاکٹر وحید عشرت)

نبی علیہ السلام کو وحیِ ربانی کی رہنمائی حاصل تھی، اسی لیے آپ ﷺ معصوم عن الخطاء تھے۔ لیکن آپ ﷺ کی آل و اصحاب رضوان اللہ علیہم میں کوئی بھی معصوم عن الخطاء نہیں تھا۔ تاہم انھیں رسول ﷺ کی صحبت کے باعث محفوظ عن الخطا تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے عملی اقدامات نے، دنیا کے سامنے، دین کے عملی نفاذ کی وہ صورت پیش کی کہ غیر مسلم دنیا بھی اُن کے حسنِ اقدام کی قائل ہوگئی۔ لیکن اسلام دشمنوں کی سازشوں کے نتیجے میں ان کی سیرت پر بھی سوالات اٹھانے کی مذموم کوششیں کی گئیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے گروہ کو سورۂ فتح میں ایک ایسی کھیتی سے تشبیہ دی گئی ہے جس کو دیکھ کر کاشت کرنے والے (رسول اللہ ﷺ) خوش ہوتے ہیں اور اس کھیتی کے پھلنے پھولنے پر کفار جلتے ہیں۔ اس تناظر میں آفتاب مضطر کے لکھے ہوئے مناقب کی جھلک دیکھتے چلیے:

جو صحابہؓ کا ہو گیا ضاحِک
ڈوبا سمجھو غضب کے دریا میں
اور مثلّث کا جو ہُوا ضحّاک
سمجھو! وہ تین میں نہ تیرہ میں

یہ تأثر تو قرآنِ کریم کی محولہ بالا آیات کی روشنی میں آفتاب مضطر کی شاعری میں قائم ہوا تھا۔ بعد ازاں انھوں نے چاروں خلفائے راشدین اور حضرات حسنین کریمین رضوان اللہ علیہم کی شان میں بھی ہائیکو کہے ہیں:

مونس، دوست، رفیق
یارِ غار بھی کہلائے
ہجرت میں صدیقؓ

کون ایسا مفروق
باطل وحق کی ہیں میزان
صرف عمر فاروقؓ

ایسا کون سخی!
فیاض و سرچشمۂ فیض
اِک عثمان غنیؓ

دیکھ درِ خیبر
کتنی کاری ہوتی ہے
ضربِ علی حیدرؓ

کب تھے شانوں پر!
دو عالم کے دوش پہ تھے
شبیر شبرؓ

"القاء" میں اور بھی مناقب کے نمونے ہیں لیکن میں صرف ان ہی چند پر اکتفا کرتا ہوں۔

موضوعاتی اصنافِ سخن میں یہ فضیلت صرف حمد و نعت و منقبت کو حاصل ہے کہ ان اصناف کا متن (Text)، شاعری کی ہر صنفی ہیئت (Form) میں سما جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آفتاب مضطر کی قادرالکلامی کا جوہر مزید نکھر کے سامنے آتا ہے، کہ انھوں نے جدید و قدیم تقریباً تمام ہیئتی اصناف میں کامیاب تقدیسی شاعری کی ہے۔

میری دعا ہے کہ آفتاب مضطر کی تخلیقی دانش کا کھلایا ہوا حمد و نعت و منقبت کا یہ گلشن ہمیشہ پھولے پھلے۔ اللہ تعالیٰ انھیں حمد و نعت و منقبت کے متون کا تخلیقی چمن سجانے کی توفیقات سے ہمیشہ نوازتا رہے..... آمین بجاہِ سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم!

☆☆☆

مولانا ملک الظفر سہسرامی، بھارت

سیرتِ سرورِ دو جہاں : ایک مطالعہ

ABSTRACT: A poetic narration of sacred character of Holy Prophet Muhammad(S.A.W) has been done by Sayyid Aulad-e-Rasool Qudsi in free verse. Evaluation of poetic worth and textual accuracy has been carried out to reflect critical point of view in this article. This seems to be first attempt of a poet in Urdu world to narrate godly character of Muhammad(S.A.W) in the form of free verse. This lengthy creative work is no doubt a successful attempt to elaborate biographical events of Holy life of Prophet Muhammad (S.A.W).

سیرتِ سرورِ دو جہاں ﷺ مومن کامل کے لیے راہِ حیات میں منارۂ ہدایت اور نشانِ منزل ہے۔ اسے نظر میں رکھے بغیر دین و ایمان کا قبلہ درست نہیں کیا جا سکتا۔ یہی تو دین کی اصل اساس اور بنیاد ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ بھی اپنے محبوب کی زبانِ وحی ترجمان سے یہی فرما رہا ہے :

قل ان کنتم تحبون اللّٰہ فاتبعونی یحببکم اللّٰہ۔

قرآنِ مقدس کی اس روشن اور غیر مبہم ہدایت کی روشنی میں سیرتِ سرورِ دو جہاں ﷺ کی تجلیات میں سجودِ نیاز لٹائے جائیں تو وہ مقبول بارگاہِ الٰہی ہیں۔ اس تناظر میں ایک مومن کے لیے سیرتِ سرورِ دو جہاں ﷺ کے ایک ایک گوشے پر گہری نظر رکھنا کس قدر اہم و ضروری ہے اس کا اندازہ ہر صاحب بصیرت کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ داعیہ اور پکار ہے جس پر لبیک وسعدیک کہتے ہوئے سیرت النبی ﷺ کو نظم وضبط کے ساتھ احاطۂ تحریر میں لانے کی ہر دور میں کوشش وکاوش کی گئی۔ اردو زبان میں بھی سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے ہمیں کسی طرح کی مایوسی کا احساس نہیں ہوتا۔ اہلِ علم اور صاحب بصیرت افراد نے اس زبان میں بھی بہت سلیقے مندی سے پیش کر کے اردو زبان داں حضرات کے لیے سیرت النبی ﷺ کے درخشاں و تابناک پہلوؤں سے اکتسابِ نور کرنے کی راہ ہموار کر دی تاکہ مسلمان اس کی روشنی میں اپنا قبلۂ حیات درست کرتے رہیں۔

نثر کے ساتھ نظم میں بھی سیرت نگاری کی روایت اردو زبان میں قدیم ہے۔ چند شعرائے کرام نے مکمل سیرت النبی ﷺ پیرایۂ نظم میں بیان کرنے کی سعادتیں حاصل کی ہیں لیکن تمام شعراء نے اس کے

لیے پابند نظم میں مثنوی کا فورم اختیار کیا ہے۔ سیرتِ سرورِ دو جہاں ﷺ اس روایت کے برخلاف ہمیں آزاد نظم میں نظر آتی ہے۔ اس طرح سید اولادِ رسول قدسی مملکتِ اردو زبان کے وہ پہلے خوش بخت شاعر ہیں جن کے سر آزاد نظم میں سیرت نگاری کا سہرا بندھتا ہے۔

سیرت نگاری کا تعلق ہماری عقیدت سے بھی ہے اور عقائد و نظریات سے بھی۔ چونکہ سرکارِ دو عالم ﷺ سے تعلق خاطر، ان کی ذات سے والہانہ وابستگی و شیفتگی اگر دین و ایمان کی اساس و بنیاد ہے تو وہیں آپ کی سیرتِ طیبہ کے تابناک و منور صفحات سے عقائد و نظریات کی پیچیدہ گتھیاں سلجھتی ہیں۔ دین کی درست تفہیم و تشریح کے لیے سیرت النبی ﷺ پر گہری نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔ اس سے عقیدت میں بھی بالیدگی پیدا ہوگی اور عقائد و نظریات کی اصلاح کی راہ بھی ہموار ہوگی۔ تیرہویں صدی میں دین کی نئی تعبیر و تفہیم کے لیے جو طبقہ سامنے آیا اس نے کلیسائی ذہنیت کے تحت ایک ایسا فتنہ جنم دیا جس نے ایک طرف جمہور سلف صالحین کے مسلم عقائد و نظریات پر بہت چابکدستی سے شب خون مارے تو وہیں ہماری عقیدت کے خوبصورت تاج محل کو بھی سنگسار کرنے کی سعی نامشکور کی۔ سید اولادِ رسول قدسی کا تعلق شعر و سخن کے اس طبقے سے ہے۔ جو کلیسائی فکر کی ہمیشہ سے نفی کرتا رہا ہے اسی کے ساتھ وہ ایک قدیم الخیال روایت پسند مذہبی اسکالر بھی ہیں جو چودہ سو سال سے زائد چلے آرہے قدیم عقائد و نظریات پر قائم رہنے کو ہی نجات و فلاح کا مدار تصور کرتے ہیں۔ گویا وہ قدیم و جدید کا خوبصورت سنگم ہیں۔ وہ تنگ خیال، کوتاہ ذہن اور فرسودہ مزاج بھی نہیں کہ نئے لب و لہجے، نئی تراکیب، نئی بندش اور جدید شعر و سخن کو خوش آمدید کہنے میں تامل کو راہ دیں اور اس قدر روشن خیال، وسیع النظر بھی نہیں کہ قدیم مذہبی روایات، چودہ سو سالہ متوارث عقائد و نظریات سے دامن جھاڑ کر روشن خیالوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرالیں۔

سیرتِ سرورِ دو جہاں ﷺ کے لیے انہوں نے آزاد شاعری کا فورم اختیار کر کے اسی ذہنیت کا اظہار کیا ہے۔ اردو زبان و ادب میں یہ راہ بظاہر جتنی آسان نظر آتی ہے، اتنی آسان نہیں بلکہ اس میں مشکلات بھی ہیں۔ پھر ایک مخصوص موضوع پر تسلسل و روانی کے ساتھ ایک خاص فورم میں فن کا اظہار بہت جانکاہ اور دقت طلب مرحلہ ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ قدسی نے یہ مشکل راہ بہت کامیابی کے ساتھ طے کی ہے اور وہ اپنی منزل سے بغلگیر ہوتے نظر آتے ہیں۔

قدسی کا تعلق اس کاروانِ عشق و محبت سے ہے، جس نے اپنی جان، دل، ہوش و خرد بلکہ تمام سرمایۂ حیات محبوبِ کونین ﷺ کے بابرکت قدموں میں نچھاور کر دیا ہے۔ وہ اسے اپنے لیے ذریعۂ فلاح و نجات تصور کرتے ہیں۔ شعر و ادب کی خوشگوار فضاؤں سے گزرتے ہوئے قدسی نے بہاریہ شاعری کے مقابلے میں نعتِ مقدس کے ذخائر زیادہ جمع کرنے کی سعادتیں حاصل کی ہیں۔ اور ان کی شناخت و

پہچان بھی اسی سے بن رہی ہے۔

نظم نگاری میں بھی یقیناً قدسی کو قدرت نے وہ ملکہ عطا فرمایا ہے کہ کسی بھی مقام پر تشنگی کا احساس نہیں ستاتا۔ قدسی سیرتِ طیبہ پر گہری نظر رکھنے والے عالم دین ہیں اس لیے کسی گوشے سے ان کی کاوشِ فکر پر انگلی رکھنے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔

اُردو زبان میں پابند شاعری کا فورم بہت قدیم ہے بلکہ اسی فورم میں شاعری کا پہلا زینہ طے ہوا لیکن جب ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوا تو بہت ساری پابندیوں سے ہم نے خود کو آزاد کرنے کی کاوشیں شروع کر دیں اور پھر نئے تجربے، نئی دریافت کا بھی معاملہ تھا۔ ساٹھ کی دہائی میں آزاد شاعری نے اردو زبان و ادب میں اپنے بال و پر پھیلانا شروع کیے۔ اور جدید ذہن و فکر کے حامل اربابِ شعر و سخن نے اس میں نت نئے تجربوں کے ذریعے اس صنف سخن کی آبیاری اور اس کی نشو و نما شروع کر دی۔ شروع شروع میں تو غیر مانوس ہونے کے سبب اسے زبان و ادب میں اپنا مستقل مقام بنانے میں بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قدیم الخیال اور روایت پسند اربابِ شعر و سخن نے اس پر ناک بھنوں چڑھائی اور اپنی بیزاری کا اظہار کیا لیکن رفتہ رفتہ جب ان حضرات نے اس صنف سخن میں شعری تجربے کیے جن کے نام کے سکّے دنیائے شعر و ادب میں رائج الوقت تھے تو پھر اس کی غیر مانوسیت کا شکوہ بھی آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور عوام و خواص میں اسے درجۂ قبول حاصل ہونے لگا اور اب تو اسے ایک مستقل مقبول صنف سخن کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ جب کہ نعتیہ شاعری کو آج تک اردو زبان و ادب میں مستقل صنف سخن کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ یہ مقام بھی اربابِ علم و دانش کے لیے ایک لمحۂ فکریہ سے کم نہیں۔ ممکن ہے کہ میری آواز بے وزن کرنے کے لیے یہ جواب دے دیا جائے کہ نعتیہ شاعری ایک موضوعاتی شاعری ہے اس لیے اسے صنف سخن کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ تو میں عرض کروں کہ اردو زبان و ادب میں مرثیہ کو ایک مستقل صنف سخن کا درجہ حاصل ہے کیا وہ موضوعاتی شاعری نہیں ہے؟

قدسی نے اردو زبان کی اس صنف سخن کا استعمال سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرت نگاری کے لیے کیا۔ اس راہ سے گزرتے ہوئے کہیں ان کا فن مجروح ہوتا نظر نہیں آتا نہ ہی واقعاتی تسلسل میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ وہ ایک ماہر فنکار اور کہنہ مشق شاعر و ادیب کی حیثیت سے منظوم سیرت نگاری کا یہ خوشگوار سفر بہت کامیابی و کامرانی کے ساتھ طے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سیرتِ سرورِ دو جہاں ﷺ کے مطالعے کے دوران ایک ناقد و ادیب کو قدسی کی بے پناہ علمی و فکری صلاحیتوں کے اقرار و اعتراف پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ یقیناً قدسی اپنی اختراع پسند طبیعت کے حامل فرد کی حیثیت سے اپنی ایک علیحدہ شناخت بناتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کے لیے میں کہوں گا

کیا حسن ہے، جمال ہے، کیا رنگ و روپ ہے
وہ بھیڑ میں بھی جائے، تو تنہا دکھائی دے

قدسی نے گھسی پٹی راہ چھوڑ کر اپنے لیے ایک نئی راہ تلاش کی ہے۔ آزاد شاعری کے فورم میں سیرت نگاری کی کوئی روایت نہیں تھی۔ یقیناً وہ اس کے لیے لائق صد تبریک ہیں۔ میں نے قدسی کی نعتیہ شاعری پر نقد و تبصرہ تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا: ''قدسی کے نعتیہ اشعار میں جہاں فکر و خیال کی بوقلمونیاں ہیں وہیں کوثر و تسنیم سے دھلی دھلائی زبان نے ان کے کلام کو لفظ و معنیٰ کی حرمت کا پاسبان بنا دیا ہے۔ قدسی نے اردو زبان و ادب کے محاوروں کا اس قدر خوبصورت اور برجستہ استعمال کیا ہے کہ ان کی قادر الکلامی اور پختہ کاری کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ اردو کی محاوراتی زبان میں ''نیند حرام کرنا'' شب بیداری کا استعارہ ہے۔ اردو اشعار میں ہمیں اس محاورے کا استعمال ملتا ہے

حرام نیند کی اقرار وصل جاناں نے
الٰہی کوئی کسی کا امیدوار نہ ہو (نوازش)

شب بیداری کی بہت ساری نوعیتیں ہیں۔ انہی میں ان بیدار بختوں کی بھی شب بیداری ہے جو یادِ الٰہی میں خود کو مستغرق رکھ کر رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر میں جاگ کر نیند حرام کرنے کا محاورہ قدسی کے صاف ستھرے ذوقِ ایمانی کو گوارہ نہ ہوا اور انہوں نے اپنی اختراع پسند طبیعت سے اس سبز روش پر محاورے کا ایک نیا پھول کھلا دیا۔ ممکن ہے علمائے ادب کی جانب سے اس انحراف کے سبب ان کے خلاف ادبی فتویٰ صادر کیا جائے لیکن قدسی کو اس کی قطعی پرواہ نہیں۔ انہوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اس تعلق سے خواہ کوئی بھی الزام عائد ہو جائے گوارہ ہے لیکن جادۂ شریعت سے سرِ مو انحراف قبول نہیں۔ وہ کہتے ہیں

تجھ میں حلول ہوگا کمالِ عبودیت
راتوں کی نیند ذکرِ خدا میں حلال کر

سید اولادِ رسول قدسی نعتیہ شاعری کے محراب و منبر کی عظمت و حرمت کے پاسدار واقع ہوئے ہیں، انہوں نے اپنے لب و لہجے سے نعتیہ شاعری کو نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ نئے استعارات، منفرد تشبیہات، خوبصورت لفظیات اور جدت تراکیب نے قدسی کے نعتیہ دیوان کو شعر و سخن کا شاہکار بنا دیا ہے۔''

سید اولادِ رسول قدسی اپنی جدت طراز طبیعت اور اختراع پسند مزاج کے سبب اردو شاعری میں اپنی ایک انفرادی شناخت قائم رکھنے میں کامران نظر آتے ہیں۔

سیرتِ سرورِ دو جہاں ﷺ میں عقیدت کی گل کاریاں بھی ہیں اور عقائد و نظریات کی ترجمانی بھی۔

محبت و شیفتگی کا پاکیزہ تسلسل بھی ہے اور نظریات کا واضح اور غیر مبہم اشاریہ بھی۔ یقیناً اس باب میں قدسی کی اس کاوشِ فکری کی داد نہ دینا بڑی ناسپاسی ہوگی۔ انہوں نے سیرتِ سرورِ دو جہاں ﷺ میں عقیدہ وعقیدت کو بے پناہ حسنِ سلیقہ کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ بناتے ہوئے سرکارِ دو عالم ﷺ کی سیرت نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ عقیدہ وعقیدت کا اظہار کرتے ہوئے ایک مقام پر وہ کہتے ہیں

ہم کو اس واقعہ سے ملا درسِ عبرت
یہ لکھا ہے حضرت محدث (دہلوی) نے تفصیل سے
بولہب کا ہے یہ واقعہ
بزمِ میلادِ سرکار کے واسطے
ہیں وہ حضرات خوش بخت بے حد
جو محفل سجاتے ہیں آقا کی میلاد کی
خوب خوشیاں مناتے ہیں اور مال بھی
خرچ کرتے ہیں عشقِ نبی میں
یقیناً
انہیں رب کی جانب سے بہتر ملے گی جزا

سیرتِ سرورِ دو جہاں ﷺ بیان کرتے ہوئے جب قدسی کا قلم سرکارِ دو عالم، محبوبِ ربِ کونین ﷺ کی ولادت سعادت آثار کے ذکرِ جمیل سے تر و تازہ ہو رہا ہوتا ہے تو وہیں مولد النبی ﷺ (سرکارِ دو عالم ﷺ کا مقامِ ولادت) کے ساتھ سعودی حکومت کے اس غیر منصفانہ سلوک پر تنقید کرتے ہوئے اپنے قلم کو روک نہیں پاتے اور تقریباً ہر حساس اور زندہ ضمیر مومن اس رویے پر اپنے جذبات قابو کرنے میں ناکام نظر آتا ہے۔

قدسی کے قلم کی دھار بہت تیز ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے۔

وہ مقدس مکاں
مصطفیٰ جانِ رحمت کی جس جا ولادت ہوئی
نام جس کا ہے تاریخ میں مولدِ مصطفیٰ
بہتا ہے جس جگہ
فضل و رحمت کا دھارا
جہاں پہلے حرمین والے

عقیدت سے کرتے تھے میلاد کی محفلیں
پیش کرتے تھے آقا کے در پر
درود اور سلاموں کا تحفہ
مگر حیف صد حیف نجدی کی تخریب کاری
مقدس مکاں کو کیا منہدم ظالموں نے
یہ ویران یوں ہی رہا سالہا سال تک
بدل ڈالا نجدی نے اب مکتبہ میں
زیارت کی اس کی
نہیں ہے اجازت کسی کو
خدا ایسے ظالم کو غارت کرے
اور ان کی حکومت کا ہو غرق بیڑا
خدا بھیج دے پھر
صحیح العقیدہ مسلمان کی اک جماعت
بنے پاسباں و نگہباں جو حرمین کے تا ابد

مکہ شریف اور مدینہ منورہ یہ دو شہر لاریب مسلمانوں کی عقیدت کے دارالسلطنت ہیں اور ان کی عظمت و سربلندی کے پرچم آج بھی مسلمانانِ عالم کے قلوب پر نہایت پاکیزگی کے ساتھ لہرا رہے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی خطے میں آباد مسلمان دلوں کے ایوان و طاق سجانے کے لیے ان دو مقاماتِ مقدس سے براہِ راست اکتسابِ نور کرنے کی آرزو و تمنا رکھتا ہے۔ گرچہ وہ ان مقدس مقامات سے بظاہر دور رہتا ہے لیکن دل سے انہیں وہ قریب سے قریب تر محسوس کرتا ہے۔ ہر شہر کی اپنی الگ خصوصیت ہوتی ہے۔ لیکن یہ دو شہر مسلمانانِ عالم کے لیے بالکل انفرادی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان مقدس شہروں کے بعض مقامات پر قیام، وہاں چکر لگانا اور دوڑنا اور وہاں چند ارکان کی ادائیگی کو حج جیسی اہم عبادت کے ارکان میں شامل کر کے اسلام نے ان کی قرار واقعی حیثیت پر مہر تصدیق ثبت فرما دی۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ان مقدس مقامات کی عظمت و حرمت بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں : ''مَنْ صَبَرَ عَلٰی حَرِّ مَکَّۃَ سَاعَۃً مِنْ نَّھَارٍ تَبَاعَدَتْ عَنْہُ جَھَنَّمُ مَسِیْرَۃَ مِائَتَیْ عَامٍ۔'' ترجمہ : جس نے مکہ شریف کی گرمی پر ایک لمحہ صبر کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے دو سو سال کی مسافت پر جہنم کو دور فرما دے گا۔ (روح البیان، جلد ۱ : ص ۶۸ :)

ایک مقام پر صاحب تفسیر روح البیان نقل فرماتے ہیں :

"وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا مِنَ النَّارِ"۔

ترجمہ: جو اس میں داخل ہوا وہ جہنم کی آگ سے محفوظ ہوگیا۔ (روح البیان، ج ۱، ص ۶۸)

سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا: "مَنْ مَاتَ فِیْ اَحَدِ الْحَرَمَیْنِ بُعِثَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اٰمِنًا" ترجمہ: جو شخص بھی حرمین شریفین یعنی مکۃ المکرمہ اور مدینۃ المنورہ میں مرے گا قیامت میں محفوظ و مامون اٹھے گا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے شہرِ رسول ﷺ کی قسم یاد فرما کر اس کی عظمت و توقیر کی ضمانت پیش فرما دی: "لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ" ترجمہ: مجھے اس شہر کی قسم کہ اے محبوب اس شہر میں تم تشریف فرما ہو۔

آثار و تبرکات نے ہی مکہ شریف اور مدینہ امینہ کو دنیا میں تمام مقامات سے بلند فرما دیا۔ آثار تو شعائر اللہ ہیں اور شعائر اللہ کی تعظیم و توقیر مومن کامل کے تقوے و پرہیز گاری کا حصہ ہیں۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: "وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ" ترجمہ: اور جو اللہ کے نشانوں کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کی پرہیز گاری سے ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے صفا و مروہ کی عظمت شان کا اظہار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: "اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ" ترجمہ: بے شک صفا و مروہ اللہ کے نشانوں سے ہے۔

مقامِ ابراہیم کی عزت و عظمت بیان فرماتے ہوئے قرآنِ مقدس ارشاد فرماتا ہے: "وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی" ترجمہ: اور ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو تم نماز کا مقام بناؤ۔

یہ صفا مروہ کیا ہیں؟ مقامِ ابراہیم کیا ہے؟ آثار و تبرکات کی نہ صرف صیانت و حفاظت فرمائی جا رہی ہے بلکہ ان کی تعظیم و توقیر کو دلوں کی پرہیز گاری بتایا جا رہا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے جب اپنے محبوب ﷺ کو مکۃ المکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کا حکم فرمایا تو سرکارِ دو عالم ﷺ اپنے رفیقِ غار حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مدینہ امینہ کی طرف ہجرت فرما ہو جاتے ہیں گو کہ مکہ مکرمہ میں تمام آثار و تبرکات جوں کے توں رہے۔ صفا، مروہ ہے، مقامِ ابراہیم ہے، چاہِ زمزم ہے، خانہ کعبہ ہے، میزابِ رحمت ہے، حطیم ہے، حجرِ اسود ہے لیکن جب محبوبِ ربِ کائنات ﷺ مکۃ المکرمۃ سے مدینہ منورہ قیام فرما ہو گئے تو اب مکہ شریف میں ٹھہرنا جرم قرار پایا۔ چونکہ ساری روحانی بہاریں انھی کے قدومِ میمنت لزوم سے ہیں۔ اب اگر وہ مدینہ منورہ میں قیام فرمائیں تو ساری رونقیں وہیں تلاش کی جائیں۔ سیدی اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہان کی، جان ہے تو جہان ہے

ڈاکٹر اقبال نے بھی اسی انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مئے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

دین و دنیا کی ساری رونقیں، تمام بہاریں محبوب رب کائنات ﷺ کے صدقے ہیں وہی تو روح کائنات اور جانِ جہان ہیں۔ علمائے کرام بیان فرماتے ہیں کہ زمین کا وہ حصہ جو سرورِ کونین ﷺ کے جسمِ منور سے مس ہونے کا شرف و افتخار حاصل کر رہا ہے وہ دنیا کے تمام مقامات سے افضل و اعلیٰ ہے۔ یہاں تک کہ اس حصے کو کعبہ اور عرشِ اعظم پر بھی فضیلت و برتری حاصل ہے۔ اسی لیے تو امام عشق و محبت سیدی امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ فرماتے ہیں۔

طیبہ نہ سہی افضل مکہ ہی بڑا زاہد
ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی ہے؟

ان مقدس و بابرکت مقامات سے ہمارے عقیدے و عقیدت کی دنیا میں ہر چہار جانب روشنی و تابناکی ہے۔ ان کے ذروں کے روبرو کہکشاں کا جمال ماند، چاند کی رعنائی بے وقعت، آثار و تبرکات کا ایک مکمل جہان آباد تھا جن سے مسلمانوں کی عقیدتوں کا بلاواسطہ تعلق تھا لیکن سعودی حکومت نے شرک و بدعات کی دعویداری کے ساتھ ان آثار و تبرکات کو تلاش کر کر کے صفحۂ ہستی سے مٹانے کا ناقابل معافی جرم کیا۔ شورش کاشمیری مدیر ''ہفت روزہ چٹان'' لاہور پاکستان جو عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے ہم سے بہت دور اور ان سے بہت قریب نظر آتے ہیں بلکہ شانہ بشانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن آثار و تبرکات کے تعلق سے سعودی حکومت کے ظالمانہ رویے کے خلاف ان کا قلم سراپا احتجاج بن کر سامنے آتا ہے۔

''میں مولد النبی ﷺ اور بیت نبی ﷺ کے پاس کھڑا یہ سوچتا رہا کہ انسان کیا ہے؟ حضور ﷺ کی مکی زندگی یاد آ گئی، ان مکہ والوں نے حضور ﷺ سے کیا سلوک کیا تھا کہ ان کے مکانوں سے کچھ اچھا سلوک کرتے۔

عشق یہاں کچھ اداس ہو جاتا ہے کہ اہل مکہ نے محمل اجاڑ دیے اور محل اٹھا رہے ہیں۔ پورے مکہ میں عہد نبوی ﷺ کی دو چیزیں رہ گئی ہیں کھجور اور زمزم اور باقی ننانوے فی صد یورپ کا مال ہے''۔

جبل نور کے قریب پہنچ کر شورش کا قلم اور زیادہ بے قابو ہو جاتا ہے۔

''حکومت کے لیے مشکل نہیں کہ ''غارِ حرا'' تک چڑھائی آسان کر دے، سوال ایک شارع کا ہے۔ اتنے حصے کو ایک پختہ روش دے کر سہل کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی دو چار چیزیں محفوظ کر لی جائیں تو عیب کیا ہے؟ اس سے قرآن و سنت کی خلاف ورزی کہاں ہوتی ہے؟ اور کہاں منشائے ایزدی کی نفی

ہوتی ہے؟ آخر حکومت خود کو بھی تو محفوظ کر رہی ہے۔ اگر شریعت کا اتنا ہی خیال ہے تو شریعت یہ نہیں کہ جبل نور یتیم پڑا رہے اور اس کی نگہداری سے قطع نظر کیا جائے۔ شریعت کے احکام معاشرے اور ریاست کے لیے ہیں آثار و مظاہر کے لیے نہیں کہ ان پر سختی برتی جائے جہاں اجتہاد لازم ہے وہاں اجتہاد کا نام بدعت بلکہ بغاوت رکھ دیا ہے۔ خلفائے راشدین کیا اپنے ساتھ حفاظتی دستے رکھتے تھے؟ وہ طیاروں پر اڑتے پھرتے تھے؟ کیا انہوں نے گرما اور سرما کے دارالحکومت بنائے تھے؟ کیا ان کے محل اور قصر تھے؟ کیا ان کے لیے سیارے تھے؟ وہ شاہانہ کروفر سے حرم میں داخل ہوتے تھے؟ انہیں جلالۃ الملک کہا جاتا تھا؟ وہ فلک بوس عمارتیں کھڑی کرتے تھے؟ وہ سونے کے زیوروں اور ریشم کے کپڑوں میں تلتے تھے؟ وہ ٹیلی ویژن لگاتے تھے؟ کہ روئے نکو معالجۂ عمر کوتاہ است! وہ ریڈیو کی آواز خوش پر مرتے تھے کہ انہیں فردوسِ گوش کی ضرورت تھی؟ یہیں کہیں ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مکان تھا کیا وہ دو منزلہ تھا؟ یہیں عمر رضی اللہ عنہ رہتے تھے۔ کیا وہ لشکر و سپاہ لے کر نکلتے تھے؟ اور وہ سامنے جہاں اب سعودی حکومت کا شفاخانہ ہے، عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا مسکن تھا ان کے دروازے پر حفاظتی دستے تھے؟ علی رضی اللہ عنہ انہی بازاروں میں موٹا جھوٹا پہن کر رہتے تھے۔ بیت المال ان کا ذاتی خزانہ نہیں تھا، ان کی خوابگاہیں کھجور کے درختوں کی چھاؤں تلے تھیں۔ قیصر کا سفیر انہیں دیکھ کر دنگ رہ گیا اور لوگوں کے اس جواب سے متعجب و متحیر تھا کہ ہمارے ہاں بادشاہ نہیں ہوتے۔ ہم اپنے کاموں کی انجام دہی کے لیے ایک امیر منتخب کر لیتے ہیں۔ جب نئے دور کی سبھی چیزیں قبول کر لی ہیں تو ایک تاریخ اور اس کے خزینے ہی ایسے ہیں جنہیں محفوظ رکھنا بدعت ہے یا خلافِ سنّت ہے، قرآن اس کی تائید نہیں کرتا۔ یہ چیزیں ہر حالت میں محفوظ رہنی چاہئیں، یہ سب اللہ کے آخری نبی ﷺ کی نشانیاں ہیں تاریخ کے جواہر ریزے اور عقیدے کے شہہ پارے ہیں انہی سے تاریخ کو تحقیق اور زائروں کو عشق کی راہیں ملتی ہیں۔"

"میں نے سہیل سے کہا آخر اس بے توجہی اور آثار فراموشی کی وجہ کیا ہے؟ جس جگہ کو قرآن، سیرت اور حدیث و تاریخ نے محفوظ کر لیا ہے وہ بے اعتنائی کی مستحق ہے؟ اگر یہ چیزیں مکہ سے نکال دی جائیں تو مکہ کے پاس کیا رہ جاتا ہے؟ بیت اللہ نے مکہ کو معراج بخشی لیکن اس معراج کو جس صاحب معراج کی معرفت ہم نے پہچانا اور مکہ ہمیشہ کے لیے ام القریٰ ہو گیا۔ اس کے آثار و نقوش نہ ہوتے تو مکہ میں کرۂ ارضی کے انسان کے لیے کیا کشش تھی؟ یہ چیزیں تو بیت اللہ کے حاشیے ہیں، عربوں کو احساس ہی نہیں کہ ان کے شرف و امتیاز کو انہی چیزوں نے زندہ کر رکھا ہے۔ یہ سب جس آقا کے دم قدم سے ہے وہی آقا عربوں کو ابد الآباد تک اعزاز دے گیا ہے۔ محمد عربی ﷺ نہ ہوتے تو عربوں کی تاریخ اس کے سوا کیا تھی کہ اور قوموں کی طرح وہ بھی ایک قوم تھے۔ حج اور عمرہ نے طلوعِ قیامت تک عربوں کی معیشت قائم کر دی

ہے۔ان کے بازاروں کی رونق فخرِ موجودات ﷺ کی ذات ہے کہ لوگ ان کے عشق میں ان کی دعوت پر کھنچے آتے ہیں اور مہمان ہو کر میز بانی کرتے ہیں۔

میں نے سہیل کو یاد دلایا کہ آلِ سعود کی حکومت یورپ کی ہر چیز سے متمتع ہو رہی ہے۔حتیٰ کہ طبیعت کو جوان رکھنے کا ہر سامان یہاں موجود ہے۔لیکن جس علم نے یورپ کی بالادستی قائم کی اور اس نے جوڑ بٹور کر اپنی تاریخ گڑھ لی وہ علم عربوں کے ہاں حقیقی مآخذ سمیت موجود ہے اور عرب ہیں کہ اپنی تاریخ اپنے ہاتھوں مٹا رہے ہیں۔یورپ کا مزاج یہ ہے کہ وہاں علم کھنڈر تلاش کر رہا ہے اور جستجو ویرانے کھوج رہی ہے۔لیکن ہم تاریخ کی اس دولت سے جو سرورِ کونین ﷺ کی سوانح وافکار پر روشنی ڈالتی ہے اور عظیم المرتبت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات وکوائف سے آگاہ کرتی ہے ایک ایسا برتاؤ کر رہے ہیں کہ اس پر اغماض واستبداد دونوں کا اطلاق ہوتا ہے۔یہ تاریخ وعشق دونوں سے زیادتی ہے۔

آخر خانۂ کعبہ اور مسجد نبوی ﷺ بھی تو آثار ہیں؟ صفا ومروہ بھی تو شعائر اللہ ہیں؟ مزدلفہ کیوں جاتے ہیں؟ منیٰ کیوں پہنچتے ہیں؟ عرفات کیا ہے؟ جمرۃ العقبیٰ، جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ الاولیٰ کیا ہیں؟ آثار ہیں جو رسمیں وہاں ادا کی جاتی ہیں وہ مظاہر ہیں۔انہیں عقیدے کی بنا پر محفوظ کیا گیا تو یہ عقیدہ جس کی معرفت ہم تک پہنچا اور جس نے یہ ملت تیار کی بہ قول اقبال دین اللہ کی طرف سے آتا ہے اور ملت پیغمبر بناتے ہیں۔اس عالی شان پیغمبر کا مولد ومسکن، اس کی دعوت کے مراکز ومنازل اور نزولِ وحی کے محور ومہبط کیوں نہ محفوظ کیے جائیں؟ اس کے سانچے میں ڈھلے ہوئے انسانوں کی یادگاریں کیوں باقی نہ رہیں؟ یہ سب یادگاریں کیوں نہ باقی رہیں؟ یہ سب یادگاریں ان انسانوں کی ہیں جو تاریخ کے دھارے کو ابدالاباد تک موڑ کے زندۂ جاوید ہو گئے۔جن کا نام اور کام صبحِ قیامت تک زندہ رہے گا۔جن کے لیے تمام عزتیں ہیں جو حضور ﷺ کے اہل بیت، وجدان جنہیں عشق کی آنکھوں سے اب بھی چلتے پھرتے دیکھتا ہے۔ان کے آثار محفوظ نہ رہیں تو پھر کون سی چیز محفوظ کی جائے گی۔سعودی حکومت نے شرک کو منہدم کیا لیکن ساتھ ہی عشق کو بھی مسمار کر دیا ہے۔وہ شرک وعشق میں امتیاز نہیں کر سکی حالانکہ یہ چیزیں عقیدہ نہیں تاریخ ہیں جس قوم نے سب سے پہلے دنیا کو تاریخ دی اور جس کے مآخذ کلام الٰہی نے محفوظ کیے ہیں۔وہ آج اپنی تاریخ مٹانے پر تلی ہو یہ ایک المیہ ہے۔“

درد وکرب کی یہی آواز اہل سنت وجماعت کے معروف قلمکار اور خطیب حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی رحمۃ اللہ علیہ کی نوکِ قلم پر آتی ہے تو احتجاجی تحریک بنتی نظر آتی ہے۔

”زیارتِ بیت اللہ، طوافِ کعبہ اور دیگر ارکان وزیارت سے شادکام ہونے والے خوش نصیب زائر کی نگاہ چمن زارِ عقیدت کو تلاش کرتی ہے، مشامِ روح خوشبوئے وفا کی جستجو کرتی ہے، دل کی دنیا متاعِ

گراں مایہ کے دیدار کی تمنا کرتی ہے اور جذبۂ عشق یوسفِ گم گشتہ کا متلاشی ہوتا ہے۔ نگاہوں کی عقیدتیں اپنے ان انمول سرمایوں کو کشادہ سڑکوں پر، بارونق بازاروں میں، حسین گلیوں میں، سر بفلک عمارتوں میں اور ایک ایک مقام پر ڈھونڈتی ہیں۔ لیکن حیف صد حیف! کہ تمام تر تلاش، ساری جستجو اور غریب الوطن عقیدتوں کی ہزار آبلہ پائی کے باوجود وہ متاعِ گم شدہ، وہ سرمایۂ عقیدت، وہ مرکزِ احترام جس کا براہِ راست تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے تھا نہیں ملتا۔ جسمانی آرام و آسائش کا اہتمام کرنے والی حکومت سے عقیدتیں ہر سال سوال کرتی ہیں اور قیامت کی صبح تک سوال کرتی رہیں گی کہ آخر وہ متاعِ عقیدت کہاں گئی، وہ سرمایۂ محبت کیا ہوا؟ کیا ہوا ان نایاب تبرکات کا؟ مولد النبی ﷺ کہاں گیا؟ مولدِ فاطمہ کہاں گیا؟ دارِ ارقم کہاں گیا؟ باب ام ہانی کہاں گیا؟ قبہ خدیجۃ الکبریٰ کہاں گیا؟ تبرکات کی دنیا کیسے ختم ہوگئی؟ کہاں غائب ہوگئی؟ اور کیسے مٹادی گئی؟ مکہ کے بازارو! تم بتاؤ، بلند عمارتو! تم کچھ کہو، حرم کی دیوارو! تم ہی کچھ نشان دہی کرو، ذمہ دار حکمرانو تم ہی کچھ بولو۔ عشق و ایمان کی امانت میں کس نے خیانت کی ہے؟ کس نے کی ہے یہ خیانت؟ لیکن افسوس! کہ عقیدتوں کی پکار اور محبتوں کی دریافت پر خاموش مایوسیوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

نیاز مند آنکھیں حرمِ پاک کے ایک ایک دروازے کو دیکھتی ہیں، اس پر لکھی عبارتوں کو بار بار پڑھتی ہیں لیکن کسی دروازے پر باب ام ہانی لکھا نہیں ملتا۔ پیہم تلاش و جستجو اور دریافت کے بعد پتا چلتا ہے کہ وہ دروازہ جس پر باب عبد العزیز لکھا ہے، وہی دراصل کبھی باب ام ہانی تھا۔ اگر انصاف دنیا سے ختم نہیں ہوگیا اور ضمیر مردہ نہیں ہوا تو میں پوچھنا چاہتا ہوں اور عوامی عدالت میں استغاثہ پیش کر کے فیصلۂ قلب لینا چاہتا ہوں۔ ایک زائر کا قدم جب حرم کی سرزمین پر پڑتا ہے تو اس کی نگاہِ شوق عشق و ایمان کے مرکزوں کو تلاش کرتی ہے، اسلاف کی مقدس یادگاروں کو ڈھونڈتی ہے یا کسی عبد العزیز کو؟ کاروانِ محبت ہر قدم پر اپنے مقدس محبوب کی نشانیاں تلاش کرتا ہے یا پھر ان کے چہیتوں کی یادگاروں کو۔ اور جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر فیصلہ دیجیے کہ یہ سب کچھ آبا پرستی کی بدترین بدعت کے سوا کچھ نہیں۔

آج عقیدتوں کی دنیا اربابِ اقتدار سے سوال کرتی ہیں کہ کیا مولد النبی ﷺ کی دیواریں لائق توقیر نہ تھیں؟ اس کی زمین محبتوں کی بوسہ گاہ نہ تھی؟ مولد فاطمہ کے بام و در قابل تکریم نہ تھے؟ خدا کے آخری نبی ﷺ کا عبادت خانہ اور وحی الٰہی کا مقامِ نزول باعث عزت نہ تھا؟ کیا اسلام کی اولین خاتون کا قبہ قابل تکریم نہ تھا؟ کیا ام ہانی کا نام لائق التفات نہ تھا؟ اگر تھا اور یقیناً تھا تو ان مقاماتِ مقدسہ کی بقا اور تحفظ کا معقول و مناسب انتظام کیوں نہیں کیا گیا؟ حرم کی توسیع پر کروڑوں اور اربوں خرچ کرنے والوں سے کوئی دریافت کرے کہ وہ عمارتیں کیوں منہدم ہوئیں؟ وہ نشانیاں کیوں زمیں بوس ہوئیں؟ وہ مآثر کیوں

بے نام و نشان ہوئے؟ کیا ان یادگاروں کا تحفظ ممکن نہ تھا؟ کیا ان کی خمیدہ دیواروں کو چند ریال کے سہارے کھڑا نہیں رکھا جاسکتا تھا؟ کیا چودہ سو سال پرانی دھول مٹیوں کو دبیز شیشوں سے ڈھانک کر محافظت کا حق ادا نہ کیا جاسکتا تھا؟

خدارا اربابِ حکومت اور اصحابِ دولت سے کوئی پوچھے کہ یہ نشانیاں آخر کیوں بے نام و نشان ہوئیں؟ کیوں بے نام و نشان ہوئیں یہ نشانیاں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ دولت کی فراوانی نے عقیدتوں میں افلاس پیدا کر دیا ہے۔ شاہراہوں کی کشادگی نے دلوں میں تنگی پیدا کر دی ہے؟ عمارتوں کی بلندی نے عقیدتوں میں پستی پیدا کر دی ہے؟ ائرکنڈیشنڈ مکانات کی اقامت نے ان مکان کی عظمت و تقدیس ختم کر دی ہے؟ بجلیوں کے رنگین تیز بلب نے محبتوں کی دنیا تاریک کر دی ہے؟ کاروں کی صبا رفتاری نے ایمان کے جذبات کو سست کر دیا ہے؟ اور وسعت حرم کی مہم نے صاحبِ حرم کی عظمت و محبت کو پس پشت ڈال دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو دنیا کان کھول کر سن لے کہ ان کے گنہ گار غلاموں کو پرشکوہ عمارت نہیں، ان کے قدموں سے لگا ہوا کھنڈر چاہیے۔ صاف سڑکیں نہیں، ان کے قدموں کی دھول اور خاکِ پا ۔۔۔ چاہیے۔ صفا و مروہ کا سائبان نہیں اسلام کی اولین خاتون کے مزارِ اقدس کے قبۂ پاک کا سایہ چاہیے۔ تیز بلب نہیں سیدہ فاطمہ کی چکی کا ٹکڑا چاہیے۔ کوئی عبد العزیز نہیں ام ہانی کے نام کی عظمت چاہیے۔ خدا کے لیے اپنی تمام مادی آسائش و سہولتیں لے لو ہماری روحانی یادگاریں اور ایمانی نشانیاں دے دو۔"

آثار و تبرکات کے ساتھ سعودی حکومت کے ظالمانہ اور غیر منصفانہ رویوں کے خلاف ہر زندہ ضمیر اور حساس دل مسلمان کے قلب سے درد و کرب کی یہی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ دنیا قیامت تک ان اربابِ حکومت سے مواخذہ کرتی رہے گی۔ دل ٹوٹتا ہے تو پھر درد بھی احتجاجی لہروں میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔ دونوں قلمکار حضرات کی تحریریں پڑھنے کے بعد آپ بھی اس اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ قدسی کا احتجاجی لب و لہجہ اسی رنگ و آہنگ میں ہے۔

قدسی کے زندہ ضمیر اور حساس قلب کی اس احتجاجی صدا کو ایک مبصر نے مسلکی اختلاف اور نظریاتی جنگ سے تعبیر کیا۔ لیکن میری نظر میں اس احتجاج کا تعلق ہماری عقیدت سے بھی ہے اور عقیدے سے بھی۔ ظلم و زیادتی کی اس ناپاک تحریک کے خلاف ہر دور میں زندہ ضمیر مسلمان احتجاج بن کر ابھرتا رہے گا اور ہر حساس مومن کا قلم خون کے آنسو بہائے گا اور اس مقام پر پہنچ کر ہر فکر رنج و غم کا شکار نظر آئے گی۔ اگر قدسی کے قلم نے حقائق بیانی پر خود کو مجبور پایا تو ہمیں اطمینان ہے کہ ان کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہے اور وہ زندہ ضمیر مومن کی صف میں ہیں۔ جس کی آواز لفظوں کا پیرہن پہن کر ہمارے روبرو احتجاج کی ایک زندہ، توانا اور متحرک تحریک بن کر ابھر رہی ہے۔ اس احتجاج پر شکوہ بلب حضرات سے میں یہ

عرض کروں گا۔

تم اپنے تغافل کا گلہ کیوں نہیں کرتے؟
کیوں دیتے ہو الزام مرے دیدۂ نم کو؟

سیرت نگاری کے لیے قلم اٹھانے سے پہلے قلمکار کو متاعِ علم و ہنر کا ایک جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس باب میں قدم رکھنے سے پہلے دیکھنا ہوگا کہ تاریخ و سیر پر اس کی جو نظر ہے اس میں گہرائی و گیرائی ہے کہ نہیں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا قلم عشقِ رسول علیہ التحیۃ والثناء کی روشائی سے تابناک و منور ہو تب کہیں جا کر سیرت کی تجلیات ورق در ورق روشن ہوتی نظر آئیں گی۔ الحمد للہ قدسی کے پاس یہ تمام سرمائے ہیں۔ قدسی جدید لب و لہجے کے ایک روشن خیال اور جدید آہنگ کے شاعر ہونے کے باوصف ایک قدیم الخیال روایتی مسلمان ہیں۔ وہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے ایک شہر میں رہنے کے باوجود اپنی قدیم تہذیب، روایتی ثقافت اور اخلاقی قدروں کو نہ صرف یہ کہ مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں بلکہ وہ وہاں اس تہذیبی شرافت اور قدیم ثقافت کے پُر جوش داعی و مبلغ بھی ہیں۔ انہیں بہت قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور جاننے والے عزیز محترم مولانا رحمت اللہ صدیقی اس حقیقت سے نقاب کشائی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''خوشی اس بات کی ہے کہ قدسی کے توشۂ حیات میں علم، عمل اور عشق کی وافر دولت موجود ہے۔ انہیں یہ تینوں چیزیں وراثت میں ملی ہیں۔ وہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں رہ کر بھی روایتوں سے اپنا رشتہ مضبوط کیے ہوئے ہیں بلکہ روایتوں کے احترام کے پُر جوش داعی و مبلغ کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے وہ نعتیہ شہ پارے جو امریکہ کی آب و ہوا میں تیار ہوئے ہیں ان سے بھی اس چیز کو بڑی تقویت ملتی ہے۔ ان کی روزمرہ کی زندگی میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہ ہر وقت عشق رسول ﷺ کی بارش رحمت میں بھیگتے رہتے ہیں۔''

قدسی کے افکار و خیالات کے دریچوں سے ان کے اندرونِ خانہ کا جو شیش محل نظر آتا ہے اس میں ان عناصر کی جھلک صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قدسی کی شاعری کا خمیر جن تشکیلی عناصر سے تیار ہوا ہے ان میں عشق رسول، محبت محبوب رب کائنات ﷺ کا عنصر سب سے زیادہ نمایاں اور سب پر غالب ہے۔ سیرت سرورِ دو جہاں کی تمہید رقم کرتے ہوئے ان کا انداز دیکھیے

سیرت سرورِ دو جہاں
مشعلِ راہِ حق و صداقت ہے کونین کے واسطے

درسِ عبرت، ہدایت کا باعث ہے ہر اک بشر کے لیے
ہے یہ پاکیزہ سیرت اس انسان کی
ہے۔ جو خیر البشر سرورِ انبیاء
وجہِ تخلیق ہر دو جہاں
ہے۔ جو بعد از خدا
سب سے اعلیٰ و اولیٰ
ہم آغاز کرتے ہیں یوں
باسعادت ولادت کے پرکیف ایام سے

قدسی اس مختصری تمہید کے ذریعے سیرت سرورِ دو جہاں ﷺ کی اہمیت، افادیت اور ضرورت پر کس سلیقے مندی اور حسن کاری کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے گزر گئے۔ اس تمہید میں اگر ایک طرف عقائد و نظریات کا اظہار ہے تو دوسری جانب عقیدت ومحبت کا اقرار بھی، قدسی سیرت سرورِ دو جہاں ﷺ کو ''صراطِ مستقیم'' کا منارۂ نور قرار دیتے ہوئے نہ صرف عالم اسلام کے لیے بلکہ مکمل دنیائے انسانیت کے لیے سامانِ ہدایت اور ذریعۂ فلاح ونجات بتاتے ہیں۔ وقت کی منھ بولتی صداقت بھی یہی ہے کہ جہاں مسلمانوں کو اپنے دین و ایمان کا قبلہ درست کرنے کے لیے گنبدِ خضریٰ میں آرام فرما کونین کے داور، قاسم علوم وخیرات، محبوب ربِ کائنات حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے روشن ومنور صفحات پر نظر رکھنا ضروری ہے وہیں دنیائے انسانیت کے لیے سیرت النبی ﷺ کے اوراق میں سارے دکھ درد کا مداوا ہے۔ زخموں سے چور چور دکھی انسانیت کے زخموں کا علاج بھی انہی میں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب کو رسولِ کائنات بنا کر دنیا میں مبعوث فرمایا۔ اس مختصر تمہید میں ان باطل عقائد ونظریات کے حامل افراد کا خوبصورت اور بلیغ انداز میں رد بھی فرما دیا جو یہ الزام تراشی کرتے نہیں تھکتے کہ اہل سنت و جماعت کے افراد رسولِ کونین ﷺ کی مدح وستائش میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور معاذ اللہ نبوت کا ڈانڈا الوہیت سے ملا دیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ مقامِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کی کوئی حد آج تک بیان نہیں کی جا سکی اور نہ کسی کے پاس ایسا پیمانہ ہے کہ جس سے رفعت وعظمتِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کی حد مقرر کی جا سکے۔ ورفعنا لک ذکرک کا تو یہی اعلانِ ربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے ''اے محبوب! ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا'' جب ربِ کائنات نے مقامِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کو عروج وارتقا عطا فرمایا ظاہر ہے کہ بڑھانے والی ذاتِ اقدس کی قوت کا جب احاطہ نہیں کیا جا سکتا تو رفعت وعظمتِ مصطفےٰ کی حد کوئی کیا بیان کر سکے۔ مقامِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء بیان کرتے ہوئے ہر فکر عاجز اور ہر قلم سکتے میں ہے۔ غالب

نے اسی مقام پر پہنچ کر اعتراف عجز پر خود کو مجبور پایا

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاآں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدیست

حضرت شیخ سعدی نے بھی یہی اعتراف تحریر فرمایا

لایمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

خدا کے بعد انہیں سب کہو خدا نہ کہو۔

قدسی نے اس مختصر مگر جامع تمہید میں سرکارِ دو عالم ﷺ کے تعلق سے انہی اسلامی عقائد ونظریات کی ترجمانی کی ہے۔

''ہے یہ پاکیزہ سیرت اس انسان کی''

یہ کہہ کر قدسی باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ سرکارِ دو عالم ﷺ کو بشر مانتے ہیں لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ اپنی طرح نہیں بلکہ

ہے جو خیر البشر سرورِ انبیاء
وجہِ تخلیق ہر دو جہاں
ہے جو بعد از خدا
سب سے اعلیٰ و اولیٰ

قدسی کی یہ مختصر تمہید اعجاز واختصار کا بہترین نمونہ ہے۔ایک ایک لفظ میں ایک جہانِ معنیٰ آباد ہے۔ زبان و بیان کی ماہرانہ قدرت نے قدسی کی اس کاوش کو منظوم سیرت نگاری کے باب میں ایک شاہکار تصنیف کے طور پر پیش کیا ہے۔ محاورات، تلمیحات، استعارات اور تشبیہات کا استعمال اس قدر چابکدستی اور مہارت سے ہوا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ برجستگی کی یہ روایت ہمیں خال خال نظر آتی ہے۔قدسی کا قلم جب واقعہ ''شق صدر'' کی نظم بندی کرتا ہے تو لفظوں کا اتار چڑھاؤ دیدنی ہوتا ہے۔

''ہوا ایک دن یوں
چراگاہ میں حسبِ معمول تھے مصطفےٰ
ہانپتے کانپتے
آ کے حضرت حلیمہ کے فرزند ضمرہ نے
ماں سے کہا

غضب ہو گیا مادرِ مشفقہ
تین حضرات آ کے اچانک
لباس ان کا گورا نظر آ رہا تھا
انہوں نے لٹایا محمد ﷺ کو چت
پھاڑ ڈالا محمد ﷺ کے نوری شکم کو
میں گھبرا کے دوڑا ہوا آ گیا
سنتے ہی سانحہ
اپنے شوہر کے ہمراہ حضرت حلیمہ
بڑی تیز چلنے لگیں سمت صحرا
بڑے پیار سے مصطفٰے سے یہ پوچھا
بتاؤ مری جاں! ہوا کیا تھا کچھ دیر پہلے
یہ فرمایا آقا نے اماں
اچانک یہاں
تین حضرات آئے
کوئی چیز باہر
نکالی شکم پھاڑ کر ان سبھوں نے
کوئی چیز پھر ڈال کر
سی دیا تھا شگافِ شکم کو مرے
مجھ کو احساسِ تکلیف ذرہ برابر ہوا ہی نہیں

اردو محاورات کا خوبصورت اور برجستہ استعمال تو قدسی کے قلم کی خصوصیات کا حصہ ہے۔ ''سیرت سرورِ دو جہاں'' نظم کرنے کے دوران بھی قدسی نے اردو محاوروں کا حسین اور برجستہ استعمال کیا جس نے ان کی اس کاوش میں یقیناً چار چاند لگا دیے ہیں۔ چند مقامات سے مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

غزوۂ بدر ہونے سے قبل سرکارِ دو عالم ﷺ نے اپنے رب کی بارگاہ میں جو استغاثہ اور فریاد پیش کی اسے پیرایۂ نظم میں ڈھالتے ہوئے قدسی لکھتے ہیں:

''یا خدا!
مٹھی بھر تیرے بندے

تری ہی رضا کے لیے
سر سے باندھے کفن آئے ہیں بدر میں
شامل حال تیری مدد گر رہی
تو یہ کفار مغلوب ہو جائیں گے
اور اسلام کا بول بالا ہر اک سمت ہو جائے گا

دشمن اسلام امیہ ابن خلف کی موت کا واقعہ نظم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اور اک دشمن دیں امیہ
یہی ہے وہ ظالم امیہ
جو حضرت بلال حبش پر
ستم پر ستم ڈھایا کرتا تھا ہر دن
مظالم کے ایسے پہاڑ ان پر توڑے
زمیں تو زمیں رو پڑا آسماں بھی
کسی نے یہ سچ ہی کہا ہے
کہ ظالم کو ملتی ہے دنیا ہی میں
اس کو اپنے کیے کی سزا
اور یہ بھی ہے سچ
رب کی لاٹھی میں آواز ہوتی نہیں

ایک موقعہ پر جب کفارِ مکہ نے دھوکے اور فریب سے حضرت سیدنا خبیب اور حضرت سیدنا زید ابن مثنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو گرفتار کر لیا اور حضرت خبیب کو ابن حارث کے ہاتھوں فروخت کر ڈالا۔ کفار و مشرکین نے حضرت خبیب کی جان بخشی کے لیے یہ شرط رکھی کہ تم محمد ﷺ کا دامن چھوڑ دو تو ہم تمھیں امان دے دیں گے۔ اس ایمان افروز واقعے کی نظم بندی کرتے ہوئے قدسی کہتے ہیں۔

خبیب آئے تحویل میں ابن حارث کی جوں ہی
کہا ظالموں نے کہ گر زندہ رہنا ہے تم کو
فقط ایک صورت بچی ہے
تمھیں چھوڑنا ہو گا دامن محمد کا ہر حال میں
ورنہ تیار ہو جاؤ پھانسی پہ چڑھنے کی خاطر

جواب اتنا پیارا دیا عاشق مصطفےٰ نے
کہ ظالم کو تارے نظر آئے دن میں
کہا کھول کر کان سن لو
کروڑوں بھی جانیں ہوں میری اگر
ان کے ناموس پر میں فدا کر تو سکتا ہوں لیکن
نہیں چھوڑ سکتا
میں محبوب کا ایک لمحہ بھی دامن
بھلے اس کی پاداش میں
بوٹی بوٹی مری کر دی جائے الگ

غزوۂ بدر میں شکست خوردہ کفارِ مکہ کی ہزیمت و رسوائی کے واقعے کی نظم بندی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ہوگئیں پست کفارِ مکہ کی سب ہمتیں
ان میں لڑنے کی کوئی سکت پھر
نہ باقی رہی
بزدلوں کی طرح مابقیہ
بھاگتے جارہے تھے
تکبر کا سارا نشہ
ہو چکا تھا ہرن ظالموں کا

غزوۂ احد کے ایک واقعے کی منظر نگاری کرتے ہوئے قدسی رقم طراز ہیں۔

''وہ اصحاب جن کی
شجاعت کا بجتا تھا ڈنکا
کھسکنے لگی پاؤں سے ان کے دھرتی

''سیرت سرورِ دو جہاں ﷺ'' رقم کرتے ہوئے سید اولادِ رسول قدسی نے اردو محاوروں کا اس قدر خوبصورت اور برجستہ استعمال کیا ہے کہ ان کے فن کی داد نہ دینا علمی خیانت ہے۔ قدسی نے جا بجا، موقع بہ موقع عربی اشعار، محاورات اور آیاتِ قرآنیہ کا برمحل خوبصورت استعمال کیا ہے جس سے عربی زبان و ادب پر بھی ان کی گہری گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔

قدسی کو امام عشق و محبت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بے پناہ

وابستگی اور جذباتی تعلق و لگاؤ ہے۔ چنانچہ منظوم سیرت سرورِ دو جہاں میں وہ انہیں فراموش نہ کر سکے۔ ایک مقام پر عشرۂ مبشرہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت کے مشہور سلام کا ایک شعر جو عشرۂ مبشرہ کی منقبت میں ہے اسے اپنے بیان کا حصہ بنا ڈالا۔

دس مقدس صحابہ تھے ایسے
جنہوں نے کی فوراً سے ہی پیشتر پیروی
ان کو رب نے دیا
خلد کا مژدۂ جانفزا
اعلیٰ حضرت نے کی ترجمانی
بڑے خوبصورت طریقے سے یوں
وہ دسوں جن کو جنت کا مژدہ ملا
اس مقدس جماعت پہ لاکھوں سلام

قدسی کو زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل ہے اسی کے ساتھ وہ پیکر تراشی کے فن میں بھی ماہر ہیں۔ واقعات و حقائق کی اس حسن کاری سے منظر کشی کی ہے کہ وہ مجسم متشکل نظر آتے ہیں۔ میرے دعوے کے ثبوت میں قدسی کی یہ نظم ملاحظہ کیجیے

شہہِ دو جہاں جس گھڑی
کر رہے تھے الگ چھوٹے بچوں کو میدان سے
عین اس وقت رافع
جو کم سن تھے جوشِ محبت میں اصرار کرنے لگے
جنگ میں مجھ کو جانے سے روکیں نہ آقا
یہ فرمایا آقا نے بچوں کی حاجت نہیں جنگ میں
وہ کھڑے ہو گئے اپنی ایڑی کے بل
پھر یہ کہنے لگے
سرورا!
اب تو میں ہو گیا ہوں بڑا
یہ ادا ایسی آقا کو بھائی
کہ دے دی اجازت انہیں جنگ کی مصطفٰے نے

اجازت ملی جوں ہی رافع کو حضرت سمرہ نے کی عرض آقا
مجھے بھی عطا ہو اجازت
اگرچہ میں کم سن ہوں لیکن
یہ رافع نہیں جیت پاتے ہیں کشتی میں مجھ سے
بالآخر
ہوئی دونوں بچوں میں کشتی
سمرہ ہوئے ان پہ غالب
شہنشاہِ عالم نے دونوں کو دے دی اجازت
اور قدسی کی یہ نظم پڑھیے
صفیں جس وقت سیدھی کرتے تھے آقا
تو اس وقت حضرت سواد ایسے قائم تھے ان کا شکم
صف سے باہر نظر آرہا تھا
شہہِ دیں نے ان کے شکم پر
لگا کر چھڑی یہ کہا
استوی یا سواد
یعنی سیدھے کھڑے ہو
انہوں نے کہا مصطفےٰ سے
شکم پر مرے
چوں کہ ماری چھڑی آپ نے
مجھ کو لینا ہے اس کا قصاص آپ سے
اس نبی کی ادا پر ہوں قربان ہم
آپ نے اس صحابی سے فوراً کہا
لو شکم میرا حاضر ہے بدلا جو چاہو تو لے لو چھڑی سے
یہ سنتے ہی دوڑے ہوئے وہ صحابہ چلے
والہانہ طریقے سے بوسہ لیا
سرورِ دیں کے نوری شکم پر

ان سے سرکار نے پھر یہ پوچھا
کس لیے تم نے ایسا کیا
عرض کی یا رسولِ خدا!
چونکہ میں سر بکف
اس جگہ ہوں کھڑا
ایسا ممکن ہے اس جنگ میں
موت ہو جائے واقع مری
اس لیے
دل میں خواہش یہ جاگی
کہ میرا بدن
موت سے پہلے ہو جائے مس آپ کے جسمِ پُرنور سے
دیکھ کر جذبۂ عشق آقا نے دیں ان کو برکت کی بے حد دعائیں
یہ تھا عشق خیز ایسا منظر
کہ جملہ صحابہ میں طاری تھی اک رشک کی کیفیت
ہوئے معذرت خواہ حضرت سواد آپ سے
اور قصاص اپنا معاف آپ نے کر دیا

سید اولادِ رسول قدسی ان خوش بخت شاعروں میں ہیں جن کا شجرۂ نعت گوئی حسان الہند سیدی امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہٗ القوی سے ہوتا ہوا امامِ نعت گویاں، شاعر دربارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سیدنا حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ اسلامی عقائد و نظریات اور مسلک و مذہب کی ترجمانی جس بے باکی و جراتِ ایمانی کے ساتھ ان حضرات نے فرمائی مقامِ مسرت ہے کہ اظہارِ حق میں قدسی بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک خوبصورت اور حسین کڑی کے طور پر نمایاں ہو رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے کہا تھا۔

رہبر کی رہِ نعت میں گر ہو حاجت
نقشِ قدمِ حضرتِ حسان بہت ہے

لاریب نعت گوئی اور مدحتِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کی راہ میں حضرت سیدنا حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نقوشِ قدم آج بھی نعت گو حضرات کے لیے منارۂ ہدایت اور نشانِ منزل ہیں۔ اصحاب کبار

رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے بہتر مقامِ مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کو کون سمجھ سکا۔ قرآن نے بھی انہی مقدس نفوس کے ایمان اور عقائد و نظریات کو تاقیامت مسلمانوں کے لیے معیار و کسوٹی مقرر فرما دیا۔ "فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا" ترجمہ: پھر اگر وہ یوں ہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پا گئے۔ ان مقدس ہستیوں کے نقوشِ قدم کو سرکارِ دو عالم ﷺ نے بھی منارۂ ہدایت فرمایا۔

"اصحابی کالنجوم فبایھم اقتدیتم اھتدیتم"

ترجمہ: میرے صحابہ تاروں کی مثل ہیں، تم جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

یوں جس کے جی میں جو آئے بک دے لیکن اسلامی تعلیمات کی حقیقت تو یہی ہے۔

ایک شاعر نے یوں کہہ دیا

کہاں ہے؟ کعب سیکھے ہم سے آدابِ ثنا خوانی
کہ نعت مصطفےٰ اور ذکرِ شمشیر مہند کا

مذکورہ شعر آدابِ شریعت کے منافی ہے۔

نعت گوئی کے محراب و منبر کی تمام تزئین کاری، آرائش و زیبائش قرآنِ مقدس کی روشن و منور تجلیات سے مستعار ہیں۔ ایک مقام پر اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں

قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی
یعنی رہے احکامِ شریعت ملحوظ

قدسی نعت گوئی کی راہ میں اپنا شجرہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

قدسی ہوں اس رضا کے درِ پاک کا گدا
سیکھی ہے جس نے نعت خدا کی کتاب سے

ایک دوسرے مقام پر یوں کہتے ہیں

ہے یہ سبق حدائق بخشش کا بے مثال
نعتِ رسول سیکھیے رب کی کتاب سے

اسی لیے قدسی کی شاعری میں عقیدت کی جو گل کاریاں ہوئی ہیں ان میں نہ افراط کا عیب نظر آئے گا نہ تفریط کا بلکہ حقائق نگاری کی مکمل جھلک صاف طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کی محرابِ عظمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ پلکوں سے لفظوں کے موتی چنتے ہیں اور ردیف و قافیے کی گتھیوں میں الجھ کر عظمتِ مصطفےٰ پر حرف نہیں آنے دیتے۔

"سیرت سرورِ دو جہاں ﷺ" نظم کرنے کے دوران عقائد و نظریات اور مذہب و مسلک کی بھی

وہ خوبصورت اور مدلل انداز میں ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

اسلامی عقائد و نظریات کے مطابق سرکارِ دو عالم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے محبت و عقیدت ہی اصل ایمان، روحِ ایمان اور جانِ ایمان ہے۔ قرآن و احادیث اس پر شاہد عدل ہیں۔

شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال نے اسی روحِ ایمانی کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست!

سیدی امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابِ زندگی کا یہی تو سرنامہ بنا اور ان کی حیات کا سرمایہ بھی ۔

اللہ کی سر تابہ قدم شان ہیں یہ
ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

قدسی بھی اسی مسلک کی ترجمانی کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں اور جدید دور کے روشن خیال مدعیانِ دین و اسلام کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

اے کاش! آج اسلام و ایمان کے مدعی بھی سمجھ جاتے اس رمز کو
یاد رکھیے!
رسولِ خدا کی محبت ہی ہے اصل ایماں
رہے ذہن میں ہر گھڑی یہ حدیثِ شہہ دیں
کہ الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے اصل ایماں

جس ذاتِ اقدس کی محبت کے چراغ دل میں جھلملانے لگتے ہیں تو اس ذات سے منسوب ہر شئے محبوب اور پیاری ہو جاتی ہے۔ سیرت سرورِ دو جہاں نظم کرتے ہوئے مدینۃ الرسول ﷺ کے تعلق سے قدسی کے قلم کی گلکاریاں دیدنی ہیں

آگیا جب مدینہ
ضیاؤں کا مصدر مدینہ
وفاؤں کا ساگر مدینہ
غریبوں، فقیروں کا غم خوار مونس مدینہ

عطاؤں کا مرکز مدینہ
محاسن کا محور مدینہ
گناہوں کا ماحی مدینہ
ثوابوں کا قاسم مدینہ
غموں کا مداوا مدینہ
مصیبت زدوں کا ٹھکانہ مدینہ
سکوں بخش، تسکیں کا ساماں مدینہ
مہاجر کا دیرینہ ارماں مدینہ
دلِ ناز انصار کا نور، راحت مدینہ
رسولِ دو عالم کا محبوب تر شہر، شہرِ مدینہ

سرکارِ دو عالم ﷺ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عطا سے قاسمِ نعمت اور مختارِ کائنات ہیں: ''انما انا قاسم واللہ یعطی''، ترجمہ: بے شک میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرمانے والا ہے۔

صحابیِ رسول حضرت سیدنا جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دولت کدے پر جو سرکارِ دو عالم ﷺ کا معجزہ ظاہر ہوا اس واقعے کی نظم بندی کرتے ہوئے قدسی اس سے اس عقیدے پر استدلال کرتے ہیں۔

آپ کا یہ حسین معجزہ
کر رہا ہے دلالت
کہ رب نے بنایا تھا مختارِ کونین ان کو

اسلامی عقیدہ و نظریہ :

سماعِ موتیٰ (مردے سنتے ہیں) اس کی قدسی کے قلم نے نفیس اور استدلالی قوت سے بھرپور ترجمانی کی ہے۔ غزوۂ بدر میں آقائے کریم ﷺ ہلاک شدہ کفار و مشرکین کی نعشوں سے خطاب فرماتے ہیں۔

جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ استفسار کرتے ہیں تو حضور ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ زندوں کے مقابلے میں مردوں کی قوتِ سماعت بڑھ جاتی ہے۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے قدسی لکھتے ہیں۔

ہمیں درس اس واقعہ سے ملا
مردہ کافر میں جب ہے سماعت کی طاقت

تو پھر مومنین رب کے ولی

کیوں ہماری پکار اور فریاد کو سن نہ پائیں گے آخر

اسلام اور اسلامی احکام و تعلیمات پر شب خون مارنے کا جو مکروہ سلسلہ شروع ہوا تو اس میں دوسرے امور کے ساتھ جہاد بھی یاروں کی خصوصی توجہات کا مرکز بنا۔ یہاں تک کہ جہاد کو دہشت گردی سے تعبیر کیا جانے لگا کچھ یارانِ زمانہ نے غیر اسلامی جنگوں کو بھی جہاد کا نام دے کر اسلام مخالف عناصر کے دعووں کے لیے دلیل فراہم کرنے کا فریضہ انجام دے دیا۔ جہاد اور موجودہ جنگوں کے درمیان کوئی مماثلت نہیں۔ اسلامی غزوات و سرایا کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد اس امر سے اختلاف کی قطعی گنجائش نہیں کہ اسلام اور مسلمانوں نے جو بھی جنگیں لڑیں وہ تمام کی تمام دفاعی تھیں۔ مسلمانوں نے اپنے تحفظ و بقا کے لیے تلواریں نیام سے باہر نکالیں۔ چنانچہ قدسی نے بھی غزوات کی تاریخ نظم کرتے ہوئے اس کے تاریخی پس منظر پر خوبصورت انداز میں روشنی ڈالی ہے

کسی قسم کا اس میں شک ہی نہیں
دین اسلام امن واماں کا ہے پیغام بر
پوری تاریخ اسلام ہے شاہد اس پر
رسولِ خدا یا کسی بھی مسلمان نے
جنگ کی ابتدا کی نہیں
جتنی جنگیں بھی عہد رسالت میں واقع ہوئیں
ساری جنگیں تھیں خالص دفاعی
یہ بات اہلِ عقل وخرد سے نہیں ہے نہاں
جو دفاع اپنا کرتا ہے مظلوم ہوتا ہے وہ
لاد دی جاتی ہے جنگ خود اس کے سر پر
جفا کار کی سمت سے
اس قدر
توڑے جاتے ہیں جور و جفا کے پہاڑ
مقابل میں آتا ہے ظالم کے مجبور ہو کر
اگر ہم بھی تاریخ کا جائزہ لیں
تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جائے گی

ظالموں کے مظالم کی بنیاد پر
سرورِ دیں اور سب مسلماں
چلے آئے مکہ سے شہرِ مدینہ
تقاضا تو تھا عدل و انصاف کا یہ
کہ ہو جاتے خاموش کفارِ مکہ
مسلمان کو چین سے رہنے دیتے مدینے کے اندر

ہماری سماجی زندگی میں بھی بہت ساری خرابیاں در آئی ہیں۔ علمائے اسلام زبان وقلم سے جن کی نشان دہی فرماتے ہوئے موقع بموقع اصلاح کرتے ہیں۔ سید اولادِ رسول قدسی نے بھی خاتونِ جنت حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے نکاح کی تفصیل نظم کرتے ہوئے معاشرے میں پھیلی ہوئی جہیز کی لعنت، بے جا فضول خرچی اور نام ونمود کے لیے بے دریغ مال و دولت خرچ کرنے کے غیر اسلامی مزاج پر تنقید کرتے نہیں چوکتے۔

نیز یہ درسِ عبرت ہے ان کے لیے
جو لٹاتے ہیں شادی کے موقع پر کثرت سے اموال یہ سوچ کر
تا کہ نام ونمود ان کو ہو جائے حاصل
رہیں لوگ رطب اللساں ان کی تعریف میں
چند مقامات پر تعقید لفظی کا عیب بھی نظر آیا ہے مثلاً
''ہو لعنت تمہارے خطرناک اس مشورے پر!
''گئیں سب الٹ ان کے چولھوں کی دیگیں!

اسلوب بیان کی شگفتگی، لب ولہجے کی شائستگی، محاورات کے برجستہ اور خوبصورت استعمال، حسن تراکیب، نفیس تشبیہات نے سید اولاد رسول قدسی کی ''سیرت سرورِ دوجہاں'' صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اُردو زبان وادب میں ایک زندہ یادگار بنا دیا ہے۔ تاہم مطالعے کے دوران کچھ مقامات پر نظر ٹھہرتی ہے اور موجوں کی روانی کا جو خوبصورت تسلسل ہے وہ ٹوٹتا سا محسوس ہوتا ہے۔ واقعہ تحویل قبلہ! کی نظم بندی کرتے ہوئے اُردو زبان میں رائج ایک غلط ترکیب قدسی کی نظم کا حصہ بن گئی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں جنہوں نے کی فوراً سے ہی پیش تر پیروی، اس میں فوراً سے پیش تر قابل توجہ ہے۔ میری ناقص فہم میں قدسی کی نظم میں یہ ترکیب غیر اختیاری طور پر شامل ہوگئی ہے۔ چونکہ اس طرح کی ترکیب خواندہ ناخواندہ کے درمیان رائج ہے۔ لیکن یہ ترکیب آج تک کسی معتبر قلم کار نے استعمال کی ہو یہ میں نے نہیں دیکھا۔ عموم بلویٰ کے اس

لسانی اثر سے قدسی کا قلم محفوظ نہیں رہ سکا۔ جب کہ قدسی کے زبان و بیان کی ایسی نفاست ہے کہ کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ دورانِ مطالعہ جن مقامات پر اس ہیچ مداں کی نظر ٹھہری اور تسلسل ٹوٹا اگر ان کی نشاندہی نہ کی جائے تو جانب داری کا الزام عائد ہو جائے گا۔

کی گئیں سب شہیدوں کی لاشوں کو یک جا
امیہ نے خود کو بچانے کی خاطر
دہائی دیے جا رہا تھا
اُتاری نہ جائے پتیلی کو چولہے سے اس وقت تک
ایک لمبا مظالم کا ناگفتہ بہ سلسلہ
انہوں نے مبارک سفر کے لئے
ساز و ساماں کی تیاریوں میں ہوئیں منہمک
فرشتے نے پھر تیسری مرتبہ
ان کو سینے سے اپنے لگا کر یہ کہنے لگا
اس خطرناک حالات میں
یہ سنتے ہی دوڑے ہوئے وہ صحابہ چلے
ہو کے لبریز جذباتیت سے یہ صفوان کہنے لگا
قتل کر ڈالا بے رحمیوں سے
چلے لاش لے کر بڑی تیز رفتاریوں سے

دورانِ مطالعہ کچھ مقامات ایسے بھی زیرِ نظر آئے جن کے تعلق سے ذہن سہوِ کتابت کی جانب مبذول ہوا۔ راقم الحروف انہیں صرف نظر کرتے ہوئے یہ اُمید رکھتا ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس جانب خصوصی توجہ دے دی جائے تو کتاب بہ سے بہتر ہو جائے خوبصورت کتابت وطباعت، عمدہ اور نفیس کاغذ، شاندار گیٹ اپ نے سیرت سرورِ دو جہاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ظاہری پیشکش کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ وقت اور حالات کا جبری تقاضہ یہی ہے کہ مسلمان دارین میں کامیابی کے لئے، سیرت سرورِ دو جہاں، کو نشان منزل بنالیں۔ سید اولاد رسول قدسی کی کاوش لائق صد مبارکباد ہے۔ مولانا رحمت اللہ صدیقی نے نہایت خلوص ومحبت سے قدسی کی اس شاہکار تصنیف میں اپنی عمدہ ترتیب، تہذیب اور تقدیم سے چار چاند لگا دیے ہیں۔

□□□

صدیق عثمان نور محمد، ٹورانٹو، کینیڈا

حامد یزدانی کی تضمین ''بہارِ قبول''......ایک تاثر

ABSTRACT: Salaam is a form of poetry through which poets pay tributes to some dignitary. Salaam composed by Aala Hazrat Ahmad Raza Khan (R.A) of Braily, to pay tribute to Holy Prophet Muhammad (S.A.W) has become classics of devotional poetry in Urdu. This Salaam inspired Hamid Yazdani to write TAZAMEEN i.e. for composing poetry blending with couplets of Aala Hazrat (R.A). Some characteristics of poetry have also been delineated here with the purpose of illuminating literary beauty of Salaam of Aala Hazar (R.A.). Examples of appreciable poetic content and creative treatment of couplet comprising Tazmeen by Hamid Yazdani, have also been cited in the article.

اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآنِ پاک میں ارشاد فرماتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتانے والے (نبی) پر اے ایمان والو! ان پر خوب درود اور خوب سلام بھیجو (اردو ترجمہ: امام احمد رضا خانؒ)۔

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اہلِ ایمان کو دو باتوں کا حکم فرماتا ہے: ایک تو اپنے پیارے نبی حضرت محمد (ﷺ) پر صلوٰۃ پڑھنے کا اور دوسرے ان پر سلام بھیجنے کا۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ

حضور نبی کریم (ﷺ) پر بہ کثرت بھیجا جانے والا درود، درودِ ابراہیمی ہے جو ہر نماز کا جزوِ لازم ہے۔ رسول اللہ (ﷺ) کے زمانے سے لے کر اب تک دنیا بھر کی زبانوں میں، نظم ونثر میں درود وسلام کی بے شمار کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ اس حوالے سے ضخیم ترین کتاب ''تنبیہ الانام'' ہے۔ شاعرانہ نثر کی حامل یہ عربی مثنوی تیونس کے شیخ عبدالجلیلؒ بن عظوم قیروانی کی تصنیفِ لطیف ہے۔

صَلُّوْ عَلَى النَّبِيِّ اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ

عربی زبان میں معروف ترین سلام حضرت امام البرزنجیؒ کا ہے جبکہ ترک زبان میں سلیمان چلپی آفندیؒ کا اور اردو میں یہ اعزاز امام احمد رضا خانؒ (۱۳۴۰-۱۲۷۲ھ بمطابق ۱۹۲۱-۱۸۵۶ء) کے سلام کو حاصل ہے جو ۱۷۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ۴۵ اشعار 'درود' اور 'سلام' دونوں سے مزین ہیں۔ یہ سلام ان کے نعتیہ دیوان 'حدائق بخشش' میں شامل ہے جو فروغِ دین کے حوالے سے ان کے متعدد کارہائے نمایاں میں سے ایک ہے۔

سیّدنا ونبینا وحبیبنا ومولانا محمد مصطفیٰ (ﷺ) پر اعلیٰ حضرت کا یہ سلام ان کے محبین ہمیشہ کھڑے ہو کر پیش کرتے ہیں۔ سب حلقہ بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مل کر سلام کا کچھ یوں آغاز کرتے ہیں:

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

یہ سلام برجستگی اور سلاست کا ایسا شاہکار ہے کہ لگتا ہے جیسے الہام ہوا ہو۔ یہ ایک عظیم امامِ وقت میں موجود ایک عالم اور مرشدِ کامل کی خصوصیات کا آئینہ دار ہے۔ اردو زبان میں مسلم دینی شاعری کا کوئی سا بھی مجموعہ اُٹھا کر دیکھ لیں اس سلام کے کچھ اشعار ضرور اس کی زینت ہوں گے۔

یہ مقبول سلام محبین مسجدِ نبوی میں روضۂ رسول اللہ (ﷺ) پر بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سلام کا ایک ایک شعر حبِّ رسول (ﷺ) کی خوشبو سے معطر و معنبر ہے۔ اس سلام کی گونج اجمیر سے لے کر لندن تک، لاہور سے لے کر ٹورانٹو تک اور ممباسہ سے لے کر شکاگو تک غرض دنیا بھر میں سنائی دیتی ہے۔

یہ سلام ہمارے محترم و محبوب پیغمبر حضرت محمد (ﷺ) سے اعلیٰ حضرتؒ کی والہانہ محبت کا عکاس ہے۔ یوں تو یہ سلام ایک مکمل اور مربوط اکائی کی حیثیت رکھتا ہے تاہم تفہیم کی غرض سے اسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ حضور (ﷺ) کی عمومی صفات (اشعار: ۱تا۳۳)

۲۔ حضور (ﷺ) کے جسمانی اوصاف (اشعار: ۳۴تا۸۱)

۳۔ حضور (ﷺ) کی حیاتِ طیبہ اور ان کے عہد کی خصوصیات (اشعار: ۸۲تا۱۰۹)

۴۔ اہلِ بیتِ اطہارؓ اور صحابۂ کرامؓ کی صفات (اشعار: ۱۱۰تا۱۴۹)

۵۔ اولیاء اللہ اور صالحینؒ کی صفات (اشعار: ۱۵۰تا۱۷۱)

امام احمد رضا خانؒ نے، جو 'اعلیٰ حضرت' کے لقب سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں، اس سلام کے ذریعے واقعتاً ہمارے دل جیت لئے ہیں۔ اور اب ٹورانٹو میں مقیم پاکستانی شاعر سیّد حامد یزدانی نے ۱۷۱ اشعار پر مشتمل اس سلام کی مکمل تضمین رقم کر کے ہمارے دل موہ لینے والا کام کیا ہے۔ تضمین، شعر

میں مصرعوں کے اضافے کو کہتے ہیں؛ اگر شعر کے دو مصرعوں پر تین مزید ہم قافیہ مصرعوں کا اضافہ کر دیا جائے تو اسے عربی زبان و ادب میں تخمیس کہا جاتا ہے۔ تاہم اردو میں اس کے لئے بھی 'تضمین' کا لفظ ہی مروّج ہے۔ مثال کے طور پر سلام کے پہلے شعر کی تضمین ملاحظہ کیجئے:

شانِ ختمِ رسالت پہ لاکھوں سلام
رَب کے احسانِ نعمت پہ لاکھوں سلام
پیارے آقا کی عظمت پہ لاکھوں سلام
"مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام"

آپ نے دیکھا کہ ہر مصرع کے آخر میں "پہ لاکھوں سلام" کے الفاظ دوہرائے گئے ہیں، یہ الفاظ اردو شاعری میں 'ردیف' کہلاتے ہیں۔ شعر کے پہلے مصرع میں ردیف سے پہلے اعلیٰ حضرتؒ نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ ہے 'رحمت'۔ سیّد صاحب نے لفظ 'رحمت' کے لئے اپنے اضافی تین مصرعوں میں جن ہم صوت الفاظ کا انتخاب کیا ہے وہ ہیں: 'رسالت'، 'نعمت' اور 'عظمت'۔ یہ الفاظ اردو شاعری میں قوانی (واحد: قافیہ) کہلاتے ہیں۔

اعلیٰ حضرتؒ کا سلام 'تائیہ' ہے کہ اسکے تمام کے تمام ۱۷۱ اشعار کے آخر میں وہ الفاظ آتے ہیں جو حرف 'ت' کے ہم صوت ہیں جیسے ہدایت، رسالت، شفاعت اور جنت وغیرہ۔ یہ قوانی بھی، اپنے طور پر، ہمیں اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی بخشتے ہیں۔

اس سلام کا پہلا شعر 'سلام' کا شعر ہے جبکہ دوسرا شعر 'درود و سلام' دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ سلام میں ۴۵ ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں 'درود' بھی ہے اور 'سلام' بھی۔ اس لئے یہ سلام 'درود و سلام' یا 'صلوٰۃ و سلام' بھی کہلاتا ہے۔

اس سلام کی متعدد شرحیں تحریر کی جا چکی ہیں تاہم یہ سب اس محبت کی گہرائی کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر رہیں جو اعلیٰ حضرتؒ، حضور رسولِ رب العالمین، رحمۃ اللعالمین (ﷺ) سے رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت جو کہنا چاہتے ہیں اس کا کلّی فہم ہر کسی کے بس کی بات بھی تو نہیں۔

سلام پڑھتے ہوئے ہم پر اعلیٰ حضرتؒ کی شخصیت اور مقام و مرتبہ کے کئی پہلو اُجاگر ہوتے ہیں؛ اعلیٰ حضرت احمد رضا خانؒ کا علم شریعت پر استوار ہے، وہ صاحبِ طریقت بھی ہیں اور حقیقی معرفت سے متصف بھی۔ اللہ کرے کہ مسلمان ان کا سلام اسی طرح ذوق و شوق سے پڑھتے رہیں اور ثواب و مغفرت کے حق دار بنتے رہیں۔ آمین

امام ترمذیؒ کی تصنیف "شمائلِ محمدیہ" ہمیں حضرت محمد (ﷺ) کے متعدد اوصافِ حمیدہ کا پتہ دیتی ہے جیسے آپ (ﷺ) کا رؤف ورحیم ہونا، صاحبِ جود وسخا ہونا، حکیم ودانا ہونا، صادق وامین ہونا، عظیم ومعتبر ہونا، شریف ونجیب ہونا، منصف وعادل ہونا، منکسر المزاج اور پرہیز گار ہونا، فصیح و بلیغ ہونا، شجیع و بہادر ہونا، انسانیت کا نجات دہندہ ہونا؛ الختصر آپ (ﷺ) کا 'انسانِ کامل' ہونا بہ قولِ شیخ عبدالکریم الجیلیؒ۔

اعلیٰ حضرتؒ نے لگ بھگ ان تمام اوصاف کو شعروں کا روپ دیا ہے اور اعلیٰ حضرتؒ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سیّد حامد یزدانی بھی اپنی تضمین میں حضور پاک (ﷺ) کے اوصافِ حسیں کا ذکرِ خیر کرتے ہیں، جیسے ۷۷ ویں شعر کی اس تضمین میں:

رنج و آلام کو خوش دلی سے سہا
زخمِ طائف پہ بھی لب پہ شکرِ خدا
اس قدر ہیں مثالی وہ صبر و رضا
"کُل جہاں مِلک اور جَو کی روٹی غذا
اُس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سلام"

اعلیٰ حضرتؒ کا سلام اس لحاظ سے انتہائی منفرد قرار پاتا ہے کہ انہوں نے اس منظوم خراجِ تحسین میں جہاں حضرت محمد (ﷺ) ابن عبداللہ، نورٌ من نور اللہ کے معجزانہ قوت واختیارات کی توصیف وثنا کی ہے وہاں حضور (ﷺ) کے ایک ایک جسمانی وصف پر سلام بھی بھیجا ہے۔ مثال کے طور پر آپ (ﷺ) کی جبینِ سعادت پر، آپ (ﷺ) کے عذاروں کی طلعت پر، آپ (ﷺ) کے سرِ تاجِ رفعت پر، آپ (ﷺ) کے گیسوئے مشک سا پر، آپ (ﷺ) کی نگاہِ عنایت پر، دورونزدیک کے سننے والے آپ (ﷺ) کے کانوں پر، آپ (ﷺ) کی چمک والی رنگت پر، آپ (ﷺ) کے معطر پسینے پر، آپ (ﷺ) کی ریشِ خوش معتدل پر، آپ (ﷺ) کے گلاب جیسے ہونٹوں پر، کُن کی کُنجی آپ (ﷺ) کی زبانِ مبارک پر، آپ (ﷺ) کے پُر شوکت شانوں کی وجاہت پر، مہرِ نبوّت پر، آپ (ﷺ) کے غنی ہاتھوں پر، قوت والے بازوؤں پر، کرامت والی آپ (ﷺ) کی انگلیوں پر اور آپ (ﷺ) کی نرمی خوئے لینت پر۔

حضور (ﷺ) کی انگلیوں کی معجزانہ قوت کا ذکر اس حدیثِ پاک میں ہے: حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں: "میں حضور (ﷺ) کے ہمراہ تھا اور اسی دوران نمازِ عصر کا وقت ہوگیا۔ ہمارے پاس جو تھوڑا سا پانی تھا وہ ایک برتن میں ڈال کر آقا (ﷺ) کی خدمت میں پیش کردیا۔ آپ (ﷺ) نے اپنا ہاتھ برتن میں ڈال دیا۔ پھر ہاتھ باہر نکالا، اپنی انگلیاں کھول دیں اور فرمایا: 'جلدی سے آجائیں وہ سب جو وضو کرنا چاہتے ہیں'۔ میں نے دیکھا کہ انگلیوں سے پانی کے چشمے اُبل رہے ہیں۔ چنانچہ اصحابؓ نے

اس پانی سے وضو بھی کیا اور اپنی پیاس بھی بجھائی۔ میں نے جی بھر کے پانی پیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ برکت ہے"۔ ایک اور راوی کہتے ہیں: "میں نے جابرؓ سے دریافت کیا: "آپ کتنے افراد تھے؟" تو انہوں نے جواب دیا: "ہماری تعداد ایک ہزار چار سو تھی"۔ (البخاری)۔

اعلیٰ حضرتؒ اس واقعہ کو یوں نظم کرتے ہیں:

نور کے چشمے لہرائیں دریا بہیں
انگلیوں کی کرامت پہ لاکھوں سلام

اور صاحبِ تضمین سیّد حامدؔ اس شعر کے ساتھ ایک دعا کا اضافہ کر دیتے ہیں:

پھر رُتیں ایسی آجائیں دریا بہیں
بدلیاں پھر وہ گھِر آئیں دریا بہیں
خیر ہی خیر برسائیں دریا بہیں
"نور کے چشمے لہرائیں دریا بہیں
انگلیوں کی کرامت پہ لاکھوں سلام"

اس تضمین کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ سیّد حامدؔ یزدانی نے عربی اور اردو میں مروّجہ متعدد اسماء و صفاتِ نبی (ﷺ) کو بھی اس تضمین کی زینت بنایا ہے۔ حضور (ﷺ) کے ۱۲۰۱ اسمائے مبارکہ جو مسجد نبوی کی سامنے والی دیوار کے اندرونی حصہ میں خوبصورت خط میں نقش ہیں، خوب جانے پہچانے ہیں۔ یہ اسمائے نبوی یا تو قرآنِ پاک میں مذکور ہیں یا حدیثِ مبارکہ میں یا پھر دونوں میں۔ زیرِ نظر نعتیہ تضمین میں ہمیں ۵۰ سے زیادہ اسماء النبی ملتے ہیں جنہیں متن میں جلی خط میں درج کیا گیا ہے۔ ان اسمائے مبارکہ میں سے درجِ ذیل کا حوالہ ہمیں قرآنِ مجید میں ملتا ہے (حوالہ کے لیے ہر نام کے ساتھ محض ایک آیت کا نمبر درج کرنے پر اکتفا جارہا ہے):

صاحب الدرجۃ الرفیعہ (اونچی شان والے): (۲:۲۵۳)
محمد (سب سے زیادہ تعریف کیا گیا): (۳۳:۴۰)
مکرم (صاحبِ تکریم وتوقیر): (۶۹:۴۰)
رحمت (رحمت): (۲۱:۱۰۷)
نور (مقدس روشنی): (۵:۱۵)
مبین (واضح، صاف): (۳۸:۷۰)
محمود (تعریف کیا گیا): (۱۷:۷۹)

احمد (سب سے زیادہ تعریف کیا گیا): (۶۱:۶)

مفضل (اللہ کا پسندیدہ): (۴:۱۱۳)

ھادی (راہنما): (۴۲:۵۲)

نبی (غیب کی خبریں دینے والا): (۳۳:۵۶)

مصطفیٰ (اللہ کا منتخب): (۲۲:۷۵)

طاہر (پاک): (۷۴:۴)

مطہر (جسے اللہ نے پاک کیا ہو): (۷۴:۴)

اُذنُ خیر (خیر کا سننے والا): (۹:۶۱)

سراج (نبوت کا سورج): (۳۳:۴۶)

صدق (سچائی، اخلاص): (۳۹:۳۳)

مبشّر (بشارت دینے والا): (۳۳:۴۵)

نذیر (تنبیہ کرنے والا): (۲۵:۱)

بشیر (خوش خبری دینے والا): (۱۱:۲)

شفیع (شفاعت کرنے والا): (۲۰:۱۰۹)

مجتبیٰ: (منتخب): (۳:۱۷۹)

رسول الملاحم (ظالم کفار سے لڑائی کرنے والا): (۳:۱۲۱)

رسول (اللہ کا پیامبر): (۴۸:۲۹)

حق (سچ، سچا، سچائی): (۳:۸۶)

جہاں تک رسول اللہ (ﷺ) کی حیاتِ طیبہ کا تعلق ہے اعلیٰ حضرتؒ اس کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے ہیں جیسے آپ (ﷺ) کی ولادت شریف، آپ (ﷺ) کی رضاعت، آپ (ﷺ) کا بچپن، غارِ حرا میں آپ (ﷺ) کی ریاضت، آپ (ﷺ) کا فروغِ اسلام کا عزم، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عبادت، آپ (ﷺ) کی دعائیں، معراج شریف، کفار کے خلاف غزوات میں آپ (ﷺ) کی فتح، ظلم کا خاتمہ اور عدلِ اسلامی کا قیام، انسانیت کی آزادی اور یہ کہ آپ (ﷺ) سب سے بڑے شفیع ہیں۔ تو آیئے اب ذرا غزوۂ بدر سے متعلق شعر اور اس کی تضمین سے اپنے دل گرماتے ہیں:

آقا شانِ شجاعت میں ہیں بے مثال
ٹھہرے ان کے مقابل یہ کس کی مجال

نورِ حکمت کھلا، ٹوٹا ظلمت کا جال
"گردِ مہ دستِ انجم میں رخشاں ہلال
بدر کی دفعِ ظلمت پہ لاکھوں سلام"

یہاں وہ شعر اور اس کی تضمین کا حوالہ بھی برمحل معلوم ہوتا ہے جس میں رسول اللہ (ﷺ) کے اصحاب وعترت کی شان بیان کی گئی ہے:

غیثِ لطفِ سراسر، کروڑوں درود
شافعِ روزِ محشر کروڑوں درود
رہبروں کے اے رہبر کروڑوں درود
"ان کے مولا کے ان پر کروڑوں درود
ان کے اصحاب وعترت پہ لاکھوں سلام"

صوفیائے عظام پر اعلیٰ حضرتؒ کا شعر اور اس پر سیّد صاحب کی تضمین بھی بہت مسرور کُن ہے:

جن کے چہروں کی رونق ہے ایماں کا نور
پاک سینوں میں حُبِ نبی کا وفور
جن کو حاصل ہے واللہ دائم حضور
"باقیِ ساقیانِ شرابِ طہور
زینِ اہلِ عبادت پہ لاکھوں سلام"

آخری شعر میں اعلیٰ حضرت ہمیں فرشتوں کے جلو میں روضۂ رسول (ﷺ) پر دکھائی دیتے ہیں اور سیّد صاحب کی دعا مستقل طور پر ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے:

رنج دوری کا کب تک سہیں ہاں رضاؔ
چشمِ حامدؔ سے آنسو بہیں ہاں رضاؔ
عمر بھر کاش طیبہ رہیں ہاں رضاؔ
"مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضاؔ
مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام"

سیّد صاحب نے بجا طور پر تضمین کو "بہارِ قبول" کا نام دیا ہے۔ یہ نام انہوں نے سلام کے ۶۲ ویں شعر سے اخذ کیا ہے:

وہ دعا جس کا جوبن بہارِ قبول
اس نسیمِ اجابت پہ لاکھوں سلام
صَلُّوا عَلَی الرَّسُول
اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّم وَ بَارِک عَلَیہ

جہاں تک شعری محاسن کا تعلق ہے اعلیٰ حضرتؒ کا سلام تشبیہات واستعارات، تجنیس وترصیع، حسنِ تعلیل، تجسیم کاری، جدتِ تخیل، مضمون آفرینی، برجستگی، کثیر القوافی اور کئی دیگر خوبیوں سے مزین ہے۔ مثال کے طور پر ۱۷ویں شعر میں انہوں نے ایک سے زیادہ قافیے استعمال کیے ہیں:

ماہِ لاہوتِ خلوت پہ لاکھوں درود
شاہِ ناسوتِ جلوت پہ لاکھوں سلام

اس شعر میں "ماہ" کا قافیہ ہے "شاہ" اور "لاہوت" کا "ناسوت" جبکہ "خلوت" کا "جلوت"۔ ان الفاظ کا مفہوم تصوف میں دلچسپی رکھنے والوں پر عیاں ہے۔ سیّد صاحب کی تضمین بھی فنی محاسن سے مالا مال ہے۔ یہ امر مسحور کُن بھی ہے اور مسرور کُن بھی۔

اعلیٰ حضرتؒ کے سلام میں ہمیں جا بہ جا مظاہرِ حسن کا تذکرہ ملتا ہے جیسے زمین و آسماں، سورج اور اس کی کرنیں، ماہتاب اور ہلال، نور کے چشمے، چاندنی، ستارے، کہکشاں، کائنات، بارش کی بوندیں، پانی، پرندے، پودے، گلستان اور سیب، غنچے اور پھول، گلاب اور پتیاں، دودھ اور شہد وغیرہم۔

اعلیٰ حضرتؒ کے ایک محبّ کی حیثیت سے سیّد حامد یزدانی نے بھی اسی طرح کے مواد کو اپنی تضمین میں برتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے سیّد صاحب کے مرشد کامل نے اعلیٰ حضرتؒ کو مولانا جلال الدین رومیؒ کے گلستان میں تشریف فرما دیکھ لیا تھا اور وہاں رسول اللہ (ﷺ) کی صلوٰۃ و ثنا چہچہاتے پرندے انہیں اتنے بھلے لگے کہ میاں صاحب نے اپنے مرید صادق کو وہیں اعلیٰ حضرتؒ کے قدموں میں بٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

سیّد صاحب کو اعلیٰ حضرتؒ سے محبت ہے اور اعلیٰ حضرتؒ، حبیب اللہ (ﷺ) سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ اب سیّد صاحب نے ایک محبّ کے طور پر اعلیٰ حضرتؒ کے قدموں میں اپنی جگہ بنالی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تضمین قلمبند کر کے سیّد صاحب واقعتاً مسلم شعراء کی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ مبارک باد صد مبارک باد۔

سیّد صاحب سے پہلے پاکستان ہی کے سیّد اختر الحامدی صاحب نے اعلیٰ حضرتؒ کے سلام کی مکمل تضمین تحریر کی تھی جسے از حد ستائش حاصل ہوئی تھی، ماشاء اللہ۔

یاد رہے کہ تضمینِ سلام سے قبل سیّد حامد صاحب 'اطاعت' کے نام سے ایک نعتیہ مجموعہ بھی پیش کر چکے ہیں۔ انہیں نہ صرف حضور کی والدہ محترمہ حضرت آمنہؓ، امہات المومنین حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شان میں ہی منقبتیں لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا بلکہ سلام بہ حضور شہدائے کربلاؓ اور سلام بہ حضور امام حسینؓ، منقبت در شانِ امام حسنؓ تخلیق کرنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ خلفائے راشدینؓ کی مناقب قلمبند کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جن نامور اولیاء و صالحین کرامؒ کی شان میں منقبتیں تحریر کی ہیں ان میں حضرت غوث الاعظم محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ، حضرت خواجہ غریب نواز مولانا معین الدین چشتی اجمیریؒ، حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت مولانا امام عبداللہ بن علوی الحدادؒ، حضرت مجددِ الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خانؒ، حضرت سیف الرحمٰن پیرِ ارچی خراسانیؒ، سیّد صاحب کے مرشدِ کریم حضرت میاں محمد حنفی سیفی نقشبندی اور الحبیب احمد مشہور بن طٰہٰ الحدادؒ کے نام نامی شامل ہیں۔

سیّد حامد صاحب کو یہ تضمین مکمل کرنے کا شرف رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ میں حاصل ہوا۔ دعا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انہیں طویل اور صحت مند زندگی عطا کرے تاکہ وہ مسلمانوں کو اپنے فن سے متمتع کرتے رہیں۔ آمین۔ اب ان کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اللہ کریم انہیں ان ذمہ داریوں سے بہ خوبی عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی تمام نیک کاوشوں کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی والدہ محترمہ اور ان کے والدِ گرامی (جنت مکانی حضرت سیّد عبدالرشید یزدانی جالندھری) کے درجات بلند فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔ یاد رہے کہ سیّد یزدانی جالندھری صاحب نے نعتیہ مجموعہ "توصیفِ خیر البشر ﷺ" بھی تصنیف کیا اور ایک طویل نعتیہ مثنوی "صبحِ سعادت" بھی لکھی۔ اور انہی کی دل نشیں تربیت نے سیّد حامد صاحب کو شاعری کے اسرار و رموز سے آگاہی بخشی۔ ہم دعا گو ہیں کہ سلام کی طرح یہ تضمین بھی دنیا بھر میں پڑھی جائے اور خاص کر روضۂ رسول اللہ (ﷺ) پر۔ اللہ کرے کہ میلاد النبی (ﷺ) کے موقع پر بھی یہ تضمین ہمیں زیادہ سے زیادہ سننے کی سعادت حاصل ہو۔ آمین۔

صَلُّوا عَلَی الحَبِیبِ الاَعظَم ﷺ
اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّم وَ بَارِک عَلَیه

۲۵۔ صفر ۱۴۳۲ھ بمطابق ۲۹ جنوری ۲۰۱۱

(انگریزی مضمون سے ترجمہ کیا گیا)

سیّد ضیاء الدین نعیم، راولپنڈی

"نعت نگینے" — ایک مطالعہ

ABSTRACT: "GEMS OF NAAT"a book of devotional poetry by Naseem Sahar, has been reviewed in this article. The opening verse of Holy Quran is"all praise is due to Almighty Allah", therefore, the book under review opens with eight poems of Hamdia text. This indicates immensity of interest of poet to compose verses praising Allah. Devotional poetry composed to denote deep love and affection towards Holy Prophet Muhammad(S.A.W.(has also been evaluated and found praiseworthy. The creative angle of poetry to arouse conscience of society, towards practical application of Islamic norms in day to day matters, needs adoption at every field of life and literary writings. The relevant and rational vision of the poet is really worth applauding.

جناب نسیم سحر بلاشبہ ایک بہت established اور لائق توقیر ادیب وسخنور ہیں ۔انہوں نے ادب کی کوئی صنف ایسی نہیں جس میں اپنا لوہا نہ منوایا ہو ۔ان کے ادبی مرتبے اور معیار کے افراد میں سے متعدد کا رویہ اپنے اردگرد دیواریں کھڑی کر لینے کا ہوتا ہے جب کہ جناب نسیم سحر تکلفات وتصنعات کی دیواریں مسمار کر کے ساتھی انسانوں سے ربط ضبط پیدا کرنے میں پیش قدمی کے قائل ہیں ۔۔۔

جناب نسیم سحر کے عمومی رویے کی اس دل کشی کو سیرت سرور عالم صل اللہ علیہ وسلم کے آئینے میں دیکھا جائے تو یہ رویہ عین سنت رسول کی اطاعت کا مظہر دکھائی دیتا ہے ۔۔۔۔۔۔ نبی مکرم نے ہمیشہ لوگوں کو پرے دھکیلنے کی نہیں قریب کرنے کی تعلیم دی ہے ۔۔۔ میرا احساس ہے کہ جناب نسیم سحر کا یہ accomodative طرز عمل پیروی ، رسول ہی کی کوشش کا ثمر ہے ۔۔۔۔ پیروی ، رسول کے اتباع کی بھرپور شعوری کوشش تو ہمیں "نعت نگینے" کے حسن ترتیب میں بھی عیاں ہو کر جناب نسیم سحر کی گہری دینی بصیرت کا سراغ دیتی ہے ۔انہیں معلوم ہے کہ پیغمبر مکرم کی سب سے اہم اور سب سے زیادہ واجب الاتباع سنت، پروردگار عالم کی حمد وتوصیف ہے ۔آپ صل اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کا آغاز ہمیشہ اللہ رب العزت کی حمد وتوصیف سے ہوتا اور انتہا بھی اسی پر ہوتی ۔گفتگو کا محور بھی وہی ذوالجلال والاکرام اور اس کا پیغام ہی

رہتا تھا، آغاز کلام، رسول مکرم چونکہ حمد رب ذوالجلال ہی سے فرماتے اس لئے جناب نسیم سحر نے بھی اپنی کتاب "نعت نگینے" کے آغاز کو ایک نہیں، دو نہیں، اکٹھی چھ حمدوں سے آراستہ کیا ہے۔۔۔ اور حمدیں بھی کیسی ---- از دل خیزد بر دل ریزد کی بہترین مثال۔۔۔

سب پر عیاں ہے کہ اول تو ہمارے ہاں حمد کہنے کا رجحان ہی بہت کم پایا جاتا ہے اس پر مستزاد یہ کہ جو حمدیں کہی جاتی ہیں ان کی اکثریت اس والہانہ جذبے سے یکسر خالی ہوتی ہے جو قرآن مجید میں مسند آرا آیت " والذین آمنوا اشد حبالله" (کہ اہل ایمان شدید محبت اللہ ہی سے رکھتے ہیں۔ البقرۃ 165) کا تقاضا ہے۔

اس روش عام کے بالکل برعکس جناب نسیم سحر کی حمدیں" اشد حبالله" کی لو سے سرتاسر منور اور پڑھنے والوں کے قلوب میں یہی جوت جگاتی دکھائی دیتی ہیں۔۔

نظر مری پس افلاک ہو تو حمد کہوں | مجھ اس کی ذات کا ادراک ہو تو حمد کہوں

***

گداز دل میں ذرا اور پیدا ہو جائے | یہ آنکھ اور بھی نمناک ہو تو حمد کہوں

***

جونہی منظر میں حروف کن فکاں روشن ہوئے | ہر زمیں روشن ہوئی سب آسماں روشن ہوئے

***

حمد باری دل کی دھڑکن میں جونہی شامل ہوئی | قمقمے کتنے، سر اشک رواں روشن ہوئے

***

ک انوکھی روشنی مجھ میں سرایت کرگئی | ذکر سے اس کے مرے لفظ و بیاں روشن ہوئے

رسول اکرم کا ایک نہایت ایقان افروز اور راہ راست پر چلنے کے تمنائی انسانوں کو خرد کی راہ دکھاتا ارشاد گرامی ہے کہ" ایسے عالم کے پاس مت بیٹھو جو دنیاوی علوم سے ناواقف ہو" ۔۔۔۔۔۔۔جناب نسیم سحر کو علی وجہ البصیرت میں ایک ایسا عالم گردانتا ہوں جو وسیع المطالعہ اور تحقیقی نظر سے متصف ہونے کے باعث کائنات کی وسعتوں، اس کے اسرار اور رب کائنات کی لاانتہا عظمتوں کا خوب خوب ادراک رکھتے ہیں۔ دیکھنے میرے اس خیال کی تصدیق ان کے یہ حمدیہ اشعار بخوبی کررہے ہیں۔

صدا اس کی بڑائی کی مسلسل آتی رہتی ہے | زمینیں حمد کہتی ہیں، سمندر حمد کہتے ہیں
نجانے کائناتیں اور بھی موجود ہیں کتنی | اور ان میں کیا خبر، کتنے سخن ور حمد کہتے ہیں
اسے تعظیم دیتے ہیں بہت سے اور بھی سورج | بہت سے اور بھی ماہ منور حمد کہتے ہیں
تسلسل حمد کا ہم ٹوٹنے دیتے نہیں ہرگز | نسیم اک حمد کہہ کر ہم مکرر حمد کہتے ہیں۔

''نعت نگینے'' میں مدحت پیغمبر معظم کے حوالے سے بھی جناب نسیم سحر عرفان و آگہی کی ایک ایسی اونچائی پر متمکن دکھائی دیتے ہیں جو یقیناً کم کم اصحاب سخن کو میسر ہے۔۔

جو دل کی ہو کیفیت وہی ہو زبان کی بھی — میں دھڑکنیں ہم زبان کرلوں تو نعت لکھوں
کچھ اور شفاف کرلوں، شفاف آئینے کو — یقین کو بے گمان کرلوں تو نعت لکھوں

***

ثنائے رب جلیل ہے اور روشنی ہے — نبی کا ذکر جمیل ہے اور روشنی ہے
جہاں جہاں بھی حضور اکرم نے پاؤں رکھا — قدم قدم اک دلیل ہے اور روشنی ہے
میں تشنگی اور تیرگی کا ڈسا ہوا ہوں — وہ میٹھے پانی کی جھیل ہے اور روشنی ہے
حیات احمد کا لمحہ لمحہ مرے سفر میں — نفس نفس سنگ میل ہے اور روشنی ہے

مدینہ منورہ سے ہم اہل ایمان کا قلبی تعلق اظہر من الشمس ہے اور اس کا سبب بھی، جناب نسیم سحر کے ہاں بھی یہ وابستگی اپنے عروج پر نظر آتی ہے لیکن ان کی عالمانہ بصیرت، احوال دنیا سے آگہی اور تاریخ عالم پر تحقیقی نگاہ نے اس شیفتگی و وارفتگی کو حد درجہ خوش رنگ، relevant اور rational بھی کر دیا ہے۔۔مدینہ منورہ میں اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت پہلی باقاعدہ اسلامی ریاست متشکل ہوئی اور اب قیامت تک کے لئے جہاں گیری، جہاں داری، جہاں بانی اور جہاں آرائی کے آداب سیکھنے کی خاطر اہل بصیرت کو یہیں سے اکتساب نور کرنا ہے۔۔

دراصل ہوئی اس دن تعمیر مدینے کی — ہجرت نے سنواری جب تقدیر مدینے کی
پہچان مدینے کی سرکار دوعالم سے — سرکار دوعالم سے توقیر مدینے کی

***

حرم کا راستہ بھولے ہوئے ہیں — یہی ہے داستاں، اہل حرم کی
اگر نافذ ہو منشور مدینہ ۔۔۔۔ — بدل جائیں گی تقدیریں امم کی

جناب نسیم سحر ایک مرد خود آگاہ وخدا آگاہ، صاحب شعور، اہل علم ہیں، چنانچہ وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر آخرالزماں کی اطاعت اور ان کی سیرت کو اپنانے میں کوتاہی وہ واحد سبب ہے جس نے مسلمانوں کے پیشوائے عالم بننے کی راہ روک رکھی ہے۔ان کا vision ملاحظہ فرمائیے :

کس سے نسبت ہے مری، کردار لیکن کیا مرا — سخت شرمندہ ہوں اپنا تجزیہ کرتے ہوئے
درحقیقت دے گئے ہیں ایک منشور حیات — سیرت اطہر کو ہم پر آئینہ کرتے ہوئے
کیا کہوں عقدے کھلے کتنے ہی قرنوں کے نسیم — اک نظر، نظارہء غار حرا کرتے ہوئے

***

پھیلے جہاں میں سیرت اطہر کی روشنی حقا، کہ بس علاج یہی تیرگی کا ہے

***

بس ان کی پیروی میں ہے اپنی سلامتی سمجھیں گے کب یہ نکتہ مسلمان ۔۔ دیکھئے!

جناب نسیم سحر ہمارے عہد کے معدودے چند قادرالکلام شعرا میں سے ہیں ۔میں ان کے معتقدین میں شامل ہوں لیکن میرا یہ اعتقاد بے دلیل نہیں، غزل کی طرح نعت میں بھی ان کی ہنروری سخن شناسوں کو مبہوت کر کے رکھ دیتی ہے ۔۔ مشکل ترین قافیہ و ردیف کو نعت کے مکمل آداب ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی خوش اسلوبی سے نباہ جانے کی کچھ مثالیں پیش کر کے اس یقین کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ آپ کو بھی "معتقد نسیم" ہوتے ہی بنے گی۔

اور کیا ان کے لئے ہو کوئی تاویل دلیل جن کی قرآن سے پہلے ہوئی انجیل دلیل
نور حق پر کسی تشکیک کی کیا گنجائش؟ روشنی کے لئے خود ہوتی ہے قندیل دلیل

***

مرحبا! آپ کا خطبہء الوداع ساری تاریخ میں وہ خطاب، انتخاب
یوں تو آتے رہے، انقلاب اور بھی وہ جو لا ئے ، وہی انقلاب، انتخاب

***

کیا خوب ہیں ہمارے لئے رہ نما اصول
ہم کو جو دے گئے ہیں شہ دوسرا، اصول
آئین کوئی اور نہ منشور کوئی اور
اپنا ہے صرف ، پیروی ء مصطفی اصول

***

ڈاکٹر شبیر احمد قادری

غالب اور ثنائے خواجہ ﷺ ــــ ایک مطالعہ

ABSTRACT: The article is based on critical study of book titled "GHALIB AUR SANAAIY KHWAJA "(S.A.W) compiled by Syed Sabeeh Rehmani comprising articles written by different scholars in Naat Rang. Dr. Shabbir Qadri has applauded the thoughts presented in the articles and quoted the gist of critical opinions of different writers along with his own comments. The aspect of opening new avenues of understanding views of Ghalib ,particularly on religion, has highly been appreciated by Dr. Qadri.

''غالب اور ثنائے خواجہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم'' اپنے موضوع کے اعتبار سے، میرے نزدیک ایک اہم اور منفرد کتاب ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے افکار و اشعار کی تفہیم کے ذیل میں جتنی کتب، تحقیقی مقالات اور رسائل و جرائد شائع ہوئے ہیں اتنے ایک محتاط اندازے کے مطابق اردو کے کسی اور شاعر کے حوالے سے منظر عام پر نہیں آئے۔ جہاں تک غالب کے نعتیہ اشعار کا تعلق اس ذیل میں اس قدر مربوط اور مبسوط انداز میں اس سے پہلے کام نہیں ہوا۔ غالب باقاعدہ نعت گو نہ سہی لیکن ایسا بھی کیا کہ اُن کی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے عقیدت کے پہلو کو سرے سے نظر انداز کر دیا جائے۔ ابتدائیہ میں کتاب کے مرتب سید صبیح الدین صبیح رحمانی، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی کتاب ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے ابتدائی جملے کہ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ''مقدس وید'' اور ''دیوانِ غالب''(۱) کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ صد سالہ جشنِ غالب پر ہندوستان اور پاکستان کے ہر ادبی اور نیم ادبی پرچے نے غالب کے فکر و فن اور زندگی پر وقیع مضامین شائع کیے اور بعض جرائد نے خصوصی نمبروں کا اہتمام کیا جو اپنی ضخامت اور مواد کے حوالے سے یادگار قرار پائے، لیکن مقامِ حیرت ہے کہ غالبیات کے اس سرمائے میں ہمیں غالب کی نعت نگاری پر کوئی ٹھوس اور قابلِ قدر کام نظر نہیں آیا۔ ضمناً کسی مضمون میں اس عنوان سے تذکرہ ہو جانا کوئی قابلِ ذکر بات نہیں۔ حالاں کہ غالب کے کلام

کی الہامی جہت کی طرف ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے بڑے پُر زور انداز میں متوجہ کیا تھا اور الہام کا درجہ اسلامی معاشرے میں کسی نہ کسی سطح پر دینی اقدار سے جڑا ہوا ہے۔ چناں چہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ غالب کی فکر کے الہامی رشتوں کی تلاش شروع ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا، اور نہ جانے کیوں ماہرینِ غالبیات اب تک مطالعۂ غالب کے اس روشن پہلو پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکے۔ الحمدللہ اس اہم موضوع پر غور و فکر کے دریچے وا کرنے کی سعادت غالب کی وفات کے تقریباً ایک سو بتیس سال بعد ''نعت رنگ'' کے حصے میں آئی۔'' (۲) بلاشبہ یہ ایک انوکھا اور قابلِ قدر کام ہے جس کا کریڈٹ سید صبیح رحمانی کو جاتا ہے۔ موصوف نے ''نعت رنگ'' کراچی کے بارھویں شمارے میں گوشۂ غالب کا اہتمام کیا۔ جس میں غالب کی نعتیہ شاعری کو زیرِ بحث لایا گیا۔ یہ شمارہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ سید صبیح رحمانی نے لکھا ہے کہ نعتیہ شاعری جس عظیم اور عالی مرتبت ہستی (نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کے حوالے سے وجود پاتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ کم از کم ہر مسلمان شاعر اس سعادت کے حصول کے لیے کچھ نہ کچھ لکھے۔۔۔ غالب بھی رند مشرب ہونے کے باوجود ایک مسلمان شاعر تھا، تو یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کا قلم کائناتِ انسانی کی سب سے بڑی ہستی کی توصیف و ثنا سے محروم رہتا۔ چناں چہ اس نے بھی توفیقِ ثنائے رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم پائی۔ اردو میں کہیں کہیں چند ایک نعتیہ شعر اس کے قلم سے نکلے لیکن فارسی میں اس کا خاصا نعتیہ کلام سامنے آیا ہے، جب کہ اس کی ایک نعت تو ادبِ عالیہ کا حصہ بن گئی ہے۔'' (۳) مرزا اسداللہ خاں غالب شروع سے ہی اربابِ نقد و نظر کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ اُن کے معاصرین سے لے کر عہدِ حاضر تک کے ناقدین کی جانب سے انہیں پذیرائی ملی ہے۔ غالب کے ایک ہم عصر، سر سید احمد خاں کی رائے میں غالب کا کلام:

رنگینیٔ معنی سے صفحہ کو گلرنگ اور طراحیٔ فکر سے کاغذ کو ارژنگ کرنا خاصہ اسی چمن طراز سخن وری نقاش صحیفہ ہنر پروری کا ہے۔ میں اپنے اعتقاد میں اُن کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں۔ (۴)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی رائے میں غالب وہ شاعر ہے کہ جس کی شعری کائنات میں عشقیہ، حُزنیہ، المیہ اور نشاطیہ جذبات اپنے طور پر الگ الگ بھی موجود ہیں اور ایک دُوسرے کے اندر جذب ہوتے ہوئے بھی ملتے ہیں۔ جذبات کی اس باہمی رفاقت سے غالب کی شاعری کا انسانی رویہ متعین ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا شاعر تھا کہ جس نے اپنے عہد کے شعرا کی طرح زندگی کو جزوی طور پر یا مختلف اکائیوں کی صورت میں نہیں دیکھا تھا۔ عہد غالب کے شعرا ایک محدود وژن کے اندر ہی گردش کناں رہتے ہیں۔ اُن کے اندر زندگی کی حقیقتوں کا وہ پھیلاؤ نہیں جو غالب کا حصہ ہے اور نہ ہی وہ زندگی کو گہرائی سے دیکھ

سکتے ہیں جب کہ غالب نے زندگی کو کلّیت کی شکل میں قبول کیا تھا۔ اس نے زندگی کے اجزا کو ایک ''کل'' کی صورت دے دی تھی۔ اس جیسے بڑے شاعر کے لیے کہ جس کی بصیرت اور بصارت لامحدود وسعت کی حامل تھی، زندگی کو ایک بڑے پیمانے پر ہی قبول کر سکتی تھی۔ (۵) ضیا حسین ضیا، غالب کے فکر و فن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب کی حرف و معنی میں نابغہ کاری ایک زمانے کے وجدان کا طلسم ہے اور جہاں بھی اردو میں کوئی چشمِ ذوق رکھتا ہے غالبیات اُس کا سرمۂ نظر ہے۔ غالب کا اردو دیوان اپنی معنی خیزی، ندرت بیانی اور تخیل پروری میں جس آفاق کو چھوتا ہے وہاں کے ماہ و نجوم کی اپنی شان، فضائے بسیط کی اپنی چھب اور سر نظر اور ورائے چشم کی بے نہایتی لباس وجود کی انوکھی زربانی کا منظر پیش کرتی ہے۔

(۶) ''غالب اور ثنائے خواجہ'' کو درج ذیل مشاہیر ادب کے مقالات سے زینت بخشی گئی ہے:

''ضیا احمد بدایونی (غالب کا نعتیہ کلام) ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی (غزلیاتِ غالب میں نعت کی جلوہ گری) پروفیسر شفقت رضوی (غالب! حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم میں) ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری (غالب کی نعتیہ شاعری) ادیب رائے پوری (غالب کے فارسی کلام میں نعت) پروفیسر محمد اقبال جاوید (غالب کی ایک نعتیہ غزل) عزیز احسن (غالب کی اُردو شاعری میں مضامین نعت کا فقدان) ڈاکٹر عاصی کرنالی (غزلیاتِ غالب کی زمینوں پر نعت گوئی) پروفیسر سید وزیر حسن (قدسی کی غزل پر غالب کی تضمین) ___ کتاب کے آخر میں کلامِ غالب کی دو تضامین بھی شامل ہیں۔ یہ تضامین ناصر کاظمی اور جعفر بلوچ کے کمال فن کی آئینہ دار ہیں۔

کتاب میں شامل پہلے مضمون نگار ضیا احمد بدایونی فکرِ غالب کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ ...... اردو میں غالب کا نعتیہ کلام نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ فارسی میں جو نعتیں انھوں نے لکھی ہیں، وہ ایک طرف اُن کی اُستادی کی بُرہان اور دوسری طرف عقیدت مندی کی جان ہیں۔ فارسی زبان پر اُن کی غیر معمولی قدرت اور شاعری میں ان کی فوق العادۃ صلاحیت کا ناقدانِ سخن اور اربابِ فن نے ہمیشہ اعتراف کیا ہے۔ اُن کے ہم عہد اور زمانہ مابعد کے تذکروں اور نیز آج تک کے انتقادی سرمایے پر نظر ڈال جائیے جس پر ہمارے دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے۔۔۔۔ وہ قدرت کی طرف سے شعر و ادب کا ایک غیر معمولی ملکہ لے کر آئے تھے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں (ص ۲۱) ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کا کہنا یہ ہے کہ غالب نے اُردو غزل کے حدود کی توسیع کی اور اردو غزل کو زندگی کا قدِ آدم آئینہ بنا دیا۔ اس آئینے کا جو ہر ذکرِ فخرِ بنی آدم ہے۔ غالب کی ذہنی اور فکری دُنیا کی تعمیر اسی ذات سے ہوئی ہے، غالب نے مرتبہ نبوت کو جس طرح سمجھا اور اپنے ایک فارسی شعر میں بیان کیا ہے اس کی کوئی مثال میری نظر سے نہیں گزری۔ صنفِ نعت کا وسیع مطالعہ رکھنے والوں سے بھی میں نے سوال کیا مگر وہ بھی کسی ایسے شعر

کی نشان دہی نہ کر سکے جو غالب کے اس شعر کے مقابل پیش کیا جا سکے:

تیر قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
لیکن کشودِ آں ز کمانِ محمد ست
(ص ۴۸)

پروفیسر شفقت رضوی رقم طراز ہیں کہ وہ روح کی گہرائیوں سے وجود خداوندی کے قائل اور اس کے وحدت پر ایمان رکھتے تھے۔ وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقدیس اور عظمت کے بھی قائل تھے۔ ان دونوں موضوعات پر اردو میں کم لیکن فارسی میں زیادہ اشعار ملتے ہیں۔ حمد ہو یا نعت ہر ایک میں ان کا مخصوص لہجہ اور دوسروں سے مختلف زاویۂ نگاہ ہے۔۔۔۔ ہمارے شاعر عموماً احد اور احمد کے فرق کو مٹانے کے درپے رہتے ہیں جو نہ تو ایمان کے نقطۂ نظر سے اور نہ شاعری کے اصول سے قابل قبول ہے۔ غالب نے خدا اور رسول کی قربتوں کے ساتھ اُن کے جُدا ہونے کا حال جس خوب صورتی سے ادا کیا ہے۔ اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔'' (ص ۵۶) ڈاکٹر محمد اسمٰعیل آزاد فتح پوری کی رائے میں غالب نے اپنی فارسی نعتوں کے ذریعہ نعتیہ شاعری کو کافی رنگارنگی اور وسعت عطا کی۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی اور قطعہ کی ہیئیات میں قابلِ قدر اور بیش بہا سرمایۂ نعت بہ طور اثاثہ، عشاقِ ادب اور قارئین کو مرحمت کیا۔ اُن کی یہ نعتیں مضامین واسالیب کے نقطہ ہائے نظر سے بھی متنوع اور رنگارنگ ہیں۔ نعتوں میں ان کا اندازِ بیان اُن کے فارسی اسلوب کی طرح سلیس اور سادہ ہے۔ (ص ۶۹) ادیب رائے پوری نے اس امر پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ غالب کی نعتیہ شاعری پر تحقیق اور پھر اس پر تنقید جو حق ادا ہونا تھا بصد افسوس کہتا ہوں کہ نہ ہو سکا (ص ۸۷) موصوف نے اپنے مضمون میں غالب کے فارسی کلام میں موجود نعتیہ اشعار کا سراغ لگایا ہے۔ ان کا انداز تحقیقی اور عالمانہ ہے۔ مضمون کے آغاز میں غالب کی سُر شناسی کے ذیل میں ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتاب ''غالب کے سات رنگ'' کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ غالب کے کلام میں حُسن اور کمال کی یک جائی نے جس ادبی قوس وقزح (قوس قزح؟) کے رنگ بنائے، یہ ان کے اپنے عدد کا کمال تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں موسیقیت رچی بسی ہوئی ہے (ص ۸۷) اس موقع ادیب رائے پوری نے بتایا ہے کہ اس موضوع پر تفصیل سے بہت جلد میرا تحقیقی مقالہ، ''غالب کی نعتیہ شاعری'' منظرِ عام پر' آپ جیسے محبّ اور پُر خلوص احباب کی دُعاؤں کے نتیجہ میں آنے والا ہے جو غالب کے سُر ساگر سے رُوشناس کرائے گا جس کی ہر تان دیپک ہے۔ (ص ۸۷) ادیب رائے پوری لکھتے ہیں کہ میدانِ شاعری کا وہ شہسوار، جس کے سخن معنی آفریں کا ایک ایک ٹکڑا بے مثال، گوہر آبدار، پروازِ فکر میں فلک مدار جس کے مرغ تخیل کی رسائی پر حکیم الامت رطب اللسان، وہ

جب اپنی فکرِ رسا کو بصد عقیدت اور محبت اور جذباتِ ایمانی کی کیفیتوں کے ساتھ مدحت ساقیِ کوثر کو متوجہ کرے گا تو اس قدح خوار کے ساغر میں کیا کچھ نہ سمٹ آیا ہوگا، جسے ہمارے ادب میں خاطر خواہ پیش کیا نہ جا سکا۔(ص ۱۰۰) ادیب رائے پوری کا یہ مضمون بوجوہ بہت اہم ہے کہ اس میں شعرا کے موازنہ کر کے استنباطِ نتائج کی سعی کی گئی ہے۔اب ان کی وفات کے بعد خدا جانے اس کتاب کا مسودہ کس حال میں ہے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید کے مضمون کا عنوان ہے، ''غالب کی ایک نعتیہ غزل''۔اس میں غالب کی ایک فارسی نعت کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔اس نعت کا مطلع ہے:

حق جلوہ گر زطرزِ بیان محمد است
آرے کلام حق بہ زبان محمد است

نعت درج کرنے سے پہلے پروفیسر صاحب اس شعر کو غالب کے باقی نعتیہ اشعار کے مقابلے میں ایک خالص نعت قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ اس کی ردیف ''محمد است'' اس بات کا ثبوت ہے کہ رسمانہیں بلکہ ارادتاً کہی گئی ہے اور اس کے آخری شعر کا قبولِ عام، نیت کے اس حسن کا خوب صورت ثمر ہے۔غالب، نعت کے یہ نو شعر نہ بھی کہتے تو یہی ایک شعر، ایک بھرپور نعت کا کام دے سکتا تھا اور خود نعت گو کے لیے توشۂ آخرت بھی بن سکتا تھا کیوں اس دربارِ دُربار میں کیفیت دیکھتی (دیکھی؟) جاتی ہے ،کمیت نہیں، وہاں دل کی دھڑکنیں، روح کی لرزشیں اور آنکھ کے آنسو بار پاتے ہیں۔یہاں تک کے احساس، لفظ بننے سے پہلے ہی موتیوں میں تُل جاتا ہے(ص ۱۱۵) اس نعت کا مقطع یہ ہے:

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

عزیز احسن نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ۔۔حساس شعرا جب تک کسی مضمون کو اپنی ذات کے اندر سمو کر شعر کا جزو بنانے کی صلاحیت حاصل نہ کریں اُس موضوع پر شعر کہنے سے اجتناب برتنے (برتتے؟) ہیں، کیوں کہ اِس طرح وہ محض بیانیہ شاعری کر سکتے ہیں جس کی سطح عام ذہنی سطح سے بلند ہونا محال ہوتا ہے اور جو تخلیقی سطح کی وہ بلندی نہیں چھو سکتی جو اعلیٰ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔غالب چونکہ شاعری کا ایک بلند آدرش رکھتا تھا اور اپنے شاعرانہ خیال (Poetic Perception) سے ہرگز اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہتا تھا، اس لیے اُس نے غزلوں میں کہیں کہیں بلا ارادہ نعتیہ مضامین کی بُنت ہی کو کافی جانا، نعت کہنے کی شعوری کوشش نہیں کی۔غالب اگر اس طرح کی کوشش کرتا تو کامیاب شاعری کے مواقع کم تھے۔''(ص ۱۴۳) ڈاکٹر عاصی کرنالی نے غالب کی زمینوں میں لکھی گئی نعتوں پر اظہارِ خیال کیا

ہے۔ایک مقام پر وہ رقم طراز ہیں کہ غالب کی یہ اور ایسی ہی بہت سی امتحان گاہیں ہیں جن سے مداحینِ رسالت کو گزرنا پڑتا ہے پھر ایک اور اعتبار سے دیکھیے کہ یہ نظامِ قوافی اور یہ ردیفیں بہت حد تک غزل اور تغزل کے مزاج اور فضا کے مطابق ہیں ۔ ان میں جذباتی سرمستیوں اور لغزش ہائے رندانہ کی بہت گنجائشیں ہیں۔اس تضمین کے حوالے سے سید وزیر حسین لکھتے ہیں کہ غالباً مرزا غالب نے کسی جذبے کے تحت تضمین تو اس نعت کی کر دی تھی لیکن اسے اپنے منتخبہ دیوان میں شامل نہیں کیا کیوں کہ یہ کُلیتاً اُن کی ملکیت نہ کہلاتی (ص ۱۵۵) اس مضمون کی نوعیت تعارفی ہے مناسب ہوتا کہ مضمون نگار مذکورہ تضمین کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا۔

''غالب اور ثنائے خواجہ'' کا آخری مضمون، ''عظمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطوطِ غالب میں'' (ص ۱۵۹ تا ۱۷۲) ہے اور مضمون نگار ہیں ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط ۔غالب کے خطوط ہمہ رنگی کی بدولت شروع سے اربابِ فکر و نظر کی توجہ کا مرکز رہے ہیں ۔تاہم ان خطوں میں غالب کے مذہبی میلانات خاص طور سرورِ سروراں صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے حوالے سے غالب کے خیالات پر بہت کم توجہ دی گئی ۔ ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط کا زیرِ نظر مضمون اس اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے ۔ غالب نہ تو معروف معنوں میں مذہبی آدمی تھے ، نہ باقاعدہ نعت گو۔ تاہم جہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ذکر مقصود ہوتا نوکِ قلم کو جھکا لیتے ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط رقم طراز ہیں کہ غالب کا عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم مومنانہ شان کا حامل ہے۔ان کا یہ عشق جاں سپاری اور قربانی پر منتج ہوتا ہے، جس کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے حتیٰ کہ جب مضمحل قویٰ غالب کے عناصر میں اعتدال نہیں رہا اور ضعف پیری نے انہیں شکنِ بستر بنا دیا تھا تب بھی رسولِ عربی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خاطر فدائیت کا جذبہ ان کے یہاں عنفوانِ شباب پر تھا۔

غالب کے خطوط میں ایسے بہت سارے گوشے ہمیں نظر آتے ہیں جب انھوں نے روادارانہ نہیں عقیدت کے اندھے پن سے نہیں بلکہ روح کی عمیق اور معاملاتِ عشق کی گونا گوں کیفیتوں کے لیے ایسے التزامات نہایت سازگار ہیں لیکن انہیں نعت کی ادب گاہوں میں لانا اور اُن میں تقدس مآب نعتیں کہنا بہ ظاہر محالات کی مد میں آتا ہے ۔ محبوب ہائے مجازی کا سروساماں محبوبِ خدا اور ممدوحِ الٰہی کے لیے کہاں زیبا ہے لیکن یہ حقیقتاً نعت گو شعرا کی عالی ہمتی، قدرتِ فن اور خصوصاً عشقِ محمدی کی برکات ہیں کہ یہ لائقِ تحسین شعرا اس بحرِ مواج کی طوفاں خیزیوں سے گزر کر بہ عافیت ساحلِ مراد تک پہنچتے ہیں ۔۔۔ ویسے بھی غالب کی پروازِ خیال کے ساتھ ہم پرواز ہونا اور آفاقِ بلند میں اس کا ساتھ دینا آسان کام نہیں اور پھر اس کی فضائے تغزل میں داخل ہو کر وہاں سے نعت کے ارفع آفاق میں بال کُشا ہونا یقیناً ''اعجازِ فکر وفن'' ہی کہلایا جا سکتا ہے ۔ (ص ۱۴۷ ۔۱۴۶) ڈاکٹر عاصی کرنالی نے اس ضمن میں ساجد اسدی، راغب

مراد آبادی، ابرار کرتپوری، ایاز صدیقی اور بشیر حسین ناظم کے مجموعوں (پیامبرِ مغفرت، ۱۹۷۵ء) (مدحتِ خیرالبشر ۱۹۷۹ء) (مدحت ۱۹۹۲ء) (ثنائے محمد ۱۹۹۳ء) اور (جمالِ جہاں فروز ۱۹۹۸ء) کا ذکر کیا ہے۔ ان شعرا میں سے ساجد اسدی اور بشیر حسین ناظم نے غالب کی تمام غزلوں اور باقی شعرا نے منتخب غزلوں کی زمینوں پر نعتیں کہی ہیں۔

پروفیسر سید وزیر حسن نے قدسی کی غزل پر غالب کی تضمین کے حوالے سے ایک مختصر مگر جامع مضمون لکھا ہے۔ یہاں پہلا بند (مخمس) نقل کرتا ہوں:

کیستم تا بہ خروش آور دم بے ادبی
قدسیاں پیشِ تو در موقف حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمۂ زیرِ لبی
مرحبا سیّدی مکی مدنی العربی
دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی (ص ۱۵۶)

گہرائیوں سے بے ساختہ اور برملا حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی عظمتِ باوقار کا اعتراف کیا اور نہ کرنے والوں کو متنبہ کیا۔ ان کی سرزنش کی۔ انھیں ٹوکا، بلکہ للکارا اور لتھاڑا بھی۔ ان کے خطوط کے تیور ہی سے ہم بھانپ لیتے ہیں کہ یہ بیانات رسمی نہیں ہو سکتے، یہ تحریریں روایتی نہیں ہو سکتیں بلکہ الفاظ کے ایک پہلو سے آپ کی عظمت کا بیان شعری پیکر میں ہوتا تو برائے شعر گفتن پر محمول کیا جا سکتا تھا لیکن یہاں تو معاملہ خطوط کا ہے جو سراسر نجی ہوتے ہیں اور مکتوب نگار کا اندرون ان میں جھانکتا ہے۔ یہ وہ شیشہ ہیں جس سے صاحبِ نامہ کی باطنی کیفیات عکس ریز ہوتی ہیں اور جو دل میں ہوتا ہے وہی قلم سے صفحۂ خط پر ٹپکتا ہے۔ (ص ۶۵-۱۶۴)

کتاب کے آخری صفحات پر ناصر کاظمی اور جعفر بلوچ کی ایک ایک تضمین شامل ہے۔ ناصر نے اردو قصیدے جب کہ جعفر بلوچ نے غالب کی فارسی نعت پر تضمین کی ہے۔ ناصر کاظمی کی چار بندوں پر مشتمل تضمین کا پہلا بند یہاں نقل کیا جاتا ہے؟

یہ کون طائر سدرہ سے ہم کلام آیا
جہان خاک کو پھر عرش کا سلام آیا
جبیں بھی سجدہ طلب ہے یہ کیا مقام آیا
''زباں پہ بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے'' (ص ۱۷۳)

جعفر بلوچ کی تضمین کا آخری بند دیکھیے:

شاعر ہوں میں ستارہ نگار و گہر رقم
وجدان و عقل میں نے کیے نعت میں بہم
اظہارِ عجز میں مری آنکھیں مگر ہیں نم
''غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک' مرتبہ دانِ محمد است'' (ص ۱۷۶)

''غالب اور ثنائے خواجہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم'' کی ترتیب و تزئین سید صبیح الدین رحمانی کا، کارنامہ ہے۔ اولیں سطح پر انہوں نے اپنے کتابی سلسلہ ''نعت رنگ'' کراچی میں گوشہء غالب کا اہتمام کیا بعد ازاں ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کر کے غالبیات کے ذیل میں ایک نیا دریچہ کھولا ہے۔ نقدِ غالب کے ذیل میں اس کتاب کو ایک جداگانہ حیثیت حاصل رہے گی۔ اس لیے کہ اس میں غالب کے فکر و فن کا ایسا زاویہ ابھارا گیا ہے جسے اس سے پہلے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اس کتاب کے مرتب کچھ نہ کچھ نیا سوچتے رہتے ہیں۔ سرمایۂ غالب میں ذکرِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے مضامین کی جمع آوری، ترتیب اور تزئین و اشاعت ان کے ذہنِ رسا اور بختِ رسا کی آئینہ دار اور ترجمان ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اِن الفاظ میں ''دیوانِ غالب'' کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں: مقدس وید اور دیوانِ غالب''۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں، لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے۔''
(عبدالرحمٰن بجنوری، محاسنِ کلام غالب، مرتبہ: ڈاکٹر طارق ہاشمی، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۹ء، ص۲۲)
محاسن کلام غالب کا آغاز اسی عبارت سے ہوتا ہے۔ تاہم اس سے پہلے غالب کے یہ دو شعر بھی نقل کیے گئے ہیں:

گر، شعر و سخن بدہر آئیں بودے — دیوان مرا شہرت پرویں بودے
غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے — آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

(۲) صبیح الدین رحمانی، سید، ابتدائیہ، غالب اور ثنائے خواجہ صلی اللہ علیہ وسلم
(مرتبہ: سید صبیح الدین رحمانی)، کراچی: نعت ریسرچ سنٹر، ۲۰۰۹ء، ص ۸۔۷

(۳) ایضاً ص ۸

(۴) سرسید احمد خاں، تذکرہ اہل دہلی، مرتبہ: قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۰۷۔105

(۵) تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۲۰۔19

(٦) ضیاء حسین ضیا، تبصرہ، مشکلاتِ غالب، مشمولہ: زرنگار، (مدیر: ضیا حسین ضیا) فیصل آباد، شمارہ نمبر ٦، ص ۳۸٦

☆☆☆

مولانا ملک الظفر سہسرامی، سہسرام (بہار) انڈیا

حرا کا چاند

ABSTRACT: A treatise of devotional poetry written by Rahi Ziyaaee has been reviewed hereunder. Poetic worth has been traced and presented with critical view point to denote contents of faith, feelings, contemporary sensibility and beauty of choosing appropriate words for expression. Elements of classical and original Islamic faith and ideology found in the poetry of Rahi Ziyaaee became point of admiration in this article.

اسلامی نقطۂ نظر سے نفس شاعری قابل تحسین نہیں رہی بلکہ شعراء کی آزاد خیالی اور فکری بے راہ روی کے سبب اسلام کے نزدیک شاعری قابل مذمت ہی سمجھی گئی۔ چنانچہ جب شعراء کی مذمت میں آیت قرآنیہ کا نزول ہوا تو اسلام کے دامن سے وابستگان کی نیند حرام ہوگئی اور روتے روتے ان کا حال خراب ہوگیا۔ لیکن اسی اسلام نے جب شعروسخن کا قبلہ درست کیا، آزاد خیالی اور فکری بے راہ روی کو پابند سلاسل کیا، بھٹکے ہوئے آہو کو حرم کا رستہ دکھا کر ان کے افکار وخیالات کی تطہیر فرمائی تو حضرت حسان بن ثابت انصاری، حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان جیسے دوسرے اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے شعروسخن سے بھی گلشن اسلام کی آبیاری اور حسن کاری کی قابل قدر زریں خدمات انجام دیں اور آج تک ان کی اتباع وپیروی میں شعراء حضرات فن شاعری کا استعمال حمد باری تعالیٰ، نعت پاک مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء میں کرتے چلے آرہے ہیں۔ جس طرح دشمنان اسلام اور شاتمان رسول علیہ التحیۃ والثناء کی گوشمالی اور ان کی ہجو قرن اول کے پاک طینت اصحاب کی خصوصیت تھی آج بھی ان کی اقتداو پیروی میں شعرائے اسلام اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہورہے ہیں۔ اس قبیل کے شعراء کو آقائے کائنات ﷺ نے **اللھم ایدہ بروح القدس**، جیسی پاکیزہ دعاؤں سے نواز کر دولت بے بہا عطا فرمادی۔ میرے خیال میں سرکار دوعالم ﷺ کی یہ مبارک دعا قیامت تک کے ان تمام مسلم شعرائے عظام کے حق میں ہے جنہوں نے اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی اقتداو پیروی میں شعروسخن کی بیاض روشن کی۔

نعتیہ شاعری ہر دور میں مسلمانوں کے بے قرار جذبوں کی تسکین کا سامان بنتی رہی اور اس گلستاں میں عقیدت ومحبت کے گل ولالہ کی کاشت ہر دور کے خوش بخت مسلمانوں کا ایمانی شیوہ رہا۔ سرکار دو عالم ﷺ کے جمال جہاں آراء کے ذکر جمیل سے اپنے فن کو جلا بخشنے کی سعادتیں حاصل کی جاتی رہیں۔ ان کے اوصاف حمیدہ کی بوقلمونیوں کا احاطہ شاعری میں کیا گیا لیکن حق یہ ہے کہ نعتیہ شاعری کا حق کسی سے ادا نہ ہو سکا اور نہ ادا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ آپ کے اوصاف حمیدہ کا بیان انسانی دسترس سے باہر ہے۔

لایمکن الثناء کما کان حقہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ان کی تعریف وستائش میں ہر بیان ناقص اور ادھورا محسوس ہوتا ہے۔ خدا کے بعد انہیں سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔

خدا کے بعد انہیں سب کہو خدا نہ کہو۔ اصغر گونڈوی کی زبان میں کہا جائے تو

اگر خموش رہوں میں، تو تو ہی سب کچھ ہے

جو کچھ کہا تو ترا حسن ہوگیا محدود

اس بارگاہ ناز میں ہر بیان عجز بیان کا نمونہ بن کر سامنے آتا ہے جب ہی تو حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نعتیہ شاعری کی شاہ راہ سے گزرتے ہوئے اپنی اسی بے بسی کا اظہار فرماتے ہیں:

ماان مدحت محمدًا بمقالتی

لکن مدحت مقالتی بمحمد

غالب جیسے استاذ اور قادر الکلام شاعر نے نعتیہ شاعری کے میدان میں قدم رکھے تو یہ بھاری پتھر ان سے نہ اٹھ سکا اور اپنے فکر وفن کی سلامتی اسی میں محسوس کی۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم

کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدیست

اوصاف محمدیہ علیہ التحیۃ والثناء کے بیان میں قادر الکلام شاعر نعت سیدی امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہٗ اسی عجز بیان کو اپنی نعتیہ شاعری کا دیباچہ واختتامیہ بناتے ہوئے گویا نظر آتے ہیں۔

تیرے تو وصف عیب تناہی سے ہیں بری		حیراں ہوں میرے شاہ میں کیا کیا کہوں تجھے

لیکن رضا نے ختم سخن اس پہ کردیا		خالق کا بندہ خلق کا آقا کہوں تجھے

عاجزی ودرماندگی کے تمام تر اقرار وعتراف کے باوصف ہر دور میں مخلص ارباب فکر نے بے قرار جذبوں کی تسکین کے لیے نعت کی بیاض سجائی سنواری۔ حضرت راہی ضیائی بھی انہی مخلص ارباب فکر

وخیال کی ایک کڑی ہیں جنہوں نے نام ونمود سے دور رہ کر ایوان نعت کو اپنے اشعار سے سجانے سنوارنے کی کوشش کی۔ آپ کا تعلق شعرائے کرام کی اس نسل سے ہے جو لفظوں کی شیشہ گری سے زیادہ معانی کے لعل وگہر تلاش کرنے میں رہتی ہے۔ زیر تبصرہ مجموعہ نعت ''حرا کا چاند'' موصوف کی نعتیہ شاعری کا مجموعہ ہے جس میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۳ء تک تحریر کیے جانے والے نعتیہ کلام شامل کیے گئے ہیں۔ اس مجموعہ ؟ کلام میں حضرت راہی ضیائی نے اپنا کوئی تعارف نامہ شامل کرنے سے قصداً گریز فرمایا ہے میرے خیال میں وہ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ

میں غلام رسول اکرم ہوں
یہ تعارف بڑا تعارف ہے (منیر قصوری)

یقیناً ان کا یہ مختصر لیکن باوزن مجموعۂ نعتیہ شاعری سرکار دو عالم ﷺ کی غلامی کا اظہار یہ بن کر سامنے آیا ہے اور ایک دیندار مسلمان کا اس سے بہتر کوئی دوسرا تعارف نامہ تحریر نہیں کیا جاسکتا۔

''حرا کا چاند'' عقیدت ونیاز مندی کی بیاض ہے تو عقائد ونظریات کا غیر مبہم اشاریہ بھی۔ سرکار دو عالم ﷺ کی بوقلموں صفات کا عکس وآئینہ ہے تو وہیں اس میں عشق رسول کونین ﷺ کی بہار جاں فزا بھی عقائد باطلہ فاسدہ کے ردو تردید کی جولانیاں ہیں تو استدلال کا زور بیان بھی، فکر ونظر کی پاکیزگی ہے تو تخیلات کی بلندیاں بھی۔

سرکار دو عالم ﷺ کے بیان حسن وجمال پہ ہر صاحب فکر کا تخیل دست بستہ نظر آتا ہے کوئی قلم ایسا نہیں جو آپ کے بے کراں حسن وجمال کا عکس وآئینہ بنا سکے، کوئی بیاض ایسی تیار نہیں ہوئی جس میں آپ کے جمال جہاں آراء کا کماحقہٗ بیان آسکا ہو۔ سیدنا حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ کے حسن وجمال کا خاکہ مرتب فرمایا تو یہی کہا

واجمل منک لم ترقط عینی واحسن منک لم تلد النساء
خلقت مبرأ من کل عیب کانک قد خلقت کماتشاء

حضرت منیر قصوری نے آپ کی اتباع وپیروی فرمائی تو یہ قطعہ اردو داں طبقے کے سامنے بطور ترجمہ پیش فرمایا

حضور آپ سے بڑھ کر کوئی حسین وجمیل نہ میری آنکھ نے دیکھا، نہ عورتوں نے جنا
حضور آپ تو ہر عیب سے مبرا ہیں کہ جیسا آپ نے چاہا خدا نے خلق کیا

فکر وخیال کی تمام تر بوقلمونیوں کے باوصف نعت کے میدان میں عجز بیانی ہر بلند فکر وخیال شاعر کا اعتراف نامہ بنا۔

شان ان کی سوچیے، اور سوچ میں کھوجایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہوجایئے

(خورشید رضوی)

قلم خوشبو کا ہو اور اس سے دل پہ روشنی لکھوں
مجھے توفیق دے یارب کہ میں نعت نبی لکھوں

(صبیح رحمانی)

نعتیہ شاعری اگر جذبات واحساسات کی ترجمان رہی ہے تو وہیں عقائد ونظریات کا اظہار یہ واشاریہ بھی، اگر دردِ دل کی تڑپ کا احساس اس میں نمایاں ہوتا ہے تو وہیں وہ امت شکستہ حال کا شہر آشوب بھی اور بارگاہ نبوی علیہ التحیۃ والثناء میں استغاثہ اور فریاد بھی ہے۔ حضرت راہی ضیائی بھی اس چارہ ساز بے کساں، والی امت کے حضور ااستغاثے کی زبان بن کر فریادی نظر آتے ہیں۔

غموں کے مارے مسلماں کی داستاں سنیے ذلیل وخوار، پریشاں کی داستان سنیے
حضور! میری عقیدت سلام کہتی ہے شکستہ حال یہ امت سلام کہتی ہے
مٹایئے مرے ماتھے سے کلفتوں کے نشاں حضور! میری عقیدت سلام کہتی ہے
حضور! میری عقیدت سلام کہتی ہے ہر ایک ساعت کلفت سلام کہتی ہے

لاریب دارین کی تمام بہاریں آقائے کونین ﷺ کے دم قدم سے ہیں۔ عزت وسرخ روئی کا دیباچہ ان کے مقدس قدموں سے لپٹ کر، خاک پائے ناز چوم کرتحریر ہوتا ہے۔ زندگی وبندگی کے تمام اوراق پر انہی کے نقش قدم سے روشنی وتابانی ہے، اجالوں کی تمام کرنیں انہی کے عارض منور سے خیرات لے کر طلوع ہورہی ہیں، ان کے نقش قدم سے الگ ہٹ کر نہ زندگی، زندگی ہے اور نہ ہی بندگی، بندگی۔ یقیناً اس بابرکت ذات سے۔۔۔۔

سب حروف روشن ہیں
سب ورق سنہرے ہیں
زیست کی کتابوں کے

یقیناً دین ودنیا کی تمام بہاریں آپ کی ذات اقدس کا صدقہ وخیرات ہیں۔ آپ کے نقش قدم پہ مرمٹنے والے دارین میں تاجدار بے نظر آتے ہیں۔

اے زہے قسمت اگر دشت جہاں میں آپ کے
نقش پا پر چلتے، چلتے نقش پا ہوجایئے

یہی اظہار خیال حضرت راہی ضیائی کی شاعری کا بھی حصہ بنتا نظر آرہا ہے۔

شعور زندگی ٹھہرا، فراز بندگی ٹھہرا
وہ رستہ جو نبی کے پائے اطہر کے نشاں تک ہے
وہ راستہ جو ہے منسوب ان کے قدموں سے
وہی تو خلد کا رستہ دکھائی دیتا ہے
دکھلاتا ہے جو منزل مقصود کا رستہ
وہ سرور عالم کے کف پا کا نشاں ہے

نعتیہ شاعری ہر دور میں مسلمانوں کے بے قرار جذبوں کی تسکین کا سامان بنتی رہی اور اس گلستان عقیدت ومحبت میں گل ولالہ کی کاشت ہر دور کے خوش بخت مسلمانوں کا ایمانی شیوہ رہا۔ نعت پاک کی ابتدا کے سلسلے میں دانشوروں کے مختلف خیالات اور الگ الگ آراء ہیں۔ لیکن اعتراف حقیقت یہ ہے کہ اس کی جڑیں بہت گہری اور اس کی شاخیں بے پناہ پھیلی ہوئی ہیں، پیش لفظ کے تحت ڈاکٹر سید محمد اکمل اجملی رقمطراز ہیں۔

''نعت کی تاریخ عظیم ہی نہیں اس کی جڑیں کافی دور تک اپنا پھیلاؤ رکھتی ہیں، قرآن وحدیث کے مطابق جو نعت گوئی کے لیے اصل سرچشمہ اور آپس میں اجمال وتفصیل کی حیثیت رکھتے ہیں نعت کی ابتداء خدائے پاک کی خلقت اول سے ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی قرآن کریم کی آیات لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدْ وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدْ یا اِنَّ اللهَ وَمَلٰئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ یا يَآاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلُ اِلَّا قَلِيْلاً یا يَآ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، یونہی حروف مقطعات مثلاً طٰهٰ، یٰسٓ، المص، یہ سب نعت محمدی کی واضح وروشن دلیلیں اور تاریخ نعت کی اہم کڑیاں ہیں، یہ تو چند مثالیں ہیں جو میں نے دی ہیں ورنہ پورا قرآن کریم نعت محمدی سے پر ہے۔ اور پھر پروردگار عالم جل جلالہٗ کے حکم سے نہ صرف اس کے مقدس فرشتوں نے سیدنا آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہوکر نور محمدی کو تعظیم دی اور عملی طور پر خود کو محمد عربی ﷺ کے مداحوں میں شریک وثابت کیا بلکہ خدائے پاک کی تمام مخلوقات میں ان کی صفات کے گن گائے اور ان کی خوبیوں کو بیان کیا، بالخصوص انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانے میں ان کے اوصاف وکمالات بیان کیے اور ان کی آمد کی پیشگوئی فرمائی، ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام نے ان کے اوصاف بیان کیے اور انہیں اپنا وسیلہ بنایا، جناب شیث علیہ السلام نے انکا ذکر کیا، حضرت نوح علیہ السلام نے ان کی صفات گنائیں، سیدنا ادریس علیہ السلام نے ان کی تعریف کی، ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی بعثت کے لیے دعاء کی اور ان کے علم وحکمت کے گیت گائے اور حضرت سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اپنے کردار وعمل سے ان کے صبر واستقامت کو خراج پیش کیا۔

غرضیکہ رسول عربی کا نور پاک جس جس کی پیشانی میں چمکا ان سبھوں نے آپ کی انفرادیت اور کمال یکتائی کے گیت گائے، اس لیے کہ یہی نور پاک سب کی نجات کا باعث تھا، اسی نور کی بدولت

سارے لوگ مامون ومحفوظ تھے۔

اگر نام محمد را نیاوردے شفیع آدم

نہ آدم یافتے توبہ، نہ نوح از غرق نجینا

رفعت مقام مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کے تعلق سے بعض کج فہم حضرات کا یہ اعتراض ہے کہ ہم مداحان مصطفیٰ ﷺ نعت نگاری کے مرحلے سے گذرتے ہوئے مبالغے سے کام لیتے ہیں بلکہ بعض تو یہاں تک کہہ گذرے ہیں کہ ثنائے مصطفیٰ ﷺ میں ہم غلو کی حد سے گذر جاتے ہیں، اولاً ایسا کوئی خوش عقیدہ شاعر پیش نہیں کیا جاسکتا جس نے عبد ومعبود کا فرق ملحوظ نظر رکھے بغیر نعت گوئی کی ہو۔ دوم یہ کہ حد سے گذرنے کا دعویٰ اس وقت قابل قبول ہوگا جب مقام مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی حد مقرر کردی جائے۔ رفعت مصطفیٰ ﷺ کا پیمانہ مقرر کردیا جائے، ورفعنا لک ذکرک، اے محبوب ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند فرمایا''

میرے خیال میں آج تک ایسا کوئی پیمانہ مقرر نہیں ہوسکا جو مقام رفعت مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثناء کی حد مقرر کرسکے یہاں تو بس اگر کوئی حد ہے تو یہی ہے۔ ع

خدا کے بعد انہیں سب کہو خدا نہ ہو

اور اسی اسلامی فکر کے زیر اثر شعرائے کرام بیاض نعت میں سرکار دو جہاں فخر موجودات، رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے جمال جہاں آراء کی تصویر کشی ومنظر نگاری کرتے ہیں نیز ان کی بوقلموں صفات کے بیان سے نعتیہ شاعری کو تب وتاب دیتے نظر آتے ہیں۔ حضرت راہی ضیائی بھی اسی لئے میں لئے ملاتے ہوئے نعتیہ شاعری کا سفر تدریجاً طے کرتے نظر آتے ہیں۔

انہوں نے اپنی نعتیہ شاعری کو اپنے عقائد ونظریات کا ترجمان بنا کر پیش کیا ہے۔ سلف سے خلف تک جمہور مسلمین کا جن عقائد ونظریات پہ اتفاق تھا آج ان کے خلاف منصوبہ بند انداز میں محاذ آرائی کی جارہی ہے، اصحاب کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ایمان واسلام کو ہی قرآن مقدس نے قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے معیار مقرر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ''فان آمنوا بمثل ما آمنتم به فقد اهتدوا''

جن عقائد ونظریات کے خلاف آج شرک وبدعت کے نعرے لگائے جارہے ہیں وہ قرن اول کے مقدس مسلمانوں کا نشان امتیاز رہا ہے۔ حضرت راہی ضیائی کا یہ مجموعۂ نعت ''حرا کا چاند'' بھی انہی اسلامی عقائد ونظریات کا ترجمان بن کر ابھرتا ہے۔ ان کے نعتیہ اشعار میں اگر تعلق باللہ کا اظہار ہے تو وہیں رسول کونین ﷺ سے رشتۂ غلامی مضبوط کرنے پہ بھی زور صرف کیا گیا ہے۔

سرزمین نجد سے اہانت رسول کی ایک مہم کا آغاز ہوتا ہے۔ ابن تیمیہ کے غیر اسلامی افکار ونظریات کے فروغ میں محمد بن عبدالوہاب نجدی نے نام نہاد توحید خالص کا علم بلند کیا اور توحید کے پرستاروں کو ایک نئی راہ پہ لگا دیا۔ نئے عقائد ونظریات کی داغ بیل ڈالی جس کا تانا بانا اسلام اور دین سے قطعی نہیں ملتا۔ رسول کونین ﷺ کی صفات عالیہ پر حملے کیے گئے، ان کے علم وفضل پہ نکتہ چینیاں کی گئیں، علم غیب عطائی کا نہ صرف انکار کیا گیا بلکہ تمسخر واستہزاء کے انداز میں گفتگو کی گئی، اختیارات مصطفےٰ کا انکار کیا گیا۔ ان باطل افکار ونظریات کے ردوابطال میں علمائے اہل سنت ہمیشہ نثر ونظم کے ذریعے سرگرم عمل رہے۔

حضرت راہی ضیائی بھی انہی حق پسند، حق گو علماء کے شانہ بشانہ نظر آتے ہیں اور اشعار میں انہوں نے ان باطل عقائد ونظریات کا سنجیدگی کے ساتھ بھرپور رد فرمایا ہے۔ آقائے کونین ﷺ سے بڑے بھائی کا رشتہ قائم کرنے کی ناپاک جسارت کرنے والے کورچشموں سے تخاطب فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔

بعد میں کیجئے دعوی مثلیت
پہلے قوسین تک تو گذر جایئے

لاریب تمام رفعت افلاک جس کی گرد راہ ہو، جو مقام ''قاب قوسین اوادنیٰ'' سے گذر رہا ہو اس سے مثلیت اور ہمسری کا دعویٰ فکری ونظریاتی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے۔ اس مقام پہ تو ایک مومن کامل کا عقیدہ حضرت راہی کی زبان میں یہی بول رہا ہے۔

منزل قاب قوسین ان کو ملی
اپنے جیسا انہیں کس طرح ہم کہیں

جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مالک ومختار نہیں۔ ایسے گستاخ اور دریدہ دہنوں کو مکمل استدلالی قوت کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

اے کج نگاہ! دیکھ صداقت کی آنکھ سے
اعجاز واختیار جو شق القمر میں ہے

اس شعر میں ''صداقت کی آنکھ سے'' کا استعمال بھی بہت معنیٰ خیز محسوس ہوتا ہے۔ ایک مفہوم تو بالکل ظاہر ہے۔ لیکن دوسرا معنیٰ یہ بھی نکلتا ہے کہ معجزۂ شق القمر کو حضرت سیدنا صدیق اکبر ودیگر جاں نثار اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی نظر سے دیکھا جائے تو اس میں رسول اللہ ﷺ کا جو سراپا ابھرتا ہے وہ ایک مجبور کا نہیں بلکہ مختار کل کا۔ لیکن اختیار کی یہ تمام بہاریں دامن مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ اسے نظر آئیں گی جسے صداقت کی نظر نصیب ہوئی ہے۔ منافقت کی نگاہ سے یہ تجلیات نہیں دیکھی جاسکتیں۔

آنکھ والے تیرے جوبن کا تماشا دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر؟ کیا دیکھے

منکرین اختیار مصطفےٰ ﷺ کو مشاہدات کے اجالے میں اختیار مصطفےٰ کی بہاریں دکھاتے ہوئے حضرت راہی فرماتے ہیں:

اللہ رے مختار دوعالم کا تصرف
یارائے سخن پائے حجر دیکھ رہے ہیں

ادب واحترام بارگاہ نبوی علیہ التحیۃ والثناء کا درس تو ہمیں اصحاب کرام سے ملا قرآن مقدس کے روشن صفحات میں بارگاہ نبوی کے تعلق سے ادب واحترام کی شمع قدم بقدم تابناک نظر آتی ہے۔ حضرت راہی اس بارگاہ ناز میں پلکوں سے چلنا بھی بے ادبی تصور کرتے ہیں اور بے ادبوں کو ایمان کی مکمل حرارت کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

جلیں تو جلتے رہیں دشمنان دین وخرد
جنہیں ہے پاس ادب وہ قیام کرتے ہیں

عقیدے کے اس شعر میں کس قدر برجستگی ہے، کیا حسین پیرایۂ بیان ہے ''جلیں تو جلتے رہیں'' اور پھر ''دشمنان دین وخرد'' کی ترکیب بھی بہت بلند اور معنیٰ خیز ہے یعنی آداب بارگاہ نبوی میں ادب واحترام کی تصویر بن جانے والے عقیدت مند مسلمانوں پر جو لوگ چیں بجبیں ہور ہے ہیں وہ دشمنان دین ہی نہیں عقل وخرد سے بھی پیدل ہیں۔

ہر شاعر کی فکر اور اس کا تخیل رفعت وعظمت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے بیان میں عجز بیان کا شکار نظر آتا ہے اور مقام مصطفیٰ کے بیان میں اپنی بلندی فکر اور پرواز تخیل کی بے بسی کا اسے قدم بقدم احساس ہوتا ہے۔

یہاں تو ہر بیان عجز بیان کا نمونہ بن جاتا ہے پرواز تخیل میں حضرت راہی ضیائی بھی اسی بے بسی اور عجز بیانی کا ظہار کرتے ہیں۔

زمیں سے آسماں تک یا مکاں سے لامکاں تک ہے
خدا جانے مرے سرکار کی عظمت کہاں تک ہے

سرکار دوعالم کے حسن سراپا اور جمال جہاں آرا کے بیاں میں ہر عقیدت مند و نیاز مند نے نجوم و کہکشاں کی بارات سجائی ہے لیکن حضرت ام معبد نے رسول کونین ﷺ کے حسن وجمال کی جو تصویر کشی کی ہے اور جو خاکہ مرتب فرمایا ہے اس کے سامنے تو ہر بیان پھیکا پھیکا سا لگتا ہے، تاہم عقیدت مانتی کب

ہے؟ حضرت راہی ضیائی نے بھی اس راہ میں عقیدت و نیازمندی کے چراغ جلائے ہیں اور اجمال میں آپ ﷺ کے بوقلموں حسن و جمال کی تصویر کشی خوبصورت انداز میں کر کے گذر جاتے ہیں۔

جس پہ قربان ہے کائنات جمال
وہ حسیں داستاں یا نبی آپ ہیں

تیور بدلتے ہیں اور لب و لہجے کو نیا رنگ و آہنگ دیتے ہیں تو پھر اس طرح کا مضمون نظم ہوتا ہے۔

تعالی اللہ حسن پائے ناز احمد مرسل
کہ اس کی ضوفشانی منزل ہفت آسماں تک ہے

''چراغ حرا'' سرکار دوعالم ﷺ کے جمال جہاں آراء کا بیان بھی ہے اختیارات و معجزات کا دیباچہ بھی اور شکست حال امت کا استغاثہ بھی

ہے روح پریشاں امت کی ہر سمت گھٹا ہے ظلمت کی
اے نور خدا اے نورِ مبیں اے عظمت کعبہ آجاؤ
شکستہ حال ہیں اب خیر امت کے لقب والے خدا را کیجئے بندہ نوازی یارسول اللہ
نہ کردے مجھ کو خائف کفر کی یہ تیز و تند آندھی اغثنی یارسول اللہ اغثنی یارسول اللہ

یوں تو سرکار دوعالم ﷺ کی محبت کے اسیر تمام مسلمان نظر آتے ہیں لیکن محبت کے اس دعوے پہ مالک کونین ﷺ نے اپنی مہر تصدیق ثبت فرمادی اور اسے اپنی غلامی میں قبول فرمالینے کے شرف سے نواز دیا تو یقیناً اس مومن کی غلامی کی معراج ہے اسی آرزو و تمنا کا اظہار حضرت راہی ضیائی بھی کرتے ہیں۔

کبھی راہی ضیائی کاش کہہ دیں سرورِ عالم
کہ ترے درد کا رشتہ ہمارے آستاں تک ہے

حضرت راہی ضیائی کی تڑپ، اضطراب اور بے چینی کا یہ تیور ملاحظہ کیجئے جس میں تمنا اور آرزوئیں مچل رہی ہیں۔

بس اک تبسم جاں بخش سے مرے آقا
نواز دیجئے راہی کو جانکنی کے قریب

یہ شعر بھی اضطراب کے اسی تیور میں ملاحظہ کیجئے۔

میں ڈوبتی سانسوں کو جاں بخش بنالوں گا
کونین کے آقا کا اے کاش نظارا ہو

''ڈوبتی سانسوں کو جاں بخش بنالینے'' میں جو خوبصورت استعارہ ہے حضرت راہی کی نعتیہ شاعری

کا خاص تیور اور انوکھا انداز ہے۔

یقیناً یہ مجموعۂ نعت اس دور کی نعتیہ شاعری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرنے کی اہلیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ کہیں کہیں کاتب کا تصرف بے جا کھٹکتا ہے ایک مقام پہ ہے۔

ہم مانگ وہ لائیں گے انوار مدینے سے
یہ ربط مسلسل ہے ایمان و عقیدے کا

حضرت راہی ضیائی کی زبان و بیان کی لطافت اور لب و لہجے کی جو پاکیزگی ہے اس سے یہ شعر میل نہیں کھاتا۔

والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ کی روشنی میں حضرت راہی ضیائی کا تخیل اور ان کی فکر بہت عمدہ اور نفیس مضمون بندی کے مرحلے سے گذرتی ہے۔

ضیائے چہرۂ زیبا سے ہے جمال سحر
کمال شمع شبستاں ہے گیسوؤں کا اثر

لیکن اس بے پناہ بلند فکر کے حامل خوبصورت شعر میں چہرۂ زیبا کی ترکیب گراں ہو جا رہی ہے جب کہ یہاں اس امر کی بخوبی گنجائش تھی کہ۔

ضیائے روئے منور سے ہے جمال سحر
کمال شمع شبستاں ہے گیسوؤں کا اثر

''چراغ حرا'' یقیناً اپنے متن و مافیہ کے اعتبار سے نعتیہ شاعری کے گلشن میں ایک خوشگوار ہوا کا جھونکا محسوس ہوتا ہے۔ جس کے لمس سے ذہن و فکر اور قلب و روح میں ایک تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

محمد زمان نظامی، مانسہرہ

روشنی کے خدوخال......ایک مطالعہ

ABSTRACT: The article placed hereunder throws light upon craftsmanship of poet Rafi-uddin-Raaz whose sestina [poem of six six-lined stanzas] has been acclaimed by critics and introduced herein. The content of the sestina 'ROSHNI KAY KHAD-O-KHAL' is the life sketch of Holy Prophet Muhammad(S.A.W), highlighting therein features of reforms that emerged after spreading Islam in the society which was posing adversity, in each and every field of life, towards mankind. This sestina is an out standing work in line with the similar efforts of some poets like Altaf Hussain Hali, Hafeez Jalundhari, Mehshar Rasool Nagri and Ahsaan Danish, because of its literary qualities. The sestina comprises of 23 chapters and 406 stanzas. Each stanza concluded on the same poetic line (misra), مرحبا صلِ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی

نعتیہ ادب کا تاریخی وعصری منظر نامہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ نعت ہمارے شعروادب کی ایسی قابلِ قدر روایت بن چکی ہے، جو شاعری میں عبادت کے عنصر وعوامل کے سازوبرگ کا سامان بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ ادب کی قلم رو ثابت ہورہی ہے۔ آغازِ اسلام سے اب تک بیش تر زبانوں میں نعتیہ ادب کا عظیم ذخیرہ اور قیمتی سرمایہ جمع ہوچکا ہے، جو ادبی وعلمی لحاظ سے خود ایک بہترین ادب ہے۔ عربی وفارسی زبان کی طرح اُردو زبان وادب میں بھی نعت گوئی کی معجزنمائی جاری ہے۔ متعدد نعتیہ تخلیقات منصۂ شہود پر ایک طرف تو گل ہائے عقیدت کی صورت میں فکروخیال کے نئے دریچے وا کررہی ہیں، جب کہ دوسری جانب اُسلوبیاتی سطح پر بھی تازگی پہنچارہی ہے۔ ان تخلیقات میں سے ایک نہایت اہم تخلیق ''روشنی کے خدوخال'' ہے۔ جس کے تخلیق کار رفیع الدین راز قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے اُردو شاعری میں منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ''روشنی کے خدوخال'' اُن کی نعتیہ شاعری پر مشتمل پہلا نعتیہ مجموعہ ہے، جو مسدس کی ہیت میں ہے۔ یہ معرکہ آرا نعتیہ مسدس ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آیا اس میں کُل ۲۳ ابواب اور (۴۰۶) بند ہیں جب کہ ضخامت ۲۵۴ صفحات ہے۔

اس نعتیہ مجموعے کا نام ''روشنی کے خدوخال'' فکری زاویے سے معنی و مفاہیم کی بے پایاں وسعت رکھتا ہے۔روشنی سے مراد ہستی فراز کن مالک ارض وسمٰوات ہیں۔ خالقِ کائنات نے روشنی کو مجسم ومقسوم کرنا تھا،اس لیے انسانیت کو شرف بخشا اور خاتم الانبیا کو مبعوث فرمایا یوں ذاتِ رسول اپنے ربّ کے اخلاق کا آئینہ بن گئی اور ابد تک انسانیت اس منبعِ رشد وہدایت کے انوار وتجلیات سے فیض یاب ہوتی رہے گی۔اسی نسبت سے عنوانِ مسدس ذاتِ رسول سے منسوب ہے۔''روشنی کے خدوخال'' مولانا الطاف حسین حالی کی ''مدوجزر اسلام'' حفیظ جالندھری کی ''شاہنامۂ اسلام'' محشر رسول نگری کی ''فخرِ کونین'' اور احسان دانش کی ''دارین'' کے بعد مسدس کی ہیت میں اپنی نوعیت کا منفرد اور اہم تخلیقی کارنامہ ہے اس معتبر اور مانند قمر مجموعہ میں کائنات کے سب سے بڑے اور جامع موضوع ''سیرت النبی کو نظم کیا گیا ہے۔سیرت النبی کا موضوع بے پایاں وسعت کا حامل ہے حیاتِ رسول کے تمام گوشوں کو اس انداز سے منظوم کرنا کہ حسنِ خیال کے ساتھ حسنِ ادا بھی دیدنی ہو آسان امر نہیں لیکن اس نعتیہ مسدس کا ہر بند فکر وفن میں ملفوف سیرت النبی کے تمام گوشوں کے فکری تنوع کو اس طرح مترشح کرتا ہے کہ قاری کو ہر بند حسنِ عقیدت و پاکیزگیِ خیال کے ساتھ ساتھ احساسِ محبت سے پُر اثر اور دل آویز کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔نفسِ مضمون کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے دورِ جاہلیت سے آغازِ اسلام اور دورِ نبوّت سے اسلام کے عروج تک کے تمام حالات وواقعات کے بیان نے اس مجموعے کو جامع ،مکمل ،پر جمال اور نمونہ کمال بنادیا ہے۔اس خصوص میں اے خیام اپنی رائے پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ نعتیہ کلام نہیں ہے، یہ صرف ایک طویل نظم بھی نہیں ہے۔یہ شاہنامۂ اسلام بھی نہیں ہے اور یہ نثری تاریخ بھی نہیں ہے اس مسدس کی شاعری حقیقت سے روشناس کرتی ہے ،ٹھوس اور کھردری حقیقتوں کو شاعری کے جامے میں عکس ریز کرتی ہے اور کھردری حقیقتیں حاوی ہونے لگتی ہیں تو انہیں شاعری کی خواہش لباس فراہم کردیتی ہے۔اس میں داستانوں کی طرح آغاز ہے، پھیلاؤ ہے، وسعت ہے،خوش بیانی ہے عروج واختتام ہے۔''......(۱)

نعت ایک ایسی صنف ہے جس کی ہنرورانہ پیش کش ہر صاحبِ دل اور صاحب احساس تخلیق کار کے جذبات میں موجزن رہتی ہے جب ان جذبات واحساسات میں عشقِ رسول کی بناپر ہلچل پیدا ہوتی ہے تو عقیدت ومحبت کا اظہار تعریفی وتوضیحی کلمات کی صورت میں نکلنے لگتا ہے۔اس مسدس کا آغاز ایسے ہی کلمات میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ہر لفظ میں دل کی دھڑکنوں کی بازگشت محسوس ہوتی ہے۔سرکارِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تاریخِ انسانیت کی ایسی باکمال شخصیت ہیں جن کا کوئی ثانی نہیں ،اور نہ ہی قیامت تک آپ کی ذات وصفات کا مقابل پیدا ہوسکے گا۔آپ کی ذات ایسی سرچشمۂ رُشد وہدایت

ہے۔جس کی تجلیّات میں فہم وبصیرت اور آبروئے پیکر آدم کی کرنیں نمایاں ہیں اس خصوص میں درج ذیل بند کا مشاہدہ کیجیے

رونقِ بزمِ تکلم، نکہتِ بادِ بہار مرکزِ فہم و بصیرت ، مخزنِ صد افتخار
پرتوِ انوارِ کل کا گنگناتا آبشار لہجہ ہائے زندگی کے حرف سارے زرنگار
آبروئے پیکرِ آدم، حریفِ تیرگی مرحبا صلِّ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی

معدنِ اتقاوسیدالاصفیا کے دنیا میں تشریف لانے سے قبل عرب معاشرہ جہالت اور گمرہی میں ڈوبا ہوا تھا۔وحشی قوم میں ہر شخص کی عزت نفس داؤ پر لگی ہوئی تھی ، ماں ، بہن ، بیٹی کی عزت انفرادی و اجتماعی صورت میں مجروح ہورہی تھی۔بُت پرستی کا یہ عالم تھا کہ خانہ خدا بھی باطل خداؤں سے بھرا ہوا تھا۔معمولی باتوں پر کئی کئی سال جنگیں جاری رہتی آپس کی نفرتوں سے ہر جان جہنم زار بنی ہوئی تھی ۔چار سو پھیلی اندھیرگی روشنی کی منتظر تھی۔مسدس کے درج ذیل بند سے اس منظر کا مشاہدہ کیجیے:

آپ کی آمد سے پہلے کا زمانہ الاماں گھپ اندھیرا
خیمہ زن تھا جسم وجاں کے درمیاں
گمرہی کا سلسلہ تھا کارواں در کارواں
نفرتوں کا اک جہنم زار تھا یہ خاک داں
روشنی کی منتظر تھی یہ فضائے تیرگی
مرحبا صلِّ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی .....(۳)

اس نعتیہ مسدس کے پہلے باب کے (۴۵) بندوں میں عرب کے گمراہ زدہ معاشرہ کی مذہبی ، اخلاقی ، سیاسی اور معاشی حالت کا نقشہ اس انداز سے کھینچا گیا ہے کہ دورِ جاہلیت کا عرب معاشرہ اپنے فرسودہ نظام اور کریہہ مناظر کی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ قاری پر آشکار ہوتا ہے۔مذہبی نکتۂ نظر سے بت پرستی کا یہ عالم تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے سنگ تراش کے مورت بنائی جاتی اور پھر اسے خدا مان کر پرستش کرنے لگتے تھے۔لات، منات اور عزیٰ تو ظاہری بت تھے جب کہ پسِ منظر میں بڑے بت تھے جو بہ ظاہر گوشت پوشت کے انسان تھے مگر درحقیقت بت تھے کہ لب ہوتے ہوئے بھی سچ نہ کہتے تھے۔ہاتھ ہوتے ہوئے برائی کو نہ روکتے تھے اور عقل ہوتے ہوئے فکرو آگہی سے محروم تھے۔اس خصوص میں مسدس کا درج ذیل اظہار یہ ملاحظہ ہو:

صحنِ کعبہ میں جو تھے، وہ تھے سرِ منظر کے بت
تھے بہت کوہ تاہ قد یہ سارے ہی پتھر کے بت

خال و خد کچھ اور ہی رکھتے تھے پس منظر کے بت
قامتِ بالا جو رکھتے تھے وہ تھے اندر کے بت
آپ نے گمراہ ذہنوں کو ضیائے عقل دی
مرحبا صلِ علیٰ ، اے آئنہ اے روشنی ......(۴)

اخلاقی لحاظ سے عرب معاشرہ نفس پرستی، عیاشی اور اخلاق سوزی کی حدیں پار کر چکا تھا۔ تہذیب و شرافت عفت و عصمت جبر وستم کے زیر سایہ تھی، ہر فرد مرد و زن پابہ زنجیر تھا۔ اخلاق سوزی کی انتہا یہ تھی کہ عورت، ماں، بیوی اور بیٹی سب حیثیتیوں سے بے مایہ، بے مصرف اور بے عزت تھی۔ بہ حیثیت بیوی اس کا مصرف یہ تھا کہ دوستوں کو پیش کر دی جاتی تھی جو اُس کے دامنِ عزت کی دھجیاں بکھیر دیتے تھے۔ اس منظر کا نقشہ مسدس سے ملاحظہ کیجیے۔

صفحۂ تاریخ سے رسمِ جہالت ہے عیاں
دوستوں کو پیش کر دیتے تھے اپنی بیویاں
اُڑ رہی تھی دامنِ عورت کی ہر سو دھجیاں
اللہ اللہ یہ مآلِ آئینہ، یہ کرچیاں
آپ نے لوٹائی آکر آئینے کی دل کشی
مرحبا صلِ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی ......(۵)

عرب قبیح اور کریہہ رسموں میں دختر کشی کی رسم انتہائی دل سوز اور دردناک تھی۔ جہالت و گمراہی کا یہ عالم تھا کہ بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا یا عہدِ نوجوانی میں خود دوستوں کو پیش کر دیا جاتا تھا۔ انا کی دستار میں لپٹی ہوئی تہذیب ماں، بہن، بیٹی کی آبروریزی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اس خصوص میں مسدس کے درج ذیل بند کا مشاہدہ کیجیے:

آنکھ میں نفرت فزوں تھی، خون میں وحشت سوا
کھینچ لیتے تھے سروں سے بیٹیوں تک کی ردا
حرمتِ ہمشیر کیسی، کون سی ماں کی دُعا
کون سا رشتہ کہاں کی آبرو ، کیسی قبا
بنتِ حوا کو ردائے حرمتِ ہستی ملی
مرحبا صلِ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی......(۶)

سیاسی لحاظ سے اہلِ عرب زعم پرستی کے شدید ترین احساس کا شکار تھے۔ آدمی کے مقام و مرتبے کا

تعین اس کے قبیلے کے پسِ منظر میں کیا جاتا تھا۔ ہر کوئی خود فریبی اور انا کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ بہادر وہی تھا جس کے ہاتھ میں شمشیر اور ہونٹ شعلہ زن تھے اس خصوص میں ایک بند ملاحظہ کیجیے:

تیز تر تھا اس قدر احساس میں زعمِ نسب
تھا کوئی اوصاف میں بوجہل، کوئی بولہب
ہاتھ میں شمشیر آنکھوں میں سناں، خنجر پہ لب
مبتلا تھے خود فریبی کے نشے میں سب کے سب
آپ نے آکر بدل دی رُت فضائے دہر کی
مرحبا صلِّ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی......(۷)

ہر فرد و قبیلہ انفرادی و اجتماعی صورت میں برتری کا دعویٰ دار تھا اور کمتری کو باعثِ ندامت سمجھتا تھا۔ دستارِ فضیلت پہنے ہر ایک مسند نشین تھا ایسے میں امیری و اطاعت کا تصور بھی محال تھا۔
اس منظر نامے کو ملاحظہ کیجیے!

اپنے قامت میں تھا ہر انسان افضل تر بہت
خود فریبی کے فلک پر تھے مہ و اختر بہت
کوئی بھی کمتر نہ تھا ہر شخص تھا بہتر بہت
مبتدی کوئی نہ تھا تھے صاحب منبر بہت
ایک سورج کے نکلنے تک رہی یہ خودسری
مرحبا صلِّ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی...... (۸)

اقتصادی لحاظ سے بھی عرب دنیا ہر قسم کے رذائل میں مبتلا ہونے سے مفلسی کا شکار تھی۔ رشوت، چوری اور سود کے ساتھ آپس کی نفرتوں اور عداوتوں نے شراب نوش معاشرے کو اقتصادی لحاظ سے تباہ کر رکھا تھا۔

اس خصوص میں درج ذیل بند کا مشاہدہ کیجیے۔

ہو رہا تھا دن بہ دن معدوم امکانِ حیات
دامنِ ہستی میں تھا ناپید سامانِ حیات
آب و تابِ زیست کیسی، کون سی شانِ حیات
منظرِ عبرت کی صورت تھا یہ دامانِ حیات
زندگی تھی آپ سے پہلے اسیرِ مفلسی
مرحبا صلِّ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی......(۹)

مسدس کے پہلے باب میں دورِ جاہلیت کے عرب معاشرہ کی ایسی بھرپور عکاسی کی گئی ہے کہ ہر گوشۂ حیات حقیقی شبیہ میں قاری پر عیاں ہوتا ہے۔ فکری لحاظ سے یہ بند حسنِ خیال سے مرصع بے پایاں وسعت کے حامل ہیں جن سے معدنِ اتقا کی ولادت باسعادت سے قبل عرب دنیا کے تمام مناظر کھل کر قاری پر عیاں ہوتے ہیں۔ مسدس کا دوسرا باب معدنِ اتقا وسید الاصفیا کی دنیا میں تشریف آوری بچپن کے حالات واقعات اور معجزات کے تذکار پر مشتمل ہے۔ ان ۳۶ بندوں میں ہر بند فکری جہت کے کئی راز منکشف کرتا ہے۔ آمدِ مصطفیٰ کے لیے گزرے ہوئے ہزار ہا زمانوں اور ہزار ہا تہذیبوں نے انتظار کیا۔ صحیفوں نے بشارتیں دیں، اور رسولوں نے تمنا کی۔ دیکھا جائے تو ازل سے سرکارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے نور کی تجلیات جلوہ کناں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ رسالت مآب بزمِ کُن فکاں کے جگمگاتے ہوئے مہر منور ہیں۔ اُن کے جمالِ برق پاش نے ایک ہی جھلک سے کفر کے چاند گہنا کر رکھ دیئے۔ تاریخ نعت گوئی میں ہر نعت گو نے آپ کی ولادتِ باسعادت اور حسن و جمال کے تذکار کو بیان کیا ہے لیکن اس مسدس میں ان باسعادت لمحات اور حسنِ رسول کا بیان اس قدر پُر اثر اور دل آویز ہے کہ ہر لفظ شدتِ جذبات اور عقیدت میں ملفوف دل کی دھڑکنوں کی بازگشت محسوس ہوتا ہے۔ اس خصوص میں آپ کی بے مثل شخصیت کے پیکر کی تصویر کشی اس بند سے مشاہدہ کیجیے:

آپ کی تصویر لاؤں کس طرح تحریر میں — خواب کی منظر کشی کیسے کروں تعبیر میں
کہکشاں کی انجمن میں صبح کی تنویر میں — آپ کی تصویر کا پرتو ہر اک تصویر میں
آپ سے منظر کی صورت، آپ سے منظر کشی — مرحبا صلِ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی (۱۰)

آپ کو صادق مانتی تھی۔ اعلانِ نبوّت کے ساتھ ہی آپ کی جانی دشمن ہوگئی اور ہر طریقہ سے آپ کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے کے منصوبے بنانے لگی۔ ان تمام حالات و واقعات کو اس مسدس کے تیسرے باب کے ۹ بندوں میں فکر کی نئی جہتوں وزاویوں سے نظم کیا گیا ہے۔ ایک بند اس خصوص میں ملاحظہ کیجیے:

تھا عجب ردِ عمل اُس مہرِ نو کو دیکھ کر
آگ برسانے لگے ہر سمت سے دیوار و در
زندگی کی سلطنت پر حکمراں تھے اہلِ شر
دشمنوں کی صف میں شامل ہوگیا تھا گھر کا گھر
سرنگوں آخر ہوئی بوجہل کی دیوانگی
مرحبا صلِ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی ......(۱۱)

مسدس کا چوتھا باب ہجرت اوّل سے منسوب ہے چھ (۶) بندوں میں ہجرتِ اوّل کے تمام مناظر

کا پُر تاثیر نقشہ کھینچا گیا ہے جب کہ مسدس کے پانچویں (۵) باب کے اکیس بندوں میں ہجرتِ رسول کا تذکرہ ہے۔ ہجرت ختم الرسل کی زندگی کا ایک عنوانِ جلی ہے۔ آپ کی ہجرت نے تاریخ وجغرافیہ دونوں کو بدل دیا۔ ہجرت ہی عہدِ نو کی تاریخ کا سرنامہ ہے۔ دشمنانِ اسلام نے جب آپ اور صحابہ کرام پر ظلم و ستم کی انتہا کردی اور نوبت یہاں تک آگئی کہ کفار مکہ نے معدنِ اتقا کے قتل کا منصوبہ بنا کر آپ کے گھر کا محاصرہ کرلیا تو سیدالاصفیا باحکم الٰہی صدیق اعظم کے ساتھ مدینہ روانہ ہوگئے اور (۸) روز کی طویل مسافت کے بعد قبا میں پہنچے۔ اہلِ یثرب نے تاریخی استقبال کیا۔ اس نعتیہ مسدس میں ان تلخ واقعات کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اسے پڑھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہجرتوں کے خصوص میں مسدس کے درج ذیل اشعار میں فکری تنوع اور شدت جذبات کی درافتگی عقیدت میں ملفوف ملاحظہ کیجیے:

ہجرتوں کا سلسلہ معراج کی منزل میں ہے مہرِ تاباں کی تجلّی روئے مستقبل میں ہے
اک سرورِ کیف آگیں چشمِ آب وگل میں ہے لمحہ لمحہ آج کوئی دیدۂ مرسل میں ہے (۱۲)
بابِ غارِ ثور پر ہر سُو حصارِ نور تھا نور کا پہرہ تھا لازم، نور جو محصور تھا (۱۳)
قافلہ اہلِ وفا کا سوئے صحرا چل پڑا شہر تیرہ بخت کی جانب اجالا چل پڑا (۱۴)

ہجرتِ نبی سے اسلام کو دوام نصیب ہوا۔ انصار نے مہاجرین کے ساتھ بھائی چارہ واُخوت کی انمول مثال پیش کی۔ اہلِ یثرب کو فضیلت ملی اور اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا یوں معدنِ اتقا جو مکہ سے بے یارومددگار نکالے گئے تھے، مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں نہ صرف سلطنت سے نوازا بلکہ ایسے جانثار عطا کیے جن کی مثال قیامت تک تاریخ انسانی میں نہیں ملے گی۔ اس خصوص میں مسدس کا درج ذیل اظہاریہ ملاحظہ کیجیے:

آئینہ صیقل ہوا روشن ہوئے قلب و دماغ قطرہ ہائے خوں میں جل اُٹھے محبت کے چراغ
فکر آئینہ صفت ہے، دل ہوا ہے باغ باغ بُجھ گیا شعلہ ہوس کا مِٹ گئے سینے کے داغ
کوئی مکّی، کوئی کوفی ہے نہ کوئی یثربی مرحبا صلِّ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی (۱۵)

یثرب میں قیام کے دوران آپ نے ایک طرف تو صحابہ کرام کو ایمانیات، عبادات، اور اخلاقیات کی تعلیمات سے آگاہ کیا جب کہ دوسری جانب اسلام اور ریاست مدینہ کی بقا، استحقام اور دماغ کے لیے جہاد فی سبیل اللہ سے بھی روشناس کیا۔ جب مشرکینِ مکہ، منافقین اور یہود ونصاریٰ کی طرف سے ریاست مدینہ کے لیے خطرات حد سے تجاوز کر گئے تو خالقِ کائنات نے نظامِ حق کی اقامت اور تحفظ کے لیے جہاد کا حکم دیا۔ جس سے غزوات کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ جانثارانِ سیدالاصفیا بدر، احد اور خندق میں سرفروشی کے کارہائے نمایاں انجام دیتے ہوئے سالارِ اعظم کے ساتھ فاتح کی حیثیت سے

مکہ میں داخل ہوئے اور جو قوم آپ کی دشمن تھی جس نے آپ کو شہرِ مکہ سے ہجرت پر مجبور کیا انھیں درگزر فرما کر نورِ ہدایت سے ضیا بار کیا۔ اس نعتیہ مسدس کے چھٹے، ساتویں، اور آٹھویں باب کے (۷۷) بندوں میں رفیع الدین رازؔ نے میدانِ کارزار کے معرکوں، سرفروشانِ وفا کی جانثاری، عظمتِ جہاد، جہاد فی سبیل اللہ میں پیش آنے والی مشکلات، فتح مکہ کے بعد اسلام و اخلاقیات کے فروغ کے لیے آپ کی کاوشوں کا نقشہ، جذبے کی سچائی اور مشاہدے کی پاکیزگی سے اس طرح کھینچا ہے کہ ہر بند کے فکری اُفق کا مطالعہ قاری کو فکر کی نئی جہتوں سے روشناس کرتا ہے۔

اس خصوص درج ذیل بندوں کا مشاہدہ کیجیے:

یہ جو پگڈنڈی ہے روشن بدر کے میدان میں
آسماں سے روشنی اُتری ہے اس کی شان میں
کس قدر بے باک ہے اس شوخ کی جلوہ گری
مرحبا صلِ علیٰ اے آئنہ اے روشنی......(۱۶)

فتح کی خاطر ہزیمت سے گزرنا شرط ہے
ٹوٹنا اور صورتِ شیشہ بکھرنا شرط ہے
وادیٔ ظلمت گزیدہ میں اُترنا شرط ہے
زندہ رہنے کی تمنا ہے تو مرنا شرط ہے...... (۱۷)

حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کائنات کا نور ہیں، آپ نے ہی کائنات میں ہدایت و راہ نمائی کی روشنی پھیلائی اور ایک وحشی قوم کو توحید کے ساتھ ساتھ محبت، ہمدردی اور مروّت و اخوت کا سبق سکھایا۔ یہاں تک کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو آپ کی قولی اور عملی تعلیمات سے مخفی رہا ہو۔ اس نعتیہ مسدس کے دسویں اور گیارھویں باب کے (۸۲) بندوں میں رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مرجع خلائق سیرت کی مدح سرائی، فضیلتوں اور رحمتوں کا سندیسہ لیے ضابطۂ حیات کا دیا ہاتھ میں تھماتی ہے۔ ان بندوں میں مسدس کا بڑا موضوع وہ فکری انقلاب ہے، جس نے زندگی کے تمام شعبوں اور افراد کے سبھی طبقوں پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ آپ کے عدل و احسان اور اخوت و مساوات کے نظام نے بے دلی و بے یقینی کو ختم کر کے زندہ و پائندہ اقدار کا احیا کیا۔ آپ کی رحمتِ بے کراں نے جملہ عالمین اور مخلوقات کو نوازا۔ آپ کا عالم گیر دین آب و تاب حیات بن کر سامنے آیا۔ آپ کی کتابِ مبین مستقل منشور ٹھہری۔ مسدس کے ان بندوں میں پوری کائنات میں پھیلے ہوئے سیدِ کونین کے فیوض و برکات کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے نہایت عمدگی سے عہدِ جدید میں منفرد نوعیت کی نمائندگی کی ہے۔ یہ زندگی آموز موضوعات ایک ایک بند میں بے پایاں وسعت رکھتے ہیں۔ اس خصوص

میں مسدس کا درج ذیل اظہاریہ مشاہدہ کیجیے:

ہے کوئی لمحہ کہ جس میں آپ کا پرتو نہ ہو
کیسے ممکن ہے دیا روشن ہو ، اُس کی لو نہ ہو
رہ گزر ہو اور اُس نقشِ قدم کی ضو نہ ہو
محفلِ افکار ہو اور فکر کی یہ رَو نہ ہو
آپ ہی سے ہے جہانِ شوق کی روئیدگی
مرحبا صلِ علیٰ، اے آئنہ اے روشنی......(۱۸)

معدنِ اتقا اور سید الاصفیا کو خالقِ کائنات نے جس طرح تمام انبیائے کرام میں اوّلیت سے نوازا اسی طرح سرفروشانِ وفا کو بھی تمام انسانوں میں فضیلت بخشی۔قرآن مجید نے ان کے مناقب بیان کیے۔ آپ نے احادیثِ مبارکہ میں ان کی تعریف و توصیف کے ساتھ ساتھ مقام و مرتبہ سے بھی اُمت کو آگاہ کیا اور انھیں ستاروں کی مانند قرار دے کر اتباع کی دعوت دی۔حلقۂ یارانِ مصطفیٰ گو تمام کے تمام گنجینۂ لعل و گہر ہیں مگر ان تمام میں مقامِ صدیقیت نہایت بلند ہے۔آپ پہلے دن سے نبی پاک (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھ ہیں، بدر، ثور، مدینہ اور مکہ کہیں بھی آپ کو تنہا نہ چھوڑا اور یہ تعلق موت کے بعد بھی جاری رہا۔

حضرت عمر فاروق دُعائے خاتم النبیین ہیں آپ سے انصاف کا بول بالا ہوا، حضرت عثمان غنی کی سخاوت اور مالی اعانت سے اہلِ ایمان مستفید ہوتے رہے جب کہ شیرِ خدا فاتح خیبر حضرت علی کی شجاعت وعلم وحکمت سے اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔خلفائے راشدین کی شخصیات اُمت کے لیے نمونہ ہیں۔اس نعتیہ مسدس کے تیرھویں باب سے سترھویں باب تک پانچ ابواب کے (۳۴) بندوں میں خلفائے راشدین اور اہلِ بیت کے مناقب، کارناموں اور خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ان ابواب کا ہر بند فکر کی بے پایاں وسعت رکھتا ہے۔اثر پزیری کا عالم یہ ہے کہ ہر شعر قاری پر نئے زاویوں سے حقائق منکشف کرتا ہے۔اس خصوص میں درج ذیل اشعار کا مشاہدہ کیجیے:

حلقۂ یاراں ہے یا گنجینۂ لعل و گہر
قربِ عثمان غنی ، حیدر و صدیق و عمر
حضرتِ حمزہ و طلحہ جیسے ہوں جن کے سپر
جن کے حلقے میں ابوذر جیسے ہوں اہلِ نظر......(۱۹)

مطلب ہوں یا ابو طالب، ہیں دونوں محترم
مدّتوں کھیلے ہیں اُن کی گود میں شاہِ اُمم
میرے آقا پر تھا ان کا مدّتوں لطف و کرم
ان کی آنکھیں آپ کے صدمے سے ہو جاتی تھیں نم......(۲۰)

اس نعتیہ مسدس کا پُر نور سلسلہ داخلی تجربات اور فکر کی بے پایاں وسعت کے ساتھ اٹھارھویں باب سے اکیسویں (۲۱) باب تک عشق و محبت کی آفاقیت اور تخلیقی دانائی کی ثروت لیے ہے۔

اوّل الذکر باب کہ سات (۷) بندوں میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی صداقت کے مختلف رنگ اُبھارے گئے ہیں۔ان بندوں میں سیرت النبی کے وہ رُوپ دکھائے ہیں جن میں معراج کی شان و شوکت بھی ہے اور شق القمر کی اشاریت بھی موجود ہے۔انیسویں (۱۹) باب کے چار (۴) بندوں میں شعب ابی طالب اور آزمائش کے سخت ایام کا تذکرہ انتہائی دل سوز اور دل گیر انداز میں پیش کیا گیا ہے جب کہ بیس ویں (۲۰) باب کے سات (۷) بندوں میں تقریباً ہر بند کو قرآن مجید کی آیات سے منوّر کر کے پیش کیا گیا ہے۔محاسنِ قرآن کے وہ تمام گل و فراز ان اشعار میں مہکتے ملتے ہیں جن میں سورۂ رحمٰن کی چاندنی بھی ہے اور قرآن مجید کی آیاتِ آئینِ انسانی کی روشنی بھی۔جب کہ اکیس ویں (۲۱) باب کے (۴۱) بندوں میں فخرِ موجودات کے کارناموں حجۃ الوداع، مکتوبات، تبلیغِ دین اور جہادِ فی سبیل اللہ پر روانہ کیے گئے۔صحابہ کرام کے لشکروں کا تذکرہ داخلی انفرادیت اور روحانی بالیدگی سے ضیابار ہے۔اس مخصوص میں مسدس کے درج ذیل اشعار کا مشاہدہ کیجیے:

شق ہوا ہے چاند اس میں شک کی گنجائش نہیں
فرضی قصے کی کہیں بھی کوئی آلائش نہیں ...... (۲۱)

یاد ہیں شعب ابی طالب کے وہ ایّام سخت
صورتِ سنگ گراں اپنوں کے تھے احکام سخت ...... (۲۲)

آپ کے مکتوب ہوں یا آپ کا طرزِ کلام
اِس کے اک اک حرف کو اللہ نے بخشا دوام......(۲۳)

کام حیرت کا خزانہ، عمر اتنی مختصر
آپ کے نقشِ کفِ پا کے اُجالے دیکھ کر
محوِ حیرت ہیں سبھی، کیا فکر، کیا قلب و نظر
میں ثنا شیشے کی لکھوں یا ثنائے شیشہ گر...... (۲۴)

بائیس ویں (۲۲) باب کو سلام کے نذرانے سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان سات (۷) بندوں کے منفرد انداز، جذبات کی شدت اور عقیدے کی پختگی نے ہر شعر کو قلبی تابانی اور احساس کی وارفتگی کا نمونہ بنا دیا۔

بساطِ ادب پر ثنائے معدنِ اتقا اور سید الاصفیا کے نزول کا اختتام تیئس ویں (۲۳) باب کے دو (۲) بندوں پر کیا گیا ہے چوں کہ اس نعتیہ مسدس میں بیان کردہ اصحابِ فکر و نظر، صاحبانِ علم و ادب اور سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھ صحابہ اور صحابیات کے تذکار کو سو (۱۰۰) بڑے ناموں پر معمور کیا ہے جو "روشنی کے خدوخال" میں چمکتے دمکتے ہیں یہ آخری بند اس کی تصریح ہے۔ اس خصوص میں آخری بند کا مشاہدہ کیجیے:

سو بڑے ناموں کی اک فہرست ہے دیوار پر
روشنی ڈالی گئی ہے ایک اک کردار پر
پرتوِ دستِ ہنر کی ضو ہر اک دستار پر
ہر نظر جا کر ٹھہرتی ہے اسی سردار پر
سو بڑے ناموں میں پہلا نام ہے نامِ نبی
مرحبا صلِّ علیٰ اے آئنہ اے روشنی......(۲۵)

ہنرورانہ حوالے سے اس نعتیہ مسدس میں نعت کا تجربہ دیگر شعرا سے مختلف اور منفرد نوعیت کا ہے۔ سیرت النبی سے متعلق تمام حالات و واقعات کا بیان نہایت آسان، صاف و سلیس، سلجھی ہوئی زبان اور شائستہ لہجے میں کیا گیا ہے۔ مسدس کے اندازِ بیان میں جدّت خیال اور ندرتِ بیاں کی طلسم کاری فنی خوبی کے نام پر اپنا جہانِ معنی کھولتی ہے۔ اس خصوص میں معتبر نقاد گوہر ملسیانی لکھتے ہیں:

"رفیع الدین راز نے صنفِ مسدس میں عشقِ رسول کے ایسے چراغ روشن کیے ہیں جن میں ندرتِ خیال اور جدید اُسلوب کی میٹھی میٹھی چاشنی، دل ربا روشنی اور شبِ مہتاب کی چاندنی ہے۔ صنفِ نعت میں یہ تجربہ دیگر شعرائے کرام سے مختلف ہے۔ ہر بند سیرت کے مختلف پہلو سامنے لاتا ہے بلکہ جدید اُسلوب کا چمنستان سجاتا ہے۔"......(۲۶)

فنی نکتۂ نظر سے اس مسدس کی انفرادیت کی ایک وجہ ہر بند کے ٹیپ کا شعر ہے جو اپنے مصرعِ ثانی کی گرفت میں ہے اور یہ مصرعِ ثانی ہر بند کے آخر میں آ کر پورے بند کو مرصّع بنا دیتا ہے۔ مسدس کی ہیئت میں یہ ایک نیا تجربہ ہے۔ وہ بیانیہ قوت جو دوسرے مصرعوں میں موجزن ہے ٹیپ کے مصرع سے نعت کے خدوخال میں مقید ہو جاتی ہے۔ اس خصوص میں ٹیپ کے مصرعۂ ثانی کا مشاہدہ کیجیے:

آپ کے پرتو نے بخشی زندگی کو زندگی
مرحبا صلِّ علیٰ اے آئنہ اے روشنی......(۲۷)

اس نعتیہ مسدس کی ایک خوبی اس کی ''غزل سامانی'' کے حوالے سے بھی ہے، جو مسدس میں بہت سے مقام میں نظر آتی ہے۔ جس کی وجہ سے اشعار بند سے الگ ہو کر بھی معنویت نہیں کھوتے اور ہمارے حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مسدس میں یہ تجربہ انفرادیت کا حامل ہے۔ اس خصوص میں درج ذیل اشعار کا مشاہدہ کیجیے:

آپ نے خورشید رکھا فکر کی بنیاد میں
اک نیا موسم اُتر آیا دلِ ناشاد میں......(۲۸)
مصطفیٰ کے نقشِ پا ہیں گوہرِ گنجِ علوم
راز ان کو سر پہ رکھ اپنے، انہیں ہونٹوں سے چوم......(۲۹)

جہاں تک اس نعتیہ مسدس کے ذخیرہ الفاظ کا تعلق ہے تو عربی، اُردو اور فارسی کے ساتھ ہندی الفاظ کو اس انداز سے برتا گیا ہے کہ کئی مقامات پر ہندی الفاظ اُردو کے مخصوص مزاج میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس خصوص میں معتبر نقاد پروفیسر ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی فرماتے ہیں:

''یہ مسدس اپنی ایک فضا رکھتا ہے جو ہمارے شعر و ادب کی مانوس فضا ہے اور فارسی عناصر کے باوجود اُردو کا مخصوص مزاج ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ کئی مقامات پر ہندی الفاظ کو مجروح نہیں کرتے بلکہ ''اُردوئیت'' کو اُجاگر کرتے ہیں۔''......(۳۰)

اس خصوص میں مسدس کا درج ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

اپنی اپنی بولیاں تھی اپنے اپنے سب کے راگ
پھن اُٹھائے پھر رہے تھے چار سو نفرت کے ناگ
لے چکی تھی اپنے دامن میں زمانے بھر کو آگ
بجھ چکی تھی دل کی دنیا سو چکے تھے سب کے بھاگ......(۳۱)

منظر نگاری کے حوالے سے بھی یہ نعتیہ مسدس منفرد شناخت رکھتا ہے۔ اُردو کی شعری اصناف میں منظر نگاری میں چہچہاتے پرندوں، خورشید کی روشنی اور ضیا کی چمک دمک کی منظر کشی تو ملتی ہے مگر روشنی کا رقص کرنا، خورشید کا نغمہ سرا ہونا، روئے عالم کی ضیا سے آئینے کا جاگ اُٹھنا، اور مناظر کے چہچہانے کی منظر کشی غالباً پہلا تجربہ ہے جو اس نعتیہ مسدس میں جا بہ جا ملتا ہے۔ اس خصوص میں مسدس کا درج ذیل بند ملاحظہ کیجیے:

روشنی ہے رقص میں، خورشید ہے نغمہ سرا
روئے عالم کی ضیا سے جاگ اُٹھا ہے آئینہ
چہچہاتے ہیں مناظر، گنگناتی ہے فضا
کیف و مستی کا سماں ہے سلسلہ در سلسلہ...... (۳۲)

اس نعتیہ مسدس میں نہ صرف توانا تخیل سے بھرپور شعر تخلیق کیے گئے ہیں بلکہ باکمال مشاطگی کی بدولت دل آویز تراکیب، مرکبات اور تشبیہات و استعارات کے ڈھیر بھی لگائے گئے ہیں۔ان تراکیب میں آبروئے پیکرِ آدم، لہجہ ہائے زندگی، پردہ بے چہرگی، آسمانِ آگہی، حریفِ تیرگی، نوائے شبنمی، کارگاہِ زندگی، سرفروشانِ وفا، جیسی خوب صورت تراکیب شامل ہیں۔ان تراکیب کا استعمال فقط رسمی یا روایتی نہیں بلکہ ان میں عصری شعور کی کرنیں اور فنی نزاکتوں کے سلسلے نمایاں نظر آتے ہیں۔اس خصوص میں ایک بند ملاحظہ کیجیے:

آسمانِ آگہی کے ماہِ کامل کو سلام
کارگاہِ زیست کے اس شاہِ عادل کو سلام
رہنمائے زندگی کو خضرِ منزل کو سلام
جو حرارت دے رہا ہے جاں کو اس دل کو سلام ...... (۳۳)

اس نعتیہ مسدس میں حسبِ موقع اور بہ قدرِ ضرورت فنی اصطلاحات اور علم البیان کے وسائل سے کام لیا گیا ہے۔اگر ایک طرف تلمیحات کی دنیا آباد کی گئی ہے تو دوسری جانب لف ونشر کی شجرکاری، حسنِ تعلیل کے شائبے اور متجانس الفاظ کے خاکوں کو بھی عمدگی سے برتا گیا ہے۔یوں یہ نعتیہ مسدس فکری اور فنی اعتبار سے قابلِ قدر تخلیق بن گئی ہے۔اس خصوص میں معتبر شاعر و نقاد شاعر علی شاعر فرماتے ہیں:

''روشنی کے خدوخال'' رفیع الدین رازؔ کا معرکہ آرا نعتیہ مسدس ہے جس کا شمار ادبِ عالیہ میں ہوتا ہے۔''...... (۳۴)

مجموعی طور پر ''روشنی کے خدوخال'' مسدس کی ہیئت میں اُردو کی شعری تخلیقات میں فکری رنگارنگی، موضوعاتی تنوع اور منفرد اسالیب بیان میں نہایت وقیع اضافہ ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ اے خیام، روشنی کی معجز نمائی، مشمولہ رنگ ادب، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، فروری ۲۰۰۹ء ص ۲۳۳
۲۔ رفیع الدین راز، روشنی کے خدوخال نعتیہ مسدس، رنگ ادب پبلی کیشن، کراچی، فروری ۲۰۱۷ء ص ۵
۳۔ ایضاً ص ۶ ۴۔ ایضاً ص ۸ ۵۔ ایضاً ص ۲۷ ۶۔ ایضاً ص ۲۸
۷۔ ایضاً ص ۲۳ ۸۔ ایضاً ص ۲۰ ۹۔ ایضاً ص ۲۵ ۱۰۔ ایضاً ص ۳۴

۱۱۔ ایضاً ص ۵۱ ۱۲۔ ایضاً ص ۵۶ ۱۳۔ ایضاً ص ۵۸ ۱۴۔ ایضاً ص ۵۲
۱۵۔ ایضاً ص ۶۶ ۱۶۔ ایضاً ص ۶۸ ۱۷۔ ایضاً ص ۱۷۲ ۱۸۔ ایضاً ص ۱۵۱
۱۹۔ ایضاً ص ۱۵۷ ۲۰۔ ایضاً ص ۱۷۱ ۲۱۔ ایضاً ص ۱۸۰ ۲۲۔ ایضاً ص ۱۸۲
۲۳۔ ایضاً ص ۱۹۸ ۲۴۔ ایضاً ص ۲۱۷ ۲۵۔ ایضاً ص ۲۲۴ ۲۶۔ گوہر ملسیانی، سخن کا چراغ، رفیع الدین راز، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، جنوری ۲۰۱۳ء ص ۲۱۱
۲۷۔ رفیع الدین راز، روشنی کے خدوخال نعتیہ مسدس، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، فروری ۲۰۱۷ء ص ۲۶
۲۸۔ ایضاً ص ۸۲ ۲۹۔ ایضاً ص ۸۹
۳۰۔ سید ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، پروفیسر، روشنی کے خدوخال ایک شاعرانہ انجیل مشمولہ رنگ ادب، رنگ ادب پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء ص ۲۵
۳۱۔ رفیع الدین راز، روشنی کے خدوخال نعتیہ مسدس، رنگ ادب پبلی کیشنز، کراچی، فروری ۲۰۱۷ء ص ۲۵
۳۲۔ ایضاً ص ۳۱ ۳۳۔ ایضاً ص ۲۲۲
۳۴۔ روشنی کے خدوخال آخری فلیپ، سیرت کی رعنائیوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس خصوص میں مسدس کے درج ذیل اشعار کا مشاہدہ کیجیے:

مطلّب ہوں یا ابوطالب، ہیں دونوں محترم
مدّتوں کھیلے ہیں اُن کی گود میں شاہِ اُمم
میرے آقا پر تھا اُن کا مدّتوں لطفِ کرم
اُن کی آنکھیں آپ کے صدمے سے ہو جاتی تھیں نم

اس نعتیہ مسدس کا اختتام دو بندوں پر کیا گیا ہے۔ آخری بند میں عظمتِ رسول کو متعین کیا گیا، سرور عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، خاتم الرسل کی سیرت، اُسوہ، کردار، اخلاق، حسن و جمال اور شمائل کی رعنائیوں پر مضامین کا اختتام ہوا ہے۔

☆☆☆

نعت نامے

ہم پہ یہ راز کُھلا مصحفِ سیرت پڑھ کر
آپ ہر لفظ میں انساں کا مقدر لائے

(قیصر بارھوی)

ڈاکٹر سیّد یحییٰ نشیط، گل گاؤں، بھارت

نعت رنگ کا تازہ شمارہ نمبر ۲۷ دستیاب ہوا۔حسب سابقہ اس بار بھی نعت رنگ کے اوراق نہایت اہم مشمولات سے بھرے ہوئے ہیں۔اس کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر کی جانب رواں ہے۔آپ کی مخلصانہ سعی اور تگ و دو سے نعت رنگ کا ہر شمارہ تقدیسی ادب میں نئے جہات سے آشنا کرا رہا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔آمین، یارب العالمین! آپ نے ہند و پاک کی جامعات کو نعت پر تحقیقی کام کرنے کے لیے جو فہرست دی تھی، یقیناً وہ ہمارے پی ایچ۔ڈی اسکالرس اور پروفیسرں کی رہنمائی کر سکے گی۔ساتھ ہی یہ بھی طے ہے کہ اردو کے بعض گائیڈس ایسے بھی ہیں جو ایسے موضوعات کو تحقیق کے لیے پسند نہیں کرتے۔ڈاکٹر اسمٰعیل آزاد فتح پوری نے، عرصہ ہوا اس جانب توجہ مبذول کروائی تھی مگر شاید ہماری بے حسی کی وجہ سے ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔پھر بھی ان کی کاوشوں سے کانپور اور اس کے اطراف کی جامعات میں حمد و نعت پر بہت کام ہوا۔اپنی اس محنت پر عنداللہ وہ ماجور ہوں گے۔آپ کی فہرست کے علاوہ محترم ریاض مجید کا مضمون بھی تحقیق نعت میں راہ نمائی کر سکتا ہے۔میں نے نعت رنگ کے گزشتہ شماروں میں بعض ایسے مضامین سپرد قلم کئے تھے جو اپنی جگہ نعتیہ تحقیق کے مستقل موضوع بن سکتے ہیں۔مثلاً اردو میں معراج ناموں کی روایت، منظوم سیرت نگاری، نور ناموں کی روایت، نعت نگاری میں اسطوری فکر، قصیدہ بردہ کے منظوم تراجم کا تقابلی جائزہ وغیرہ۔چند برس قبل امریکہ میں مقیم محترمہ نیر جہاں معروف بہ ’اردو آپا‘ نے ”عالمی زبانوں میں نعت کا سرمایہ“ کے ایک پروجکٹ پر کام کرنا شروع کیا تھا۔انھوں نے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں نعت کے سرمایہ کو جمع کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔میں نے بنگالی، ملالیم کنڑ، راجستھانی، مراٹھی، ہندی، گجراتی، کشمیری، اڑیا، تیلگو اور بعض لوک ادب کی نعتیں ترجمے کے ساتھ انھیں ڈاک سے بھیج دی تھیں۔آپا نے بھی فرنچ، انگریزی، جرمن، عبرانی،، جاپانی، براعظم افریقہ کی زبانوں اور بولیوں میں لکھی گئیں نعتوں کا وافر حصہ اور قطب شمالی کے قریب ترین علاقوں میں بولی جانے والی زبانوں میں لکھی گئی نعتوں کا ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔لیکن اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے شاید وہ یہ کام مکمل نہ کر سکیں۔اس دوران ان کے شوہر کا بھی انتقال ہو گیا تھا اور وہ بالکل نڈھال ہو کر رہ گئی تھیں۔اگر محترمہ کے اس پروجکٹ پر کام کیا جائے تو ساری دنیا کی زبانوں کا نعتیہ سرمایہ نعت ریسرچ سینٹر میں جمع ہو سکتا ہے۔

جہاں تک حالیہ شمارے کی مشمولات کا تعلق ہے تو ہر ایک اپنی جگہ گوہر نایاب ہے۔آپکا اداریہ ہمیشہ مثبت انداز میں اپنے قارئین کی رہ نمائی کرتا ہے۔آپ کی اسی مثبت اور تعمیری سوچ کی وجہ ہی سے نعت رنگ نے اتنی ترقی کی ہے۔اور یہی انداز، اسے اور ترقی عطا کرے گا۔نعت رنگ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے، کہ اس میں ہر مکتب فکر کے تنقیدی نظریات کو والہانہ انداز میں قبول کیا جاتا ہے اور مسلکی

اختلافات کو ہوا نہیں دی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ نعت رنگ میں نعتیہ ادب کا سرمایہ کچھ اس انداز میں جمع ہو گیا ہے کہ اس میں "رب و رسول" میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ نعت رنگ میں شامل مذاکرہ نعت اور مرثیے کے فرق اور ان میں پائی جانے والی ندرتوں کو واضح کرنے والا ہے۔ تقی عابدی، انوار احمد زئی اور ڈاکٹر عزیز احسن نے اپنی گفتگو میں مذاکرے کے نئے ابعاد قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ گوئٹے کی نظم پر پروفیسر فتح محمد ملک اور حسنین عاقب کے مضامین جرمن شاعر گوئٹے کے عشق رسول ﷺ کو واضح کرنے والے ہیں۔ پروفیسر اشفاق انجم نے "گلدستہ سفینۂ نجات" پر مدلل معلومات بہم پہنچائی ہے۔ محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری پر سلیم شہزاد کا تنقیدی مضمون تقدیسی ادب کے ناقدین کے لیے مینارۂ نور ثابت ہوگا۔ انھوں نے نعتیہ شاعری میں رسول اکرم ﷺ کی بشریت کو دانستہ مافوق البشر ثابت کرنے کی غیر اساسی عقیدت کی خبر لی ہے۔ حق پرستی اور بے لاگ ولپیٹ اپنی بات کہہ دینے کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔ ناقد کا اپنا ایک منصبی فریضہ ہوتا ہے، اس میں مروت کا دخل فریضے کو ناقص کرسکتا ہے۔ سلیم شہزاد اپنے فن نقد میں سخت گوئی کے لیے معروف ہیں مگر ان کی یہ سختی بے جا نہیں ہوتی اور نہ وہ تنقید کی جگہ تنقیص کو روا رکھتے ہیں۔ ہاں مجھے صرف اتنا محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ نعت کے ایک معتبر اور نامور بزرگ شاعر کی نعتیہ شاعری پر نقد و جرح کی شدت کو کم کردیتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ مشاہد حسین رضوی کی نعتیہ شاعری پر سلطان سبحانی کا مضمون اچھا ہے۔ باقی مشمولات بھی اپنی نظیر آپ ہیں۔ آپ نے یہ اچھا سلسلہ شروع کیا ہے کہ سابقہ شمارے کا تجزیہ فوراً بعد شائع ہونے والے شمارے میں کردیا جاتا ہے۔

نعت رنگ کے شماروں میں 'نعت ناموں' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے قلم کاروں کو کافی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ حالیہ شمارے میں اشفاق انجم صاحب نے میرے مضمون "غالبؔ کی مثنوی بیان معراج کا تنقیدی مطالعہ" پر گرفت کرنے کی کوشش کی ہے۔ (۱) ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ "یہ قرآن و حدیث سے متصادم ہے۔" (نعت رنگ شمارہ ۲۷ ص ۴۹۹)

غالب کی یہ مثنوی شب معراج کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ اردو میں کسی رات کی تعریف میں مجھے اس سے عمدہ کوئی نظم نہیں ملی۔ غالبؔ نے معراج کے واقعے کی ابتداء جبرئیلؑ کی آمد سے کی ہے۔ یہاں غالبؔ نے مقام کی نشاندہی نہیں کی۔ البتہ راجح قول یہ ہے کہ آپ ﷺ حطیم میں لیٹے ہوئے تھے کہ فرشتے (حضرت جبرئیلؑ) نے نوید سنائی۔ ام ہانیؓ کے مکان میں استراحت فرمانے کی روایت کو محدثین کمزور سمجھتے ہیں۔ یہاں اس کی بحث کی چنداں ضرورت نہیں۔ فرشتہ آپ ﷺ سے کہتا ہے

خداوند گیتی خریدار تست
شبست ایں ولے روز بازار تست

یعنی مالک زمین و آسماں آپ کا طلب گار ہے۔ کہنے کو یہ رات کا وقت ہے لیکن آپ کے لیے یہی روز بازار ہے۔

ترا خواستگارست یزدانِ پاک

ہر آئینہ از لن ترانی چہ باک

یعنی خداوند عالم خود آپ ﷺ سے ملاقات چاہتا ہے تو اب لن ترانی کا کوئی اندیشہ نہیں۔

بیار اے شمشاد بے سایہ را

بہ پیمائے اورنگ نُہ پایہ را

یعنی اپنے شمشاد جیسے سیدھے قدسے جس کا سایہ نہیں پڑتا، اُٹھیئے اور نو درجے کے تخت یعنی آسمان کو طے کر ڈالئے۔ اس کے بعد آپ کو سواری کے لیے ایک گھوڑا پیش کیا گیا۔ اس نے آپ ﷺ کو بیت المقدس کی سیر کرائی اور پھر آپ ﷺ آسمانوں کی جانب روانہ ہوئے۔ پہلے آسمان پر (جس کو نجوم میں فلک قمر کہا جاتا ہے) آپ کی سواری پہنچنے کی روداد میں غالبؔ نے علمِ نجوم کا سہارا لیا ہے اور آگے اس علوی سفر کی تمام روداد کو اسی علم کی روشنی میں بیان کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ پروفیسر اشفاق انجم غالبؔ کے اس شعری پیرائے کو قرآن و حدیث سے متصادم سمجھتے ہیں، جبکہ ہماری نعتیہ شاعری میں نجوم سے ناواقف شعراء بھی کہیں نہ کہیں اس کا استعمال کرتے آئے ہیں۔ خود اشفاق انجم کے یہاں اس کی مثالیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

چوم کے جس کے روشن تلوے چمکا چاند
خود وہ کیسا ہوگا خدایا گیسوؤں والا

سورج جس کی پیشانی کا ہلکا پَر
کون و مکاں کے نور کا ہالا گیسوؤں والا

شاید ٹپک گئی تھی پسینے کی کوئی بوند
اسریٰ کی شب تجلّی ہوئی ماہتاب میں

سفیرِ اسریٰ کی خاطر یہ اہتمام سفر
ہوا کو اسپ کیا، کہکشاں کو جادہ کیا

وہ شب اسریٰ سفر کی داستاں
مل گئے جیسے مکان و لا مکاں
نور میں ڈوبے ہوئے تھے سب جہاں
رف رف و قصویٰ نشیں تم پر سلام

کہکشاں کا ہر ستارہ نقشِ پا
چاند تلوے چوم کر روشن ہوا
راستے سے آسماں بھی ہٹ گیا
راہی عرشِ بریں تم پر سلام

زیرِ پا ہے فلک محوِ حیرت ملک
نقشِ پا کی چمک قاب قوسین تک
ماورائے گماں تم پہ لاکھوں سلام

کیا مندرجہ بالا اشعار کے واقعات قرآن و احادیث سے ثابت ہیں یا صرف ایک وجدانی کیفیت اور غلوئے عقیدت کے بہاؤ میں لکھے گئے ہیں؟؟ حضورﷺ سے رکھی جانے والی محبت کا تقاضا ہی ایسے اشعار قلم برداشتہ صفحۂ قرطاس پر اتار دیتا ہے۔ ان پر نہ علماء کرام گرفت کرتے ہیں نہ صوفیاء کرام، بلکہ پیر و مرشد تو دعائیں دیتے ہیں اور خود شاعر ایسے اشعار کو روحانی فیوض کا ثمرہ گردانتا ہے۔ ایک میلادیہ نعت میں اشفاق انجم نے یہ اشعار قلم بند کئے ہیں۔

"حضورؐ تشریف لا رہے ہیں"، صدا فرشتوں کی آ رہی ہے
فلک ستارے چھڑک رہا ہے، زمین کلیاں بچھا رہی ہے
فرشتے مکہ پہنچ رہے ہیں، ہے غرقِ انوار کعبۃ اللہ
سواری نبیوں کی وقفے وقفے سے آسمانوں سے آ رہی ہے

(اشفاق انجم: "صلو اعلیہ وآلہٖ" ص ۹۳۔ ۹۲)

یہ نہ تو قرآن و احادیث سے لگا کھاتے ہیں نہ اس واقعے کے تاریخی پہلو سے ان کا واسطہ، بلکہ شاعر کی عقیدت تو ان ساروں کو جھٹلا رہی ہے۔ پھر بھی یہ اشعار فیوض و برکات کا ثمرہ سمجھے گئے ہیں۔ ان شواہد سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اگر نعتیہ شاعری کو بالقصد قرآن و احادیث کی میزان پر پرکھنے کی کوشش کی جائے تو اس کا شاید نو، دس فی صد سرمایہ دریا برد کرنا پڑے گا اور تقدیسی شاعری کی بربادی کا یہ بڑا سانحہ قرار پائے گا، نیز ہمیں اپنے کلاسکی ادب سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اشفاق انجم کے درج بالا اشعار میں شاعر کی عقیدت کا دھارا اتنا تیز ہے کہ معراج کا ذکر آتے ہی سیارات و نجوم اور خلاء و سماء کے مضامین نعت کے اشعار سے جڑ جاتے ہیں۔ اس میں شاعر کی فکر کو دخل نہ فن کا کمال، بس خیالات کی آمد کا سلسلہ ہے جو تھمنے کا نام نہیں لیتا اور اسی جذب و کیف اور سرشاری و سرمستی میں وہ "خلاء میں بھی پا پیادہ سفر کرنے لگتا ہے اور" آیۂ قوسین کے حوالے سے آسمان کو اپنا مکان لکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

نبی کے عشق میں کچھ ایسا جذب طاری تھا سفر خلاء کا بھی انجم نے پا پیادہ کیا
الٰہی، آیۂ 'قوسین' کے حوالے سے میں آسمان کو اپنا مکان لکھتا ہوں

(صلو اعلیہ وآلہٖ ص مختلف)

اس لیے شاعری چاہے وہ تقدیسی ہی کیوں نہ ہو، جب تک وہ قرآن و احادیث کی تعلیمات اور امور شرعیہ سے متصادم نہیں ہوتی، اسے کم سے کم اباحت کے دائرے میں جگہ دی جانی چاہیے۔

۲) اشفاق انجم کا دوسرا اعتراض یہ کہ میں (مضمون نگار) نے "فلک اور سما" کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"فلک قرآن کے مطابق وہ اجرام فلکی ہیں جو متحرک ہیں جنھیں سائنسی و جغرافیائی اصطلاح میں "سیارہ" کہتے ہیں اور علم نجوم کی اصطلاح میں یہ ستارہ کہلاتے

ہیں (ستارہ شناس اور ستارہ شناسی کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے) اور یہ ہمارے نظام شمسی کا حصہ ہیں۔ ایسے کئی نظام شمسی خلا میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ غیر متحرک روشن اجرام (ستارے) آسمانوں کی زینت ہیں (جو شیطانوں کو مارے جاتے ہیں) یہ تمام کے تمام "تحت السما" یعنی حقیقی آسمانوں سے نیچے ہیں۔ جو لوگ "فلک" کو "سما" جانتے ہیں وہ غلطی پر ہیں" (نعت رنگ ش ۷، ص ۴۹۹۔۵۰۰)

پروفیسر صاحب کے اس فاضلانہ تبصرے کو پڑھنے کے بعد میں نے قرآن سے رجوع کیا تو پتہ چلا کہ وہاں لفظ "فلک" کا استعمال دو جگہ ہوا ہے۔ دونوں جگہ یہ لفظ 'آسمان' یا 'گھیرے' / 'دائرے' کے معنی میں مستعمل ہے۔ پارہ نمبر ۱۷ سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۳۳ وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۔ تفسیر موضح القرآن میں اس آیت کے معنی ہیں، "اور وہ ہے خدائے تعالیٰ جس نے اپنے کمال سے پیدا کیا رات کو اندھیری جو آرام کریں اور سو دیں اور پیدا کیا دن کو روشن تو اس میں تلاش کسب کی کر کے روزی پیدا کریں اور پیدا کیا اپنی قدرت سے سورج اور چاند کو اور یہ سب آسمان میں پھرتے ہیں"۔ گویا فلک کے معنی یہاں آسمان کے ہیں۔ اشرف علی تھانویؒ نے اس آیت میں لفظ 'فلک' کے معنی "دائرہ" بتائے ہیں، جس سے غالباً جغرافیائی اصطلاح "مدار" مراد ہے۔ اس کے علاوہ سورۂ یٰس کی آیت نمبر ۴۰ میں بھی لفظ فلک کا استعمال ہوا ہے، "وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ" یعنی "اور دونوں ایک ایک دائرے میں تیر رہے ہیں۔" یہاں بھی فلک کے معنی دائرہ یا آسمان ہی ہے۔ ان دونوں آیتوں کے علاوہ لفظ فلک کا استعمال قرآن حکیم میں اور کہیں نہیں ہوا۔ اور نہ ہی اس لفظ کا اطلاق "اجرام، سیارے یا ستارے کے معنی پر ہوا ہے۔ شاید اشفاق انجم کو یہاں معنی کی تفہیم میں تسامح ہوا ہے۔

قرآن حکیم میں دوسرے ایک لفظ "سما" کا استعمال بھی ہوا ہے اور اس کے معنی مترجمین قرآن نے آسمان یعنی فلک ہی کے لیے ہیں۔ مثلاً "السموٰت والارض" سے مراد آسمان و زمین ہے۔ السموٰات، السما کی جمع کا صیغہ ہے۔ قرآن میں یہ ترکیب جتنی بھی جگہ استعمال ہوئی ہے اس کے معنی "زمین و آسمان ہی کے لیے گئے ہیں۔ پھر کس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ "جو فلک کو سما کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ قرآن میں نجم، کوکب، شہاب وغیرہ کا ذکر ستارے اور سیاروں کے لیے ہوا ہے، اس پر مستزاد یہ کہ 'شہاب' ٹوٹے ہوئے تارے ہی کے لیے استعمال ہوا ہے ان دلائل کی روشنی میں اشفاق انجم کی جرح کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔

۳) اشفاق انجم کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ جنت کو سجانا، حوروں کا سنورنا سجنا، تمام مفروضات ہیں۔ تو ان سے عرض ہے کہ جنت کو سجانے اور حوروں کے سنورنے کی کئی احادیث آپ بہ آسانی تلاش کر سکتے ہیں

۔پھر آپ نے خود مذکورہ بالا اشعار میں فرشتوں کے استقبالِ رسولؐ کے لیے آسمانوں سے مکہ میں وارد ہونے اور "تشریف لا رہے ہیں" کی صدا لگانے کا اعتراف کیا ہے۔غالبؔ نے اگر ایسا بلکہ آپ کے ڈھنگ سے کہیں درجہ بہتر انداز میں کہا ہے تو اس پر گرفت کیا معنی؟؟

۴)اشفاق انجم نے"واقعہ معراج کو اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم الشان معجزہ" کہا ہے۔یہاں اللہ تعالیٰ کا معجزہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان قدرت کہنا چاہیے تھا۔اس لیے کہ معجزے کی نسبت پیغمبر اور نبی سے ہوتی ہے۔جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔

۵)اشفاق انجم کا پانچواں اعتراض یہ ہے کہ میں (مضمون نگار) نے"غالبؔ کو ماہر نجوم کی حیثیت سے پیش کیا ہے جبکہ غالب نے اپنی مثنوی میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس زمانے میں عام سی باتیں تھیں۔ علم نجوم کی اصطلات سے واقفیت اور اس کے اسرار و رموز کا علم دو علاحدہ چیزیں ہیں،اس کی واضح مثال غالبؔ اور مومنؔ ہیں۔مومنؔ کا شمار ان کے عہد کے نابغہ روزگار ستارہ شناسوں میں ہوتا تھا جبکہ غالبؔ کے ستارہ شناس ہونے کی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔"(نعت رنگ شمارہ ۲۷ ص ۵۰۰)

مولانا محمد حسین آزاد کی'آبِ حیات' میں مومنؔ کی نجوم شناسی کے دو تین قصے درج ہیں ان کے کلیات میں علم نجوم پر سطحی انداز کے چند اشعار ملتے ہیں جن میں ان کا ایک مشہور شعر بھی ہے۔اس میں نجوم کے ساتھ فنِ موسیقی کے نکات پیش کیے گئے ہیں۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

ان اشعار کے علاوہ مومنؔ کے علم نجوم پر دسترس کا کوئی تحریری ثبوت (ان کا اپنا تحریر کردہ) نہیں ملتا جبکہ غالبؔ کی مثنوی"بیانِ معراج" میں علم نجوم اور اس کی اصطلاحات کا ایک دریا ہے کہ بہتا چلا آتا ہے۔پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے مضمون میں مومنؔ اور غالبؔ کا موازنہ مقصود بھی نہیں ہے ہمیں اس بات سے بھی کوئی سروکار نہیں کہ غالبؔ علم نجوم میں مومنؔ سے زیادہ قابل تھے یا ان کا علم مومنؔ کے مقابلے میں کمتر تھا۔ہو سکتا ہے کہ علم نجوم میں غالبؔ کی معلومات سرسری رہی ہوں گی لیکن انھوں نے اس مثنوی میں جن نجومی نکات کو بیان کیا ہے اس سے ان کے متعلقہ علم کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔اشفاق صاحب کا یہ بھی اعتراض ہے کہ غالبؔ نے اپنی مثنوی میں'مریخ' کو زیادہ روشن سیارہ کہا ہے۔تو عرض ہے کہ مثنوی کے سیاق کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہی اصل حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے۔مضمون میں ان ساری باتوں کی وضاحت کی میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔

۶)اشفاق انجم نے اپنے چھٹے اعتراض میں بلا وجہ خلط مبحث قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔اردو میں معراج ناموں کی روایت پر میرے شاید تین چار مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ان میں میں نے ادب کے ناقدین کو اس جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ"عالمی ادب میں علوی سفر پر جتنی بھی

تخلیقات پائی جاتی ہیں، وہ تمام تخیلاتی اور توہماتی ہیں ان کے بالمقابل اردو کے معراج نامے رکھے جاسکتے ہیں جن کے واقعات حقیقی اور تاریخی نوعیت کے ہیں''۔ظاہر ہے کہ ان سفرناموں کی روداد اور معراج کے سفر کی روداد میں فرق ضرور رہے گا۔ ہاں البتہ ان کے تقابلی جائزے میں ان کے موضوعات پر بحث ہوسکتی ہے اشفاق انجم جانتے ہوں گے کہ اقبال نے''جاوید نامہ''، دانتے کی''ڈیوائن کامیڈی'' کے جواب میں لکھا تھا وہ خود بھی ایک معراج نامہ لکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے حضرت غوث گوالیاری کی کتاب کی انھیں تلاش تھی جو باوجود بسیار کوشش کے انھیں حاصل نہ ہوئی اور معراج نامہ لکھنے کا ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔میں نے جاوید نامہ میں فلک قمر کی روداد اور غالبؔ کی مثنوی بیان معراج میں فلک قمر کے سفری احوال دونوں کو یکجا رکھ دیے ہیں۔واقعہ معراج سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اشفاق انجم صاحب اگر اردو،فارسی کے میلاد ناموں اور نورناموں کا مطالعہ کریں گے تو انھیں پتہ چلے گا کہ اسطوری فکر نے انھیں اسلامی اساس سے کتنی دور ڈھکیل دیا ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں اس امر کا اعتراف بھی کیا ہے کہ''(معراج) کی ان ساری تفصلات کے بیان میں انھوں (غالبؔ) نے اپنے علم و ہنر کو تو خوب آزمایا لیکن نفس مضمون اور موضوع کی انھوں نے مطلق پروانہ کی اور واقعہ معراج کے حقائق اور تفصیلات جو احادیث میں مذکور ہیں، ان سے سراسر اغماض برتا۔ یہاں تک کہ اس میں مختلف علوم کے پرتو تو نظر آتے ہیں لیکن واقعۂ معراج کی روشنی کہیں نظر نہیں آتی کہیں کہیں چقماق کی سی چنگاریاں نظر آتی ہیں وہ غالبؔ کے حسن تدبر، تفکر اور تخیل کے سائے میں آنکھ مچولی کرتی نظر آتی ہیں۔اس مثنوی میں غالب کا کمال فن اوج پر دکھائی دیتا ہے۔اس میں تقدس کا بھی خیال رکھا گیا ہے،لیکن معراج سے رکھی جانے والی عقیدت اور حضورؐ سے رکھی جانے والی انسیت کا اس مثنوی میں فقدان نظر آتا ہے۔'' آخر میں میں ایک بار اور کہتا ہوں کہ''بیانِ معراج'' خالصتاً مذہبی موضوع کی حامل مثنوی ہے۔مگر غالبؔ نے شعری جمالیات کے سہارے اور مضمون و معنی آفرینی کے ذریعہ اس کے کشف کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔عقیدت میں فن کو سمانے کا یہ ہنر بڑا مستحسن ہے۔مذہبی امور کا یوں فنکارانہ اظہار کہ تقدس مجروح بھی نہ ہو،نہایت مشکل عمل ہے۔واقعۂ معراج بیان کرتے وقت انھوں نے علم نجوم کے غوامض کو ماہرِ فن کی طرح منکشف کیا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اس علم میں درک رکھتے تھے بلکہ سیاروں کے سعد و نحس اثرات کو بھی مانتے تھے۔شب معراج کی تعریف میں غالبؔ نے جو اشعار قلم بند کیے ہیں، اردو میں کسی رات کی تعریف میں مجھے ایسے اشعار دکھائی نہیں دیے۔میرا اپنا ماننا ہے کہ اگر غالبؔ واقعۂ معراج کو منظوم نہ کرتے اور صرف منقبت شب معراج ہی پر اکتفا کر لیتے تو بھی''معراج'' پر نظم لکھنے کا حق ادا ہو جاتا۔ والسلام

□□□

ڈاکٹر اسلم انصاری، ملتان مورخہ ۲۳ مارچ ۲۰۱۸ء

آپ کا ۲۰ر فروری ۲۰۱۸ء کا مکتوب گرامی پیش نظر ہے۔ آپ کا سوالنامہ غور و فکر کا متقاضی تھا۔ کچھ اور ناگزیر وجوہ کی بنا پر تاخیر بھی ہوئی، فون پر آپ سے گفتگو باعث راحت ہوئی، نعت کے موضوع سے آپ کی پُرخلوص دلچسپی اور نعت کے فروغ میں آپ کا انہماک شوق انگیز ہیں۔ آپ کے گیارہ سوالات کے جواب آج (۲۳ر مارچ) مکمل ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی رائے اور اپنے محسوسات بلاکم و کاست بیان کر دیے ہیں۔ البتہ جو کچھ لکھا ہے خلوصِ نیت سے لکھا ہے۔ اب تک آپ نے نعت رنگ کے جتنے شمارے مجھے بھیجے ہیں، ان سب کے لیے بہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ کے متذکرہ مکتوب میں خاکسار کے بارے میں جس حسنِ ظن کا اظہار ہوا ہے، اس کے لیے بھی شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین!

اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ والسلام مع الاکرام

□□□

ڈاکٹر تحسین فراقی، لاہور ۱۱ر ستمبر ۲۰۱۷

آپ کا برقی مراسلہ کئی دن پہلے ملا تھا۔ شرمندہ ہوں کہ جواب جلد نہ دے سکا۔ آپ نے مراسلے میں عرفی کا ایک مشہور نعتیہ شعر لکھا ہے جسے اقبال نے ایک موقعے پر بہت سراہا تھا۔ شعر یہ ہے:

سایۂ من ہچومن در ملکِ ہستی اُمّت
سایۂ تو در عدم پیغمبر ہمتائے من!

آپ نے کرم کیا کہ میرے استفسار پر بتایا کہ علامہ کا یہ پسندیدہ شعر "روز گار فقیر" (سید وحید الدین) کی پہلی جلد میں (ص ۱۴۷) پر مذکور ہے جہاں علامہ نے اس کی پسندیدگی کی وجہ بھی بیان کی ہے۔

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اس شعر کی توضیح پیش ہے مگر پہلے یہ صراحت ضروری ہے کہ یہ شعر عرفی کے مشہور قصیدے "در نعتِ حضرت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)" کا حصہ ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے:

صبحدم چوں در دمد دل صور شیون زای من
آسماں صحنِ قیامت گرد داز غوغای من

تشریح طلب شعر کی وضاحت کے ضمن میں چند اُمور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں۔ پہلا یہ کہ شعر چونکہ قصیدے کا ہے اس لیے اس میں تعلّی کا ہونا گویا اس کے عناصر ترکیبی میں سے ہے۔ دوم یہ کہ آپ کے فرستادہ شعر کی توضیح کا حق اس صورت میں اطمینان بخش طریقے سے ادا ہو سکتا ہے جب اس کے ساتھ اس کے ماقبل و مابعد کا شعر بھی پیشِ نظر رکھا جائے یعنی:

آسمانِ وحدتم بر عالمِ فطرت محیط
تو امینت بر نتابد پیکرِ جوزای من

سوم یہ کہ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ اس عالم ناسوت میں حضور اکرم ﷺ کے پیکرِ مبارک کا سایہ نہیں تھا (ای و دقیقہ دانِ عالم۔ بے سایہ و سائبانِ عالم — فیضی) گویا یہ ایک معجزہ تھا منجملہ اور متعدد معجزوں کے۔ چہارم یہ کہ قصیدے کے میدان میں بقول عرفی کوئی اس کا ہمسر اور حریف نہیں۔ اقبال نے درست فرمایا ہے کہ عرفی کے مذکورہ شعر میں خوبصورت تعلّی موجود ہے۔ اب آئیے ان دونو شعروں کی توضیح کی جانب:

پہلے شعر کے پہلے مصرعے میں شاعر حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ با برکات سے اپنے کمال والہانہ پن کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے نبی والا صرف میں ہی نہیں میرا سایہ بھی اِس دنیا میں آپ ﷺ کا امتی ہے۔ دوسرے مصرعے کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ چونکہ آپ ﷺ کے پیکرِ مبارک کا سایہ معدوم ہے تو گویا وہ عالم موجودات میں نہیں عالم عدم میں ہے۔ اِس دنیا میں شاعری کے باب میں میرا بھی کوئی ثانی نہیں گویا میرا حریف بھی معدوم ہے یعنی ملکِ عدم میں ہے۔ لہٰذا وہاں آپ ﷺ کا سایہ میرے حریف کا پیغمبر ہوگا۔ اگلے شعر کا مفہوم سابقہ شعر کی تکمیل کرتا ہے۔ عرفی کہتا ہے کہ میں وحدت کا آسمان ہوں (یعنی شاعری کے میدان میں واحد ہوں) جو عالم فطرت پر چھایا ہوا ہے اور میری شاعری کا پیکر دوئی کا متحمل نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شاعر نے اپنے پیکرِ شعری کو بارہ بروج میں سے ایک برج — جوزا قرار دیا ہے جس کی شکل و شبیہہ دو لڑکوں کی صورت میں ہے جو پشت کی جانب سے جڑے ہوئے ہیں گویا توام ہیں۔ شاعر کے نزدیک اس کی شاعری ہے تو برجِ جوزا سے مماثل مگر یہ پیکرِ شعری واحد ہے، اس کا جوڑا یا حریف و ہمسر ناپید ہے۔ مطلب یہ کہ میری شاعری اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ اب سوال یہ ہے کہ عرفی نے اپنے شعری پیکر کو جوزا کس لیے قرار دیا ہے تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ منطقۃ البروج میں برجِ جوزا سب سے بڑا، سب سے زیادہ باشکوہ اور غیر معمولی شانِ امتیاز کا حامل ہے۔ باقی باقی۔ اُمید ہے آپ بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔ احباب کی خدمت میں سلام۔

□□□

پروفیسر سحر انصاری، کراچی — ۱۷؍ ستمبر ۲۰۱۸ء

تحفہ دینا اور تحفہ لینا ایک خوب صورت رسم ہے۔ آپ کے تحفوں میں محبت اور اخلاص کے علاوہ عمدہ اور معیاری کتابیں اور رسالے بھی شامل ہوتے ہیں، اس سے حسنِ طلب میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور ذوقِ طلب کو آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اس بار بھی آپ نے یہی ارمغان دیے ہیں۔ ان میں سلیم شہزاد صاحب کی کتاب ''کشفیہ'' مجھے بہ طورِ خاص پسند آئی۔ اگرچہ کتاب نسبتاً مختصر ہے لیکن بہ قول شیخ سعدی ''ہر کہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر'' اس کے تمام مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ مجھے اس کتاب میں غالبؔ کی فارسی مثنوی ''ابرِ گہربار'' کا منظوم ترجمہ دیکھ کر زیادہ خوشی ہوئی۔

غالبؔ نے "ابرِ گہربار" کے علاوہ بھی فارسی میں نعتیہ کلام تخلیق کیا ہے۔ ایک نعت کا آغاز یوں ہوتا ہے:

بعد حمد ایزد و نعتِ رسولؐ
مینگارم نکتہ چند از اصول

جلوۂ اوّل کہ حق بر خویش کرد
مشعل نورِ محمدؐ پیش کرد
شُد عیاں زان نور در بزم ظہور
ہر چہ پنہاں بود از نزدیک و دور

ایک اور نعت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بنام ایزد اے کلکِ قدسی صریر
بہر جنبش از غیب نیرد پذیر

محمدؐ کز آئینہ روے دوست
جز نیش ندانست دانا کہ اوست

مثنوی "ابرِ گہربار" ہر لحاظ سے بہت اہم اور اپنے اسلوب میں بے مثال ہے۔ اس کے نثری ترجمے ہوئے ہیں لیکن سلیم شہزاد کا منظوم ترجمہ بہت رواں اور شستہ ہے۔ ترجمے کی بحر بھی وہی ہے جو غالبؔ کی فارسی نعت کی ہے۔

غالبؔ کی فارسی اور قدرتِ کلام کو ذہن میں رکھیے تو اردو یا کسی اور زبان میں اس کا منظوم ترجمہ ایک کارِ محال معلوم ہوتا ہے۔ "مہرِ نیمروز" کے آغاز میں لکھتے ہیں:

اے ہمہ و بے ہمہ و باہمہ

اب اس بلیغ مصرے کا اردو میں کیا ترجمہ ہو سکتا ہے بجز اس کے کہ یہی مصرع اردو ترجمے میں دہرا دیا جائے۔

سلیم شہزاد کے ترجمے کو میں ترجمے کے بہ جائے ترجمانی کہوں گا۔ انھوں نے لفظی ترجمے کے بہ جائے خیال کو اہمیت دی ہے۔ مثلاً یہ شعر:

سپاسے کہ شوریدگان الست
دہندش ببانگِ قلم دل زدست

کا اردو ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

جسے سن کے شوریدگان الست
"بلٰی رَبّنا" میں ہوئے جذب و مست

بعض ترجمے لفظی بھی ہیں اور بے ساختہ بھی، مثلاً:

زدل جستہ و بادل آویختہ

کا ترجمہ:

وہ حمد و ثنا موج جس کی اُٹھے
اگر دل سے تو راہ دل میں کرے

اس ترجمے یا ترجمانی کی داد نہ دینا ناانصافی کے مترادف ہے۔

سلیم شہزاد کی قدرتِ سخن، فارسی اور اردو پر ان کی دست رس لائق ستائش ہے۔ فارسی سے عبرت انگیز دوری کے اس دور میں سلیم شہزاد جیسے اسکالر خال خال نظر آتے ہیں۔ اگر وہ غالبؔ کے فارسی کلام کے منتخبات کا اردو میں مزید ترجمے کریں تو غالب شناسی کا دائرہ عام قارئین تک بھی وسیع ہو سکتا ہے جو ایک بڑی علمی خدمت ہوگی۔

نبی کریمؐ کی ذاتِ مبارکہ چودہ سو سال سے زیادہ (اب ۱۴۴۰ ہجری ہے) تمام دنیا میں توجہ کا مرکز رہی ہے۔ ان کی مخالفت سے زیادہ حضورؐ کی مدح و ثنا اور رسالت شناسی پر مختلف گوشوں سے تحقیقی کام ہوا اور ہو رہا ہے۔

آپ کی دل چسپی کے لیے ایک حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ بی وی رمن (B. V. Raman) نامی اسکالر نے جو علمِ نجوم کے ماہر ہیں، سائنسی بنیادوں پر اکابرِ عالم کے زائچے تیار کیے ہیں۔ انھی میں ایک رسالت مآبؐ کا زائچہ بھی ہے۔ رمن صاحب نے حضورِ اکرمؐ کی تاریخِ ولادت اور وقت کا یہ تعین کیا ہے ۲۰ ر اپریل ۵۷۱ عیسوی، صبح ایک بج کر دس منٹ۔

پروفیسر رمن کے مطالعے کا خلاصہ یہ ہے کہ "دنیا کی مذہبی تاریخ میں محمدؐ یقیناً ایک غیر معمولی شخصیت ہیں۔ وہ ایک پیغمبر، فلسفی اور ماہر سیاسیات تھے۔ یہ اس لحاظ سے غیر معمولی زائچہ ہے کہ نویں بُرج میں سیارہ مشتری، تیسرے بُرج میں آفتاب اور عطارد ہیں اور ہر ایک کا اثر بہت گہرا ہے۔ انؐ کے زائچے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہؐ ایک بے حد منفرد شخصیت تھے۔"

بہر حال یہ بھی ایک علم ہے۔ اور اس کے ذریعے حضورِ اکرمؐ کے فضائل تک رسائی کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے اسے کسی پیش گوئی، علمِ غیب یا تقدیر پرستی سے ہٹ کر دیکھنا چاہیے۔

"نعت رنگ" کے اگلے شمارے کا انتظار ہے۔ حضرت محسن کاکوروی اور علامہ اقبال کی نعتیہ شاعری پر آپ کی مرتب کردہ کتابوں کا بھی تذکرہ سنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی دیگر علمی کاوشوں کی طرح یہ تالیفات بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی اور حوالے کی کتب ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر عزیز احسن، کراچی ۱۸ر ستمبر ۲۰۱۸ء

تمھیں معلوم ہے کہ میں آج کل نعتیہ شاعری کے مختلف الابعاد تخلیقی رویوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس ضمن میں تم سے بھی کئی بار گفتگو ہوئی ہے۔ میرے خیال میں نعتیہ ادب کے ناقدین کو تنقید میں تخلیقی پہلوؤں کی بوقلمونی کا دھیان رکھنا لازمی ہے، تاکہ شعری تخلیقات کے محرکات اور اظہار کے مختلف انداز کے حوالے سے ایک مفاہمتی فضا بن سکے۔ ورنہ یا تو ہم مدحیہ شاعری کے لیے دروازے بالکل بند کر دیں گے یا ہر شاعر کو فکر و خیال کی وادی میں بھٹکنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں گے۔

پچھلے دنوں میں، سر آرتھر اڈنگٹن کا ایک خطبہ پڑھ رہا تھا۔ سر آرتھر اڈنگٹن نے سوارتھ مور لیکچر شپ (Swarthmore Lectureship) کے زیرِ اہتمام "دارالاحباب" (Friends House) لندن میں سن 1929ء میں "غیب وشہود" کے عنوان سے اپنا یہ خطبہ پڑھا تھا۔ اس خطبے کا اردو ترجمہ معروف اسکالر سید نذیر نیازی نے کیا ہے۔ یہ نذیر نیازی علامہ اقبال کے بہت قریب رہے ہیں۔ علامہ کے خطبات "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" کا ترجمہ بھی "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے عنوان سے، ان ہی نے کیا تھا۔ علامہ کی سوانح حیات بھی دانائے راز" کے نام سے لکھی تھی۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ جناب نذیر نیازی کے ترجمے کے باعث مجھے "غیب وشہود" کا مطالعہ کرنے میں سہولت رہی۔ مترجم کے بقول، اڈنگٹن کا شمار سر برآوردہ سائنس دانوں میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ وہ سائنس کے ساتھ ساتھ فلسفے اور مذہب کے موضوعات میں بھی دلچسپی رکھتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے دوران میں جب تم میرے پاس آئے تھے تو میں نے تمھیں بتایا تھا کہ اڈنگٹن نے دو باتیں بڑی معنی خیز کہی ہیں...... وہ کہتا ہے:

۱۔ "برقی ذروں کے اجتماع سے، جو شروع شروع کی حالتِ فساد میں ہر طرف پراگندہ تھے، مادے کی ۹۲ مختلف قسمیں یا ۹۲ کیمیائی عناصر پیدا ہوئے"۔

۲۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس حقیقت کا اظہار کیا جائے بھی تو کیسے کہ فطرت کے حساب میں اگر ۶ کا عدد نہ ہوتا تو حیاتِ نامیہ کا آغاز بھی نہ ہوتا"۔

اڈنگٹن کی دریافت نے مجھے، حقیقتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تفہیم کا سائنسی نکتہ سمجھایا ہے۔ کیوں کہ ۹۲ کا عدد حضورِ اکرم ﷺ کے نام نامی "محمدؐ" کا عدد ہے۔ لہٰذا، اس انکشاف سے میرے لیے اس قطعے کی تفہیم اور آسان ہوگئی ہے جو اقبال نے فلکِ مشتری پر حسین بن منصور حلاج کی زبان سے ادا کروایا تھا:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو

یا زنورِ مصطفیٰ اورا بہا ست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ؐ ست

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جہانِ مشہود میں جہاں جہاں بھی آرزوؤں کی پیدائش کا منبع ہے، اس میں جتنی بھی روشنی اور، چمک دمک ہے......اور جس کے باعث اس کی قیمت یا قدر (Value) متعین ہو چکی ہے، وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے نور کا فیضان ہے......اور جہاں یہ روشنی نہیں پہنچی ہے وہ عالم شہود، حضورِ اکرم ﷺ کے نور کا متلاشی ہے کیوں کہ وہ [عالم شہود]، غیب (پوشیدہ حقیقتِ محمدیہ ﷺ) سے اتصال کے بغیر نامکمل ہے۔

ایڈنگٹن کی تحریر دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ایک سائنس داں تو ۹۲ کی حقیقت جاننے کے لیے عالم شہود سے عالم غیب کا سراغ لگانے کے لیے بے چین ہے۔ لیکن جو مسلمان حضورِ اکرم ﷺ کے لائے ہوئے دین کے طفیل ''عالم غیب'' پر ایمان رکھتے ہیں وہ حقیقتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی معرفت کی طرف قدم بڑھانے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ ان لوگوں (صوفیہ کرام) کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں جو حقیقتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی معرفت کے مراحل طے کر کے، ان کی طرف علامتی زبان میں اشارے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس خط میں یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اس ادق موضوع پر قلم فرسائی کروں۔ تاہم یہ اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں، کہ نعتیہ شاعری کے تخلیقی رویوں کا مطالعہ سہ ابعادی (Three dimensional) پہلوؤں سے کیا جانا چاہیے۔ یعنی [۱] عوامی سطح کی شاعری ...... [۲] شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی شعری تخلیقات...... [۳] صوفیانہ مشاہدات و تجربات کے عکس کی حامل نعتیہ شعری تخلیقات۔

ناقدین کو ہر قسم کی شاعری کو اسی ذہنی و فکری تناظر میں دیکھ کر بات کرنی چاہیے۔ مثلاً جو لوگ حضورِ اکرم ﷺ سے براہِ راست مخاطبہ کرتے ہیں انھیں ''حاضر و ناظر'' کے شرعی نکتہء نظر کے یک رخے پہلو کی روشنی میں رد کرنے کا رویہ اپنانے کے بجائے۔ عام شعری تخلیقات کے محرکات پر غور کرنا چاہیے۔

میں اس موضوع پر پہلے بھی کسی تحریر میں اپنا مؤقف بیان کر چکا ہوں، یہاں بھی اشارۃً کہے دیتا ہوں کہ دنیا کا ہر شاعر، اپنے محبوب کو سامنے بٹھا کر نہ تو اس کے حسن کی تعریف کرتا ہے اور نہ ہی اس سے گلے شکوے کرتا ہے۔ وہ تو ہر شعر اپنے محبوب کو سامنے تصور کر کے ہی کہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ عالم شہود کے علاوہ کسی اور عالم کی کیفیات کو لایعنی اور باطل تصور کرنے والے ناقدین، ان اشعار کی تشریح کیسے کریں گے؟؟؟......... ذرا غور کرو کیا درجِ ذیل اشعار کہتے ہوئے شعراء کے مخاطبین (محبوب) ان شعراء کے سامنے ہوں گے؟؟؟

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا (مومن خاں مومنؔ)

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہوگیا گوشت سے ناخن کا جدا ہوجانا (اسداللہ خان غالبؔ)

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ (احمد فرازؔ)

ظاہر ہے یہ اشعار محبوب کی جدائی میں تصوراتی مکالماتی فضا میں کہے گئے ہیں۔
ایسی صورت میں اگر ان اشعار کی تشریح محبوب کو حاضر سمجھ کر کی جائے گی تو ادب کا کوئی معمولی طالب علم بھی یہ کہہ دے گا کہ، وصال میسر ہونے کی صورت میں شاعری ممکن ہی نہیں ہوتی.......... ایسی صورت میں تو شاعر، فراق گورکھپوری کی طرح، صرف یہ کہہ سکتا ہے:

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں؟ (بات...... یعنی شاعری کروں).......... (فراق گورکھپوری)

تو میرے بھائی صبیح!
جو لوگ عام دنیاوی محبوبوں کے شعری ذکر کو حاضر و ناظر کے زمرے میں رکھ کر نہیں دیکھتے وہ ایسا کیوں سمجھ لیتے ہیں کہ نعتیہ شاعری کرتے ہوئے ہر شاعر حضورِ اکرم ﷺ کو اپنے سے دور سمجھے گا؟؟؟
میں اس موضوع پر تفصیل سے کبھی لکھوں گا...... ان شاء اللہ!

خط کے آغاز میں، میں نے اڈنگٹن کے حوالے سے دو نکات پر اشارۃً کچھ عرض کرنے کی ٹھانی تھی۔ پہلا نکتہ تو کسی حد تک سطورِ بالا میں آگیا ہے۔ گو ابھی اس نکتے کے کئی دیگر پہلو تشنۂ اظہار ہیں۔
رہا دوسرا نکتہ یعنی......''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس حقیقت کا اظہار کیا جائے بھی تو کیسے کہ فطرت کے حساب میں اگر ۶ کا عدد نہ ہوتا تو حیاتِ نامیہ کا آغاز بھی نہ ہوتا''.......... ایڈنگٹن کا بیان کردہ یہ نکتہ، قرآن کی چھ یوم میں تخلیقی کام کی تکمیل والے نکتے کی تشریح معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چھ یوم میں کام کی تکمیل کے اشارے سورہ اعراف، یونس، ھود، فرقان، السجدہ، قٓ، حدید اور سورۂ مجادلہ میں کیے ہیں۔ کہیں صرف ارض و سماوات کا ذکر کیا ہے اور کہیں ''وما بینھما'' کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مثلاً سورۂ ''قٓ'' کی آیت ۳۸ میں ارشاد ہوا......''وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ۔۔۔۔۔۔ بلا شبہ پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان سب چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں، چھ دنوں میں''۔
اس لیے میرا خیال ہے کہ سائنسی ذہن رکھنے والے ناقدین کو اس طرف متوجہ کرنا ضروری ہے کہ علم کا کام شہود سے غیب اور غیب سے شہود کی گتھیوں کو سلجھانے سے عبارت ہے۔ لہٰذا حمد و نعت کے شعری لوازمے (Matter) کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔
صوفیانہ کیفیات کو شعری سانچوں میں ڈھلتا ہوا دیکھ کر فتاویٰ جاری کرنے کے بجائے، شعراء کی روحانی واردات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ یہ الگ بات کہ کچھ باتیں شطحیات کی سطح کی بھی ہوتی ہیں۔ جن

کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ...... یہ حال [کیفیاتِ عالمِ غیب] کی باتیں ہیں، عالمِ شہود میں رہنے والے اہلِ قال، ان باتوں سے نابلد ہیں۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ بغیر سمجھے بوجھے ان باتوں کو اپنا موضوعِ تفہیم نہ بنائیں۔

باتیں بہت ہوگئیں۔ تم جب آتے ہو تو گفتگو کے دائرے پھیلتے چلے جاتے ہیں اور بہت سارے موضوعات ادھورے رہ جاتے ہیں، اس لیے میں نے چاہا کہ تمھیں خط لکھ کر کچھ باتیں ریکارڈ پر لے آؤں۔ زندگی کا کیا بھروسہ؟؟؟

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ نعت ریسرچ سینٹر کے زیرِ اہتمام شائع کی جانے والی کتب کے ذریعے بالعموم اور خود تمھاری مرتب کردہ کتب کے ذریعے بالخصوص نعتیہ ادب کی تفہیم کے بہت سارے آفاق روشن ہو رہے ہیں۔ یہ جذبہ برقرار رہا اور یہ کام اسی رفتار سے جاری رہا تو ان شاء اللہ نعتیہ ادب کے حوالے سے اٹھنے والے بہت سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ نعتیہ میدان میں تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کام کے ضمن میں کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا عہد ایک سنہری عہد ہے اور اس عہد کا نمایاں کتابی سلسلہ ''نعت رنگ'' ہے۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک!

پچھلی ملاقات میں تم نے سلیم احمد کے ان مضامین کا مجموعہ طلب کیا تھا جو روزنامہ جسارت، کراچی میں شائع ہوئے تھے۔ آج میں نے اپنے کتب خانے سے وہ کتاب ڈھونڈ نکالی...... ''اسلامی نظام، مسائل اور تجزیے''۔ اب تم خود لے جاؤ یا اپنے شوفر کے ذریعے، مجھ سے یہ کتاب منگوالو!

کل تمھارا فون سننے کے بعد میں نے اپنے وہ دو مضامین جو آرٹس کونسل میں آٹھویں عالمی اردو کانفرنس (۹ر دسمبر ۲۰۱۵ء) اور نویں کانفرنس (۲ر دسمبر ۲۰۱۶ء) میں پڑھے تھے، مبین مرزا صاحب کو برقی ڈاک سے بھجوادیے ہیں۔ ان مضامین کے عنوانات درجِ ذیل ہیں:

۱۔ ''نعت اور ہمارے شعری روایت''

۲۔ ''اردو نعت اور جدید اسالیب''

□□□

ڈاکٹر معین نظامی، لاہور

نعت رنگ، شمارہ ۲۷، دسمبر ۲۰۱۷ء کے دو نسخے موصول ہوئے۔ بہت ممنون ہوں کہ آپ نے نوازش فرمائی۔ مسرت ہوئی کہ شمارہ وقتِ موعودہ سے پہلے شائع ہوگیا۔ دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔

حسبِ روایت اور توقع کے عین مطابق یہ شمارہ بھی بہت وقیع ہے۔ اس میں شامل کچھ مضامین سے مَیں نے خوب استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً شاہ محمد ولی الرحمن چشتی جمالی نعمانی کا تعارف اور ان کا انتخابِ کلام بہت پسند آیا ہے۔

□□□

ڈاکٹر عابد حسین حیدری، سنبھل، انڈیا ۱۳ر فروری ۲۰۱۸ء

مزاج گرامی! کئی ماہ بعد سرسیّد مرحوم کے قابلِ فخر ادارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں اپنے عزیز دوست اور عہد حاضر کے معروف ناقد، ادیب اور شاعر پروفیسر مولیٰ بخش کی زیارت سے مشرف ہوا۔ ازراہِ محبت انھوں نے نعت رنگ شمارہ ۲۷ بطور تحفہ پیش کیا۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ ہندوستان کے ایک چھوٹے سے شہر سنبھل میں ایم جی ایم کالج کے پرنسپلی کے باعث سرحد پار کی ادبی سرگرمیوں سے بہت کم واقفیت ہو پاتی ہے جس کے سبب اس عظیم تحفہ کے مطالعہ سے محروم رہا۔ آپ کی پُرخلوص کوشش کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ اُستادِ محترم مرحوم علی جواد زیدی نے العم ممبئی سے ایک خصوصی نمبر ''نعت خیر المرسلین'' شائع کیا تھا جس میں راقم الحروف بھی بحیثیت مدیران کا شریک کار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہبی شہ پاروں کی بھی ادبی پرکھ ضروری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں جواں سال ادیب ارتضیٰ عباس نقوی اور آپ یہ کام بخوبی انجام دے رہے ہیں۔ اللہ آپ حضرات کو اس کی جزا دے گا۔ سردست پروفیسر مولیٰ بخش کے حکم پر ایک مضمون ''دلو رام کوثری کی نعت گوئی، ہندو کی نعت و منقبت کے حوالے سے'' آنے والے شمارے میں شمولیت کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ نعت رنگ میں شامل فرما کر شکر گزار فرمائیں گے اور اگر ممکن ہو تو گزشتہ شمارے بھی میرے پتہ پر ارسال فرمائیں تو خصوصی کرم ہوگا۔

□□□

شاہدہ حسن، ٹورانٹو (کینیڈا)

آپ سے اچانک ملنے کی خوشی ہوئی۔ آپ کی فرمائش پر کچھ کلام اکٹھا کیا ہے وہ خود ہی کمپوز کر کے آپ کو بھیج رہی ہوں۔ ان میں سے اکثر کلام پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں پڑھا ہے۔

''بابِ مدحت جو کھلا، دل کی نوا لے آئی'' یہ نعت آج سے کم و بیش بیس سال قبل کہی تھی۔ نعت گوئی میرا اختصاص نہیں، مگر اپنی روح کو ان کی بارگاہ سے منسلک رکھنے کے لئے، اس جراتِ سخن سے کام لیتی ہوں۔ دعا کرتی ہوں کہ وہ اپنی نظرِ عنایت سے میری ان ناکام کاوشوں کو قبول فرمالیں۔۔ چند اور نعتیں بھی بھجوا رہی ہوں۔ بہت دعائیں

□□□

سیّد ضیاء الدین نعیم، راولپنڈی ۷ر فروری ۲۰۱۸ء

''نعت رنگ'' کا شمارہ ۲۷ پیش نظر ہے۔ ''ابتدائیہ'' میں کیا خوبصورت بات کہی آپ نے ''کوئی لکھنے والا ہو یا پڑھنے والا، ہر شخص کا ہر دوسرے شخص سے مکمل اتفاق ضروری نہیں ہے۔ مکمل یا جزوی اختلاف کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف کوئی بری چیز بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے، ادب، فکر اور تنقید

کے لئے تو یہ بڑی بابرکت شے ہے۔اس لئے کہ اس سے خیال کے نئے در وا ہوتے اور فکر و نظر کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں"

ماشاءاللہ"نعت رنگ" کی یہی صحت فکر اسے ہر اعتبار سے وقیع سے وقیع تر مقام کا حامل بناتی چلی جارہی ہے۔اس شمارے میں جناب ڈاکٹر عزیز احسن کا مضمون" نقد نعت میں تنقیدی دبستانوں کی بوقلمونی" میرے نزدیک خصوصی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں فکر و تنقید کے ایسے ایسے گوشے قارئین کے سامنے آتے ہیں جن سے غالباً پہلے کم کم اصحاب فکر ہی آشنا ہوں گے۔امین راحت چغتائی کے مضمون"مشکلات تنقید" کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے جناب عزیز احسن نے یہ چونکا دینے والے جملے تحریر کئے ہیں کہ" امین راحت چغتائی نے غیر معمولی شہرت حاصل کرنے والے الفاظ'لولاک لما خلقت الافلاک' کو حدیث قدسی کے طور پر قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ملا علی قاری کی" الموضوعات الکبیر" کے صفحہ ۵۹ کا حوالہ دے کر یہ بتایا ہے کہ یہ جعلی احادیث میں شامل ہے"

اہل علم سے گزارش ہے کہ تحقیق کر کے ہم واجبی معلومات رکھنے والوں کو آگاہ فرمائیں کہ یہ" ملا علی قاری" کون ہیں اور" الموضوعات الکبیر" کی استناد کے لحاظ سے کیا حیثیت ہے؟

جناب عزیز احسن کا یہ معرکہ آرا تفصیلی مضمون نقد و نظر میں دلچسپی لینے والے سب احباب کو بار بار پڑھنا چاہئے۔

" مذاکرہ" میں بہت علم افزا اور ذہن کشا مباحث سامنے آئے۔جناب عزیز احسن کی بیان کردہ حدیث مبارکہ کہ" کلام میں مبالغہ کرنے والے ہلاک ہو گئے" ایلیٹ کا یہ قول کہ" جو صنف ادب عالیہ میں داخل ہوتی ہے اس کا سینہ اتنا کشادہ ہونا چاہیے کہ وہ تنقید کے تیر برداشت کر سکے" اور آپ کا یہ کہنا کہ" نعت کے ادب عالیہ میں لانے کے لئے"غفلت" (اصل) مسئلہ ہے" نہایت قابل اعتنا باتیں ہیں۔۔" شاعرانہ اپروچ، poetic reality اور fact کے حوالے سے گفتگو بھی بہت عمدہ رہی۔

جناب سحر انصاری نے انٹرویو کے دوران نعت نگاری میں نئے مضامین کے حوالے سے سوال کا جواب دیتے ہوئے بڑی اچھی رہنمائی کی کہ" نئے مضامین میں ایک تو حضور سرور کائنات کی انسان دوستی، ان کے ہاں جو رواداری ہے مسلک کی، ایک بہت وسیع میدان ہے زندگی کا، آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا کی زندگی کو بھی انہوں نے اہمیت دی ہے، جو حقوق العباد پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے، ان موضوعات کو لوگ زیادہ نہیں لاتے۔۔۔ یہ زیادہ ضروری ہیں"

جناب ڈاکٹر اشفاق انجم ایک بے باک اور محترم نقاد کی حیثیت سے" نعت رنگ" میں اپنا بلند مقام بنا چکے ہیں۔۔ دیگر احباب کی طرح میں بھی ان سے فیض اٹھاتا ہوں اور فکر و فہم کے نئے نئے دریچے ان کی بدولت وا ہوتے رہتے ہیں۔" نعت رنگ" کے شمارہ ۲۵ میں میرا گوشہ شائع ہوا تو انہوں نے بنظر غائر اس کا مطالعہ کیا، بعض مشورے عنایت کئے اور کچھ غلطیاں بتائیں۔

میرا ایک مصرع تھا۔۔

ساری" بدزیبیاں ماحول کی زیبا کر دیں"

جناب اشفاق انجم نے ازراہ کرم بالکل درست نشاندہی فرمائی کہ کوئی شے یا تو" زیبا" ہوتی ہے یا "نازیبا"۔۔۔۔میں نے شکریے کے ساتھ اپنا مصرع درست کرلیا ہے

بعض دوسری تجاویز کے ساتھ جناب اشفاق انجم نے میرے ذیل کے شعر:

" انہوں نے تزکیہ فرمایا اہل ایماں کا

نکال لے گئے ظلمت سے روشنی کی طرف"

کے بارے میں تبصرہ کیا کہ" عجیب سا شعر ہے۔انہوں نے اہل ایماں کا تزکیہ فرمایا اور انہیں ظلمت سے روشنی کی طرف نکال لے گئے! "کیا اہل ایمان ظلمت میں تھے؟ یہاں" اہل ایماں" کی جگہ" اہل عصیاں "ہونا چاہئے"۔)۔۔۔۔

جناب ڈاکٹر اشفاق انجم اور جملہ اہل علم کے روبرو مجھے اپنا یہ موقف رکھنا ہے کہ میرے خیال میں قرآن کریم کی رو سے تزکیہ اور ظلمت سے روشنی کی طرف نکال لے جانے کا عمل ایمان لے آنے کے بعد ہی انجام پاتا ہے۔

اللہ ولی الذین آمنوا۔۔یخرجھم من الظلمات الی النور (القرآن)

(اللہ اہل ایمان کا ولی ہوتا ہے اور انہیں اندھیروں سے اجالے کی جانب نکال لے جاتا ہے)

اس مفہوم کو میں نے اپنے ایک حمدیہ شعر میں یوں نظم کیا ہے۔

تو خود ظلمت سے لے آتا ہے اس کو نور کی جانب

وہ جس کے دل میں تیری ذات پر ایمان ہے یارب

سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۴ ہے:

لقد من اللہ علی المومنین اذبعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ و یز کیھم ویعلمھم الکتاب والحکمہ (ج) وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (آیت)۔۔۔

مفہوم :یقیناً بڑا احسان کیا ہے اللہ نے مومنوں پر کہ بھیجا ان میں ایک رسول انہی میں سے، جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اللہ کی آیات اور" تزکیہ" کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے ان کو کتاب اللہ کی اور سکھاتا ہے ان کو حکمت، اگرچہ تھے وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں۔۔۔۔

شمارہ ۲۷ میں صفحہ ۴۸۳ پر شائع شدہ میری نعت میں کمپوزنگ کی بعض غلطیاں ہیں جن کی نشاندہی ضروری ہے۔

شعر ا پہلا مصرع کھلاؤں مسکیں کو کھانا سلام" عام" کروں

شعر ۲ پہلا مصرع — نبی کی پیروی "ہی" میں ہے رب کی خوشنودی
شعر ۸ پہلا مصرع — کرے جو دور رسول خدا کے "رستے" سے
شعر ۱۲ دوسرا مصرع — بلند سچ کا ہی "ہر" حال میں ۔۔ میں نام کروں

اللہ حافظ

□□□

ڈاکٹر محمد شاہ کھگہ

۱۲ر فروری ۲۰۱۸ء

بعد از تسلیمات، فون پر بات کر کے بہت اچھا لگا۔ اطمینان اور تسکین کا باعث بنا۔ ان شاء اللہ رابطہ رہے گا۔ آپ کی جانب سے کتابوں کا پارسل موصول ہوا، جن میں "نعت رنگ کے پچیس شمارے"، "پاکستانی زبانوں میں نعت روایت وارتقا"، "نعت رنگ کا ستائیسوں نمبر" اور "کلامِ رضا فکری وفنی زاویے" بہت خوبصورت موضوعات کی کتب ہیں۔ بہت اعلیٰ کاغذ، عمدہ بائنڈنگ اور بڑے روحانی موضوعات ہیں۔ خدائے تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور اس طرح کے علمی وتحقیقی وروحانی کام کرنے کی مزید توفیق فرمائے۔ جو پروجیکٹ آپ نے مجھے تفویض کیا ہے اس کی تفصیل آپ تحریری صورت میں اگر مجھے ارسال کردیں تو میرے لیے آسانی رہے گی۔ اور میرے لیے اوّلین ترجیح بھی۔ ایک بار پھر شکریہ اور دُعاؤں کی التماس۔

□□□

تنویر پھول، نیویارک

آپ کی بڑی نوازش کہ آپ نے "نعت رنگ" شمارہ نمبر ۲۷ گلستان جوہر، کراچی میں میرے بھتیجے سیف الدین کو مجھے ارسال کرنے کے لئے عنایت کیا۔ شمارہ پا کر بے حد مسرت ہوئی اور آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلیں۔ سرورق پر سورۃ الرحمن کی آخری آیت "تبارک اسم ربک ذی الجلال والاکرام" بہت خوبصورتی سے لکھی ہوئی ہے۔ سب سے پہلے آپ کا "ابتدائیہ" جو ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے، پڑھا۔

بلاشبہ آپ کی یہ تحریر ایک گراں قدر مقالے کی حیثیت رکھتی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مضامین نثر ونظم کا انتخاب خوب ہے جس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کمپوزنگ پہلے سے بہت بہتر ہے لیکن پھر بھی مزید توجہ کی ضرورت ہے، مثال کے طور پر صفحہ نمبر ۴۲۸ پر چوتھی سطر میں کئی الفاظ آپس میں اس طرح مل گئے ہیں جو بدنما لگ رہے ہیں۔ صفحہ نمبر ۴۵۱ پر شعر نمبر ۱۱ کے دوسرے مصرع میں لفظ دوزخ "دروزخ" کمپوز ہوا ہے۔ صفحہ نمر ۴۵۴ پر شعر نمبر ۷ میں گل عذار، گل غدار بن گیا ہے۔ صفحہ نمبر ۴۶۶ پر نعت کے آخری مصرع میں کونین کے آخری ن کا نقطہ غائب ہے۔ صفحہ نمبر ۴۷۱ پر ریاض حسین چودھری مرحوم کی نعت کے پانچویں مصرع میں "رکھ" کی جگہ "رکھے" کمپوز کر کے مصرع کو بے وزن کر دیا گیا ہے، درست مصرع یہ ہونا چاہیے: